

منہج اسلام حضرت مولانا سید الحسن علی ہودوی
کے فکر انگیز خطبات کا مجموعہ

خطبات علی میاں

جمع و ترتیب

مولوی محمد رمضان میاں صاحب
جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن - کراچی

دارالانشاعت

اردو بازار ایم اے جناح روڈ ۵ کراچی ۱

خطباتِ علی میاں

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
کے فکر انگیز خطبات کا مجموعہ

خطباتِ علی میاں رحمۃ اللہ علیہ

جلد ششم

علم و دانش

جمع و ترتیب

مولوی محمد رمضان میاں نیپالی
جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن - کراچی

اردو بازار ایم اے چنچ روڈ
کراچی پاکستان 2213768

دارالاشاعت

جملہ حقوق باقاعدہ معاہدے کے تحت محفوظ ہیں

باہتمام : خلیل اشرف عثمانی دارالاشاعت کراچی
طباعت : اکتوبر ۲۰۰۲ء علمی گرافکس پرنٹنگ پریس، کراچی۔
ضخامت : 424 صفحات

..... ملنے کے پتے.....

ادارۃ المعارف جامعہ دارالعلوم کراچی	بیت القرآن اردو بازار کراچی
ادارہ اسلامیات ۱۹۰۔ انارکلی لاہور	بیت العلوم 20 ناہیہ روڈ لاہور
مکتبہ سید احمد شہید اردو بازار لاہور	کشمیر بکڈ پو۔ چنیوٹ بازار فیصل آباد
مکتبہ امدادیہ بی بی ہسپتال روڈ ملتان	کتب خانہ رشیدیہ۔ مدینہ مارکیٹ راجہ بازار راولپنڈی
مکتبہ رحمانیہ ۱۸۔ اردو بازار لاہور	یونیورسٹی بک اینجمنی خیبر بازار پشاور
ادارۃ اسلامیات موہن چوک اردو بازار کراچی	بیت الکتاب بالمقابل اشرف المدارس گلشن اقبال کراچی

..... نیپال میں ملنے کے پتے.....

مکتبۃ الحرمین، مدرستۃ الحرمین للٹ پور (کاٹھمنڈو) نیپال
حاجی بک شاپ نیپالی جامع مسجد، دربار مارگ، کاٹھمنڈو
دارالعلوم ہدایت الاسلام، انروا بازار، سنسری، نیپال

فہرست عنوانات

۱۹	انتساب
۲۰	خطبات کی اہمیت
۲۱	خامہ فرسائی
۲۳	میری علمی اور مطالعاتی زندگی
۵۷	سوالنامہ
۷۳	علوم اسلامیہ کے سوتے ایمانیات سے ملتے ہیں
۷۳	مہارت اور اختصاص ضروری ہے
۷۴	معیار کی طرف توجہ کی ضرورت ہے
۷۵	استشراق کی ترقی کاراز
۷۵	علم کا عشق
۷۷	ماضی قریب کی علمی شخصیتیں
۷۸	علم محنت بھی ہے اور انعام بھی
۷۹	دلچسپی اور شغف عارضی نہ ہو
۷۹	علوم اسلامیہ کے سوتے ایمانیات سے ملتے ہیں
۸۰	عربی زبان کی اہمیت
۸۱	انتشار انگیزی سے احتراز کیجئے
۸۳	ملک و ملت کی نوجوانوں سے توقعات
۹۵	اٹھو! کہ اب گردش جہاں کا انداز اور ہے
۹۵	”الاصلاح“ کا قیام ایک جرأت مندانہ اقدام تھا:

صفحہ	عنوان
۹۶	آج زمانہ بہت بدل چکا ہے:
۹۷	متوسط درجہ کی لیاقت کافی نہیں:
۹۸	زمانہ کا دامن سمٹتا اور پھیلتا رہتا ہے:
۹۸	آج پہلے سے کہیں زیادہ تیاری کی ضرورت ہے:
۹۸	تحقیق و مطالعہ کا میدان بہت وسیع ہے:
۹۹	بہت سے قدیم مباحث آج اپنی اہمیت کھو چکے ہیں:
۹۹	زمانہ آسانی کے ساتھ کسی کو تسلیم نہیں کرتا:
۱۰۰	یقین کی طاقت:
۱۰۱	سب سے بڑا معرکہ افکار:
۱۰۲	آج کا تجدیدی کام:
۱۰۲	یہ چیلنج قبول کیجئے:
۱۰۲	آج زمانہ زیادہ اہم چیزوں کا طالب ہے:
۱۰۳	یہ علم کا، تہذیب کا، خیالات کا اور مقاصد کا حرم ہے:
۱۰۵	ہنگلہ زبان میں فاضلانہ مہارت پیدا کیجئے
۱۰۵	ملک کا رشتہ اسلام سے کمزور نہ ہونے پائے!
۱۰۶	مادری زبان میں مہارت حاصل کرنے کی ضرورت
۱۰۸	اس ملک کی حفاظت کی ذمہ داری آپ پر ہے
۱۱۱	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا کام اور پیغام
۱۱۳	مسلم یونیورسٹی کی حیثیت
۱۲۱	ذاتی تعلق، ذاتی محنت اور جذبہ خدا طلبی
۱۲۱	قدیم رسم:

صفحہ	عنوان
۱۲۲	ذاتی تعلق:
۱۲۳	ذاتی محنت:
۱۲۳	جذبہ خدا طلبی:
۱۲۷	آج نبوت محمدیؐ پر الحاد و دہریت کا حملہ ہے
۱۲۷	کوئی شاہین ہے جو اس کے مقابلہ کی سعادت حاصل کرے؟
۱۲۷	طلبہ کی دو قسمیں:
۱۲۹	دوسری قسم:
۱۳۱	عصر حاضر کے فتنے
۱۳۲	تمہارا میدان:
۱۳۲	نبوت محمدیؐ پر الحاد و دہریت کا حملہ:
۱۳۴	یکسوئی کی ضرورت:
۱۳۵	ایک فیصلہ:
۱۳۷	پاکیزہ ذوق، علم و مطالعہ کی کنجی ہے
۱۳۷	نصاب تعلیم کا دائرہ عمل:
۱۳۷	ذوق کیسے پیدا کیا جائے؟
۱۳۸	ایک مثال:
۱۴۰	اعتماد، اعتقاد اور اتحاد:
۱۴۱	مدرسہ کیا ہے؟
۱۴۱	راجستھان کا ایک یادگار دن:
۱۴۲	خزاں رسیدہ انسانیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ:
۱۴۳	مرض اور مسیحائی کے درمیان الٹو رشتہ:

صفحہ	عنوان
۱۴۴	صحرا بہار کا پیغام دیتا ہے:
۱۴۵	ہری ہو گئی ساری کھیتی خدا کی:
۱۴۷	علماء ہند کی علمی خدمات:
۱۴۹	مدرسہ کس درو کی دوا ہے؟
۱۵۰	مدرسہ کا شجرہ نسب:
۱۵۳	یہ ہے مدرسہ کی شان:
۱۵۳	دوسرا نمونہ دیکھئے:
۱۵۵	جامعہ ہدایت کے طلبہ اور فضلاء کو ہدایت:
۱۵۷	عالم ہر زمانہ میں قبلہ نما رہے:
۱۵۸	مدرسوں نے ہوا کے رخ پر چلنا قبول نہیں کیا:
۱۵۹	دارالرقم جو مسلمانوں کی پناہ گاہ تھا
۱۶۹	وقت کا سب سے بڑا جہاد
۱۷۷	چراغ زندگی اور دستور العمل
۱۷۸	کوشش کا نتیجہ ضرور نکلے گا
۱۷۹	درس نظامی اور ملا نظام الدین سہالوی
۱۸۰	علم اور کمال
۱۸۲	زبان کی حسیت اور خاصہ لسانی سے واقف ہونا ضروری ہے
۱۸۳	مسائل کا استحضار
۱۸۵	مادر علمی سے محبت
۱۸۶	عقیدہ توحید اور اتباع سنت
۱۸۷	بیعت کر لیجئے

صفحہ	عنوان
۱۸۷	ہدایت اور انقلاب
۱۸۹	دعوت اور پیغام
۱۹۱	نزول قرآن کا مقصد اور حاملین قرآن کی ذمہ داریاں
۱۹۱	منصب نبوت اور اس کا کام
۱۹۳	تلاوت آیات
۱۹۳	ترکیہ نفس
۱۹۳	نزول قرآن کا اہم ترین مقصد
۱۹۳	تعلیم کتاب
۱۹۶	تربیت و تزکیہ
۱۹۶	تجدید سلوک
۱۹۶	حامل قرآن کی ذمہ داریاں
۱۹۸	عبرت آموز واقعہ
۱۹۹	قرآن کی دولت سب سے بڑی دولت ہے
۲۰۱	روحانیت پیدا کرنے کے لئے عظمت اور اکتساب ضروری ہے
۲۰۲	قرب الہی کا سب سے بڑا ذریعہ قرآن کریم ہے
۲۰۳	قرآن کو بطور پیشہ پڑھنا گناہ ہے
۲۰۳	قرآن سے فائدہ حاصل کرنے کے لئے صحبت اور محنت ضروری ہے
۲۰۵	ممتنع اور گہرے مطالعہ کی ضرورت
۲۰۵	عالم اسلام کی موجودہ صورتحال کا تقاضا
۲۰۵	کورس کی کتابوں اور مطالعہ کی کتابوں میں فرق
۲۰۶	اسلام کے بارے میں موجودہ دانشور طبقے کے خیالات

صفحہ	عنوان
۲۰۷	کتاب کے اندر علمی وزن، طرز نگارش اور
۲۰۹	نفسیات شناسی بھی ضروری ہے
۲۰۹	مغربی تہذیب کا سو فیصدی انکار صحیح نہیں ہے
۲۱۱	چند بنیادی کتب جن کا مطالعہ ضروری ہے
۲۱۳	کلیات اقبال ضرور پڑھئے
۲۱۳	حیاء الصحابہ کی افادیت
۲۱۵	مدرسہ دینیہ سے فارغ ہونے والے طلباء کے نام
۲۱۶	اپنا وقار بلند کریں
۲۱۷	زہد و استغنا کی ایسی مثال قائم کریں کہ !!
۲۱۸	اپنے ضمیر کو آزاد رکھیں
۲۱۹	اسی ماور علمی سے رشتہ نہ ٹوٹے۔
۲۲۱	علمائے حق نے وراثت نبوت کا حق کس طرح ادا کیا؟؟
۲۲۱	دین خالص
۲۲۱	دین خالص سے نفرت
۲۲۳	علماء کی اصل ذمہ داریاں
۲۲۴	ایک لمحہ فکریہ
۲۲۸	جانشین انبیاء کی خصوصیات
۲۲۹	علمائے دین کا منصب
۲۲۹	استقامت اور حقیقت پسندی کا جامع
۲۳۰	علماء امت کی شان
۲۳۲	امت مسلمہ کا فرض

صفحہ	عنوان
۲۳۴	ملک کوتاہی سے بچانا ہمارا ذمہ داری ہے!
۲۳۷	بے مثال استاد..... بے مثال شاگرد
۲۳۷	استاد اور شاگرد کا تعلق
۲۳۸	خوش نصیب طالب علم
۲۴۰	ہر چیز تقدیر الہی کے مطابق ہوتی ہے
۲۴۰	شیخ خلیل عرب سے ہمارا تعلق
۲۴۲	حضرات! جامعات و کالج کی سب سے بڑی کوتاہی
۲۴۲	دنیا کی تین بڑی جامعات
۲۴۴	استاد اور طالب علم کے درمیان ربط
	استاد ایسا ہو جو اپنا ذوق طالب علم میں
۲۴۷	منتقل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو
۲۴۹	قرآنی مطالعہ اور اس کے آداب
۲۴۹	قرآن مجید ہر موقع پر مشکل کشائی اور دست گیری کرتا ہے:
۲۵۰	قرآن مجید کی حکمت دعوت:
۲۵۱	دل کا دروازہ کبھی کبھی کھلتا ہے:
۲۵۱	مطالعہ قرآن مجید سے علمی زندگی کا آغاز:
۲۵۲	قرآن مجید کا مزاج صدیقی ہے:
۲۵۳	مولانا سید سلیمان ندوی اور علوم قرآن:
۲۵۴	اجتباء خاص، ہدایت عام:
۲۵۵	قرآن مجید پڑھ کر انسان مشرک نہیں ہو سکتا:
۲۵۵	عقل جج نہیں بلکہ وکیل ہے:

صفحہ	عنوان
۲۵۶	ہدایت کے لئے قرآن آسان ہے:
۲۵۷	افادہ اللہ کی طرف سے:
۲۵۸	میری ذاتی کتاب:
۲۶۱	عالم اسلام میں اعلیٰ تعلیم کا مقصد و منہج
۲۶۱	علم ایک صداقت ہے:
۲۶۲	تعلیم کا اصل مقصد:
۲۶۴	خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی:
۲۶۵	اسلامی ملک کا معاملہ زیادہ اہم ہے:
۲۶۶	کسی اسلامی ملک کی جامعہ کا اولین فریضہ:
۲۶۶	قلب اور دماغ دونوں کا اطمینان ضروری ہے:
۲۶۷	علم کی قسمت قلم سے وابستہ:
۲۶۹	یہ دین علم سے الگ نہیں ہو سکتا:
۲۷۰	سب کا خلاصہ، علم الانسان ما لم يعلم:
۲۷۲	سیرت سازی:
۲۷۳	مقصود ہنر سوز حیات ابدی ہے:
۲۷۷	زر خیز زمین مردم خیز خطہ
۲۷۷	ملک کی عظمت کا حقیقی معیار:
۲۷۸	یہاں آ کر خوشی حاصل ہوئی:
۲۷۸	اپنی بہترین صلاحیت اس ملک پر صرف کریں:
۲۷۹	نظریات، فلسفوں اور علمی تحقیقات و مسلمات کا غلبہ جاری ہے:
۲۸۰	علم کسی منزل پر رکتا نہیں:

صفحہ	عنوان
۲۸۱	کاش یہ کام اسلامی ملکوں میں ہوتا:
۲۸۱	آپ نوبل پرائز حاصل کریں:
۲۸۲	مسلم اقوام کے دل کی زرخیز زمین:
۲۸۳	زرخیز زمین میں مردم خیز خطہ:
	محبت مجھے ان جوانوں سے ہے
۲۸۵	ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند
۲۸۵	محبت مجھے ان جوانوں سے ہے:
۲۸۵	صراط مستقیم پل صراط ہے:
۲۸۶	اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے:
۲۸۶	آپ کا رب آپ سے مخاطب ہے:
۲۸۷	مسئلہ ربوبیت کا تھا:
۲۸۸	نوجوانوں کا جذبہ عمل:
۲۸۹	ہم نے ان کے دلوں کو تھام لیا:
۲۸۹	وادی گلزار، وادی پر خار:
۲۹۱	تین باتیں:
۲۹۲	مسلح مادیت کا مقابلہ:
۲۹۳	اسلام کے ہاتھ میں رہنمائی:
۲۹۳	اپنی فکر کیجئے:
۲۹۴	منفی حصہ مثبت حصہ سے بڑھنے نہ پائے:
۲۹۴	اپنا مطالعہ وسیع کیجئے:
۲۹۵	میرے دل میں آپ کے لئے جگہ ہے:

صفحہ	عنوان
۲۹۷	اخلاص، جذبہ قربانی اور جوہر ذاتی
۲۹۸	قراغت کا غلط تخیل:
۲۹۸	اخلاص:
۲۹۹	جذبہ قربانی:
۲۹۹	جوہر ذاتی:
۳۰۰	آخری بات:
۳۰۱	علماء اور تعلیم یافتہ طبقہ کی ذمہ داریاں
۳۰۱	علماء اور تعلیم یافتہ طبقہ کی ذمہ داریاں:
۳۰۲	مسلم حکومتوں میں علماء کا کارنامہ:
۳۰۲	مسلمانوں کے فاتح اسلام کے مفتوح:
۳۰۳	یہ دین جہالت سے نہیں بلکہ علم سے پیدا ہوا ہے:
۳۰۴	عیسائیت مستقل شریعت نہیں رکھتی تھی:
۳۰۵	اسلام اور علم کا چولی دامن کا ساتھ ہے:
۳۰۵	اسلام زمانہ کا رفیق ہی نہیں بلکہ راہنما ہے:
۳۰۶	اسلام کو ہر مفاد پر ترجیح دیتے ہیں:
۳۰۸	ایثار و قربانی:
۳۱۱	اسلام اور علم کا دائمی رشتہ
۳۱۱	اسلام اور علم کا رابطہ
۳۱۲	پہلی وحی میں علم و قلم کا تذکرہ
۳۱۳	تعلیم و تعلم کی ضرورت اور اس کا انتظام
۳۱۳	حفاظت قرآن کا مفہوم

صفحہ	عنوان
۳۱۴	فضلائے مدارس کا فرض
۳۱۵	عوام کی ذمہ داری
۳۱۷	مدارس دینیہ کے قیام و بقاء کے شرائط
۳۱۷	انسانی سعی و کوشش کے آثار و مظاہر
۳۱۸	مردم خیز شہر اور قصبے
۳۱۸	مالوہ کی قدیم تاریخ
۳۱۹	رضا کار و ایشار پیشہ خادم دین، علماء اور نگران حکومت و معاشرہ صوفی
۳۲۱	اجتماعی کام کی شرطیں
۳۲۱	عمارت کے تین پتھر
۳۲۲	مسلمانوں میں تعاون کی کمی
۳۲۲	پہلے دل جوڑنا پھر اینٹیں
۳۲۵	فتح و غلبہ کے دوا الہی نظام
۳۲۵	دوا الہی نظام
۳۲۵	منصفانہ قانون، میزان عدل
۳۲۶	دلائل سے بے نیاز
۳۲۶	دوسرا نظام
۳۲۷	طبعی نظام کی شکست
۳۲۸	انبیاء کی بے سرو سامانی اور بے اسبابی
۳۳۰	غیبی تائید اور اسباب
۳۳۰	کامیابی کا رمز
۳۳۱	انبیاء کرام عقل سلیم کا اعلیٰ نمونہ
۳۳۱	فرعون اور حضرت موسیٰ کی کشمکش

صفحہ	عنوان
۳۳۳	مشعل راہ
۳۳۴	تاریخ ساز واقعہ
۳۳۴	دعاء کا پاسبان
۳۳۵	”فیصلہ تیرا تیرے ہاتھوں میں ہے، دل یا شکم؟“
۳۳۵	بحر و بر پر حکمرانی
۳۳۶	مومنانہ فراست
۳۳۷	ایمان و عقیدہ کا نظام
۳۳۷	موجودہ عربوں کی دونوں نظاموں سے بغاوت
۳۳۸	نسل و نسب
۳۳۸	۱۵ جون کی جنگ
۳۳۹	جنگ کے زمانہ میں مصر کی اخلاقی و دینی حالت
۳۴۰	ایک غیر عرب بادشاہ کا عمل
۳۴۰	شکست تعجب خیز نہیں
۳۴۱	یمن کی داستان غم
۳۴۲	”نغمہ ہندی ہے تو کیا، لے تو حجازی ہے مری“
۳۴۳	عرب قومیت کے علم برداروں نے کیا دیا؟
۳۴۴	عرب قومیت میں غیر عربوں کے لئے کوئی کشش نہیں
۳۴۴	قومیت عربیہ اور عالم انسانیت
۳۴۵	دنیا تمہاری منتظر ہے
۳۴۶	اجتہاد اور فقہی مذاہب کا ارتقاء
۳۴۶	(۱) اسلام کی دائمی حیثیت:
۳۴۷	(۲) امت مسلمہ، شریعت اسلامیہ، اور انسانی زندگی:

صفحہ	عنوان
۳۴۷	دوسری اور تیسری صدی ہجری میں اجمہاد اور مجتہدین:
۳۴۹	امت اسلامیہ کی زندگی میں اجتہاد کی فضیلت:
۳۵۲	چوتھی صدی ہجری سے پہلے لوگوں کی حالت:
۳۵۳	متبع رسول ﷺ کی اجتہادی فکر:
۳۵۵	مذہب اربعہ کی خصوصیات:
۳۵۶	اجتہاد کی ضرورت، جدید نسل کی کوتاہی:
۳۵۷	بعض علاقوں اور ادوار میں اجتہاد کے معطل ہونے کے اسباب:
۳۵۸	اجتہاد کی حدود:
۳۵۹	دین ہی زندگی کا محافظ ہے:
۳۶۱	مغربی تعلیم اور اس کے تباہ کن اثرات
۳۶۱	ایک اہم مسئلہ:
۳۶۱	انسانی معاشرے کا مزاج:
۳۶۳	معاشرہ میں کمزوری:
۳۷۳	مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا پیغام فیصل ایوارڈ کمیٹی کے نام
۳۷۶	مرد وہ ہیں جو زمانہ کو بدل دیتے ہیں
۳۸۴	فقہ و قضا کی صلاحیت میں علماء گجرات کا امتیاز و اختصاص
	عالم اسلام میں احساس کہتری کا مرض
۳۹۸	اور اس کے اثرات و نتائج
۴۰۸	علم کا بھی ایک قانون ہے
۴۰۸	صحیح راہ کی ضرورت:
۴۰۹	حروف تہجی کی اہمیت

صفحہ	عنوان
۴۱۰	یورپ میں استاد و شاگرد:
۴۱۱	علم دین کا امتیاز:
۴۱۲	علم کے آداب:
۴۱۳	قطب الرجال کا دور:
۴۱۵	اصل مسئلہ ترجیح کا ہے
۴۱۵	اول سلام:
۴۱۵	موقعہ سے فائدہ اٹھائیے:
۴۱۷	ہاتھی یا علم حدیث:
۴۱۸	ترجیح کی بات:
۴۱۹	شعائر اللہ کا احترام:
۴۲۰	بے حرمتی کا انجام:

انساب

خطبات علی میاں جلد ششم کو اپنے ان تمام مہربان اساتذہ
کے نذر کرتا ہوں جن کی شفقت اور خصوصی توجہ کے سایہ عاطفت
تلے بندہ علوم نبوت کی پیاس بجھاتا رہا، میں تو بادِ سموم کا شکار تھا
انہی قابل احترام شخصیات نے مجھے انتہائی محنت کے نسیم جانفرا
کے جھونکوں سے ہمکنار کیا!

ۛ اک توشنہ امید کرم لے کے چلا ہوں
کچھ اس کے سوا پاس نہیں زادِ سفر اور

محمد رمضان میاں نیپالی عفا اللہ عنہ

خطبات کی اہمیت

قال رسول الله ﷺ :

عليكم بمجالسة العلماء واستماع كلام الحكماء ، فان الله
تعالى يحيى القلب الميت بنور الحكمة كما يحيى الارض الميتة
بماء المطر - (الحديث)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا!

اہل علم کی ہم نشینی اور اہل حکمت کا کلام سننے کو خود پر لازم کرلو، اس لئے کہ
حق تعالیٰ جل شانہ قلم مردہ کو نورِ حکمت سے ایسے زندہ فرماتے ہیں جیسے مردہ
زمین کو بارش کے پانی سے۔

بحوالہ منہیات ابن حجر عسقلانی

خامہ فرسائی

سر اپا شکر و امتنان ہوں اس ذات بابرکت کا جس نے اس ناچیز کو اپنے ایک محبوب بندے کے ارشادات و خطبات کو جمع کرنے کی توفیق بخشی۔ و ماتوفیقی الا باللہ العلی العظیم۔
خطبات علی میاں کی چھٹی جلد (علم و دانش) آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے جس قدر روحانی اور قلبی اطمینان ہو رہا ہے وہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے۔

مولانا علی میاں کی ہشت پہلو شخصیت میں سے سب سے نمایاں اور واضح پہلو ان کا ایک داعی و مربی ہونا ہے، حضرت مولانا کی ساری زندگی اسی دشت کی سیاحی میں گزری ہے، بیس برس کی عمر سے شروع ہونے والا سفر حیات عارضی کے آخری لمحے تک جاری رہا، انہوں نے جس بے تکلفی، سادگی اور برجستگی کے ساتھ علماء و طلبہ کے مجمع میں تقریریں فرمائی ہیں شاید ہی کوئی دوسرا طبقہ اس وصف میں ان کا ہمسر ہو، خود مولانا علی میاں کے ان الفاظ میں جو وہ اکثر طلبہ کے سامنے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے کہ ”آپ سے مجھے کسی قسم کا تکلف نہیں اس لئے کسی بناوٹی یا تصنع آمیز بات کرنے کی بھی ضرورت نہیں“

اس چھٹی جلد کی اکثر و بیشتر تقریریں عصری درس گاہوں میں کی گئی ہیں اور مذہبی جامعات و دارالعلوم میں بھی، ان کے مخاطب جہاں مذہبی و دینی جامعات کے اہل فضل علماء کرام اور طالبان علوم نبوت ہیں وہیں عصری علوم و فنی درس گاہوں کے طلبہ اور ماہر اساتذہ بھی شامل ہیں اور کسی درجہ میں ان جامعات کے خیر خواہ مخلص اور معاونین بھی حضرت مولانا نور اللہ مرقدہ کے مخاطب ہیں، اس جلد میں طلبہ و علماء کی علمی افادیت کو مد نظر رکھتے ہوئے مولانا کی علمی و مطالعاتی زندگی سے متعلق ایک چھوٹا سا مضمون بھی شامل کیا گیا ہے، نصاب تعلیم سے متعلق چند مفید و دقیق سوالوں کے جوابات کو بھی شامل کیا گیا، انشاء اللہ یہ مضامین کافی مفید ثابت ہو سکیں۔

الحمد للہ مجھے پچھلی جلدوں کی طرح اس جلد میں بھی اپنے سابقہ معاونین کا ہر قسم کا تعاون حاصل رہا، ان منتشر خطبات کو ترتیب کی لڑی میں پرو کر منصفہ شہود پر لانے کی تمام عرق ریزیوں اور دسوزیوں میں میرے رفقاء برابر کے شریک رہے ہیں۔

خصوصاً مواعی سید عدنان کا کاخیل^(۱) سلمہ اللہ کہ موصوف نے کتاب کی ترتیب میں وہ قابل قدر معاونت فرمائی جس کا بندہ مصمم قلب سے شکریہ ادا کرتا ہے۔ زادہ اللہ علما و شرفاً۔ اسی طرح ادارہ تحقیقات اسلامی (بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی) اسلام آباد کے کتب خانہ^(۲) کے ناظم اور ان کا تمام عملہ جو تلاش بسیار کے دشوار کام میں مخلصانہ معاونت کرتے رہے اور سب سے اخیر میں سب سے زیادہ سپاس گزار ہوں اپنے محترم استاذ جناب علماء الدین فلاحی حفظہ اللہ کا جنکی رہنمائی و اصابت رائے ہر قدم پر دستگیر رہی۔ اللہ تعالیٰ ان تمام مخلصین کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

والسلام

راقم عاجز محمد رمضان میاں (نیپالی) عفا اللہ عنہ

یکے از کفش بردار مولانا علی میاں رحمہ اللہ

۱۵ شوال المکرم ۱۴۲۳ھ

۱۰ دسمبر ۲۰۰۲ء بروز منگل

(۱) نبیرہ حضرت مولانا عبدالحق نافع گل رحمہ اللہ رحمۃ واسعہ، سابق شیخ الحدیث جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ناؤن کراچی۔

(۲) ڈاکٹر حمید اللہ لائبریری شعبہ مجلات

میری علمی اور مطالعاتی زندگی

۱۹۳۵ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ کی ترجمان الندوہ نے برصغیر کے مشاہیر اہل علم و دانش کو دعوت دی تھی کہ وہ طلبہ اور اہل ذوق کے لئے ان کتابوں کی نشاندہی کریں جنہوں نے ان کی سوچ اور اخلاق و کردار کی تعمیر میں خاص حصہ لیا ہے۔ مولانا علی میاں نے بھی (جب ان کی عمر ۳۳ برس تھی) اپنے تاثرات و تجربات قلم بند کئے۔ یہ مضمون دوسرے مضامین کی ساتھ مولانا محمد عمران خان نے مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں (اعظم گڑھ مطبع معارف، س۔ن) میں شامل کر لیا تھا۔ بعد ازاں ۱۹۷۲ء میں ماہنامہ الحق (اکوڑہ خٹک) کے مدیر کی قلمبندی پر مولانا علی میاں نے ۱۹۳۵ء میں لکھے گئے مضمون پر نظر ثانی کی اور اس میں جا بجا اضافے کئے تاہم جن کتابوں کا تذکرہ پہلی بار کیا گیا تھا، کم و بیش وہی رہیں، بعد میں انہوں نے اپنی علمی و تصنیفی اور تدریسی زندگی میں بلاشبہ سینکڑوں کتابوں کا مطالعہ کیا جن پر تبصرہ کیا جانا مشکل تھا مضمون پر نظر ثانی کرتے ہوئے مولانا علی میاں نے بجا طور پر لکھا تھا اس کا طرز واقعاتی اور سوانحی ہے تنقیدی اور تحقیقی نہیں، اس لئے ذہن پر مطالعہ کے جواثرات پڑے ان کو بے تکلفی اور بے ساس خستگی کے ساتھ بیان کر دیا ہے مصنفین کے خیالات، مسلک اور طرز فکر کی پوری ذمہ داری نہیں لی گئی اور نہ کسی ایسی کتاب اور مصنف کا ذکر محض اس کے مفید یا بلند پایہ ہونے کی وجہ سے کیا گیا ہے جس کے مطالعہ کی نوبت نہیں آئی یا ذہن و شعور نے اس سے کوئی گہرا اور دیرپا تاثر قبول نہیں کیا، اس لئے اس فہرست میں سے کسی کتاب یا مصنف کے نظر انداز ہو جانے کے معنی اس کی عدم افادیت یا تنقیص نہیں ہے۔ مولانا نے نظر ثانی کرتے ہوئے جو چند حواشی لکھے تھے، وہ ان کے نام کے اظہار کے ساتھ باقی حواشی سے الگ کر دیے گئے ہیں۔ (مرتب) (۱)

خاکسار کا خاندان ایک خزاں رسیدہ دینی خانوادہ ہے ۲ جس کے بزرگوں نے کبھی فصل خزاں میں بھی دنیا کو پیام بہار سنایا تھا، ہندوستان میں جب دین کی بہار آخر ہوئی تو اس

(۱) حیات افکار کے چند پہلو، مصنفہ جناب سفیر اختر صاحب

خاندان پر بھی تنزل آیا، ہوش کی آنکھیں کھولیں تو دین داری جوانوں سے زیادہ بوڑھوں میں، اور مردوں سے زیادہ عورتوں میں تھی۔

میرے والد مرحوم مولانا حکیم سید عبدالحی نے ۱۹۲۳ء کے شروع میں انتقال کیا، میری عمر اس وقت دس سال کی تھی، میرے بڑے بھائی صاحب ڈاکٹر حکیم مولوی سید عبدالحی صاحب لکھنؤ میں میڈیکل کالج میں پڑھتے تھے اور میں اپنے وطن رائے بریلی میں اپنی والدہ صاحبہ کے ساتھ رہتا تھا، اور بھائی صاحب کی ہدایت کے مطابق خاندان کے بعض بزرگوں سے فارسی کتابیں پڑھتا تھا اور لکھنؤ بھائی صاحب کے پاس آتا جاتا رہتا تھا۔

خاندان میں دستور تھا کہ تقریباً روزانہ اور ان دنوں میں خاص طور پر جب کسی حادثہ کی وجہ سے تسکین و مشغلہ کی ضرورت ہوتی، ایک گھر کی تمام بیبیاں ایک جگہ جمع ہو جاتیں اور ہمارے ہی خاندان کے ایک بزرگ (سید عبدالرزاق صاحب کلّامی، م ۱۳۳۴ھ - ۱۹۱۶ء) کی منظوم ”فتوح الشام“ ۳ پڑھی جاتی۔

سید عبدالرزاق صاحب کلّامی مرحوم، حضرت سید احمد شہید کے ہم شیر زادہ منشی سید حمید الدین صاحب کے پوتے اور ان کے حقیقی بھائی سید عبدالرحمن صاحب کے نواسے تھے۔ واقدی کی عربی ”فتوح الشام“ کو کلّامی صاحب نے بڑی قادر الکلامی اور جوش و دلی جذبہ کے ساتھ پچیس ہزار شعروں میں اردو میں نظم کیا ہے چونکہ ان کو اس کا طبعی ذوق تھا، اور جہاد و حرارت ایمانی کی چنگاری اسی تنور سے منتقل ہوئی تھی جس نے ایک وقت میں سارے ہندوستان کو گرمادیا تھا اس لئے نظم میں جوش و اثر اور کلام میں آمد ہے۔ حضرت خالد سے شاعر کو عشق تھا، اور خواب میں بار بار ان کی زیارتیں ہوئی تھیں، اس لئے خصوصیت کے ساتھ ان کا ذکر کرتے ہوئے وہ بے قابو ہو جاتے ہیں، اور اشعار میں خاص روح اور زور پیدا ہو جاتا ہے۔ میری بڑی خالہ سیدہ صالحہ مرحومہ جو قرآن مجید کی بھی حافظہ تھیں، یہ منظوم ”فتوح الشام“ بڑے پراثر و دلکش لہجہ میں پڑھتی تھیں اور پڑھتے پڑھتے کتاب ان کو بہت رواں ہو گئی تھی۔ عموماً عصر کے بعد یہ مجلس ہوتی، بچے بھی کبھی اپنی ماؤں کے پاس کھیلتے کھیلتے یا کسی پیغام لئے آ جاتے، اور بے ارادہ کچھ دیر ٹھہر کر سنتے کبھی بارادہ بیٹھ جاتے اور کبھی مانیں اپنے پاس بٹھا کر سننے کا موقعہ دیتیں، پھر جب اس میں لطف آنے لگتا تو کھیل چھوڑ کر اس مجلس میں شریک ہوتے۔

میری خالہ مرحومہ جب سادہ و بے تکلف، لیکن پراثر لہجہ میں یہ اشعار پڑھتیں تو جہاد کا ایک سماں بندھ جاتا، دل امنڈ آتے، حضرت خالدؓ، حضرت ضرارؓ اور ان کی بہن حضرت خولہؓ بنت الازور اور دوسرے صحابہ کرامؓ و مجاہدین شام کی جاں بازی اور شجاعت کا ذکر آتا تو مجلس پر ایک کیف و سرور اور نشہ سا طاری ہو جاتا، کسی سخت معرکہ میں مسلمانوں کے گھر جانے اور کسی بہادر کے شہید ہونے کا تذکرہ ہوتا تو آنسوؤں کی جھڑیاں لگ جاتیں، آنسوؤں کے یہ طوفان اٹھتے اور برستے تو ان کا چھینٹا ہمارے معصوم دلوں پر بھی پڑ جاتا، اور اس نرم مٹی کو تر کر جاتا۔ ”فتوح الشام“ کی ان زندہ مجلسوں نے دل پر یہ اثر چھوڑا کہ مجاہدین کی محبت و عظمت اور اللہ کی راہ میں جان دینے کی قیمت کو کوئی نئی علمی تحقیق، اور جہاد کو مدافعا نہ ثابت کرنے کی کوئی کوشش کم نہیں کر سکی۔ خون کے نقش کو سیاہی کے وہ نقوش کبھی نہیں مٹا سکے جو لیٹے لیٹے یا آرام سے بیٹھے بیٹھے کاغذ پر ثبت کیے جائیں، پھر وہ نقش جس کو بچپن کے پاک آنسوؤں نے پائیداری بخشی ہو۔

اتانی هو ا هاقبل ان اعرف الهوى

فصادف قلباً خالياً فتمكنا

دوسرا اثر یہ ہوا کہ اس قوم و مذہب (عیسائیوں) کے خلاف جس کے مقدر میں قیامت تک کے لئے اسلام کا عالم گیر حریف و مد مقابل بننا لکھ دیا گیا ہے، اور جس کی قائم مقامی اور وراثت موجودہ یورپ کے حصہ میں آئی ہے، ایک حریفانہ جذبہ اور عناد پیدا ہو گیا جس پر کسی ملک کے مقامی مسائل و حالات کبھی غالب نہیں آ سکے۔

اس وقت شرفاء کے خاندانوں میں ”مسدس حالی“ کا عام رواج تھا۔ اس کے اشعار لوگوں کے نوک زبان تھے، تقریروں اور مواعظ میں جا بجا اس کے اشعار سے کام لیا جاتا، مضامین میں نقل کیے جاتے۔ میں نے بھی ”مسدس“ کو بڑے جوش و لطف سے بار بار پڑھا، اس کے اشعار اپنی تقریروں میں جو بچوں کے جلسوں میں کی جاتیں، اور ان انعامی مضامین میں جو مقابلہ کے لئے لکھے جاتے، بار بار نقل کیے۔ اس کا بہت سا حصہ زبانی یاد تھا۔ دل و دماغ پر ”مسدس“ کا اچھا خاصا اثر رہ چکا ہے، عام استعداد و معلومات میں اضافہ کے علاوہ اس کا ایک احسان یہ تھا کہ برسوں بعد مغربی مورخین و مصنفین کی یہ کوشش بالکل بے اثر رہی کہ جاہلیت عرب کی اتنی مدح سرائی کی جائے اور اس میں اگر خوبی کے کچھ ذرات تھے تو ان کو خوردبین سے

دیکھ کر پہاڑ بنا کر اس طرح پیش کیا جائے کہ معلوم ہو کہ عربوں میں اخلاقی انقلاب کی پوری تیاری تھی، اور کوہ آتش فشاں پھٹنے کو تھا کہ موقع شناسی سے بروقت اس کو چنگاری دکھا دی گئی۔ اسلامی انقلاب کی پیغمبرانہ عظمت اور رسول اللہ ﷺ کے معجزہ کی اہمیت کو گھٹانے کی یہ علمی سازش مولانا حالی کے ان پراثر اور سادے چند بندوں پر غالب نہ آ سکی جن میں انہوں نے جاہلیت کا نقشہ اور اس کی اخلاقی پستی کی تصویر کھینچی ہے۔ نہ بعض قوم پرست عربوں کے مضامین اور تالیفات متاثر کر سکیں جو اپنی قومیت کے جوش میں کبھی کبھی جاہلیت کی طرف سے مدافعت کرنے لگتے ہیں، اور اس کے روشن پہلو کے دکھانے میں مبالغہ سے کام لیتے ہیں۔

میرے گھر کا ماحول دادا صاحب (مولوی سید فخر الدین صاحب خیالی) اور والد صاحب کی وجہ سے جو جید عالم اور عربی کے مصنف ہونے کے ساتھ ساتھ اردو کے ادیب و نقاد بھی تھے، دینی کے ساتھ ادبی بھی تھا۔ بہت بچپن ہی سے اردو نثر و نظم کی درسی وغیر درسی کتابیں ہم بھائی بہنوں کے مطالعہ میں رہتی تھیں، مولانا حالی، ڈپٹی نذیر احمد، راشد الخیری کی بہت سے کتابیں اس زمانہ میں پڑھ لیں، اس زمانہ میں عام طور پر مولوی اسماعیل صاحب میرٹھی کا اردو نصاب ”کلمک اردو“ سوادِ اردو اور سفینہ اردو“ رائج تھا۔ ہندوستان کا سررشتہ تعلیم ان کتابوں سے بہتر کتابیں مرتب نہیں کروا سکا، ان میں سفینہ اردو کا اثر آج تک دل و دماغ پر باقی ہے۔ تقریباً نصف صدی گزر جانے کے بعد اور ذہنی بلوغ و ارتقاء کی بہت سی منازل طے کر لینے کے باوجود اب بھی اگر وہ کتاب ہاتھ آ جائے (جو افسوس ہے کہ اب بالکل نایاب ہے) تو شاید سب کام چھوڑ کر اسی کو پڑھنے لگوں اور بچپن کی یاد تازہ کروں اور کم سے کم اپنی چند پسندیدہ نظمیں اور مضامین، مولوی ظفر علی خاں بی۔ اے علیگ کی نظم راجہ دسرت کی کہانی“ اور حیدر آباد کے طوفان پران کی نظم ”اونا مر اوندی“ سید سجاد حیدر یلدرم کا مضمون ”مجھ کو میرے دوستوں سے بچاؤ“ کو ایک بار بڑھے بغیر کتاب ہاتھ سے رکھنی مشکل ہو جائے۔ اس غیر شعوری مطالعہ کا یہ فائدہ ہوا کہ زبان کا لطف اور ذوق زندگی کے ہر دور میں ساتھ رہا اور تحریر و انشاء میں کبھی مولویانہ خشکی پیدا نہ ہونے پائی۔ میرے خیال میں ابتدائے عمر میں سلیمس و شگفتہ زبان اور اچھے مصنفین کی کتابوں کا پڑھنا جو سلیمس و شیریں زبان میں اپنے خیالات ادا کرنے کے عادی ہیں، بہت مفید اور ایک حد تک ضروری ہے، ورنہ نئی نسل اور نئے عہد سے رشتہ منقطع ہو جاتا ہے اور دعوت و تلقین کا

پورا فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا۔

اردو کے ابتدائی مطالعہ اور طالب علمی کے اس ابتدائی دور میں جس کتاب کو اپنے شوق سے پڑھا اور جس نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ قاضی سلیمان صاحب منصور پوری مرحوم کی سیرت رحمۃ اللعالمین کا پہلا حصہ ہے، مجھے یہ کبھی نہیں بھولے گا کہ جب اسکی دونوں جلدوں کا بعض دوسری کتابوں کے ساتھ وی۔ پی رائے بریلی آیا ہے اور اس کے چھڑانے کے لئے اس وقت روپیہ نہ تھا، تو میں نے بے اختیار رونا شروع کیا، یہاں تک کہ کسی نہ کسی طرح اس کا انتظام کیا گیا اور کتاب میرے ہاتھ میں آئی، بار بار پڑھی کئی جگہ اور کئی بار اپنے دل اور آنکھوں کو قابو میں نہ رکھ سکا۔ بعض خاص مقامات کا ہمیشہ خاص اثر پڑتا تھا، اسلام کے ابتدائی مبلغین کے واقعات حضرت مصعب بن عمیر کی مکی و مدنی زندگی کا مقابلہ، ان کی والہانہ کیفیت، آنحضرت علی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ طیبہ میں تشریف آوری اور حضرات انصار کی مسرت استقبال اور جان نثاری، انصار کا ایثار اور مہاجرین کے ساتھ ان کی دینی محبت آنحضرت ﷺ کی وفات کے واقعات و حالات کا دل پر خاص اثر پڑتا تھا ٹھل ٹھل کر کر ان کو پڑھتا تھا، لوگوں کو سناتا تھا اور اسی زندگی کی تمنائیں دل میں پیدا ہوتی تھیں قاضی سلیمان صاحب کے درجات اللہ بلند فرمائے، اس عالم میں ہوتے تو کہتا کہ آپ کی کتاب کا مجھ پر بڑا احسان ہے، اس نے سب سے پہلے سرور کائنات ﷺ کی محبت کے اس مزہ سے آشنا کیا جس کے بغیر یہ زندگی اور عالم خس و خاشاک ہے۔

در خرمن کائنات کر دیم نگاہ

یک دانہ محبت است باقی ہمہ گاہ

انہی دنوں کے کچھ بعد میرے ہاتھ میں مولانا شبلی مرحوم کی الفاروق آ گئی۔ مطبع نامی۔ کانپور کی چھپی ہوئی، سراپا تصویر پڑھی اور کئی بار پڑھی۔ عراق کی جنگوں بویب، جسر، قادسیہ وغیرہ کے میدان جنگ کی تصویر مولانا نے جن چھوٹے چھوٹے بے ساختہ و برجستہ جملوں میں کھینچی ہے، شاید اس سے زیادہ فردوسی ”شاہنامہ“ میں مسلسل اشعار اور پر شکوہ الفاظ اور مبالغہ سے پیدا نہیں کر سکا ”الفاروق“ کے جاندار اور گرم جملے اور لفظ شمشیر و سناں کا کام کرتے ہیں۔ مولانا نے نظام خلافت پر جو کاوش کی ہے، اس کے سمجھنے کی اس وقت صلاحیت نہ تھی، اور اب اس سے کوئی

دلچسپی اور علمی تاثر نہیں ہے لیکن واقعات کے حصہ کا اثر اس وقت بھی تھا اور اب بھی ہے۔ مولانا کی دوسری کتاب جو اس دور میں پڑھی، سفرنامہ روم و مصر و شام، تھی۔ اتفاق سے یہی دو کتابیں ہمارے گاؤں کے محدود ذخیرہ کتب میں تھیں۔ آخر الذکر کتاب سے معلومات میں بڑا اضافہ ہوا، ذہن میں وسعت پیدا ہوئی، اور کیا عجب ہے کہ اول اسی کتاب سے دنیائے اسلام کی سیاست کا شوق پیدا ہوا ہو جس کی نوبت برسوں بعد آئی۔ کچھ عرصہ بعد مولانا کی سوانحی تصنیفات ”الغزالی“، ”سوانح مولانا روم“ اور ”الماسون“ پڑھیں۔ غالباً اسی وقت سے ذہن نے یہ اثر قبول کیا کہ سوانح حیات اور تذکرہ نگاری کے لئے اس سے بہتر اسلوب اور زبان جدید اردو میں پائی نہیں جاتی، اور غیر ارادی طریقہ پر ان تذکروں اور تاریخ دعوت و عزیمت کے سلسلہ میں جو راقم کے قلم سے نکلا، اس کو اختیار کیا گیا۔ افسوس ہے کہ شعرا عجم کے پڑھنے کی نوبت بہت بعد میں آئی جس کو میں اپنے موضوع پر منفرد اور مولانا کا شاہکار سمجھتا ہوں۔ اس تاخیر میں غالباً میری فارسی کی کم لیاقتی کو دخل تھا۔

عم محترم مولانا سید طلحہ صاحب حسنی مرحوم ایم۔ اے، استاد اور نیشنل کالج۔ لاہور کی صحبت اور مجلسوں میں ”آب حیات“ سے تعارف ہوا سنی اور بار بار پڑھی، یہاں تک کہ اس کے بہت سے مضامین مستحضر ہو گئے۔ اشخاص، شعراء اور ان کا کلام دماغ پر اس طرح نقش ہو گیا جس طرح بچپن کی دیکھی ہوئی چیزیں اور سنی ہوئی باتیں ذہن پر مرتسم ہو جاتی ہیں، اور ان کا دماغ پر کوئی بار نہیں ہوتا۔ گل رعنا، گھر کی کتاب تھی، اس کو اتنی بار پڑھا کہ اردو شاعری کی تاریخ اور شعراء کے متعلق اتنی معلومات ہو گئی کہ اس موضوع پر مجلس میں گفتگو کرنے اور گفتگو میں حصہ لینے کی استعداد پیدا ہو گئی۔

میرے حقیقی ماموں زاد بھائی مولوی سید ابوالخیر صاحب برق لکھنؤ کی ٹکسالی زبان لکھتے اور بولتے تھے۔ لکھنؤ کے محاورات اور صحت و صفائی زبان میں وہ سند کا درجہ رکھتے تھے تھی سخن شناس بھی تھے اور سخن سنج بھی، ابتداء میں شمس لکھنؤی کو کلام دکھاتے تھے، پھر آغا ثاقب قزلباش لکھنؤی کے حلقہ تلمذ میں شامل ہو گئے اور انہیں کے رنگ کی پیروی کی، ان کی صحبت میں زبان کا ذوق اور اچھے برے کی تمیز پیدا ہوئی۔ ان کے چھوٹے بھائی حافظ سید حبیب الرحمن جامعہ ملیہ میں پڑھتے تھے، ان کو اردو شعر و شاعری کا برا شوق تھا۔ ان کا ایک خاص ذوق یہ تھا کہ بچوں

سے اساتذہ کے اشعار کا مطلب پوچھتے اور اردو میں تقریر تحریر کے مقابلے کرواتے۔ اس سلسلہ میں خاص طور پر مومن غالب، ذوق اور لکھنؤ کے شعراء میں سے آتش اور امیر مینائی کے کلام سے ان کو خاص ذوق تھا، چنانچہ ان کے اشعار سننے اور ان کا مطلب بیان کرنے کے سلسلہ میں دماغ پر زور ڈالنے اور مشکل اشعار کے سمجھنے کی عادت پڑی۔ اس زمانہ میں اودھ میں مشاعروں کا بڑا زور تھا، ہمارے چھوٹے سے گاؤں میں کئی مشاعرے ہوئے، دیکھا دیکھی میں نے بھی کچھ موزوں کرنے کی کوشش کی، مگر اللہ تعالیٰ بڑے بھائی صاحب کو جزائے خیر دے کہ انہوں نے بہت سختی سے روک دیا، اور یہ شغل بے حاصل جاری نہ رہ سکا۔

رائے بریلی میں گھر میں بعض عزیزوں کا ذخیرہ کتب تھا جس میں مولوی محمد حسین آزاد کی نیرنگ خیال بھی تھی، عمر کے اس ابتدائی دور اور زبان و ادب کے اس ابتدائی ذوق میں آزاد کی نثر کا جو نثر اردو کا ایک مرصع نمونہ ہے، بہت اثر پڑا۔ بہت دنوں تک نیرنگ خیال اور آب حیات کی تقلید میں بہت سے صفحے سیاہ کیے، جو اپنی کم سواد کی باوجود فائدہ سے خالی نہیں رہے، یہ زمانہ ہر چھپی ہوئی چیز کے پڑھنے کے مرض کا تھا ہر قسم کی چیزیں پڑھیں، شرر مرحوم اور رتن ناتھ سرشار کی بھی چند کتابیں پڑھیں کہتے ہیں کہ کوئی پڑھی ہوئی چیز خواہ بھلا دیجائے بے کار و بے اثر نہیں رہتی، اپنا اچھا برا اثر ضرور کرتی ہے، اس لئے اس کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ وہ نقش آنکھوں سے آگے نہیں بڑھنے پائے، لیکن ان کا کوئی خاص اثر یاد نہیں آتا۔

اردو مضمون نویسی میں ابتدائی اثر والد مرحوم کی کتاب یاد ایام کا تھا جو سنجیدہ زبان کا ایک شگفتہ نمونہ ہے، اور جس میں تاریخ کی متانت کے ساتھ، زبان بانگنیں بھی موجود ہے جو میرے علم میں مصنف "گل رعنا، اور نواب صد ریا جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کی تحریر کا مشترک جوہر ہے اس طرز پر میرا مضمون جواب یاد آتا ہے اندلس پر تھا۔

عربی تعلیم شروع ہو جانے کے بعد میرے استاد شیخ خلیل عرب بن محمد بن شیخ حسین یمنی (محدث بھوپال) نے ہمیشہ کے لئے دل پر تو حید کا نقش قائم کر دینے کے لئے سورہ زمر بڑی تو جہ اور ذوق و شوق سے پڑھائی، عربی ادب اور بالخصوص عربی شعر کا عرب صاحب مرحوم کو اللہ نے ایسا فطری ذوق بخشا تھا، جس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ وہ اس قوم کے فرد تھے جس کے متعلق زبان نبوت نے شہادت دی ہے کہ ایمان اس کے گھر کی دولت ہے (الایمان یمان) عجم کا

حسن طبیعت نہیال سے اور عرب کا سوز دروں انہوں نے ددھیال سے پایا تھا۔ قرآن مجید پڑھتے تھے تو خود بھی روتے تھے اور دوسروں کو بھی رلاتے تھے، قصائد پڑھتے تھے، تو سوق و کاظ کا نقشہ کھینچ دیتے تھے۔ تو حیدان کا ذوق مضمون تھا، دل کھول کر پڑھایا اور دل کو تو حید کے لئے کھول دیا وہ دن ہے اور آج کا دن، اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے۔ (الا للہ الدین الخالص (سورہ زمر) کا نقش قائم ہے، اور اس کے سامنے مانعبد ہم الا لیقر بو نا الی اللہ زلفا (زمر) (مشرکین کہتے ہیں کہ ہم اپنے معبودوں کی عبادت محض اس لئے کرتے ہیں کہ وہ ہم کو خدا کے قریب کر دیں) کا حیلہ اور دعویٰ، جو ہمیشہ کے نظام شرک کا سب سے بڑا فلسفہ ہے، تاریکبوت معلوم ہوتا ہے۔ ادب میں شیخ خیل عرب کا ایک مجتہدانہ نصاب تھا، جو ہندوستان میں بالکل نیا تھا، ان کو اپنا ذوق تلامذہ کی طرف منتقل کرنے میں خاص کمال حاصل تھا، انہوں نے مبادی صرف اور تحریر و انشاء کی مشق کے ساتھ مصرو بیروت کے سلسلہ قرأت (ریڈرس) المطال العربیہ الطریقۃ المبتکرۃ (۱۱۵ اجزاء)، مدارج القراءۃ (ایک جزء) کے بعد ابن المقفع کی ”کلیلہ و دمنہ“، ”مجموعۃ من النظم والنثر“ حصہ نثر کا ایک حصہ حفظ اور حصہ نظم نہج البلاغہ حصہ کتب، اور نظم میں ”حماسہ“ اور معری کی ”سقط الزند“ اور ”دلائل الاغیاز للبحر جانی“ بڑے ذوق و شوق سے نیز ”مختصر تاریخ ادب اللغۃ العربیہ“ پڑھائی، عربی کے قواعد زبان کی مشق میں سب سے بڑا احسان اس گمنام کے نامور ہم نام ابوالحسن علی الضریر کے رسالہ ”الضریری“ کا ہے، جو چند اور راق کی کتاب ہے۔ عرب صاحب نے اس کی عملی مشق کرائی، اور یہی مشق اس وقت تک کام آ رہی ہے۔ اس تعلیم کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس میں ایک وقت میں مختلف علوم و فنون اور زبانوں کی تعلیم نہ تھی، صرف عربی زبان و ادب کی تعلیم تھی اور وہی اوڑھنا بچھونا، وہی مقصد حیات اور وہی ذوق طبع۔

عرب صاحب کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اپنے محبوب و منتخب مصنفین اور ان کی محبوب و منتخب تصنیفات کو اس طرح طلبہ کے سامنے پیش کرتے تھے، گویا وہی زبان و ادب اور طرز ادا کا واحد نمونہ اور ادب و ذوق کا منتہی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ وہ مصنفین طلبہ کے دماغ اور تخیل پر حاوی ہو جاتے تھے، اور طالب علم ان کا رنگ اتارنے لگتے تھے۔ ابن المقفع اور جاحظ نثر میں، عبد القاہر جرجانی ذوق، نقد ادب اور سخن فہمی میں متمنی و بختری شعر میں ان کے منتخب لوگ تھے، اس لئے ان کے طلبہ اپنی بڑی سعادت اور کمال سمجھتے تھے کہ ان میں ان کا رنگ اور انداز پیدا

ہو جائے۔ راقم الحروف نے ابن المقفع اور صاحب نہج البلاغہ نیز کبھی کبھی جر جانی کی تقلید میں لکھنے کی کوشش کی اور اس کا بڑا فائدہ ہوا۔ عرب صاحب کا ایک تعلیمی نکتہ یہ بھی تھا کہ وہ طلبہ کے دماغ پر یہ نقش قائم کر دیتے تھے کہ ادب و نثر کا ترکہ صاحب ذوق طلبہ کی میراث ہے جس کے استعمال کرنے اور اس سے فائدہ اٹھانے میں انہیں باک نہیں ہونی چاہیے، چنانچہ ان کی ہمت افزائی سے کبھی کبھی ان صاحب طرز انشاء پر دازوں کے بعض بعض جملے اور تعبیریں اپنی تحریر میں نگینہ کی طرح جڑ کر انعام حاصل کیا۔

اس تعلیم کے انتہائی مرحلہ پر مصر کے مشہور صاحب طرز نثار سید مصطفیٰ الطفی المنفلوطی کی کتاب ”المنظرات“ عرب صاحب نے دیکھنے کو دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس صدی کا یہ ساحر ادیب دماغ اور تخیل پر چھا گیا اور دل میں سما گیا، اس کے عنوانوں پر اپنے مضامین لکھے اور تیز رفتار ہوا کے پیچھے دوڑ کر دور تک خاک اڑائی۔

میری مکرر خوش قسمتی تھی کہ حدیث میں مولانا حیدر حسن خاں صاحب جیسا تخر استاد نصیب ہوا، جو مولانا غلام احمد صاحب لاہوری، مولانا لطف اللہ صاحب کوٹلی، مولانا احمد حسن صاحب کانپوری اور شیخ الاسلام شیخ حسین یمنی کے شاگرد، اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کے مجاز تھے۔ یہ بھی خوش قسمتی تھی کہ حدیث کی تعلیم شروع ہوئی تو کوئی دوسرا فن اور موضوع مزاحم نہ تھا، صرف حدیث کے اسباق تھے، مولانا کی صحبت تھی، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے طلبہ تھے، اور ندوۃ العلماء کا نادر علمی ذخیرہ اور مولانا کے علمی مآخذ تھے۔

مولانا کے یہاں تعلیم کی دوسری خصوصیتیں تھیں جن کی وجہ سے فن کا ذوق اور اس کا کچھ بہ قدر استعداد و توفیق (عملی ملکہ حاصل ہو جایا کرتا تھا ایک یہ کہ تعلیم بالکل ناقدانہ اور محدثانہ اصول پر تھی، مولانا کو مذہب حنفی پر کلیۃً اطمینان تھا اور وہ اس کے زیر دست و کیل و ترجمان تھے، لیکن ان کا درس حدیث محدثانہ طرز اور نقد حدیث اصول حدیث و رجال کے بحثوں پر مبنی تھا، اور اس میں بندوستانی طرز تذریس حدیث سے زیادہ یمنی طرز حدیث، اور شوکانی کے طرز تالیف کا اثر تھا۔ شوکانی کی تالیف نیل الاوطار اس کا ایک نمونہ ہے۔ محدثین میں خصوصاً محمد بن ابراہیم الوزیری اور محمد بن اسمعیل الامیر اور علامہ مقبلی کی تالیف اور اصول حدیث کے بعض نوادر ان کے خاص مآخذ تھے جن میں تنقیح لا انظار اور توضیح الافکار کے قلمی و شرح کے مسودات خاص طور پر

قابل ذکر ہیں۔ دوسری چیزوں کے مقابلہ میں علامہ ابن الترمذی کی الجوہر النقی امام زلیعی کی نصب الرایہ سے بہت مدد لیتے تھے اور حدیث صحیح کا جواب حدیث صحیح سے اور نقد حدیث کے علم استاد کے ساتھ شریک عمل ہوتے تھے۔ مولانا طلبہ ہی سے کتابوں کے نقول مذاہب کے دلائل رجال پر نقد و جرح کی بحثیں نکلاتے تھے اس طرح تدریس و تالیف کا سلیقہ سکھاتے تھے۔

درس حدیث میں عملی طور پر سب سے زیادہ فائدہ امام نووی کی ”شرح مسلم“ سے ہوا، جو ایک مبتدی طالب علم کے لئے بڑا اچھا استاد ہے۔ شروح حدیث سے فائدہ اٹھانے اور ذہن پر زور ڈالنے کا ملکہ اسی سے پیدا ہوا فتح الباری سے استفادہ کی اصل نوبت تدریس کے زمانہ میں آئی، اس وقت حافظ ابن حجر کی وسعت نظر فن حدیث پر ان کی قدرت اور اس کے وسیع ذخیرہ پر ان کا احتواء دیکھ کر آنکھیں کھل گئیں۔ یہ کتاب مسلمانوں کا ایک علمی کارنامہ ہے جس کی نظیر سے دوسری ملکوں کا مذہبی ذخیرہ خالی ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے کہیں وجد و سرور کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، قلبی طور پر سب سے زیادہ اثر ابو داؤد کی ”کتاب الادعیہ“ اور ترمذی کی ”کتاب الزہد والرقاق“ نے ڈالا۔

اسی زمانہ میں احیاء العلوم دیکھنے کا شوق ہوا اور اس نے دل پر بجلی کا سا اثر کیا مگر یہ مطالعہ جاری نہیں رہ سکا۔ اس میں بڑے بھائی صاحب کی بصیرت کو دخل تھا جن کے نزدیک اس کے مطالعہ کے شغف سے بعض غیر معتدل رجحانات کے پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔

۱۹۳۰ء میں شیخ خلیل عرب کی تجویز اور بھائی صاحب کی دعوت پر درالعلوم ندوۃ العلماء میں تدریس ادب کے لئے ایک فاضل و محقق صاحب زبان مراکشی عالم تشریف لائے، یہ علامہ شیخ تقی الدین ہلالی تھے، جن کو اگر نہ دیکھا ہوتا تو عربی زبان و ادب کے بہت سے مبادی و بدیہیات، زبان کی تعلیم کے بہت سے حقائق و اصول نظر سے ہمیشہ اوجھل رہتے، اور عجمیت و ہندیت کے اثر سے کلیۃً آزادی نصیب نہ ہوتی۔ ان کو اگر نہ دیکھا ہوتا تو قرن ثانی و ثالث کی زبان کو مردہ اور صرف کاغذ کے نقش و نگار سمجھتے، اس ایک شخص میں سلف کی احتیاط اور علمی تورع (عدم تحقیق کی حالت میں بے تکلف لا اداری کہہ دینا)، مغرب اقصیٰ خصوصاً اہل شنقیط کا حفظ و استحضار اہل لغت کا اتقان، علمائے نحو کی پختگی اور اہل زبان کی شیریں نوائی اور خوش گفتاری جمع تھی بات کرتے تھے تو منہ سے پھول جھڑتے تھے، ہر جملہ ادب کی جان ہوتا تھا جس کو آدمی

جس ادب کی کتاب کے حاشیہ پر چاہے لکھ لے، میں نے ”اعلمانی“ اور جاحظ کی کتابوں کی زبان بولتے ہوئے ان کے سوا کسی کو نہیں سنا، جو سمجھتے تھے، وہی بولتے تھے اور جو بولتے تھے وہی عربی زبان کا رزمہ اور محاورہ ہے۔

ہلائی صاحب سے عربی ادب و شعر کی کتابیں پڑھنے کی بھی سعادت حاصل ہوئی، لیکن اس سے زیادہ مفید ان کی صحبت اور مجالس و سفر کی رفاقت تھی، ان کی صحبت و افادات سے دو حقیقتیں پہلی بار منکشف ہوئیں، ایک تو یہ کہ زبان اور ادب میں فرق ہے۔ زبان وہ ہے جو ادب کی بنیاد ہے، ادب زبان کی بنیاد کے کاغذ و ایوان اور زبان کی دیوار کے نقش و نگار ہیں، ادب خیالات کے اظہار کا بلند اور ترقی یافتہ ذریعہ ہے جو تمدن و تخیل کی ترقی سے پیدا ہوتا ہے۔ زبان کی تعلیم و تربیت ادب کی تعلیم پر مقدم ہے اگر زبان نہیں آتی تو ادب نہیں آسکتا اور اس کی قبل از وقت تعلیم ضیاع وقت ہے۔ ہندوستان میں زبان کے دھوکہ میں اور عربی زبان کے نام سے اعلیٰ عربی ادب کی تعلیم دی جا رہی ہے، جو اکثر اوقات بے بنیاد اور بے نتیجہ ثابت ہوتی ہے۔ ہلائی صاحب کہتے تھے کہ حریری اور متنبی و حماسہ ادب عربی کی اعلیٰ کتابیں ہیں جو بلا و عربیہ میں زبان کی طویل اور مسلسل تعلیم اور زبان کی مشق کے بعد پڑھائی جاتی ہیں، اور عربی ادب کی تکمیل کرنے والے فضلاء ان کو پڑھتے ہیں، لیکن ہندوستان میں یہی کتابیں ادب کا کل سرمایہ اور جمع خرچ ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان سے پہلے زبان کو ایک زندہ زبان کی طرح پڑھا جائے، ان کا یہ بھی اصرار تھا کہ زبان کو انسانی زبان کی طرح بغیر ترجمہ کی مدد کے پڑھنا چاہئے، اس پر شیخ نے دارالعلوم میں مسلسل تقریریں کیں، اور اپنے مدعا کو دلائل سے ثابت کیا۔

دوسری حقیقت یہ منکشف ہوئی کہ صرف و نحو کے قواعد زبان کی تشکیل کے اصول ہیں، جن کا درجہ زبان کے بعد ہے۔ زبان کا ذخیرہ اگر کچھ نہ ہو تو صرف و نحو کے قواعد بے کار ہیں۔ مفردات، الفاظ و جمل مکان کی اینٹیں ہیں، اور نحو کا علم اصول تعمیر کے قواعد اور انجینئری کا فن۔ اگر سرے سے اینٹیں نہ ہوں تو انجینئر ننگ اور اصول تعمیر کا بڑے سے بڑا علم ناکارہ اور فضول ہے۔

ہلائی صاحب سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ زبان کا بہترین نمونہ تاریخ کی مستند کتابیں اور عہد عباسی کے ادباء کی غیر مصنوعی تصنیفات ہیں، اس کے لئے انہوں نے ابن قتیبہ کی

الاماتہ والسیاستہ، ابن المقفع کی کلید و... ابوالفرج الاصبہانی کی کتاب الامانی اور جاحظ کے رسائل کی سفارش کی۔

یہ زمانہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں عربی کی بہار کا تھا۔ ادھر ہلالی صاحب کا فیض عام تھا، ادھر ہمارے دوست مولانا مسعود عام ندوی عربی کا رسالہ النضیاء نکال رہے تھے، عربی زبان و تحریر نقد و تبصرہ گویا اوڑھنا بچھونا ہو رہا تھا۔ مصری، شامی عراقی اور مغربی (الجزائری و مراکش) رسائل و جرائد تبادلہ میں آتے تھے، پڑھے جاتے تھے، اوان پر گفتگو رہتی تھی۔ یہ میری عربی اخبار بینی کی عمر کا بچپن تھا۔ عربی ادب کی کتابیں پڑھ لینے اور عربی اساتذہ کی صحبت میں رہنے کے باوجود اخبارات کا بڑا حصہ سمجھ میں نہ آتا اس لئے ہمیں کہ ہندوستانی علماء کے بقول (ہو سراسر غلط فہمی ہے)

یہ کسی جدید عربی میں ہوتے تھے، بلکہ طرز ادا اور اشتقاق کی ناواقفیت کی وجہ سے سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ بھائی صاحب کی مدد سے میں نے اخبار پڑھنا شروع کیا اور اس سے جتنا فائدہ اور تعبیر اور اظہار خیال میں جتنی قدرت حاصل ہوئی، ادب و زبان کی کسی کتاب یا کتابوں سے نہیں ہوئی۔ مصری و شامی ادباء و فضلاء کے مضامین پڑھ کر ان کی فصاحت، زبان کی قدرت کا سکہ دل پر بیٹھا، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عربی زبان کے خزانہ عامرہ کے نوادر جو صدیوں سے سر بہرہ تھے، وہ اپنے اخبارات و رسائل کے کھلے صفحات میں روزانہ لٹاتے ہیں، اور امیر شکیب ارسلان کے بقول عہد عباسی کا ایک ادیب برسوں میں جتنا لکھتا تھا، وہ اس عصر کا ادیب و سخانی چند دنوں میں لکھ لیتا ہے لیکن معنوی و ذہنی حیثیت سے ذوق و مانع پر ان مضامین کا کوئی اچھا اثر نہیں پڑا اور ہمارے ہندی ذوق نے جس نے ہندوستان کے زیادہ منجیدہ زیادہ گہرے اور زیادہ طاقتور اسلامی ادبیات اور ماحول میں نشو و نما پائی تھی، عربوں کے قوم پرست اور وطنی افکار مغرب سے ذہنی مرعوبیت اور خیالات کی سطحیت کے خلاف ہمیشہ احتجاج کیا اور ذہن نے اس کی پستی اور کمزوری بصاف محسوس کی۔ ان مضامین کو میں نے ہمیشہ روحانی اذیت اور ذہنی کوفت کے ساتھ پڑھا اور حیثیت سے امیر شکیب ارسلان کی تحریروں اور خیالات میں نسبتاً کچھ گہرائی اور پختگی اور اسلامیت معلوم ہوئی، لیکن امت اسلامیہ کے امراض کی تشخیص اور علاج کی تجویز میں اس وقت جس شخص کے خیالات و افکار میں نسبتاً زیادہ بلند نظری اور باریک بینی معلوم ہوئی، اور

جس کی فراست نے متاثر کیا، وہ سید عبدالرحمن الکواکبی کی تخیلی کتاب ”ام القریٰ“ ہے، جواب پرانی بوجھتی ہے، اور اس کے لائق مصنف کو لوگ بھولتے جا رہے ہیں لیکن بعد میں یہ دیکھ کر کہ وقت و میت عربیہ کے اولین نقیبوں میں ہیں، اور انہوں نے سب سے پہلے دولت عثمانیہ کے خلاف عربوں میں بیزاری پیدا کرنے کی کوشش کی، دل چھیکا ہو گیا اور عقیدت میں کمی آئی۔

۱۹۲۷ء یا ۱۹۲۸ء میں رسالہ ”توحید“ امرتسر میں جو مولانا داؤد غزنوی مرحوم کی ادارت میں نکلتا شروع ہوا تھا، تیرہویں صدی کا مجدد اعظمؒ کے عنوان سے حضرت سید احمد شہید کے متعلق مولوی محی الدین قصوری مرحوم کا ایک سلسلہ مضمون شائع ہوا۔ بھائی صاحب کے حکم سے ۱۹۲۹ء۔ ۱۹۳۰ء میں میں نے اس کا عربی میں آزاد ترجمہ کیا جو بلالی صاحب کی اصلاح کے بعد علامہ سید رشید رضا مرحوم نے المنار میں بھی شائع کیا، اور ترجمہ الامام السید احمد بن عرفان الشہید کے نام سے علیحدہ رسالہ کی شکل میں بھی چھاپ دیا، اس موضوع سے یہ میرا پہلا تعلق تھا۔ میری مدرسے تعلیم کا اختتام ہو چکا تھا، اور آزاد مطالعہ کا آغاز، حافظ ابن قیم کی ”زاد المعاد“ میرا کتب خانہ، میری رفیق سفر اور میری گویا اتالیق و معلم تھی۔ دینیات کے کتب خانہ کی اتنی بہتر نمائندگی ایک کتاب میں ملنا مشکل ہے۔ اگر مجھے کبھی پورے ذخیرہ علمی سے محروم کر دیا جائے، اور صرف دو کتابوں کی اجازت دی جائے، تو میں کتاب اللہ اور ”زاد المعاد“ اپنے ساتھ رکھوں گا، اس نے مجھے نماز سکھائی، دعائیں اور اذکار یاد کرائے، سفر کے آداب بتائے، روزمرہ زندگی کے مسنون قواعد و احکام سکھائے، اور سنت کا ضروری علم بخشا۔

ابتدائے شباب میں جو کتابیں فرشتہ رحمت بن کر سامنے آئیں، ان میں سے زیادہ موثر اور محسن کتاب محمد بن نصر المروزی کی کتاب ”قیام اللیل“ ہے۔ اس کتاب کا خاص کام یہ ہے کہ عقلی اور استدلالی طریق سے نہیں، بلکہ قلبی اور ذوقی طور پر دلچسپی اور شوق کا رخ بدل دیتی ہے اور سارا کھیل دلچسپی اور انس ہی کا ہے، اس کتاب میں شب بیدار نو جوانوں کے ایسے موثر واقعات لکھے ہیں، اور قرآن مجید کی بعض آیات کی اتنی پر اثر تفسیر اور قیام لیل کے فضائل جمع کیے ہیں جو اگر کسی خوش قسمت نو جوان کو آغاز شباب میں مل جائیں، اور اپنا اثر کر جائیں تو ایک شیخ کامل کی بیعت سے کم نہیں۔

امام ابن تیمیہ کی تفسیر سورۃ النور نے بھی اس پر آشوب زمانہ میں دستگیری کی یہ اور حافظ

ابن قیم کی ”الجواب الکافی“ نو جوانی میں بہترین نگران اور اتالیق، اور اخلاقی محتسب و ناظر ہیں۔ زمانہ تعلیم کے بے شعور دور میں جس کتاب نے تعلیم سے اور معلمین سے نفع اٹھانے اور ان کے احتمام اور طالب علمی کے آداب کا لحاظ کرنے کا خیال پیدا کیا وہ صاحب ہدایہ کے ایک شاگرد کی چھوٹی سی کتاب ”تعلیم المستعلم“ ہے۔ اسی طرح تحصیل علم میں علوئے ہمت، عزیمت اور ذوق علم پیدا کرنے میں نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خان شروانی کی کتاب ”علمائے سلف“ نے ہمیز کا کام دیا اور دل و دماغ پر علمائے سلف کی عظمت و عزیمت کا نقش ثبت ہو گیا۔ میرے نزدیک ہر سچے طالب علم کو اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیے اور اس کو حرز جان بنا کر رکھنا چاہیے۔

والد مرحوم مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب سابق ناظم ندوۃ العلماء کی تصنیفات کو ملتے پلتے، ان کا ایک مسودہ ارمغان احباب ۴ کے نام سے ہاتھ آ گیا جو انہوں نے اپنی ۲۶ سال کی عمر میں لکھا ہے، اور ۱۳۱۲ھ کے طالب علمانہ سفروں کا روزنامہ ہے، نہایت سادہ اور بے تکلف، لیکن اس نے میرے دل پر بڑا اثر کیا، مردان خدا کی محبت اور دین کی چاشنی محسوس ہوئی، حضرت سید احمد سہید سے اصل قلبی تعلق اسی رسالہ سے پیدا ہوا جہاں والد مرحوم حضرت سیدنا لکھتے ہیں، وہاں دل جھوم جاتا تھا، اور دل ایک خاص کیف محسوس کرتا تھا۔

دوسری چیز جس نے حضرات اہل اللہ کی محبت و عقیدت پیدا کی اور دین کا ایک خاص مزہ معلوم ہوا جس کو الفاظ میں ادا کرنا مشکل ہے، حضرت مولانا محمد علی بانی ندوۃ العلماء کا چھوٹا سا رسالہ ارشادِ رحمانی ہے جس میں شیخ وقت مولانا فضل رحمن صاحب گنج مراد آبادی کے کچھ حالات حکایات و ملفوظات اور سلوک و طریقت کے کچھ نکات ہیں۔ حضرت مولانا گنج مراد آبادی میرے والد مرحوم کے شیخ تھے اور بچپن سے گھر میں آپ کا ذکر خیر سنا تھا۔ اس روزحانی تعلق اور ذہنی ربط سے کتاب ذوق و شوق سے پڑھی، محبت کے اشعار، اور عاشقانہ کلمات دل میں چبھ گئے اور تیر و تشر کی طرح دل میں اتر گئے۔ اس سے کچھ پیشتر یا بعد والد مرحوم کا ایک مختصر سا رسالہ یا مقالہ جو استفادہ کے نام سے شائع ہوا تھا بار بار پڑھا تھا، اس میں انہوں نے اپنے گنج مراد آبادی کی حاضری کے حالات، اور وہاں کے مشاہدات، اور مولانا کے الطاف و عنایات کے واقعات قلم بند کئے تھے، اس نے مولانا کی محبت و عقیدت، اور اہل اللہ

سے ملاقات اور استفادہ کے شوق میں اور اضافہ کیا۔

مشائخ و بزرگان دین کے ملفوظات کے مضموعے بھی نظر سے گزرے۔ ان مضموعوں میں حضرات چشتیہ کے ملفوظات میں سب سے زیادہ محبوب الہی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے ملفوظات فوائد الفوائد اور حضرات نقشبندیہ کے ملفوظات میں حضرت شاہ غلام علی کے ملفوظات در المعارف کا قلب پر اثر پڑا۔ اگرچہ ذہن نے حدیث کے اثر اور ایک خاص ذہنی تربیت و مطالعہ کا وجہ سے بعض باتوں کے قبول کرنے سے ادب کے ساتھ معافی چاہی، لیکن قلب نے واقعات، اور بے ساختہ گفتگو اور خلوس کی برمی و نرمی محسوس کی۔

فلسفہ تصوف اور فلسفہ اخلاق کے نکات و مباحث نے جو متاخرین صوفیہ کی کتابوں میں بہشت ملتے ہیں، کبھی متاثر نہیں کیا، البتہ درد و محبت اور سوز و گداز کی باتیں بے اثر نہیں رہتی تھیں اور یہ تیرم خطا جاتے تھے، درد و محبت میں ڈوبے ہوئے اشعار اور فقرے دل پر نقش اور حافظہ میں محفوظ ہو جاتے تھے۔

ہم نے اپنے آشیانہ کے لئے

جو چھبے دل میں وہی تنکے لئے

بزرگوں کی مجالس و ملفوظات کے سلسلہ میں تاریخی ترتیب کا لحاظ کیے بغیر یہ کہے بغیر آگے نہیں بڑھا جاتا کہ عرصہ کے بعد جب مولانا شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی بھوپالی کی مجالس میں حاضری کا شرف حاصل ہوا اور ان کی التفات و عنایات سے سرفراز ہوا تو ان کی زبان سے دینی حقائق و نکات، اور سلوک و تصوف کی نادر تحقیقات سن کر عالم حیرت میں پڑ گیا، اللہ تعالیٰ نے ان کے ملفوظات و مجالس کے قلم بند کرنے کی توفیق بھی عطا فرمائی۔ اپنے علم و فہم کے مطابق یہ کہنے میں زرا مبالغہ معلوم نہیں ہوتا کہ عرصہ دراز سے ترکیہ و احسان اور دینی حقائق کے سلسلہ میں ایسے بیش قیمت ملفوظات اور ایسے گہرے علوم و مضامین سننے میں نہیں آئے۔

والغیب عند اللہ (اور) وفوق کل ذی علم علیم۔

طالب علمی کے باقاعدہ اختتام کے قریب ضلع رائے بریلی کے ایک مردم خیز قصبہ سلون جانے کا اتفاق ہوا، اور دو کتب خانے دیکھے ایک زندہ و متکلم، ایک جامد و خاموش۔ زندہ کتب خانہ مولانا شاہ حلیم عطا صاحب ۶، اور جامد کتب خانہ ان کا قیمتی علمی ذخیرہ۔ شاہ صاحب کے

واسطے حافظ ابن جوزی، حافظ ابن تیمیہ، حافظ ابن قیم، حافظ ابن رجب اور ابن عبد البر وغیرہ کی بعض کتابیں دیکھیں، پھر وطن واپس جا کر ”احیاء العلوم مع تاریخ عراقی“، ”فضل علم السلف علی الخلف“، ”دقائق الكنوز“، ”تلبیس ابلیس“، ”مختصر منہاج القاصدین“ وغیرہ منگوائیں۔ ”تلبیس ابلیس“ کے مطالعہ سے ناقدانہ ذہنیت پیدا ہوئی۔

اب اس سے پہلے کہ میں اپنی آخری محسن و موثر کتابوں کا ذکر کروں، تاریخی ادوار کے لحاظ کے بغیر ان کتابوں اور تحریروں کا ذکر کرتا ہوں، جنہوں نے بعض خاص حیثیتوں سے دل و دماغ پر کوئی اثر کیا اور کوئی قابل ذکر علمی فائدہ یا ذہنی تغیر پیدا کیا۔

نظام و نصاب تعلیم کے متعلق اصلاحی و تجدیدی خیالات کا ختم شیخ خلیل عرب و شہنشاہ الدین الہدالی کی مجالس درس میں دماغ پر پڑا۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ماحول اور لٹریچر نے اس کا نشوونما کیا، ندوۃ العلماء کا تخیل اور دین و دنیا کی بہم آمیزی، اور علماء و اہل دین کی قیادت و اقتدار کی ضرورت و اہمیت کا احساس نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی کے اس خطبہ صدارت سے وضاحت و قوت کے ساتھ ہوا جو موصوف نے ندوۃ العلماء کے اجلاس ۱۹۲۴ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں پڑھا تھا، اور میں نے اس کو غور سے بعد میں چھپا ہوا پڑھا، پھر مزید مطالعہ سے اس پر یقین اور اطمینان بڑھتا رہا اور یہ دونوں چیزیں میرے علمی عقائد و نظریات کا جزو بن گئیں۔

مغربی تہذیب و نظام سے نفرت اصل میں بڑے بھائی صاحب ڈاکٹر حکیم سید عبد العلی صاحب مرحوم بی۔ ایس۔ سی، ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کی صحبتوں اور مجلسوں میں پیدا ہوئی، جو اس سے براہ راست واقفیت رکھتے تھے، اور اعلیٰ مغربی تعلیم کے باوجود اس کی سخت تنقید اور مذمت کرتے تھے۔ یوں بھی ان کی زندگی، اور ان کا سراپا قدیم اسلامی تہذیب و ثقافت کی فتح مندی اور مغربی ماحول کے اثرات کی شکست و ہزیمت کا اعلان کرتا تھا، اس نفرت کو جو زیادہ تر قلبی تھی، مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی کے ”سچ اور صدق“ کے پرچوں نے مستحکم اور دماغی بنا دیا۔

مغربی تہذیب کی تاریخ سمجھنے میں اور لادینیت و مادیت کے ارتقاء کی اس منزل کی توجیہ میں ڈریپر کی پرانی کتاب ”معرکہ مذہب و سائنس“ (مترجمہ مولانا ظفر علی خاں مرحوم) اور لیگی کی ”تاریخ اخلاق یورپ“ (مترجمہ مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی) نے بڑی مدد دی اور اس

سے بڑا مواد ملا جس سے اپنے مضامین و استدلال میں بہت کام لیا۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کے مضامین ترجمان القرآن اور ان کی کتاب تحقیقات نے اور زیادہ وضاحت و تقویت پہنچائی۔ مولانا ابوالاعلیٰ کے ”ترجمان القرآن“ کے مضامین نے طرز استدلال اور طرز تحریر پر بھی اثر ڈالا، اور ان کی تحریروں نے ذوق و فکر کو متاثر کیا۔

مغربی تہذیب کے مزاج اور اس کے حقیقی نقائص، اسلامی تہذیب سے اس کے بنیادی و اصولی تضاد اور دونوں کے اتحاد کے عدم امکان کے متعلق سب سے زیادہ واضح اور پر مغز چیز محمد اسد صاحب کی کتاب معلوم ہوئی جس کا لفظ لفظ دل نشیں ہوا۔ نرصد دراز کے بعد ان کی دوسری فکر انگیز لیکن دلچسپ کتاب شائع ہوئی جس کا عربی ترجمہ ”الطریق الی مکہ“ انہوں نے ازراہ عنایت مجھے خود بھیجا، یہ اس اجمال کی تفصیل اور اس نظریہ کی عملی تطبیق تھی جو انہوں نے اپنی پہلی کتاب میں پیش کیا تھا۔ میں نے ان کی اجازت سے اس کا ترجمہ اور تلخیص ”طوفان سے ساحل تک“ کے نام سے شائع کیا، یہ کتاب ہر جو یائے حق اور صاحب ذوق کے پڑھنے کی ہے۔

۳۹-۱۹۳۸ء میں مصر کے فاضل مولف ڈاکٹر احمد امین کی ”فجر الاسلام“ (جلد ۱) اور

”ضمی الاسلام“ (جلد ۳) کے مطالعہ کا موقع ملا، یہ عہد نبوی اور عہد اموی و عباسی کی فکری، ادبی، اخلاقی، سیاسی و علمی تاریخ ہے جس میں واقعات سے نتائج اخذ کیے ہیں، جزئیات سے کلیات قائم کیے ہیں اور ہر دور اور حیات انسانی کے ان مختلف شعبوں پر مجموعی نگاہ ڈالی ہے۔ کتاب مصنف کی قوت ملاحظہ اور حسن استنتاج کا اچھا نمونہ ہے، اور اگرچہ موجودہ عصری و مغربی تاثرات سے کلیتہً پاک نہیں، اور اس کے مطالعہ سے ذخیرہ حدیث پر اعتماد کسی حد تک متزلزل ہو جاتا ہے، اور اس کی بعض بنیادی شخصیتوں کے بارے میں وہ عظمت اور عقیدت قائم نہیں رہتی جو ایک مسلمان کے دل میں قائم رہنی چاہیے، مگر میری سادہ لوحی کہنے پر ناقدانہ نظر کی کمی کہ مجھے مصنف کی اس کمزوری کا پورا احساس اس وقت نہیں ہونے پایا، اس کا شیخ احساس و علم اور اس سے اذیت اس وقت ہوئی جب میں نے ڈاکٹر الشیخ مصطفیٰ السباعی کی فاضلانہ کتاب ”

السنة و مکانتها فی التشريع الاسلامی“ پڑھی جس کے مطالعہ کی سفارش فن حدیث کے ہر طالب علم سے ہے۔ اس کے باوجود ڈاکٹر احمد امین سے خیالات میں بڑا تو اور معلوم ہوا کئی جگہ حواشی پر اختلاف یا اظہار خیال کیا، یا مصنف کو بے اختیار داد دی، لیکن سب زیادہ فائدہ جو ان

کتابوں کے مطالعہ سے حاصل ہوا، وہ شائق شیعہ اور ملی طرز تحریر کا ہے جس میں احمد امین اپنے معاصرین میں خاص امتیاز رکھتے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے تذکرہ سے احمد بن حنبل اور محمد شین کی عمومی عظمت دل و دماغ پر قائم ہوئی تذکرہ اور البلال کے ادبی بحر حلال نے مشہور کیا۔ ترجمان القرآن کی دوسری جلد سے تفسیر اور فہم قرآن کے بعض نئے و شے سامنے آئے، اور فکر میں وسعت پیدا ہوئی۔ سورہ یوسف پر جو کچھ انہوں نے لکھا ہے، وہ نہ صرف قرآنی نکتہ شناسی کی ایک مثال، بلکہ ادب عالی کا ایک زندہ جامہ نمونہ ہے۔

جب ترجمہ قرآن اور تفسیر کی تدوین کی خدمت دارالعلوم میں سپرد ہوئی تو مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کے حواشی کی قدر آتی جن میں انہوں نے تفسیرین کے اقوال کا مظہر اور ان کی تحقیق کا وہ حصہ نقل کر دیا ہے جس کو اس زمانہ کا سلیم ذہن آسانی کے ساتھ قبول کر لیتا ہے۔ اس میں مولانا کی سلامت فکر، حسن انتخاب اور تحریر کی شگفتگی بخوبی عیاں ہے۔ میں نے دیوبند کی ایک ملاقات میں مولانا سے اپنا یہ تاثر ظاہر کیا، مولانا کو بڑی مسرت ہوئی، اور بعض صاحبوں سے اس کو نقل کیا۔ جدید معلومات و تحقیقات نے تفسیر کے سلسلہ میں جو نئے سوالات پیدا کر دیے ہیں، ان کا حل تلاش کرنے میں اور قرآنی اجاز کے بہت سے گوشوں کو بے نقاب کرنے میں ”تفسیر ماجدی“ اور اس کے مصنف مولانا عبد الماجد دریا آبادی کے تفسیری مضامین و تحقیقات سے بڑی مدد ملی، اور اپنے مطالعہ و معلومات میں تحقیقی اضافہ ہوا۔

مولانا سید سلیمان صاحب ندوی کی تمام تصنیفات نقد کامل عیار اور علم و انشا کے لحاظ سے معیار ہیں لیکن اس بے بضاعت کو جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ خطبات مدراس ہے۔ اگر کسی مصنف کے حصہ میں صرف یہی تصنیف آئے تو اس کو زندہ جاوید بنادے اور اگر مقبول ہو (جیسا کہ آثار سے بھی ظاہر ہے) تو مغفرت کے لئے تنہا کافی ہے۔ بار بار منہ لے لے کر پڑھی، حدیث و سیرت کے نئے نئے پہلو سامنے آئے اور اس عہد انقلاب میں اہل علم اور تعلیم یافتہ غیر مسلموں کے سامنے حدیث و سیرت پیش کرنے کی راہ معلوم ہوئی۔

مولانا سید مناظر احسن گیانی کی کتابوں میں بڑی معلومات اور مواد ہے، بہت سے لوگوں کا ان کے مخصوص طرز تحریر اور بات سے بات نکلنے کی وجہ سے جی نہیں لگتا، لیکن میرا ہمیشہ

ان کی کتابوں میں جی اگا اور اپنے مسم میں اضافہ ہوا۔ خاص طور پر ان کی کتاب ”النہی الخاتم“ سیرت پر بڑی اہمیتی کتاب ہے۔ اسی طرح ان کی دوسری کتاب ”ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت“ بڑی پر از معلومات اور مؤثر کتاب ہے۔ تیسری کتاب ”مدوین حدیث“ بڑی مبہمہ اند اور نکتہ وارانہ تصنیف ہے۔ ان کا مضمون ”عبد الف ثانی کا تجدیدی کارنامہ“ بھی بڑی بصیرت و معلومات کا ذریعہ بنا، اور اس سے ان کے دوسرے مقابے جو ”الخرقان“ شاہ ولی اللہ دہلوی میں شائع ہوا تھا، تاریخ ہند کے نئے گوشے سامنے آئے۔

”حیات جاوید“، ”وقار حیات“ اور ”تہذیب الاخلاق“ کے پرانے قائل سے ہندوستانی مسلمانوں کے موجودہ مزاج اور ان کے موجودہ تعلیمی و سیاسی رجحانات کے سمجھنے میں بڑی مدد ملی، جس کی تکمیل ”حیات شبلی“ سے ہوئی۔ مولوی سید ظہیر احمد صاحب کی ”حکومت خود اختیاری“ اور ”مسلمانوں کا روشن مستقبل“ سے ہندوستان کی برطانوی سیاست اور مسلمانوں کے سیاسی تنزل اور ذہنی تغیر کی توجیہ ہوئی۔ ہندوستان کی اسلامی، دینی و علمی تاریخ کا سب سے بڑا خزانہ گھر میں موجود تھا کبھی خیال نہیں آیا تھا، حیدر آباد سے اشاعت کی تحریک ہوئی تو والد مرحوم کی تصنیف اور سرمایہ حیات ”نزبۃ الخواطر“ کی آٹھ جلدیں ایک سے زائد بار پڑھیں۔ ان کتابوں سے ہندوستان کی آٹھ سو برس کی جیتی جاگتی تاریخ آنکھوں کے سامنے آگئی، علماء و مشائخ، اہل درس و اہل تصنیف، اہل ذوق و اہل کمال، سلاطین و وزراء، امراء و رؤسا کے ایسے حالات اور ہندوستان کی علمی تاریخ کے ایسے قیمتی نواد و نکات مفت میں مل گئے، جن کے لئے سینکڑوں کتابیں الٹنے اور ہزاروں صفحات کھنگالنے سے بھی کام نہ چلتا۔ یہ ایک بہت بڑی ثقافت اور معلومات کا خزانہ تھا، جس کو ہندوستان کا کوئی طالب علم جو علم سے اپنا انتساب کرتا ہو، نظر انداز نہیں کر سکتا، اور جس کے بغیر آدمی اپنے ملک ہی میں اندھیرے میں رہے گا۔ علمی طور پر کسی کتاب کے مواد اور علمی ذخیرہ سے اتنا کام نہیں لیا، جتنا ”نزبۃ الخواطر“ کی ان ضخیم آٹھ جلدوں کے تاریخی معلومات سے جن کی تلاش کے لئے تاریخ و تصوف کی کتابوں کے ہزاروں صفحات دیکھنے کی نہ توفیق تھی نہ فرصت اور نہ یہ اندازہ کہ ان کو کہاں تلاش کرنا چاہئے، اور کس جگہ سے دستیاب ہو سکتے ہیں۔ میری محرومی کہ میں اپنی کم سنی کی وجہ سے اپنے والد سے کوئی استفادہ نہ کر سکا، لیکن اللہ ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، وہ ایسا علمی سرمایہ چھوڑ گئے

ہیں کہ ساری عمر اس سے استفادہ کا موقع ہے۔

زندگی کے طویل تر دور میں دماغ پر علامہ اقبال مرحوم کا بڑا غلبہ رہا ہے، اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ کسی معاصر شخصیت کے افکار کا اتنا گہرا اثر دماغ پر نہیں پڑا جتنا علامہ اقبال کے کلام کا، غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ان خیالات اور تصورات کی ترجمانی کرتے ہیں جو روح و جسم میں پیوست ہو چکی ہیں۔ اقبال اور ان کے کلام پر اردو میں اتنی کتابیں شائع ہوئی ہیں جو شاید کسی معاصر شخصیت اور اس کے فکر پر شائع نہیں ہوئیں، لیکن ان میں سب سے زیادہ پر مغر اور روح پرور کتاب ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی ”روح اقبال“ معلوم ہوئی۔

علامہ مرحوم سے ۱۳۵۶ھ/۱۹۳۷ء میں دوسری ملاقات کی، اور کئی گھنٹے ان کے التفات و ارشادات سے محفوظ رہا، جس کا خلاصہ پنجاب کے ایک رسالہ میں ”عارف ہندی کی خدمت میں چند گھنٹے“ کے عنوان سے شائع ہوا۔ بلا دیر یہ کہ مسلمانوں کی بے التفاتی اور ناشناسی پر دل کھول کھول کر رہتا اور ٹیکور کی قدر افزائی پر غصہ آتا۔ علامہ مرحوم کی وفات کے بعد مصر میں پڑھنے جانے کے لئے ایک مفصل و طویل مضمون علامہ مرحوم کی زندگی و خصوصیات پر لکھا اور بعد میں عالم عربی میں ان کے تعارف کی سب سے زیادہ کامیاب کوشش کی توفیق ”روائع اقبال“ ۷۷ء کے ذریعہ ہوئی، جس نے بلا دیر یہ کہ نوجوانوں میں بڑی مقبولیت حاصل کی۔ ابتدائی استغراق و انہماک کے دور میں تنبیہ ہوئی کہ کسی انسان کے کلام سے اس قدر انہماک اور شیفٹنگی اچھی نہیں۔ اصل شغف اور انہماک کی چیز اللہ تعالیٰ کا ابدی پیغام اور کلام ہے جو قرآن مجید کی شکل میں محفوظ ہے، اور جس کو جو کچھ ملا ہے، اسی سے ملا ہے، لیکن اب بھی ان کے اشعار خون میں توجہ اور جذبات میں حرکت پیدا کر دیتے ہیں، اور عالم اسلام کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لئے اب بھی اس کو طاقت و خود اعتمادی کا ایک بہت بڑا سرچشمہ سمجھتا ہوں۔

مطالعہ کے سلسلہ میں مولانا عبد الباقی صاحب ندوی کی ایک چھوٹی سی کتاب ”مذہب و عقائد“ پر نظر پڑی جو ”بقامت کہتہ و بقیامت بہتر“ کی صحیح مصداق ہے۔ ذوق و ذہن نے اس کو پورے طور پر اپنا لیا۔ اس رسالہ سے عقل و نقل کے حدود اور تجربہ و علم انسانی کی نارسائی اور کوتاہی و ناپائیداری اور انبیاء علیہم السلام کے علم کی قطعیت کا ایک ابتدائی تخیل حاصل ہوا جو مطالعہ میں بہت کام آیا۔ اس کے بعد قدیم و جدید فلسفہ، اور اس کی تاریخ پر جو کچھ ہاتھ آیا،

پڑھا، مگر اس ابتدائی تخیل میں ذرا تزلزل واقع نہیں ہوا۔ بلکہ جس قدر پڑھا ”ان ہم الا یخربون“ اور ”بل کذبوا بما لم یحیطوا بعلمہ ولما یاتہم تأویلہ“ کی تفسیر و توشیح ہوتی رہی۔ حافظ ابن تیمیہ کی ”تفسیر سورہ اخلاص“ اور ”کتاب النبوءات“ کے اشارات سے مزید مدد ملی، لیکن اس نقش کو پختہ حضرت مجدد الف ثانی کے مکتوبات نے کیا۔

میرے معلم و مربی، میرے برادر معظم ڈاکٹر سید عبدالعلی مرحوم، جن کی اصابت رائے، خداداد سلامت فکر، استقامت اور گہرا علم زندگی کی ہر منزل اور ہر موڑ پر میرا دستگیر رہا، برابر حضرت مجدد الف ثانی کے مکتوبات اور حضرت شاہ ولی اللہ کی ”ازلۃ الخفاء“ کے مطالعہ کی تاکید فرماتے رہے، لیکن نو عمری کی سطحیت اور کم سنی کی ثبات کی وجہ سے کبھی دو چار سنیوں سے زیادہ نہ پڑھ سکا۔ دفتر اول کا پہلا مکتوب جو حضرت نے اپنے مرشد خواجہ باقی باللہ کو لکھا ہے، اور جس میں اپنے بہت سے واردات اور راہ سلوک کے تجربات لکھے ہیں، ہمیشہ ہمت شکن ثابت ہوا اور جس طرح بدشوق بچے ہمیشہ قرآن کی تلاوت میں پہلا پارہ پڑھ کر چڑھ دیا کرتے ہیں، میں بھی اس مکتوب کے چند صفحات پڑھ کر کتاب ہاتھ سے رکھ دیا کرتا تھا، لیکن ایک بار اس کا عزم کر لیا کہ ”مکتوبات“ کا لفظ بہ لفظ مطالعہ کروں گا، چاہے بڑا حصہ سمجھ میں نہ آئے، چنانچہ اس کی چاروں ”کذا، تینوں“ دفتر پڑھے، لفظ بہ لفظ، دل اگا کر اور لطف لے لے کر پڑھے۔ بے استعدادی، قوت مطالعہ کی کمی اور علوم عقلیہ و آلیہ کی بے بضاعتی قدم قدم پر عنایاں گیر رہی، لیکن ایک عامی کے حصہ میں جو کچھ آیا، اس پر اللہ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ:

آنچه ساقی ماریخت بین الطاف است

ایک عرصہ کے بعد حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کے مکتوبات کے مطالعہ کی سعادت حاصل ہوئی، حضرت مجدد اور حضرت مخدوم بہاری کے مکتوبات کے مطالعہ سے علم کا ایک نیا عالم آنکھوں کے سامنے آ گیا، وحی و نبوت کی قطعیت، مقام نبوت و منصب رسالت کی بلندی و برتری اور خصائص نبوت و انبیاء، اور نبوت و ولایت کے لوازم و مابہ امتیاز چیزوں کے متعلق جو نکتے اور حقائق لکھتے ہیں، ان پر وقت فکر کے لحاظ سے یونان و روم کا پورا فلسفہ سو بار قربان اور وجد آفرینی اور کیف آوری کے لحاظ سے شعراء کے دواوین اور ادب کی بیاضیں ہزار بار تیار۔ مکتوبات مجددی کے تذکرہ کے آخر میں سنت و بدعت کے بارے میں جو مجددانہ

کلمات و تحقیقات قلم سے نکلی ہیں، ان سے بڑا شرح صدر اور یقین کا اضافہ ہوا، نیز دور اکبری و جہانگیری میں دین کی نصرت و حمایت سے سلسلہ کے مکتوبات نے دینی حمیت و محبت کو بیدار کیا اور افسردہ قلب و جسم میں دین کی حرارت پیدا کی، انسانی تصانیف اور تحریروں میں جن پر زمانہ سرد چکا ہے، کم چیزوں میں ایسی زندگی اور قلب کی حرارت دیکھی جتنی ان دونوں حضرات سے مکتوبات میں پائی جن میں صدیاں گزر چکی ہیں، مگر وہی زندگی اور تاثیر موجود ہے جو موماں لکھنے کے وقت ہوتی ہے۔

میر کے محترم دوست اور دینی کاموں میں رفیق کار مولانا محمد منظور صاحب نعمانی نے "الفرقان" کا شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کا ارادہ یا تمنا اس باب سے اس وقت سے بھی فائدہ کی کہ اس میں حصہ لے۔ میں نے "شاہ ولی اللہ بحیثیت مصنف" کا عنوان اپنے لئے منتخب کیا۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ شاہ صاحب کی تصنیفات پر ایک نظر ڈالی جائے۔ کچھ پہلے دیکھی تھیں، کچھ نہیں دیکھی تھیں۔ اس سلسلہ میں "ازالۃ الخفاء" کی بالاستیعاب پڑھنے کی نوبت آئی۔ یہ اپنی نکتہ آفرینی کا دوسرا نمونہ تھا۔ انسانی تصنیفات میں کم کتابوں سے اتنا متاثر ہوا ہوں گا، جتنا مکتوبات اور "ازالۃ الخفاء" سے، علم کا چشمہ ابتدا نظر آتا ہے، آدمی ایک نکتہ کا لطف نہیں لینے پاتا کہ دوسرا نکتہ سامنے آجاتا ہے، اور دوسرے سے فارغ نہیں ہونے پاتا کہ تیسرا نکتہ سامنے آجاتا ہے۔ آیات کی تفسیر و تطبیق میں اور خلافت کے خصائص، نیز دینی انحطاط و تغیر کی تدریجی تاریخ کی تدوین میں جو کچھ لکھا ہے وہ علمی پختگی کی ساتھ کیا لطف و لطافت میں ادب و شاعری سے کم ہے؟

"حجتہ اللہ البالغہ" میں نے مولانا عبید اللہ صاحب سندھی نے تلمیذ رشید اور پنجاب کے مشہور عالم و مصلح حضرت مولانا احمد علی لاہور سے پڑھی تھی اور دماغ پر اس کی عقلیت، محکوم استدلال اور شاہ صاحب کی باریک بینی کا اثر اسی سے قائم ہوا۔ "حجتہ اللہ البالغہ" سے علمی و اصولی مباحث اور متکلمانہ و فلسفہ آمیز دینی کتابوں کے سمجھنے کی استعداد پیدا ہوئی، اور اس حیثیت سے اس نے بڑا احسان کیا۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ پچھلی صدیوں کی کسی شخصیت سے ذہن اتنا متاثر اور اس کی تحقیقات سے اتنا متفق نہیں، جتنا شاہ ولی اللہ صاحب اور ان کی کتابوں سے۔ اگر اپنے فکر و مسلک کے لئے کسی مکتب خیال کا تعین ضروری ہے، تو میں انہیں کا نام لے سکتا ہوں، اور

در حقیقت ہمارا تعلیمی و فکری نسب و شجرہ انہیں پر قائم ہوتا ہے۔

شاہ صاحب کے نامور پوتے شاہ محمد اسماعیل صاحب شہیدی عقیدت خاندانی ورثہ سے، لیکن ان کی شہرہ آفاق اور مسلم ذکاوت اور بنور علم کا اندازہ صرف ”منصب امامت“ سے ہوا، جو اس موضوع پر میرے محدود علم میں اپنی طرز کی منفرد تصنیف ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب کی مختصر تصنیف ”الغور البیہ فی اصول الشیہ“ (پس گو میں شاہ صاحب کی قلمی بیاض کہتا ہوں) کے بعض علمی اشاروں اور مختصر ناموں نے قرآن مجید کے مطالعہ و تفسیر میں بڑی رہنمائی کی، اور شاہ صاحب کے بعض مختصر جملوں، اور تھوڑے لفظوں سے پورے پورے مضامین کے راستے، اور مطالعہ قرآن میں ذہن کی بہت سی گرہیں کھل گئیں۔

حضرت سید احمد شہید کے ملفوظات کے مجموعہ ”صراط مستقیم“ (مرتبہ مولانا اسماعیل شہید، مولانا عبدالحی) کو بہت دیر میں دیکھا، مگر تصوف کے اچھے ذخیلے اور ائمہ تصوف کے ملفوظات، خصوصاً حضرات چشت کے پورے سلسلہ ملفوظات کے مطالعہ کے بعد دیکھا اور معلوم ہوا کہ تصوف کے لٹریچر میں یہ بالکل ایک انقلابی کتاب ہے، سلوک راہ نبوت اور تقرب بالفرانص کے موضوع کے علاوہ جس کے سید صاحب امام تھے، اور جو اس عصر کے لئے تزکیہ نفس اور قرب الی اللہ کی سب سے آسان، بے خطر اور وسیع شاہراہ ہے، طریقت و حقیقت اور سلوک و تربیت کے متعلق جو نکتے اور حقائق لکھے ہیں، وہ خدا داد ذکاوت، علوم نبوت سے فطری مناسبت، اعلیٰ روحانیت اور دقت نظر کی دلیل ہیں، اہل ظاہر اور اہل معرفت کے مختلف فیہ مسائل میں جو محاکمہ کیا ہے، اور جو فیصلہ کن باتیں کہی ہیں، وہ ان کی اعلیٰ سلامت طبع، دماغی توازن و اعتدال اور میانہ روی کی شاہد ہیں۔ کاش! اس کتاب کی شایان شان خدمت ہوتی اور نئے طرز پر مرتب کر کے پیش کی جاتی۔

ان کتابوں کا ایک فیض یہ تھا کہ علوم نبوت سے وحشت اور اجنبیت جو وضعی اور صناعی علوم، اور تصنیفات سے پیدا ہو جاتی ہیں، دور ہوئی۔ اس کی بری بھلی تمیز پیدا ہوئی کہ علمی اصطلاحات اور زمانہ کی زبان کے بغیر بھی علوم و حقائق ادا کئے جاسکتے ہیں، اور کتابوں کے راستہ کے علاوہ کچھ اور بھی راستے ہیں، جن سے وہ علوم آتے ہیں جو کتابوں کے صفحات میں مقید نہیں کئے جاسکتے۔ ایسا بھی ممکن ہے کہ مغز ہو اور چھلکے نہ ہوں، معانی ہوں اور زیادہ الفاظ نہ ہوں، متن

ہو اور حواشی نہ ہوں۔

اس مصر کے عارف مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلوی (م ۱۳۶۳ھ/ ۱۹۴۴ء) سے ملا، ان کی باتیں اور ان کے معارف سمجھنے میں نسبتاً سہولت ہوئی۔ حسن الفاظ اور حسن ادا کا خیال زمانہ کی زبان اور علمی اصطلاحات کی تلاش مقصود کے سمجھنے میں حجاب نہ بن سکی۔ میں نے ایک موقع پر عرض کیا کہ اگر میں نے حضرت سید احمد شہید کے حالات نہ لکھے ہوتے، اور حضرت مجدد الف ثانی کے مکتوبات نہ پڑھے ہوتے تو مجھے آپ کی باتوں سے بڑی وحشت ہوتی، مولانا نے اس کو پسند فرمایا، اور دوسروں سے نقل کیا۔

میرے قرآن مجید کے مطالعہ میں مولانا احمد علی صاحب کی مجلس درس کا فیض اور برکت شامل ہے۔ درسی و متداول اور نغض فیہ متداول ضخیم تفسیریں، لغض لفظ بہ لفظ دیکھیں، ٹیلن اصل فائدہ متن قرآن کے سادہ اور بار بار پڑھنے سے ہوا۔ اس سلسلہ میں اس کا اظہار ضروری ہے کہ قرآن مجید سے اپنا حصہ لینے میں ضروری علمی و لسانی واقفیت کے بعد دو چیزیں سب سے زیادہ مفید ثابت ہوتی ہیں، ایک علوم نبوت و مزاج نبوت سے مناسبت رکھنے والے اشخاص کی صحبت جن کی معاشرت و زندگی کان خلقہ القرآن کا پرتو ہو، اور جنہوں نے انا للقرآن الناطق (حضرت علی کا مقولہ) کہنے والے کی قلبی و ذوقی وراثت میں حصہ پایا ہو۔ ان حضرات کے علوم کی تازگی و شگفتگی، بے آمیزی اور نکھار اور علم کی وسعت و گہرائی سے قرآن مجید کے الفاظ کی وسعت و عمق کا ایک قیاسی اندازہ ہوتا ہے۔ کئی الفاظ جو ”لسان العرب“ اور ”مفردات غریب القرآن“ سے اور کئی آیات جو زخشری کی ادبی تفسیر ”کشاف“، امام رازی کی عقلی تفسیر ”فتوح الغیب“ اور ابن کثیر کی نقلی تفسیر سے حل نہیں ہوتیں، وہاں باتوں باتوں میں حل ہو جاتی ہیں۔ الفاظ و معانی میں نئی وسعت اور قوت نظر آتی ہے جو پہلے نظر سے اوجھل تھی۔

دوسری چیز یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام جن راستوں پر چلے، ان پر چلنے سے قرآن مجید کھلتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی جو کیفیات بیان کی گئی ہیں، ان کا احساس ہوتا ہے۔ قوموں نے اپنے پیغمبروں کو جو جواب دیئے ہیں، کان وہی آوازیں سنتے ہیں، اور آنکھیں وہی منظر دیکھتی ہیں۔ جواشکالات اور شبہات علم کلام کی کتابوں نے، اور کتابی مطالعہ نے فرضی طریقہ پر پیدا کر دیئے ہیں، وہ وہاں بے حقیقت ہو جاتے ہیں۔ قرآن مجید کے سمجھنے کے یہ دو طبعی طریقے ہیں۔

سنا ہے کہ جب قرآن مجید میں آدمی کا جی لگنے لگتا ہے، تو انسانی تصنیفات سے جی
 اٹھرانے لگتا ہے۔ انسانی کتابیں، انسانی تحریریں، انسانی تقریریں پست اور بے مغز معلوم
 ہونے لگتی ہیں، ادباء اور حکماء اور مفکرین کی باتیں طفولانہ اور عامیانہ نظر آتی ہیں۔ جن میں کوئی
 کبرانی اور چمکتی نہیں معلوم ہوتی۔ عقیدہ کاغذ پر چھپے ہوئے سیاہ نقیشتوں کا رنگ بے چہول معلوم
 ہوتے ہیں، جن کا رنگ بے خوشبو نہیں۔ انسان کا علم اٹھلا اور خالی معلوم ہونے لگتا ہے، اور اس کا
 دیر تک پڑھنا ذوق اور روح پر بار ہوتا ہے۔ ہر وہ چیز جو علوم نبوت کے سرچشمہ سے نہ آئی ہو،
 مشتملہ اور الفاظ کا طلسم معلوم ہوتی ہے۔ تسکین صرف وہی نبوت کے راستے سے آئے ہوئے علم
 سے ہوتی ہے۔ جس کو رسول اللہ ﷺ نے دنیا تک پہنچایا اور جو وحی کی زبان میں قرآن مجید
 میں، اور عربی زبان میں حدیث میں محفوظ ہے۔

داویم ترا از منزل مقصود نشان

گر منانہ رسیدیم شاید تو رسی

☆ ☆ ☆

(مولانا علی میاں ۶ اکتوبر ۱۹۷۷ء کو خدا بخش اور فیمل پبلک انٹرنیٹ پبلیکیشنز شریف لے
 گئے جہاں انہوں نے ”خدا بخش سالانہ خطبہ“ پیش کیا۔ ”علم دائم کے رابطہ کی ضرورت و
 افادیت“ کے موضوع پر خطبے کے آخر میں انہوں نے اپنے مطالعے کا ذکر کیا۔ یہی آخری حصہ
 پیش خدمت ہے۔ مولانا علی میاں نے اس میں اپنی علمی و مطالعاتی زندگی کی بعض محسن کتابوں کا
 تذکرہ دہرانے کے ساتھ مزید اضافے کئے ہیں۔ مرتب)

میں بجائے اس کے کہ ان کتابوں کا ذکر کروں جس سے معلومات حاصل ہوئی ہیں
 اور جن کا ممنون احسان ہوں اور جس کی وجہ سے محدود صلاحیت ہی تھی، لیکن اس درجہ کی
 صلاحیت پیدا ہوئی کہ لکھ پڑھ سکتا ہوں، عربی میں بھی اور اردو میں بھی، ان کے بجائے ان
 کتابوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے گہرا اثر ڈالا اور ایک انقلاب انگیزی کا کام کیا، لوگوں
 نے ایسی کتابیں تو لکھی ہیں، جن میں کتابوں کی فہرست آگئی ہے کہ کیا کیا پڑھا، لیکن ضرورت
 تھی کہ ان کتابوں کے نام لئے جاتے، اور اچھے پڑھنے لکھنے والے دانشوران کتابوں کا ذکر
 کرتے جن کتابوں کے مطالعہ سے ان میں انقلاب پیدا ہوا۔

میں ان چند کتابوں کا ذکر کرتا ہوں جنہوں نے میرے محدود رقبہ علم میں، رقبہ عمل میں اور رقبہ خیالات میں، میرے دائرہ فکر و انتخاب پر یہ کیا۔ شاید بعض لوگوں کو چھتیاں پیدا ہوں گی۔ ان پر ہنسے، ان کے دیکھنے کا، ورنہ کتابیں اپنی تعداد کے لحاظ سے، صفحات کے لحاظ سے، اپنی ضخامت کے لحاظ سے ناقابل شمار ہیں۔

سب سے پہلے ”مسدس حالی“ کا اثر پڑا۔ ”مسدس حالی“ میں حضور ﷺ کے بارے میں

جو لکھا گیا

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی بر لائے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا
وہ اپنے پرانے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا، ضعیفوں کا ماوی
یتیموں کا والی، غلاموں کا مولی

اس کے بعد صحابہ کرام کی تعریف بھی انہوں نے بڑے دلکش و دل نشیں انداز میں کی ہے۔ میرا خاندان ایک علمی خاندان تھا، میرے والد محترم مولانا حکیم عبدالحی صاحب ہندوستان کے پییدہ ترین اور عظیم ترین مصنفین میں تھے جنہوں نے ایک کتاب آٹھ جلدوں میں ”نزہۃ الخواطر“ کے نام سے لکھی۔ جس میں ساڑھے چار ہزار شخصیتوں کا حال ہے، اور یہ بتا دوں کہ جتنی کتابیں لکھی گئیں، وہ ایک ایک صدی پر لکھی گئیں، ان کے نام بھی میں لیا کرتا ہوں۔

بڑے بڑے فضلاء عرب اور بڑے بڑے مورخین اور سوانح نگاروں نے ایک ایک صدی کا انتخاب کیا، لیکن ایک ایسی کتاب جو پہلی صدی سے لے کر آخری صدی تک کے لوگوں کا حال بیان کر دے، وہ خود بلاد عربیہ میں نہیں لکھی گئی، چنانچہ خود ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب مرحوم نے جو صدر جمہوریہ تھے، فرمایا کہ جب میں مصر کے دورہ پر گیا تو صرف آپ کے والد صاحب کی کتاب ”نزہۃ الخواطر“ لے گیا اور میں نے ڈیسک پر رکھ دی، جب کوئی مصری اسکالر آتا یا کوئی اخبار کا بڑا نمائندہ یا کسی جامعہ کا پروفیسر، وہ کہتا کہ کیا ہندوستان میں علم ہے؟ ہندوستان میں لوگ عربی جانتے ہیں؟ ہندوستان میں کوئی بڑا کام ہوا؟ کوئی بڑی خدمت

ہوئی؟ میں کہتا یہ کتاب دیکھ لیجئے۔ مصر بھی ایسی کتاب نہیں پیش کر سکتا، اور میں بتاتا ہوں عالم عربی کے ایک سیاح کی حیثیت سے بھی اور وہاں کی جامعات میں جانے والے اور وہاں خطاب کرنے والے کی حیثیت سے بھی کہ ایک کتاب بھی عالم عربی میں ایسی نہیں ملتی جو پہلی صدی سے چودہویں صدی پر محیط ہو، یا تو ایک صدی پر کتابیں ہیں یا پھر ایک ایک فن پر ہیں، مثلاً کوئی کتاب صرف ونحو پر ہے، کوئی شاعر پر ہے، کوئی طب پر ہے، لیکن انہوں نے ہندوستان کی تاریخ لکھی، پہلی صدی جب سے یہاں عرب آئے اور اسلام آیا، اس وقت سے لے کر اپنی وفات تک کے کارناموں کا اس میں ذکر ہے۔

دوسری کتاب لکھی جوان کا بڑا کارنامہ ہے اور ہندوستان کے لئے ایک شاہکار چیز ہے، وہ ہے ہندوستان کے علماء کی تصنیفات کی ڈائریکٹری۔ پہلی صدی سے لے کر اس وقت تک کسی فن میں بھی کسی عالم نے کوئی کتاب لکھی ہے تو اس میں اس کا ذکر ہے۔ پوری ڈائریکٹری ہندوستان کی تیرہ سو برس چودہ سو برس کی جس میں سینکڑوں کتابوں کے نام ہیں، اس فن میں یہ کتاب ہے، اس کی یہ خصوصیت ہے۔ عالم عربی کی سب سے بڑی اکیڈمی، دمشق کی ”المجمع العلمی العربی“ جس کا نام تھا، اب ”مجمع اللغة العربیة“ ہو گیا ہے، اس نے اس کو شائع کیا، دو ایڈیشن وہاں سے شائع ہوئے ہیں، ہندوستان میں اس کا ترجمہ ہوا اور ”اسلامی علوم و فنون ہندوستان میں“ کے نام سے دارالمصنفین کی طرف سے شائع ہوا جو سب سے مقتدر ادارہ ہے۔ عام طور پر ہوا یہی ہے کہ لوگوں نے پورا احاطہ نہیں کیا، اب اس کی ضرورت ہے کہ ایسی کتابیں لکھی جائیں جن میں ان کتابوں کا تذکرہ ہو جو منفرد ہیں، ان کی مثال عالم اسلام اور عالم عربی میں نہیں ملتی اور ایسی بہت سی چیزیں ہیں، پھر اس کے بعد ضرورت ہے کہ جن چیزوں سے متاثر ہوئے اور انقلاب ہوا، ان کا بھی ذکر ہونا چاہئے۔

تو سب سے پہلے جو مجھے یاد ہے میری زندگی پر اثر ”مسدس حالی“ کا پڑا، انہوں نے صحابہ کرامؓ کا جہاں تذکرہ کیا ہے، پھر اسلام کی خدمت اور اس کی انقلاب انگیزی کا جہاں ذکر کیا ہے، اس کا بڑا حصہ زبانی یاد تھا، اس زمانہ میں مسلمانوں کے اکثر گھروں میں ”مسدس حالی“ پڑھی جاتی تھی، اس کے بہت سے شعر خواتین، بچیوں اور لڑکیوں کی زبان پر بھی تھے۔

اس کے بعد پھر جس کتاب کا اثر پڑا، وہ ہمارے خاندان کے ایک بزرگ سید عبدالرزاق

صاحب کلامی کی کتاب ”صمصام الاسلام“ ہے۔ حضرت سید احمد شہید کم سے کم پٹنہ اور اس کے اطراف میں ضرور معروف ہیں اور محترم شخصیت ہیں، صادق پوران کا پیرو تھا اور اس نے ہندوستان کی آزادی میں انگریزوں کے مقابلہ میں وہ کردار ادا کیا جو (میں ایک تاریخ داں کی حیثیت سے بھی اور ایک محب وطن کی حیثیت سے بھی کہتا ہوں) ہندوستان میں شاید کسی علاقہ نے اتنا بڑا حق ادا نہیں کیا۔ سید عبدالرزاق صاحب کلامی سید احمد شہید کے نواسہ ہوتے تھے اور میرے والد صاحب کے حقیقی پھوپھا تھے، انہوں نے ”صمصام الاسلام“ کے نام سے پچیس ہزار اشعار میں واقدی کی فتوح الشام کو منتقل کیا، وہ شاعرانہ حیثیت سے بھی بڑے بلند کلام ہیں۔ اس کتاب میں پچیس ہزار اشعار ہیں، خاندان میں یہ رواج تھا کہ جب کوئی حادثہ پیش آتا، کوئی غمی ہو جاتی تھی تو اس کے اثر کم کرنے کے لئے مستورات جمع ہوتی تھیں اور ”صمصام الاسلام“ پڑھی جاتی تھی۔ مجھے یاد ہے میں اس میں شریک ہوتا تھا، اپنی کم سنی کے باوجود، کیونکہ میری خالہ صاحبہ یا میری ہمشیرہ وغیرہ پڑھتی تھیں تو حالت یہ ہوتی تھی کہ آنسوؤں کی جھڑیاں لگ جاتی تھیں اور چہروں کا رنگ بدل جاتا تھا، اور بالکل معلوم ہوتا تھا کہ اپنا غم بھول گیا ہے اور کسی کی شہادت کا ذکر آتا (خاص طور سے خواتین کی شہادت اور قربانیوں کا ذکر آتا) تو اپنا غم بھول جاتی تھیں، یہ بہت اچھا رواج تھا، اس وقت اس حادثہ کا اثر کم ہو جاتا تھا اور کسی کا کوئی وعظ یا تلقین یا کوئی کتاب اتنی موثر نہیں ہوتی تھی جتنی کہ ”صمصام الاسلام“ ہوتی تھی۔

پھر ”صمصام الاسلام“ کے بعد مجھے جس چیز نے متاثر کیا، وہ اکبر الہ آبادی مرحوم کا کلام ہے۔ ملک میں مغربی تہذیب کا دور آیا اور میں چونکہ لکھنؤ شہر کا رہنے والا ہوں جو تحریک خلافت اور تحریک آزادی کا بڑا مرکز ہے، لیکن اس وقت انگریزی تہذیب کا اور انگریزی دانش کا، مغربی ثقافت کا اتنا اثر تھا کہ کوئی شخص اس سے بچا نہیں تھا، اس کے لئے اتنی بات کافی ہے کہ اس وقت ایک لفظ چلا ہوا تھا ”ولایت“، اس سے آپ سمجھ جائیے کہ یہ کس ذہن کی غمازی کرتا ہے، جب کسی چیز کی بڑائی بیان کرنا چاہتے تھے تو کہتے تھے، یہ ولایت سے آئی ہے، میں ولایت سے آیا ہوں، اس وقت دو چیزیں میرے بڑے کام آئیں، ایک اکبر الہ آبادی کا کلام، اس نے اس ظلم کو توڑا اور اس کی اصل کمزوریوں کو دکھایا اور وہ کام کیا جو بڑے بڑے دانش کدوں نے بڑی بڑی علمی، دقیق اور عمیق اور بلند مرتبہ کتابوں نے کیا ہوگا۔ ان کا کلام جب پھیلا تو ان سے

مغربی تہذیب کا تسلط، اس کی sovereignty کم ہوئی، ان کے چند شعر پڑھتا ہوں، جن سے آپ سمجھ جائیں گے کہ کتنی بڑی حقیقت بیان کی ہے، وہ کہتے ہیں:

لکھے گا کلک حسرت دنیا کی ہسٹری میں
اندھیر ہو رہا تھا بجلی کی روشنی میں

☆☆☆

علوم مغربی کے بحر میں غوطہ لگانے سے
زباں گو صاف ہو جاتی ہے دل طاہر نہ ہوتا

☆☆☆

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

اکبر الہ آبادی کا بہت اثر ہوا، ایک اعتراف بالحق کے طور پر یہ بھی کہہ دوں کہ مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی کا رسالہ ”سچ“ (جو بعد میں ”صدق“ کے نام سے نکلنے لگا) اکبر الہ آبادی کا بھی بڑا ترجمان تھا، میں جب تک رائے (بریلی) میں رہتا تھا، وہاں بھی ”سچ“ کا پرچہ آتا تھا، پھر وہ ”صدق“ کے نام سے نکلنے لگا اور میرا مولانا سے ذاتی تعلق اور رابطہ قائم ہوا۔ اس وقت لاہور سے ”زمیندار“ آتا تھا جس میں مولانا ظفر علی خاں کی نظمیں شائع ہوتی تھیں، وہ نظمیں ایسی زلزلہ انگیز ہوتی تھیں اور جذبات پر ایسی اثر انداز (زبان کے لحاظ سے بھی اور زور بیان کے لحاظ سے بھی) کہ اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔

اس کے بعد اقبال کے کلام نے دل و دماغ کو متاثر کیا، یہ عرض کر دوں کہ اقبال کے کلام میں ”بانگ درا“ نے اتنا مجھ پر اثر نہیں ڈالا، اس وقت تو یہ چیز رائج تھی، اور آپ کو معلوم ہے اقبال کا کلام وقت کے فاصلہ سے شائع ہوتا رہتا تھا، مثلاً ابھی ”بانگ درا“ آئی ہے، پھر ”ضرب کلیم“ آئی ہے، ”بال جبریل“ آئی ہے اور دوسری کتابیں، لیکن مجھ پر سب سے زیادہ اثر ”بال جبریل“ کا پڑا ہے، ان کے اشعار پڑھتا تھا اور لطف لیتا تھا، پھر خدا نے ایسی توفیق دی کہ میں

نے ان کا عالم عربی سے تعارف کرایا، میں جب مصر گیا ۱۹۵۱ء میں تو میں نے دیکھا کہ مصر میں بہت زیادہ غیر ممتاز شخصیتوں پر لکھا گیا ہے اور لوگ ان سے واقف ہیں، میں وہاں کے چوٹی کے لکھنے والوں سے ملا، جن میں ڈاکٹر احمد امین، عباس محمود العقاد، احمد حسن الزیات اور سید قطب وغیرہ تھے، لیکن میں نے دیکھا کہ سارا مصر اقبال سے نا آشنا ہے اور عالم عربی بھی نا آشنا ہے، تو میں نے وہاں سے آنے کے بعد اس کا بیڑا اٹھایا، ہمت کی کہ میں اقبال کو عربی میں پیش کروں، چنانچہ پہلے میں نے مضامین کی شکل میں یہ کام کیا، پھر پوری کتاب ”روائع اقبال“ کے نام سے لکھی اور مصر ہی نہیں، عالم عربی میں پہلی مرتبہ ان کا تعارف ہوا اور مجھے حیرت ہوئی کہ بعض عرب ادیبوں، دانشوروں کو اس کے صفحے کے صفحے یاد ہیں، مجھے خوب یاد ہے کہ امیر حسن نے جو اردن کے ولی ہیں، وہاں ”موسسہ اہل البیت“ کے نام سے ایک اکیڈمی ہے، میں اس کا ممبر ہوں، انہوں نے ایک ڈنر کا انتظام کیا، اپنی طرف سے اعزاز کا، اس وقت میں تھا اور میرے بھانجے مولوی سید محمد واضح حسنی ندوی اور مفتی خلیلی صاحب تھے جو مسقط کے بہت بڑے عالم، بڑے مفتی ہیں تو مجھے حیرت ہوئی کہ انہوں نے ”روائع اقبال“ کے صفحے کے صفحے زبانی سنانا شروع کر دیئے اور پھر اس کے بعد وہاں بہت سے لوگوں کو اس سے بڑی دلچسپی ہوئی اور اس کتاب کا بڑا اثر پڑا اور اقبال سے لوگوں کا تعارف ہوا اور انہیں حیرت ہوئی کہ ایسے شاعر سے ہم ناواقف تھے جو اسلام کا صحیح ترجمان ہے اور اس نے طاقت کا پیغام، خود اعتمادی کا پیغام اور انقلاب انگیزی کا پیغام جواب تک کسی شاعر نے نہیں دیا تھا، دنیا نے اسلام کو دیا۔

پھر اس کے بعد سب سے زیادہ جس کا اثر مجھ پر پڑا، وہ سید احمد شہید کی تحریک کا تھا، وہ ہمارے گھر کی چیز تھی، خاندان کی چیز تھی، لیکن اس کا تذکرہ بہت کم ہو گیا تھا، کہیں کہیں مجلسوں میں اس کا تذکرہ ہوتا تھا، لیکن اسی زمانہ میں مولوی محی الدین صاحب قصوری نے جو مولانا آزاد کے خاص لوگوں میں تھے، امرتسر کے ایک پرچہ ”توحید“ میں جو مولانا داؤد صاحب غزنوی کی ادارت میں نکلتا تھا ”عصر حاضر کا عظیم مجاہد سید احمد شہید“ کے نام سے مقالہ لکھا، میرے بڑے بھائی ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب نے کہا کہ تم اس کا ترجمہ عربی میں کرو، اس وقت میری عمر ۱۶-۱۷ سال تھی، میں نے اس کا ترجمہ عربی میں کیا، اسی زمانہ میں عالم عربی کے بہت بڑے محقق ادیب اور نقاد استاد علامہ تقی الدین الہمالی مراکش، جن کا حال یہ تھا کہ جب دو بڑے

ادیبوں میں جو بڑے کہنے مشق نامور لکھنے والوں میں تھے، کسی لفظ کے بارے میں اختلاف ہوتا تھا کہ لفظ صحیح ہے یا نہیں تو ان کی طرف رجوع کرتے تھے، چنانچہ امیر البیان امیر شکیب الارسلان جو ”حاضر العالم اسلامی“ کی چار جلدوں کے مصنف ہیں اور علامہ سید رشید رضا میں جو شیخ محمد عبدہ کے شاگرد ہیں اور وہ جمال الدین افغانی کے شاگرد و ترجمان تھے، جب ان کا آپس میں اختلاف ہوتا تھا تو ان کی طرف رجوع کرتے تھے، اور وہ جو فیصلہ کرتے تھے مان لیا جاتا تھا، اس کے شواہد موجود ہیں۔ امیر شکیب ارسلان کی خود نوشت کتاب ”السید رشید رضا او احوالہ بعین سہ“ میں لکھا ہے، کہیں لفظ میں ہمارا اختلاف ہوا، ہم نے شیخ تقی الدین کی طرف رجوع کیا، انہوں نے یہ فیصلہ کیا، وہ لکھنؤ آئے تھے اور ندوۃ العلماء میں اس کو تعلیم کا عہدہ دیا جائے والا تھا۔ انہوں نے جو یہ مضمون دیکھا تو کہا کہ اگر تم کہو تو اسے علامہ سید رشید رضا کے پاس مصر بھیج دوں، اب خیال کیجئے، ۱۶-۱۷ سال کا نوجوان، اس کا مضمون علامہ سید رشید رضا جو شیخ محمد عبدہ کے شاگرد ارشد ہیں، وہ ”المنار“ نکالتے تھے، انہوں نے اس مضمون کو رسالہ میں شائع کیا اور اس کے بعد انہوں نے لکھا کہ اگر مضمون نگار چاہیں تو ہم اس کو الگ رسالہ کی شکل میں بھی شائع کر سکتے ہیں، تو خدا کا شکر ادا کرنے کے سلسلہ میں کہتا ہوں کہ شاید ہندوستان میں بلاد جمیہ میں کم ایسا ہوا ہو کہ ۱۶-۱۷ سال کے نوجوانوں کی کتاب مصر میں شائع ہوئی ہو اور مستند سمجھی گئی ہو، چنانچہ ”ترجمۃ الامام السید احمد بن عرفان الشہید“ کے نام سے وہ رسالہ وہاں شائع ہوا اور پھر ہندوستان میں بھی پھیلا۔

مجھ پر سب سے زیادہ جس کا اثر پڑا وہ حضرت سید احمد شہید کے واقعات تھے، میں بلا کسی مبالغہ کے اور بغیر کسی خود ستائی کے کہتا ہوں کہ کچھ خاندانی تعلق بھی ہے کہ جب ان کے حالات پڑھتا تھا، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ایک گوشہ میں (جس زمانہ میں وہاں بجلی بھی نہیں آئی تھی چراغ جلا کر، لائٹن جلا کر میں کتاب پڑھتا تھا) ”وقائع احمدی“، جو ان کے حالات میں لکھی گئی ہے یا دوسری کتاب ”منظورۃ السعداء“ جو فارسی میں ہے مولانا سید جعفر علی صاحب بستوی کی، وہ جب پڑھتا تھا تو ایک دم سے مجھے معلوم ہوتا تھا کہ رحمت کی کوئی گھٹا آگئی ہے اور دعا کرنے کا وقت ہے اور آنسو جاری ہو جاتے اور دعا کرتا، ویسا اثر میں نے سیرت نبوی ﷺ کے بعد کسی چیز میں نہیں دیکھا، مجھ پر سب سے زیادہ اثر پڑا ہے سید احمد شہید کا اور پھر اس کے بعد اس کے نتیجے

میں، میں نے ”سیرت سید احمد شہید“ لکھی، پہلے ایک جلد تھی، اس پر علامہ سید سلیمان ندوی نے مقدمہ لکھا، بڑا طاقتور مقدمہ ہے، پھر دو جلدوں میں، میں نے کتاب لکھی اور اس وقت تک بحمد اللہ ۶، ایڈیشن نکل چکے ہوں گے اور پاکستان، ہندوستان میں بہت پھیلی، پھر اس کے بعد چودھری غلام رسول صاحب مہر (جو ایک بہت بڑے صحافی اور جرنلسٹ تھے) کہتے تھے کہ میں تیرہ چودہ سال سے یہی کام کر رہا ہوں اور کوئی دن ایسا نہیں گزرا کہ میں نے دو رکعت نماز پڑھ کر دعا نہ کی ہو، انہوں نے کتاب لکھی ”سیرت سید احمد شہید“ چار جلدوں میں، ان کی کتاب کافی مقبول ہوئی۔ اس کتاب نے ہزاروں انسانوں پر اثر ڈالا، ان کے عقائد میں بھی اصلاح ہوئی، ان کے جذبات میں بھی ایمانی طاقت پیدا ہوئی جو بہت کم چیزوں سے پیدا ہوتی ہے۔

ابھی تک بہت کم لوگوں نے اس پر کوئی کتاب لکھی ہے کہ کس کتاب نے ان کی زندگی میں انقلاب برپا کر دیا، اگر کسی کتاب کا ذکر آتا ہے تو وہ ”مثنوی مولانا روم“ ہے۔ خود اقبال مرحوم اس سے بڑے متاثر ہیں، وہ کہتے ہیں:

پیر رومی مرشدِ روشن ضمیر
کاروانِ عشق و مستی را امیر

اور اردو میں کہتے ہیں:

صحبتِ پیر روم سے مجھ پہ ہوا یہ رازِ فاش
لاکھ حکیم سرِ بجیب، ایک کلیم سرِ بکف

مولانا روم کے کلام کا بہت سے آدمیوں کے ذہنوں پر بڑا اثر پڑا ہے، مگر ان لوگوں نے تحریری شکل میں کوئی شہادت نہیں دی، لیکن اگر پوچھا جائے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ پورے اس برصغیر میں اور پھر ایران میں سینکڑوں، ہزاروں کی تعداد میں لوگ اس سے متاثر ہوئے ہیں، یہ تو عربی، فارسی، اردو کا ذکر کیا گیا۔

میں نے جب مغربی تہذیب کی تنقید کے مطالعہ کا ارادہ کیا، میرے بڑے بھائی صاحب نے جو بڑے مبصر تھے، مجھے انگریزی بھی پڑھوائی تھی، جہاں تک تاریخ، اخلاقیات اور دین کا تعلق ہے، اس میں، میں نے مسلمانوں کے انحطاط، مسلمانوں کے مسند قیادت سے دست کش ہو جانے یا پیچھے ہو جانے سے دنیا کو کیا نقصان پہنچا، اس کا بھی میں نے بالکل ایک

تاریخی، غیر جانبدارانہ، ایک مبصرانہ اور ناقدانہ تبصرہ کیا جو عربی زبان میں ”ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین“ کے نام سے چھپا، جس کا اردو ترجمہ ”انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر“ کے نام سے شائع ہوا۔ عالم عربی میں میری جو کتاب سب سے زیادہ پڑھی گئی اور مقبول ہوئی، وہ یہی کتاب ”ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین“ تھی، اس کے تقریباً پچیس ایڈیشن نکل چکے ہیں، قاہرہ اور دمشق اور کویت میں اور مختلف جگہوں پر اور اردو میں جس کے ترجمے بار بار شائع ہوئے ہیں، بعض ادیبوں نے اس کا ذکر کیا کہ جب مجھے کوئی زوردار چیز لکھنی پڑتی ہے اور خیال ہوتا ہے کہ تحریر میں جوش ہو تو پہلے ”ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین“ کے چند صفحے پڑھ لیتا ہوں، پھر قلم اٹھاتا ہوں، یہ استاد انور الجندی کا مقولہ ہے جو اس وقت مصر کے اچھے نامور کاتب ہیں، تو اس وقت مجھے اس بات کی ضرورت ہوئی کہ غیر جانبدارانہ طریقہ پر اور غیر جذباتی طریقہ پر میں مغربی تہذیب کی کمزوریوں کو سمجھوں اور کیا اس کا Donation ہے، اس نے کیا دنیا کو عطا کیا اور کیا نقصان پہنچایا، اخلاقیات کے پہلو سے، دینیات کے پہلو سے، انسانیت کے پہلو سے، تو میں نے اس وقت انگریزی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا، اس میں مجھے سب سے زیادہ جن کتابوں سے فائدہ ہوا ان میں **Coflict between Religion- and Science** ہے، یہ ڈراپر کی کتاب ہے، اسے میں نے غور سے پڑھا اور اس کے نوٹس لئے، اس میں (مصنف نے) بتایا کہ کلیسا اور دربار کی جو جنگ ہوئی، جو کشمکش اور تقابل ہوا، اس سے کیا فائدہ پہنچا، کیا نقصان پہنچا اور اس نے کیا اثرات ڈالے، مغرب معاشرہ، مغربی ذہن پر۔ پھر کتاب **History of European Morals** پڑھی، اس سے مجھے معلوم ہوا کہ یونان کا کیا اثر پڑا ہے یورپ پر، یونان نے کیا دیا اور اس میں کیا افراط و تفریط تھی، ان کے دو بہت بڑے **Schools of thought** تھے، ایک جسے رواقی کہتے ہیں اور ایک لذتی، بس جس میں آدمی کو مزا آئے وہی چیز لینا چاہئے، اسی کو اختیار کرنا چاہئے، یہ لذتی مکتب خیال ہے، مگر رواقی مکتب خیال ہے کہ نہیں، عقل سے کام لینا چاہئے۔ اس کتاب میں اس نے ثابت کیا ہے کہ لذتی اسکول نے یورپ پر زیادہ اثر ڈالا ہے، اس وقت یورپ فلسفہ لذتیت کا کار بند نہیں، بلکہ پابند ہے۔

امام ابن تیمیہ کی کتاب میں نے پہلے پڑھی تھی، اس لئے بہت چیزوں کی مجھے تصدیق

ہوئی، انہوں نے ایک بڑے کام کی بات کہی ہے، انہوں نے کہا ہے کہ ایک چیز ہے ”نفی“ اور ایک ہے ”اثبات“۔ امام ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ یونان کی ایک بڑی کمزوری یہ تھی کہ ان کے یہاں نفی زیادہ ہے، اثبات کم ہے، حالانکہ سارا عمل، جوش عمل، طاقت اور انرجی سارے ذہنی و اعصابی محرکات، اعصابیت پیدا ہوتی ہے اثبات سے نفی سے پیدا نہیں ہوتی، قرآن کیا کہتا ہے ”لیس کمثلہ شئی“ ”وہو السميع البصیر“ اللہ تعالیٰ کی طرح کوئی چیز نہیں ہے اور وہ سمیع و بصیر ہے، لیکن جب اس کی صفت بیان کرتا ہے تو کہتا ہے هو الخالق الباری المصور له الاسماء الحسنی یسبح له مافی السموات والارض وهو العزیز الحکیم۔ اور پھر اس سے پہلے کی جو آیتیں ہیں ۵-۱۰ صفتیں بیان کی ہیں کہ اللہ یہ ہے، اللہ یہ ہے اور ان صفتوں کا تعلق انسانی زندگی سے بھی ہے اور کائنات سے بھی ہے، اس سے آدمی میں ایک جذبہ عمل پیدا ہوتا ہے، جذبہ دعا پیدا ہوتا ہے، جذبہ عبادت بھی پیدا ہوتا ہے، ایک اطمینان اور سکون قلب پیدا ہوتا ہے کہ میں جس خدا کا پرستار ہوں، وہ بڑا رحمان و رحیم ہے، وہ بڑا حکیم و بصیر ہے، وہ خالق ہے کائنات کا اور قادر ہے ہر چیز پر۔

پھر جس سے فائدہ پہنچا، وہ گبن کی مشہور کتاب ہے Decline and Fall of the Roman Empire اس سے معلوم ہوا کہ رومۃ الکبریٰ کی سلطنت سے کیا غلطیاں ہوئیں، کیا اس میں ناہمواریاں پیش آئیں اور اس میں ضعف کے سرچشمے کیا تھے، کیوں اتنی بڑی رومۃ الکبریٰ جو دنیا کی سب سے بڑی شہنشاہی تھی، اس کو زوال ہوا، اور پھر اس کتاب Makin of Humanity پڑھی، اس میں انسانیت کی تعمیر اور تخریب کی تاریخ پر بحث کی گئی۔ آخر میں یہ عرض کرتا ہوں کہ اس وقت ضرورت اس کی ہے کہ لوگ ان کتابوں کی طرف توجہ کریں اور ان پر خامہ فرسائی کریں، جنہوں نے ان کے اندر انقلاب (پیدا) کیا اور کس طرح سے انقلاب (پیدا) کیا؟ اور پھر ایسی منتخب اور مفید کتابوں کے پڑھنے کا مشورہ دیں۔

(ماہنامہ ”سیارہ“ (لاہور) نے مختلف ارباب علم و ادب سے ان کے ذوق مطالعہ، تصنیف و تالیف اور ذہنی نشو و ارتقاء کے حوالے سے ایک مفصل سوال نامے کے جواب حاصل کئے تھے، ذیل میں سوالنامہ، اور مولانا علی میاں کا جواب ماہنامہ مذکور کی اشاعت بابت ستمبر ۱۹۶۵ء سے نقل کیا جاتا ہے۔ مرتب (۱)

سوالنامہ

- ۱۔ آپ کے اندر ذوق مطالعہ کب نمایاں طور پر متحرک ہوا؟ آغاز کیسے ہوا؟ اس کا نشوونما کس طرح ہوا؟ کیسا ذہنی ماحول اس میں آپ کیلئے ممد ہوا؟ نظام تربیت کا اثر کہاں تک ہوا؟ کون سی شخصیتیں تھیں جنہوں نے آپ کے ذوق مطالعہ کو ہمیز کیا اور اس سفر میں رہنمائی؟ آپ کے مطالعہ کے مختلف دور؟ ذوق میں ارتقائی تبدیلیاں؟
- ۲۔ آپ کے پسندیدہ موضوعات مطالعہ کیا رہے؟
- ۳۔ آپ اردو کے علاوہ اور کن زبانوں میں مطالعہ کرتے ہیں (انگریزی؟ عربی؟ فارسی؟ بنگلہ؟ ہندی؟ پنجابی؟ سندھی؟ پشتو؟ بلوچی، دیگر زبانیں؟)
- ۴۔ اردو اور انگریزی کا تقابلاً سامنے رکھ کر فرمائیے کہ دونوں میں کس زبان میں آپ کا مطالعہ زیادہ وسیع ہے؟
- ۵۔ آپ کے پسندیدہ مصنفین؟ آپ کے پسندیدہ کتابیں؟ آپ کے پسندیدہ رسائل؟ پسندیدہ شعراء؟ پسندیدہ افسانہ نگار؟ پسندیدہ مزاح نویس اور طنز نگار؟
- ۶۔ آپ اپنی دنیا کے مطالعہ میں کسی ایک مصنف کو بلند ترین مقام پر رکھتے ہیں جس کا آپ کی ذہنی نشوونما پر سب سے زیادہ اثر پڑا ہو؟ (خصوصاً اردو لکھنے والوں سے)
- ۷۔ آپ کی نگاہ میں وہ بہترین کتاب یا تحریر جس نے آپ پر بہت زیادہ اثر ڈالا ہو؟ (خصوصاً اردو زبان میں)

(۱) حیات و افکار کے چند پہلو۔ مؤلفہ جناب سفیر اختر صاحب

- ۸۔ ایسے دو چار مقالات، نظموں یا افسانوں کا ذکر جن سے آپ کی فکری یا عملی زندگی متاثر ہوئی ہو؟
- ۹۔ اردو رسائل کے اب تک جتنے خاص نمبر آپ کی نظر سے گزرے ہیں۔ آپ کو ان میں سے بہت زیادہ پسند کون سے رہے؟ خصوصاً اگر کسی ایک کو بہترین قرار دے سکیں تو اور بھی اچھا ہے۔
- ۱۰۔ یہ بھی فرمائیے کہ مطالعہ میں آپ کی پسند کے بالمقابل آپ کی ”ناپسند“ کیا ہے؟ کن چیزوں کے مطالعہ سے آپ کی طبیعت آبا کرتی ہے؟ آپ کوئی ایسی نگارش بتائیں جس سے آپ کو نفرت محسوس ہوئی ہو؟
- ۱۱۔ بالعموم آپ کے مطالعہ کے اوقات کیا ہوتے ہیں؟ پروگرام کس طرح چلتا ہے؟ مطالعہ کی نشست کس طرح کی آپ کو پسند ہے؟ رفتار مطالعہ کیا ہوتی ہے؟
- ۱۲۔ تنہائی اور خاموشی آپ کے مطالعہ کے لئے ضروری ہے یا آپ ہجوم اور شور و شغب میں بھی پڑھ لیتے ہیں؟
- ۱۳۔ سفر میں آپ نے مطالعہ کا کیا تجربہ کیا؟
- ۱۴۔ کیا مطالعہ کے دوران آپ کتاب پر نشانات لگاتے ہیں؟ کیا آپ الگ نوٹ یا خلاصہ لکھتے ہیں؟
- ۱۵۔ آپ کا حافظہ آپ کی وسعت مطالعہ کا ساتھ کہاں تک دیتا ہے؟ کیا آپ کو پڑھی ہوئی کتابوں اور مضامین کے مطالب اور ان کے مصنفین کے نام پوری طرح یاد رہتے ہیں؟
- ۱۶۔ آپ اپنے مطالعہ، حاصل مطالعہ اور ذوق مطالعہ میں کیا اپنے گھر کے لوگوں، خصوصاً بچوں کو۔ (اگر وہ ہوں) بھی حصہ دار بناتے ہیں؟ بچوں کی تربیت ذوق کیلئے آپ کے تجربات کیا ہیں؟
- ۱۷۔ کیا آپ کی ذاتی لائبریری ہے؟ اس کا حدود و اربعہ کیا ہے؟ اس میں اہم ترین کتابیں کون سی ہیں؟ خاص خاص کتابوں کو حاصل کرنے کیلئے اگر آپ کو کوئی خاص معرکہ سر کرنا پڑا ہو تو درج فرمائیے۔ نمایاں شخصیتوں کی طرف سے ہدیہ میں آئی

ہوئی کتابیں؟

۱۸۔ کتابیں مستعار دینے اور لینے کے متعلق آپ کے تجربات کیا ہیں اور اس معاملے

میں نظریہ و مسلک کیا ہے؟ کیا کچھ واقعات ایسے ہیں کہ بعض اہم کتابوں سے آپ ہاتھ دھو بیٹھے ہوں؟

۱۹۔ آپ ایک اوسط درجہ کے عام تعلیم یافتہ آدمی کو مشورہ دیں کہ وہ موجودہ مصروف زندگی میں مطالعہ کا پروگرام کیسے بنائے اور کتابیں کیسے فراہم کرے؟

۲۰۔ خاص طور پر ادبی مطالعہ کی ضرورت و اہمیت کیا ہے؟ عام آدمی کے لئے؟ طلبہ کے لئے؟

۲۱۔ ادبی مطالعہ کیلئے نوجوانوں کو آپ کیا رہنمائی دیتے ہیں کہ وہ کن مصنفین اور کتابوں کو لازماً پڑھیں؟ نیز آپ اردو کے ایسے موجودہ رسائل کی نشاندہی کریں جن کا مطالعہ صحت مند فکر کی نشوونما میں مدد ہو۔

۲۲۔ کیا آپ کسی بہتر اور موثر اسلوب سے لوگوں کو یہ بتا سکتے ہیں کہ صرف تفریحی مطالعہ کافی نہیں، اس کے ساتھ علمی، ادبی اور معلومات چیزوں کا مطالعہ ضروری ہے اور پروگرام میں توازن ہونا چاہئے؟

۲۳۔ ڈائجسٹوں کا جو دور ہمارے یہاں شروع ہوا ہے، اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ ایک رائے یہ ہے کہ اس طرز کے رسائل انگریزی رسائل کی جگہ لے کر اردو کے حق میں مفید پارٹ ادا کر رہے ہیں۔ دوسری رائے یہ ہے کہ یہ ادبی مطالعہ کے راستے میں حائل ہو رہے ہیں۔

۲۴۔ آپ کے سامنے ایک مسلمان معاشرہ ہے اور یہ واضح ہے کہ نوجوانوں کی بڑی بنیادی ضرورت ہے کہ وہ اسلام کے انقلاب آفریں نظریہ حیات، اس کے ضابطہ و نظام، اس کے تہذیب و تمدن اور اس کی شاندار تاریخ کو جانیں، اس سلسلے میں آپ کیا مشورہ دیتے ہیں؟ کن مصنفین اور کن کتابوں کی طرف رہنمائی دیتے ہیں؟

۲۵۔ کچھ لوگوں کی رائے میں قرآن ناظرہ پڑھنے کے بجائے سمجھ کر پڑھنا چاہئے، طوطے کی طرح رٹنے کا کیا فائدہ؟ آپ کی رائے اس بارے میں کیا ہے؟

جواب

اس وقت اس حال میں یہاں (نہیں) ہوں کہ دماغ پر زیادہ زور ڈال سکوں یا کوئی مضمون پوری توجہ سے لکھوا سکوں، زیادہ وقت بستر پر پڑے ہوئے گزرتا ہے۔ اس وقت اتفاقاً آپ کے سوال نامے کا کاغذ نکل آیا اور ایک عزیز نے پڑھ کر سنایا۔ سوالات بڑی ذہانت سے مرتبہ کیے گئے ہیں اور طبیعت کو اکساتے ہیں۔ دل میں ان کے جواب دینے کی تحریک پیدا ہوئی، طبیعت کے مشورہ کو جو پاسبان عقل ہے، ذرا ہٹا کر دل کو تنہا چھوڑ دینے پر عمل کرنے کو جی چاہا۔ آپ نے انتخاب کی آزادی دے دی ہے، اس لئے ہلکے پھلکے سوالات کا جواب دے دیتا ہوں وہ بھی مختصر۔

نمبر ۱۔ قدیم شرفاء اور علماء کے دستور کے مطابق اور بعض خاص اسباب کی بناء پر اس سے کچھ زیادہ ہمارے گھر میں وسیع موروثی کتب خانہ تھا۔ دادا صاحب اور والد صاحب رحمۃ اللہ علیہم (حکیم سید فخر الدین مصنف ”مہر جہاں تاب“ اور سید عبدالحی مصنف ”گل رعنا“ و ”نزہۃ الخواطر“) دونوں بڑے مصنف تھے۔ یہ کتب خانہ کئی ہزار کتابوں پر مشتمل تھا جن میں عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں کی کتابیں تھیں۔ میرے بڑے بھائی صاحب (ڈاکٹر حکیم مولوی سید عبدالعلی صاحب مرحوم) بڑے اچھے مرہبی و ماہر نفسیات تھے، انہوں نے کتابوں سے مانوس کرنے کیلئے اور اس موروثی دولت کی قدر کرنے کیلئے کتابوں کو دھوپ دکھانے اور ان کی حفاظت و پرداخت کے کام میں پہلے شریک کیا، پھر اس کی ذمہ داری ڈالی۔ پرانی کہاوت ”کونکوں کی دلالی میں ہاتھ کالے“ کے مطابق پہلے کتاب و مصنف کا نام پڑھنے، پھر اس کو کہیں کہیں سے دیکھنے اور مطالعہ کرنے کا شوق پیدا ہوا، اور اس سے کتاب بینی کا جو بہت حد تک موروثی اور فطری تھی، چسکا پڑ گیا اور یہ شوق لت اور بیماری کی حد تک پہنچ گیا۔

نمبر ۲۔ میرے لئے سب سے زیادہ ذوقی اور تفریحی موضوع جس میں کبھی طبیعت پر بار نہیں پڑتا اور جس سے سیری نہیں ہوتی، تذکرے، تراجم اور سوانح حیات کا موضوع ہے، غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ دادا صاحب اور والد صاحب بڑے

مورخ اور سوانح نگار تھے، اور ان کی زندگی کا بڑا حصہ اس مشغلے میں صرف ہوا۔ اس کے بعد دوسرے درجہ میں ادبیات، خاص طور پر وہ ادبی کتابیں جن میں تکلف، آورد اور ضائع و بدائع نہ ہوں، لیکن نظم سے زیادہ نثر کی کتابیں پڑھنے کا ذوق ہے، اور وہ عربی اردو دونوں میں یکساں ہے۔

نمبر ۳۔ سب سے زیادہ عربی میں، دوسری نمبر پر اردو اور بضرورت انگریزی میں مطالعہ کا اتفاق ہوتا ہے۔ جب سے نظر کمزور ہوئی، انگریزی کا مطالعہ برائے نام رہ گیا۔

نمبر ۴۔ ۵۔ پسندیدہ مصنفین، پسندیدہ تصانیف اور مضامین کے متعلق میرے مضمون ”میری محسن کتابوں“ میں خاصا مواد آ گیا ہے۔ مزاحیہ لکھنے والوں میں مجھے پرانے لکھنے والے مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی سب سے زیادہ پسند ہیں، پطرس کے بعض اور پروفیسر رشید احمد صدیقی کے وہ مضامین جن میں زیادہ علمیت اور تفلسف نہیں ہے، پسند آتے ہیں، نیز ان کے مضامین کے مجموعوں میں سے ”گنج ہائے گراں مایہ“ بہت کامیاب اور دل آویز ہے۔

طنز نگار میں مولانا عبدالمجید دریابادی خاص مرتبہ رکھتے ہیں۔ خاص طور پر جہاں زیادہ تلخی اور تیزی نہیں ہوتی۔ یہ احتیاط مولانا آزاد کے یہاں زیادہ ہے اور ان کے ادب کے وہ حصے اگرچہ کم ہیں، لیکن (ہیں) بہت لطیف اور سبک۔

نمبر ۶۔ یہ کہہ سکتا ہوں کہ چوں کہ ابتداء میں ندوۃ العلماء کی تحریک سے تعلق رکھنے والوں کی تصنیفات اور تحریریں زیادہ پڑھیں، اس لئے ان کا اثر زیادہ ہے۔ اردو انشاء اور نثر نگاری میں شاید سب سے زیادہ اور اولین اثر خود اپنے والد صاحب کا پڑا، خصوصاً ان کی کتاب ”یادایام“ اور ”گل رعنا“ کا۔ دوسرے نمبر پر مولانا شبلی کا۔

نمبر ۷۔ ۸۔ کے جوابات بھی میرے مذکورہ بالا مضمون سے مل سکتے ہیں۔

نمبر ۹۔ اردو رسائل کے خاص نمبر نہ تو بہت زیادہ دیکھے اور نہ اس وقت ذہن میں محفوظ ہیں، لیکن اپنے ذوق اور حالات کے لحاظ سے ”الفرقان“ کا ”مجدد نمبر“ اور ”شاہ ولی اللہ نمبر“ زیادہ دلچسپی سے پڑھے۔

نمبر ۱۰۔ وہ کتابیں جن کا پڑھنا بڑا مجاہدہ ہے اور شدید ضرورت کے بغیر ان کے چند صفحات

کا پڑھنا بھی میرے لیے دشوار ہے، وہ تین طرح کی چیزیں ہیں۔ ایک مناظرہ اور تردید کی کتابیں، دوسرے خشک فلسفیانہ مباحث یا وحدۃ الوجود وغیرہ اور فلسفہ اخلاق کی متصوفانہ کتابیں، تیسرے قادیانی لٹریچر جو حسن انشاء، حلاوت تحریر اور عمق فکر سے یکسر خالی ہے۔

نمبر ۱۱۔ چوں کہ میری تحریر و تصنیف کا وقت صبح کو نماز فجر اور چائے کے بعد سے لے کر موسم گرما میں اس وقت تک کہ گرمی شدید نہ ہو اور موسم سرما میں ظہر کے وقت تک محدود ہے۔

اس کے علاوہ سالہا سال سے کسی دوسرے وقت میں تصنیفی کام نہیں کیا کرتا، اس لئے پڑھنے کا وقت ظہر سے عصر تک اور مسافروں میں تقریباً دن بھر (کھانے اور آرام کرنے کے علاوہ)۔ رات کا پڑھنا نظر کی کمزوری کی وجہ سے تقریباً بیس پچیس سال سے بالکل بند ہے، سوائے اس زمانہ کے جس میں دارالعلوم کے اندر حدیث کا کوئی درس اپنے ذمے لے لیتا تھا، اس کے لیے بہت مطالعہ کی ضرورت ہوتی تھی۔ لکھنے کا کام نہیں ہوتا یا لکھنے کیلئے مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے تو فجر و ظہر کے درمیان کا وقت بھی مطالعہ ہی میں صرف ہو جاتا ہے۔

میں میز کرسی پر یا ڈسک پر لکھنے کا کبھی عادی نہیں رہا۔ عام طور پر اس طرح لکھتا ہوں جس طرح آپ نے کاپی نویسوں کو لکھتے دیکھا ہوگا۔

رفتار مطالعہ عام طور پر سست ہے، طبیعت روا روی کے ساتھ پڑھنے پر قانع نہیں ہوتی، لیکن اس کا زیادہ انحصار موضوع اور مضمون کی نوعیت پر ہے، ادبی اور تاریخی چیزیں تیز رفتاری سے پڑھتا ہوں اور علمی مباحث آہستہ رفتاری اور دقت نظر کے ساتھ۔

نمبر ۱۲۔ عام طور پر شور و غلبہ اور لوگوں کی موجودگی سے میرے مطالعہ میں بعض اوقات لکھنے میں بھی کوئی خلل نہیں پڑتا اور شاید بعض لوگوں کیلئے یہ بات موجب تعجب ہو کہ بعض اوقات اس سے مدد ملتی ہے میں اپنے بعض اہم مضامین اور کتابیں تھڑکلا اس کے مسافروں سے بھرے ہوئے ٹرین کے ڈبے میں لکھی ہیں جب

طبعیت میں روانی پیدا ہو جاتی ہے اور اپنے اندر لکھنے کا تقاضا اور مضامین و خیالات کی چونٹیاں رینگتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں تو شور و ہنگامہ اس میں مغل نہیں ہوتا لیکن جب ایسی کیفیت نہ ہو اور طبعی بند و کند معلوم ہوتی ہو تو تنہائی اور خاموشی کی تلاش ہوتی ہے۔

نمبر ۱۳- جب سے زمانہ قیام اور حضر کی مشغولیتیں اور ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں کسی نئی کتاب کے مطالعہ کا زیادہ تر موقع سفر ہی میں ملتا ہے جو بکثرت پیش آتے ہیں اور اس لحاظ سے سفر میں بڑے مفید ثابت ہوتے ہیں صد ہا صفحات کی کتابیں اکثر سفر میں ہی ختم ہوتی ہیں۔

نمبر ۱۴- کتابوں پر نشان لگانے کی عادت بہت پرانی ہے اور میں نے اپنے استاد اور بزرگ مولانا طلحہ صاحب ایم اے سابق استاد اور نیشنل کالج لاہور سے سیکھی ہے لیکن نشان بڑی احتیاط سے سرخ پنسل سے لگاتا ہوں اگر گاڑی کی رفتار زیادہ تیز ہوتی ہے تو اس کے ٹھہرنے کا انتظار کرتا ہوں تاکہ نشان کتاب میں بدنمائی پیدا نہ کرے۔ خاشیے میں اپنی رائے بہت خوش خط لکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ بعض اوقات ناواقف ایسے خواشی چھپے ہوئے نظر آتی ہیں ان نشانوں اور حواشی سے کتاب کے دوبارہ پڑھنے میں مدد ملتی ہے۔ اور اس کے بہترین حصے تصویر کی طرح سامنے آ جاتی ہیں۔

نمبر ۱۵- میرا حافظہ خاندانی طور پر کمزور ہے لیکن اپنے ذوقی مضامین میں حافظہ زیادہ رفاقت اور رواداری کا ثبوت دیتا ہے، غیر ذوقی مضامین میں سے بہت کم میرے خیال میں حافظہ کا کچھ تعلق ذوق پسندیدگی سے بھی ہے۔

نمبر ۱۶- اپنی پسندیدہ چیزوں میں ہم نشینوں اور عزیزوں کو شریک کرنا ایک فطری امر ہے اور شاید یہ میرے اندر بہت سے لوگوں سے بڑھی ہوئی ہوگی، مجھے اپنے بزرگوں کی اس عادت سے خود بھی فائدہ پہنچا اور میں سمجھتا ہوں کہ میرے عزیزوں اور اہل مجلس کے لئے بھی یہ بات اسی قدر مفید ہوگی۔

نمبر ۱۷- ہم دونوں بھائیوں کو ایک بڑا وسیع اور متنوع کتب خانہ وارثت میں ملا جو کئی

پشتوں اور ایک علمی خاندان کا اندوختہ اور ترکہ ہے۔ لیکن اسکی موجودگی میں بھی اپنے ذوق و ضرورت کی کتابیں خریدنے کا شوق بچپن سے ہے۔ اور اس سلسلے میں بچپن کے واقعات کسی حد تک مضحک اور کسی حد تک سبق آموز ہیں۔ اس شوق کا آغاز اس عمر سے ہو گیا جس عمر میں عام طور پر بچوں کو کھلونوں اور مٹھائیوں کے خریدنے کا شوق ہوا کرتا ہے۔ ذوق اور نقاہت کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ اس شوق میں بھی اصلاح و ترقی ہوتی گئی چنانچہ خود اپنی خریدی ہوئی اور مصروف شام سے منگوائی ہوئی کتابوں کا ایک ذخیرہ جمع ہو گیا ہے جو اگرچہ زیادہ وسیع نہیں ہے مگر منتخب ہے۔ اس میں زیادہ تر وہ کتابیں ہیں جن کی حیثیت کسی موضوع پر چھوٹے سے دائرۃ المعارف (انسائیکلو پیڈیا) جو اپنے موضوع پر خود ایک چھوٹے سے کتب خانے کا کام دیتی ہے۔ چوں کہ شروع سے عربی ادب اور انشاء کا ذوق ہے اس لئے ان میں وہ کتابیں بھی شامل ہیں جن کی کوئی علمی و فکری اہمیت نہیں ہے مثلاً اغانی کا خلاصہ اور ادباء کے مضامین کے مجموعے۔ اس منتخب ذخیرے میں ”دیوان غالب“، مثنوی، کی کلید ”مرآۃ المثنوی“، کلام اقبال اور ”گلستان بوستان بھی ہے۔

بعض دفعہ مصروف شام کی کسی نئی چھپی ہوئی کتاب کے حصول کیلئے اپنے عزیزوں اور دوستوں کو لکھنا پڑتا ہے۔ بعض اوقات ایک کتاب جس کی قیمت آٹھ دس روپے سے زائد نہیں، کسی تصنیف کے سلسلے میں ہوائی ڈاک سے منگوائی جاتی ہے اور وہ پچاس ساٹھ روپے میں پڑی ہے۔

اسلامی فکر عربی مصنفین اکثر اپنی تصنیفات ازراہ کرم ہدیہ بھیجتے ہیں اکثر سفروں میں علمی ہدایا اور مصنفین کی دستخطوں سے مزید ہو کر ملے ہیں جو اس ذاتی کتب خانہ کی زینت ہیں۔

نمبر ۱۸۔ کتابیں مستعار دینے میں بڑے تلخ تجربے ہوئے ہیں اس سلسلے میں اچھے اچھے اہل علم کی بے احتیاطی مشہور و معروف ہے بعض مرتبہ مستعار لینے والے اپنی ذمہ داری محسوس نہیں کرتے اور مستعار دینے والا بھول جاتا ہے کہ کتاب کس کو دی

تھی، میرے ساتھ یہ المیہ بہت پیش آیا ہے اس سے کمتر المیہ یہ ہے کہ مستعار لینے والا کتاب بے احتیاطی کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ کتاب پر دھبے اور نشان پڑ جاتے ہیں اور بعض اوقات ستم ظریف اس پر اپنے حواشی اور تاثرات ثبت کر دیتے ہیں اور کتاب جی سے اتر جاتی ہے، مجھے دو مرتبہ ایک کتاب سے اس لئے دستبردار ہونا پڑا کہ اس پر دھبے پڑ گئے تھے۔ یا حواشی نے اس کی رونق و روحنائی ختم کر دی تھی۔ اس سلسلے میں یہ بھی عرض کر دوں کہ میں شروع سے کتاب کے بارے میں کچھ زیادہ نفاست پسند اور ذکی الحس واقع ہواں ہوں کتاب پر پسینے کے دھبے یا کسی پڑھنے والے کا حاشیہ ارائی مجھے کتاب کے مطالعہ سے محروم کر دیتی ہے۔ اور بعض اوقات مستعار لینے والے ہی کو نذر کر دیتا ہوں کہ اب میرے کام کی نہیں رہی۔

نمبر ۱۹- میرے نزدیک ابتدا میں ادبی مطالعہ کی اہمیت بہت ہے خوش قسمتی سے جن لوگوں کو ابتدا میں اچھی ادبی کتابوں کے مطالعہ کا موقع مل جاتا ہے۔ اور ان کا ادبی ذوق کسی حد تک بن جاتا ہے۔ یا ان کے اندر ادبیت کے جراثیم پیدا ہو جاتے ہیں۔ وہ خواہ فلسفہ کا موضوع اختیار کریں یا دینیات کا میدان۔ ان کی تحریر میں شگفتگی اور شیرینی باقی رہتی ہے۔ اور وہ زیادہ کامیاب مصنف ثابت ہوتے ہیں میرے نزدیک ہر مرحلے میں کسی نہ کسی قدر ادبی مطالعے کا عنصر شامل رہنا چاہئے۔

نمبر ۲۰-۲۱- ادبی مطالعہ اور تحریروں کی مشق کیلئے اس وقت نوجوان کو مولانا شبلیؒ مولانا حالیؒ، مولانا سلیمان ندویؒ، مولانا آزادؒ، مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ، مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ، ڈاکٹر سید عابد حسینؒ، چوہدری غلام رسول مہرؒ، مولانا شاہ معین الدین ندویؒ کی کتابوں کی تحریروں کو ضروری دیکھنا چاہئے۔ اس سے زیادہ ادبی ذوق اور زبان کی واقفیت پیدا کرنے کا شوق ہو تو پھر کچھ تحدید نہیں۔ مولوی محمد حسین آزادؒ، ڈپٹی نذیر احمد اور خالص ادیبوں کو بھی پڑھنا ہوگا۔ یہ نام تحریر کی پختگی، شگفتگی اور زبان کی صحت کے لحاظ سے پیش کئے گئے ہیں۔ کسی مخصوص خیالا

وافکار یہاں بحث نہیں ہے یہاں بحث نہیں۔

نمبر ۲۲۔ محض تفریحی ادب کے مطالعہ سے ذہن میں سطحیت، علم اور فکر میں بے مغزی اور معلومات میں تہی مائیگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور ایسا آدمی کوئی وقیع اور موثر کام نہیں کر سکتا۔ تفریحی ادب کا وہی حصہ ہونا چاہئے جو نمکیات و فواکہ کا ہوتا ہے۔ اور بعض اوقات اس سے کہیں زیادہ فلسفیانہ اور فکر انگیز مباحث کا مطالعہ بھی ذہن میں تحریک پیدا کرتا ہے۔ اور اس کا کچھ نہ کچھ حصہ بھی شامل رہنا چاہئے۔

نمبر ۲۳۔ اردو ڈائجسٹوں کا سلسلہ مفید اور ہمت افزائی کا مستحق ہے لیکن اس میں مزید محنت اور حسن انتخاب کی ضرورت ہے۔ اردو کی اشاعت و ترقی کیلئے یہ سلسلہ یقیناً مفید ثابت ہوتا۔ ان میں اگر ادبی عنصر کا اضافہ اور ادبی شخصیات اور کلاسیکل ادب کے تعارف کا سلسلہ بھی شروع کر دیا جاتا ہے۔ اور وہ شوق انگیز اور مطالعہ کے لئے مہمیز ہو تو اس سے یہ خطرہ بھی باقی نہیں رہے گا۔ کہ لوگ قدیم مستند ادب سے بے تعلق ہو جائیں گے۔

نمبر ۲۴۔ اس سلسلہ میں دارالمصنفین، ندوۃ المصنفین اسلام پبلی کیشنز اقبال اکیڈمی، شاہ ولی اللہ اکیڈمی، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام جیسے اداروں کی مطبوعات کا مطالعہ مفید ہوگا۔ اس سلسلہ میں تواضع اور انکسار کو برطرف رکھ کر ”تاریخ دعوت و عزیمت“ کے سلسلے کے مطالعہ کا مشورہ بھی دوں گا۔

نمبر ۲۵۔ میرے نزدیک ابتدا میں ناظرہ قرآن مجید پڑھنا بہت ضروری ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض ماہرین تعلیم کی رائے کے مطابق تھوڑی سی اردو پڑھا کر قرآن شریف کا پڑھنا زیادہ بہتر ہوگا۔ عام دستور کے مطابق قرآن مجید ہی سے ابتدا کرنا زیادہ بہتر ہے۔ بہر حال مجھے اس رائے سے بالکل اتفاق نہیں ہے کہ سمجھ کر قرآن مجید کی استعداد پیدا ہونے کے انتظار میں ناظرہ پڑھانے کو بالکل موقوف رکھا جائے۔ ناظرہ قرآن شریف پڑھنا اور محض تلاوت خود ایک بڑھی عبادت اور ایک امر مقصود ہے۔ سمجھ کر پڑھنا یہ ایک الگ کام اور ضرورت ہے ان میں سے کوئی ایک دوسرے سے مستغنی نہیں ہے۔

مولانا فضل محمد (م ۱۹۸۱ء) مہتمم مدرسہ قاسم العلوم فقیر والی، ضلع بہاول نگر دینی تعلیم کے مروجہ نصاب میں ترمیم کرتے ہوئے اپنے مدرسے کے لئے ایک نیا نصاب مرتب کرنا چاہتے تھے، اس سلسلے میں انہوں نے تقسیم ہند سے کچھ پہلے مشاہیر وقت کو ایک سوالنامہ ارسال کر کے ان کی رائے طلب کی تھی، مولانا علی میاں نے مختصر اپنی رائے کا اظہار خط کی صورت میں کیا، خط سے پہلے مرسلہ سوالنامے پر ایک نظر ڈال لینا مناسب ہوگا۔ مرتب (۱)

سوال نامہ

- سوال نمبر 1- ”علوم مقصودہ“ تفسیر حدیث فقہ میں کون کون سی کتابیں رکھی جائیں جن سے کم از کم وقت میں اچھا اور زیادہ کام لیا جاسکے۔
- 2- ترجمہ قرآن شریف کے بعد تفسیر میں ”جلالین“ کے علاوہ کوئی دوسری معتدل تفسیر بھی تجویز کی جائے ”تفسیر مظہری“ یا ”تفسیر جوہری طنطاوی“ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟
- ”دورۂ حدیث“ سے پہلے حدیث مشکوٰۃ شریف کے علاوہ ایسی اور کیا کتاب رکھی جائے جو حذف مکررات کے بعد صحاح ستہ کو حاوی ہو۔ جمع الفوائد اور تیسرا اصول کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ فقہ کی مجوزہ کتب میں فتویٰ نویسی کی رعایت سے بھی کتاب ضروری رکھی جائے۔
- 3- اصول تفسیر، اصول حدیث ”الفوز الکبیر“ ”نخبۃ الفکر“ کے علاوہ اور کیا کتاب رکھی جائے خیر الاصول اور مولانا عبدالحق دہلوی کے رسالہ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔
- 4- ”علوم آلیہ“ ادب، کلام، معانی، مناظرہ، فلسفہ، ہیئت میراث، صرف، نحو، میں کیا کیا کتابیں رکھی جائیں۔ جو بقدر ضرورت استعداد کو حاوی ہوں نیز وقت میں بحیثیت انفرادی ”علوم مقصودہ“ سے زائد نہ ہو۔ طریق مطالعہ و تعلیم کی وضاحت کی جائے۔ درستی اخلاق و صالح باطنی و ظاہری کا لحاظ بھی ضروری رکھا جائے۔
- 5- فلسفہ جدید، منطق جدید، سائنس جدید علم کلام، تاریخ، اخلاقیات، معاشیات، سیاسیات، علم النفسیات وغیرہ علوم عصریہ بھی آپ کے نزدیک قابل اضافہ ہیں یا نہیں؟ اگر ہیں تو

کون کون سی ہیں اور کس حد تک کتابیں کیا کیا رکھی جائیں۔ طریق تعلیم و مطالعہ کیا ہوں حضرت شاہ ولی اللہ وغیرہ اکابر کی کتابوں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ مناظرہ کے بارے میں موجودہ ضروریات مثلاً مزائیت، خاکساریت، بدعات و رسومات کی تردید و معلومات کیلئے مناسب کتب کی تجویز کی ضرورت ہے؟

6- فرضی مناظروں اور تقریروں کے بجائے اگر طلبہ کو عملی طور پر تبلیغ میں شرکت کا موقع دیا جائے۔ جس سے قوم کے صحیح امراض، احساسات و رجحانات کے اندازہ کا موقع بھی ملتا رہے گا اور دکھی ہوئی رگوں پر صحیح نشتر زنی مشتق بھی تدریجاً بہم پہنچتی رہے گی۔ گویا طلبہ کیلئے علمی قسم کی ٹریننگ ہوگی۔ اس میں آپ کی کیا رائے ہے؟

7- ابتدائی تعلیم کیلئے نمبر وار ہدایات کی ضرورت ہے۔

☆ داخلہ کیلئے معیار عمر اوسطاً کیا رکھا جائے اور مدت تعلیم کتنی ہو

☆ اس کے علاوہ کسی دوسری چیز کو بھی معیار قرار دیا جائے یا بلا تخصیص سب کو ایک طرف داخل کر لیا جائے۔

☆ دینیات کی تعلیم کا قدیم مروجہ طریقہ زیادہ مفید ہے کہ مثلاً اول قرآن مجید کی تعلیم مکمل کر لی جائے بعد ازاں اردو، فارسی، وغیرہ شروع کرائی جائے یا جدید مخلوط طریقہ تعلیم زیادہ بہتر ہے مثلاً دینیات، اردو، فارسی قرشن شریف سب کے الگ الگ گھنٹے مقرر کر دیئے جائیں۔ سب مضامین ایک ہی معلم کے متعلق ہوں۔ یا مختلف اساتذہ کے پاس ہونے چاہئیں۔ پہلی قدیم صورت میں وقت زیادہ صرف ہوتا ہے اور ثانی جدید صورت کے متعلقہ مضامین ناقص اور نامکمل رہ جاتے ہیں۔ آپ کے نزدیک اس کے ازالہ کی کیا صورت ہے۔

☆ قرآن شریف، مناظرہ، حفظ، اردو، حساب، جغرافیہ وغیرہ کے مضامین کی مدت تعلیم کیا رکھی جائے۔

☆ اور ان کا نصاب کیا مقرر کیا جائے۔

☆ معلم کے اوصاف ضروریہ کی تشریح فرمائی جائے۔

☆ جسمانی تربیت کیلئے کیا طریقہ تجویز کیا جائے۔ اور ورزش کے لئے کون کون سے کھیل رکھے جائیں۔

حضرت مولانا فضل محمد نور اللہ مرقدہ متوفی ۱۹۸۱ء سابق مہتمم مدرسہ قاسم العلوم فقیر والی، ضلع بہاول نگر نے دینی تعلیم کے مروجہ نصاب تعلیم میں ترمیم کرتے ہوئے اپنے مدرسے کے لئے ایک نیا نصاب تعلیم مرتب کرنے کے سلسلے میں جو خط مولانا علی میاں کو ارسال کیا تھا، جس میں انہوں نے مولانا علی میاں سے ان کی رائے طلب کی تھی تو مولانا علی میاں نے مختصر اپنی رائے کا اظہار اس خط کے ذریعے فرمایا تھا۔

دائرہ حضرت شاہ علم اللہ نقشبندی

رائے بریلی (ہندوستان)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مکرم و محترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

گرامی نامہ شرف صدور لایا۔ آپ کے مدرسہ اور آپ کی مساعی سے اجمالاً واقفیت تھی جن مقاصد و خصوصیات کے ساتھ آپ کو مدرسہ چلانا چاہئے۔ وہ وقت کی اہم ضرورت ہے مگر افسوس ہے کہ حضرات علما ہی اس میں سب سے زیادہ بے اعتنائی برت رہے ہیں۔ جس کی وجہ سے مجھے شدید خطرہ ہے۔ کہ مستقبل میں ہندوستان میں دینی تعلیم باقی رہ بھی سکے گی یا نہیں۔ میں نے رسالہ ”الفرقان“ اور ”الندوہ“ مرحوم میں ”اسلام کے قلعے“ کی عنوان سے ماتحت اپنے خیالات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اگر کہیں سے آپ کو یہ پرچے مل سکیں تو ضرور ملاحظہ فرمائیں۔

آپ نے جو سوالات قائم ہیں ان کی جوابات کچھ تفصیل اور وقت چاہتے ہیں۔ اگر اس کا انتظار کیا جائے۔ تو معلوم نہیں کب اس کی نوبت آئے۔ اس لئے مختصراً عرض کر دیتا ہوں نیز بلا تکلف ہر سوال کے جواب کی بھی اہلیت نہیں رکھتا۔ جو میرا موضوع نہیں اور اس سلسلے میں میری کوئی نظر اور علمی تجربہ نہیں، اس کو اصحاب نظر پر محمول کروں گا۔

جواب نمبر ۱۔ علوم مقصودہ کی تفسیر و حدیث و فقہ میں کتابوں میں اتنی تبدیلی اور اضافے کی ضرورت نہیں ہے جتنی طرز تعلیم، مطالعہ اور اسعداد آفرینی کے لحاظ سے ضرورت ہے ہمارے مدارس میں ان فنون میں جو مستند قدیم کتابیں داخل ہیں ان سے استغنا مشکل ہے۔ اور ان کا بدل بھی آسان نہیں لیکن طرز تعلیم کی تبدیلی کی ضرورت ہے۔

اصل انحصار معلمین ان کی تربیت زمانہ کے فہم اور روح دعوت اور جدید علم سے واقفیت پر ہے اس میں ہر جز مستقل تفیل طلب ہے۔ حظ اس کا تحمل نہیں ہو سکتا۔ مختصراً اگر معلمین ان کے علوم کے مقاصد و کلیات کو گرفت میں لے آتے ہیں زمانہ کے رجحانات اور ذہن کے نئے راستوں سے واقف ہیں۔ مسائل دینیہ کو ذہن نشین کرنے کی قابلیت رکھتے ہیں اور دعوت کا جذبہ ہے تو ان کیلئے موجودہ کتب بھی کافی اور مفید ہیں اور اگر ایسا نہیں تو کتابوں کی تبدیلی بے کار ہوگی اور میرے نزدیک ان کتابوں کو ابھی بحالہ قائم رکھا جائے تو مضائقہ نہیں۔

جواب نمبر ۲۔ ترجمہ قرآن شریف کے بعد ”جلالین“ کے علاوہ ”مدارک“ مناسب ہو سکتی ہے مگر اصل یہ ہے کہ کوئی ایک تفسیر ہی کافی نہیں طالب علم کو اس کا عادی بنانا چاہئے۔ کہ وہ چند تفسیروں کو سامنے رکھ کر مطالب حل کرے۔ اگر تھوڑے سے حصے میں بھی اس کی عادت پڑھ گئی تو بہت مفید ہوگی۔ تفسیر مظہری بھی کچھ طویل ہے، تفسیر طنطاوی، کسی طرح موزوں نہیں ہے۔

دورہ حدیث سے پہلے سب سے زیادہ اس کی ضرورت ہے۔ کہ کوئی کتاب ایسی کتاب پڑھائی جائے جس سے طالب علم کو روحانی اور اخلاقی فائدہ ہو اور مسائل اور احکام کے بجائے فضائل اعمال اور اخلاق معلوم ہوں اخلاص، ایمان، واقتساب اور جذبہ عمل بیدار ہو۔ اس کیلئے سب سے زیادہ موثر و بابرکت کتاب امام نووی کی ریاض الصالحین ہے اس کو ضرور رواج دینا چاہئے۔ کہ حدیث کا اصل موضوع یہی ہے اس کی طرف سب سے کم توجہ ہے۔ فتویٰ نویسی کے سلسلہ میں مولانا اعجاز علی اور جناب مفتی کفایت اللہ صاحب اور مولانا خیر محمد جالندھری سے استصواب کیا جائے۔

3- اصول تفسیر ”الفوز الکبیر“ نہایت ضروری ہے لیکن کوئی ایسے صاحب پڑھائیں جو قرآن مجید سے مناسبت اور قرآن مجید کا طبعی شوق رکھتے ہوں اور شاہ صاحب کی طرز سے آشنا ہوں۔ اصول حدیث کے سلسلہ میں شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب (مظاہر العلوم) مولانا ادریس صاحب (دارالعلوم) سے مشورہ کیا جائے۔

4- صرف و نحو طرز تعلیم بدلنے کی فوری شدید ضرورت ہے۔ سب سے ابتدا کتابیں اپنی

زبان میں مشق و استقرانی اصول پر ہوں مصر کا سلسلہ ”انجو الواضح“ اور اسکے اردو ترجمہ ”تمرین انجو“ ملاحظہ ہو مدرسین صاحب استعداد و اجتہاد ہوں جو اپنے فن کو دلچسپ اور سہل کر سکیں۔

ادب سے پہلے زبان کی تعلیم کی ضرورت ہے۔ ابتدائی درجوں کیلئے ”ا طریقہ الجدیدہ“ (مولانا محمد ناظم صاحب ندوی، استاذ دارالعلوم ندوہ) ”قصص البنین للاطفال“ (۳، ۲، ۱، از کاتب الحروف، القراءۃ الراشدہ) (۳، ۲، ۱) زیر طبع اختیار کرنی چاہئیں عربی زبان کی تعلیم دراصل ہمارے مدارس میں نہیں ہو رہی ہے اس کیلئے خود عربی عربی ممالک میں بھی شاید اس سے بہتر نصاب تیار نہ ہو۔

ادب کیلئے مختارات من ادب العرب (مطبوعہ دارالعلوم ندوۃ العلماء) موزوں کتاب ہے۔ مکتبہ التعاون دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ سے یہ کتابیں مل سکتی ہیں۔ ترجمہ العربیہ (مولفہ مسعود عالم ندوی و مولانا محمد ناظم) بھی قابل اضافہ ہیں۔

کلام کی تعلیم کیلئے قدیم کتابیں مثلاً شرح عقائد نسفی، وغیرہ نہ صرف ناکافی بلکہ مضر ہیں دراصل اس کی از سر نو تدوین و تربیت کی اشد ضرورت ہے۔ جب تک کوئی شایان شان کتاب نہ ہو۔ مضامین قرآن از راقم سطور، ”رسالہ اہل سنت“ از مولانا سلیمان ندوی سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ مطالعہ کیلئے ”مذہب و عقلیات“ از مولانا عبدالباری ندوی ”مذہب و تمدن“ از راقم السطور ”تنقیحات“ و ”تہذبات“ از سید ابوالاعلیٰ مودودی کی سفارش کی جاسکتی ہے۔ یہ سب علم کلام سے متعلق ایک نظریہ پر مبنی ہیں جس کی تفصیل کی گنجائش نہیں کبھی ملاقات ہو تو عرض کیا جاسکتا ہے۔ نمبر ۵ کا بھی مجمل جواب اوپر آ گیا ہے۔ ان تمام عناوین کیلئے نئی کتابوں کی تربیت کی ضرورت ہے۔ اور اس کا سامان نہیں ہے۔ اگر ان میں غفلت سے کام نہ لیا جائے تو ایک متوسط مدرسہ کیلئے اس کی گنجائش نہیں ہے۔

شاہ صاحب کی کتابوں میں رسالہ ”انصاف“ اگر داخل درس ہو تو طلبہ حدیث کیلئے چشم کشا، بصیرت افروز و اعتدال آفریں ہوگا۔ باقی ”ازالتہ الخفاء“، کے مطالعہ کے تشویش و ترغیب ہو۔ ”حجتہ اللہ“ بلند (پایہ) کتاب ہے۔ اگر استعداد ہو تو اس کے منتخب ابواب پڑھانے چاہئیں۔

نمبر 6- مناظروں کے بارہ میں مجھے آپ کی رائے سے اتفاق ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا الیاس صاحب کے طریقہ کے مطالعہ کی بھی ضرورت ہے۔ مولانا کی سوانح اور ”ایک اہم دینی دعوت“ ضرورت ملاحظہ ہو۔

نمبر ۷ کے استفسارات تجارب و انتظامی امور سے متعلق ہیں مدارس کے مہتمم حضرات سے اس سلسلہ میں مشورہ کیا جاسکتا ہے۔ کبھی ملنا ہو تو شاید کوئی مفید بات ہو سکے۔ امید ہے کہ فی الحال اسی قدر پراکتفا کی اجازت دی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے مقاصد میں کامیاب و بامراد فرمائے۔ والسلام وعلیہم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ *

خاکسار

ابوالحسن علی

علوم اسلامیہ کے سوتے ایمانیات سے ملتے ہیں

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ہندوستان میں شعبہ اسلامک اسٹڈیز کے زیر اہتمام ایک چار روزہ
سینار منعقدہ ۲۲ تا ۲۵ جنوری ۱۹۷۷ء میں کی گئی ایک اختتامی تقریر

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونعوذ بالله من شرور انفسنا ومن
سيئات اعمالنا من يهد الله فلا مضل له ومن يضلل فلا هادي له ونشهد
ان لا اله الا الله ونشهد ان محمد عبده ورسوله الذي ارسله الله تعالى
بالحق بشيرا ونذيرا وذا عيا الى الله باذنه وسراجا منيرا

مہارت اور اختصاص ضروری ہے:

حضرات! میں آپ کی اس عزت افزائی کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے اس عملی مجلس کے
افتتاح کے موقع پر اپنے خیالات کے اظہار کا موقع دیا اب اس کے آخری نشست کے اختتام
پر بھی مجھے تقریر کا موقع دیا ہے آغاز و انجام میں خاص مناسبت ہے میں آپ کے اس اعتماد و
اعزاز کے لئے دل سے شکر گزار ہوں مجھے بڑی مسرت ہے کہ علوم اسلامیہ اور دینی موضوعات
سے کچھ عرصہ سے عصری دانش گاہوں کے فضلاء بھی دلچسپی لینے لگے ہیں اور یہ سیمینار اس کی
دلیل ہے اب علوم اسلامیہ کے ایک خادم اور میدان تحقیق کے پرانے مسافر کو اقبال کے الفاظ
میں یہ کہنے کا حق ہے کہ

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں

یہاں اب میرے راز داں اور بھی ہیں

دماغی صلاحیتوں کا خزانہ کسی ایک طبقہ میں مرکوز نہیں ہے نہ کبھی مرکوز رہا ہے اور نہ بھی مرکوز
ہو سکتا ہے اور ایسا ہونا کچھ اچھا بھی نہیں اس طبقہ کے لئے خواہ بات کتنی ہی نازش و افتخار کی ہو
لیکن انسانیت کے حق میں یہ کوئی بہتر نہیں ہے کہ انسانی ذہانتوں کا خزانہ اور مخنتوں کا ذخیرہ کسی
ایک طبقہ میں مرکوز ہو کر رہ جائے جہاں تک اسلام کا تعلق ہے آپ جانتے ہیں کہ اسلام میں

علماء دین کا کوئی مخصوص موروثی طبقہ ہے، کلر جی اور پریسٹ ہڈ کا تخیل مسیحی دنیا میں ملتا ہے اس کا دنیاۓ اسلام میں کہیں وجود نہیں، اگر ہمارے بعض اہل قلم مصنفین کی تحریروں میں کچھ ایسی تعبیرات اور الفاظ آتے ہیں تو بے سوچے سمجھے یا مغرب کی تقلید میں، مثلاً اس وقت عرب مصنفین کے یہاں ”رجال الدین“ کا ایک لفظ استعمال ہوتا ہے جو تقریباً اسی معنی میں ہے جو مسیحی دنیا میں پریسٹ ہوڈ کیلئے استعمال ہوتا تھا اس محتاط مصنفین جو اسلام کی صحیح روح اور صحیح فکر کی ترجمانی کرنا چاہتے ہیں ان لفظوں سے ہمیشہ احتراز کیا ہے، لیکن علوم اسلامیہ کی طرف عصری دانش گاہوں کے فضلاء کی توجہ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے بھی میں یہ اضافہ کروں گا کہ کلر جی اور پریسٹ ہڈ اسلام میں نہیں ہے لیکن ایکسپریٹ اسپیشلسٹ ماہرین فن اور اصحاب اختصاص کا وجود ہمیشہ رہا ہے اور یہ ایک علمی حقیقت ہے اس لئے کہ علوم اتنے پھیل گئے ہیں اور ان میں اتنا تنوع اور وسعت پیدا ہو گئی ہے کہ ایک آدمی کے لئے ہمہ واں ہونا عملاً ناممکن ہے، یورپ میں بھی ترقی اس وقت شروع ہوئی جب وہاں تقسیم کار کے اصول پر عمل کیا گیا، اور علوم کے مختلف شعبے تقسیم ہو گئے اور اس کی کوشش مغربی فضلاء نے چھوڑ دی کہ وہ تمام علوم میں اتھارٹی اور سند کا درجہ حاصل کریں، جہاں تک مجھے علم ہے یورپ میں اب بھی اس اصول کا احترام مشرق سے زیادہ کیا جاتا ہے وہاں کہ علم کے فاضل بھی بعض اوقات اس علم کے بعید متعلقات کے متعلق بغیر کسی شرم و ندامت کے محسوس کئے کہہ دیتے ہیں کہ یہ ہمارا موضوع نہیں، اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے ہمیں اس کو اصول کے تحت تسلیم کر لینا چاہیے کہ ہماری آئندہ دلچسپیاں اور ہماری علمی اور تصنیفی سرگرمیاں کسی خاص موضوع یا فن کے ساتھ مخصوص ہوں گی۔

معیار کی طرف توجہ کی ضرورت ہے

مجھے خوشی اور فخر ہے کہ میں آپ کا ہم سفر ہوں، ہم سفری کے اس حق سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں آپ کے سامنے چند باتیں عرض کر دینا چاہتا ہوں، آپ اس کو کسی تعریض پر محمول نہ فرمائیں، پہلی بات جسے میں محسوس کر رہا ہوں، اور آپ میں سے بہت لوگ محسوس کر رہے ہوں گے، بہت سے سینئر اسکالرز یہاں موجود ہیں جن کے ۳۰-۴۰ برس اس صحرا نوردی میں گزرے ہوں گے کہ علم و تحقیق کا معیار روز بروز گھٹتا جا رہا ہے، مجھے یورپ کے سفروں میں بھی اس کا احساس ہوا اور میں نے بعض فضلاء سے بھی سنا وہاں بھی اور نیشنل ازم کا جہاں تک تعلق ہے یعنی

مشرقی مباحث لکھنے کا اس کا معیار فروتر ہو گیا ہے اور وہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ جتنی محنت اور جیسا عشق اور لگن گزشتہ نسل کے فضلاء میں تھی اس میں کمی ہے اس کے پیچھے بہت سے عوامل کام کرتے ہیں، کچھ سیاسی ہیں کچھ معاشی ہیں۔

استشراق کی ترقی کا راز

ہر علم کے پیچھے بعض بہت طاقتور محرکات ہوتے ہیں ان عوامل و محرکات نے اورینٹل ازم کو ایک زمانہ میں چوٹی پر پہنچا دیا تھا، فزکس اور ٹکنالوجی یا اکنامکس کے چند دائروں کو چھوڑ کر جہاں تک علمی اور نظر مباحث کا تعلق ہے اورینٹل ازم کو یورپ میں اعزاز حاصل تھا، مستشرقین اور ان کی کتابوں کی جس طرح قدر ہوتی تھی وہ کم علوم کو حاصل تھی یہاں تک کہ ادبیات اور لسانیات کے علوم کو بھی شاید وہ درجہ نہیں دیا جاتا تھا اس کے پیچھے ایک بہت بڑا عامل کام کر رہا تھا، ہم کو خوشی ہونی چاہیے کہ اب وہ باقی نہیں رہا، وہ تھا استعمار، مشرق کے سب سے زیادہ سرسبز و شاداب ممالک بدقسمتی یا خوشی سے مسلمانوں کے زیر اثر تھے ان پر مغرب کی لپٹائی ہوئی نگائیں پڑ رہی تھیں۔

استعماری نئی نوآبادیاں قائم کرنا چاہتا تھا اس لئے وہاں کے قومی مزاج اور خصوصیات اور ان کی خوبیوں سے زیادہ کمزوریوں سے واقف ہونے کی ضرورت تھی اس کیلئے مستشرقین ایک ہر اول دستہ کا کام کرتے تھے ان کے پیچھے حکومتوں کی سرپرستی تھی بڑے بڑے فنڈ اور بڑے بڑے ادارے تھے اور ان کا اکرام بادشاہ اور صدر جمہوریہ کے دربار میں بھی ہوتا تھا یہ عرصہ ہوا کمزور پڑ گیا ہے۔

دوسرا معاشی عامل تھا اس پر بھی کچھ اثر پڑا ہے، معاشی دھانچہ میں ایسی تبدیلیاں ہوئیں ہیں کہ اب وہ انعام ملنا مشکل ہیں جو پہلے ملتا تھا۔

علم کا عشق

تیسری چیز جو زیادہ توجہ کے قابل ہے اور اس کو میں اصل سمجھتا ہوں وہ ہے علم کا عشق جو ہماری پہلی نسل میں تھا، ایک لگن اور خود فراموشی کی کیفیت جو اس عہد میں تصنیفی اور تحقیقی کام کرنے والوں پر طاری رہتی تھی۔

یہ بات کسی خاص دانش گاہ یا جامعہ کو سامنے رکھ کر نہیں کہہ رہا ہوں، یہ میرا عالم مطالعہ ہے، تقریباً سب جگہ یہ محسوس کیا جا رہا ہے (اور یہ بد قسمتی کی بات ہے) کہ علم سے عشق جو ہمارے اسلاف میں پایا جاتا تھا، اسلاف سے مراد مسلمانوں ہی کے اسلاف نہیں بلکہ گزشتہ نسل میں پایا جاتا تھا، وہ اب بہت کم نظر آتا ہے۔

نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خان شروانی کی کتاب ”علمائے سلف“ جو انہوں نے اسی علی گڑھ میں لکھی ہے اس کو پڑھنے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ علم کا عشق اس وقت کے مصنفین اور محققین کے دلوں میں کیسا موجزن تھا، اور آج اس میں کس قدر نمایاں انحطاط ہوا ہے، یہ انحطاط کیوں ہوا؟ اس کا تعلق سیاسیات، معاشیات، ادبیات اور اخلاقیات سب سے ہے اس کے پورے اسباب کا تجزیہ کرنا اس وقت نہ ضروری ہے اور نہ اس کی گنجائش ہے، لیکن اتنی بات آپ تسلیم کریں گے اور ہمارے معزز شرکاء، کار اور ہم سفر ضرور اس کو تسلیم کریں گے کہ علم سے عشق، شمع علم پر پروانگی کی کیفیت علم و تحقیق کا ایسا جنون کہ کھانے پینے، کپڑے کا ہوش نہ رہے آج مفقود بلکہ معدوم نظر آتا ہے، علماء سلف کے واقعات کو چھوڑ دیجئے اسی علی گڑھ میں جو علماء پیدا ہوئے، مولانا لطف اللہ علی گڑھی ان کے اس عشق کو دیکھئے اور اس کو بھی آپ چھوڑ دیجئے، اس وقت کے مغربی مصنفین کے یہاں ”لین“ جس کا عربی لغت انگریزی دانوں کیلئے ہی نہیں بلکہ عربی ادب کے ان فضلاء کے لئے بھی قابل استفادہ ہے، جو تفصیلات میں جانا چاہتے ہیں، اور وہ موداد یکجا دیکھنا چاہتے ہیں، جو بعض اوقات بہت سے عربی لغتوں میں بھی نہیں ملتا، میں نے سنا ہے کہ قاہرہ میں جب وہ اس لغت کا کچھ حصہ تیار کر رہا تھا تو مہینوں گزر گئے وہ کہیں نہیں گیا اس کو پتہ نہیں تھا کہ بازار کہاں ہے، بازاروں میں جانے اور اہرام مصر جیسے عجائبات عالم کو دیکھنے کی فرصت نہ تھی، اس کو آپ بد مذاقی یا مردہ دلی پر محمول کر سکتے ہیں، لیکن یہ واقعہ ہے، بہت سی لازوال اور لافانی تصانیف کی تاریخ اگر آپ دیکھیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان کے مصنفین پر خود فراموشی کا علم طاری تھا، یہ وہ چیز تھی جس نے مغرب و مشرق کے مصنفین کے قلم سے وہ زندہ جاوید تصانیف اور ایسی تحقیقات نکلوائیں (جن سے اختلاف کے باوجود) ان کی عملی قدر و قیمت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

ماضی قریب کی علمی شخصیتیں

میرا روئے سخن خالص اپنے ان دوستوں سے ہے جو لکھنے پڑھنے کا کام کرتے ہیں مثال کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ مولانا شبلی نے کتب خانہ اسکندریہ پر قلم اٹھانے کی ضرورت محسوس کی ایک زمانہ تھا جب ہندوستان میں مشترک دانش گاہوں میں پڑھنے والے مسلمان طلباء کو چڑھانے کے لئے صرف یہ کہنا کافی تھا ”اچھا آپ اس نسل اس مذہب سے تعلق رکھتے ہیں جس کے خلیفہ نے اسکندریہ کا کتب خانہ جلوادیا تھا“ ابھی وہ لوگ موجود ہیں جنہوں نے وہ زمانہ پایا ہے وہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم لوگ منہ چھپاتے تھے بلکہ منہ چراتے تھے اور آنکھیں نہیں ملا سکتے تھے کہ اس کا کیا جواب دیں ایک چلی ہوئی کہانی تھی کہ حضرت عمرؓ کو لکھا گیا کہ یہاں ایک کتب خانہ ہے جو ظہور اسلام سے پہلے کا ہے اس میں فلاسفہ کی اور منطقیوں کی کتابیں ہیں تو انہوں نے کہا کہ اگر وہ قرآن کے مطابق ہیں تو اس کی ضرورت نہیں اگر خلاف ہیں تو اس کو آگ لگا دینی چاہیے چنانچہ لوگوں نے فیصلہ کیا کہ وہ قرآن کے خلاف ہیں اور بغیر پڑھے کتب خانے کو آگ لگا دی یہ ایک کہانی تھی جس کو ٹائن بی جیسا مؤرخ تک دہراتا ہے ٹائن بی نے جب رسم الخط کی تبدیلی اور کمال اتاترک کی اصلاح پر تبصرہ کیا تو اس نے کہا اب کتب خانہ اسکندریہ کو جلانے کی ضرورت نہیں صرف رسم الخط بدل دینا کافی ہے علامہ شبلی نعمانی نے اس پر قلم اٹھایا اور اس افسانہ کو آخری طور پر ختم کر دیا کہ اب کسی پڑھے لکھے کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ یہ کہے کہ کتب خانہ اسکندریہ حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں ان کے حکم سے جلادیا گیا انہوں نے قدیم مورخین کی شہادتوں سے ثابت کر دکھایا کہ کتب خانہ اسکندریہ حضرت عمرؓ کی خلافت سے پہلے ہی جل چکا تھا اس کا کہیں وجود ہی باقی نہیں تھا مثلاً انہوں نے جزیہ کے مسئلہ پر قلم اٹھایا تو اس بحث ہی کو ختم کر دیا یا انہوں نے ”شعرا لعمم“ لکھی تو اہل ذوق اور فارسی دانوں سے اپنا لوہا منوالیا پروفیسر براؤن جن کی کتاب ”لٹری ہسٹری آف پرشیا“ اپنے موضوع پر (Gospel) کا درجہ رکھتی ہے اور دنیا کی اکثر یونیورسٹیوں کے کورس میں داخل تھی نے کہا کہ مجھے اب اردو سیکھنے کی تمنا پیدا ہوتی ہے تو اس لئے کہ میں براہ راست ”شعرا لعمم“ کا مطالعہ کر سکوں یہ سب اس علمی شغف اور علمی استغراق کا نتیجہ تھا جو ان لوگوں پر طاری تھا۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ جن کا اصل موضوع قرآن مجید، سیرت نبوی ﷺ اور تاریخ اسلام

تھا انہوں نے ”عمر خیام“ پر ایک ایسی کتاب لکھی جس کی داد فضلاء ایران نے بھی دی اسی طرح ان کی کتاب ”عرب و ہند کے تعلقات“ محنت و کاوش اور ریسرچ کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

میں اس موقع پر ”نزہۃ الخواطر“ کا بھی ذکر کروں گا جو میرے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی (سابق ناظم ندوۃ العلماء) کی تصنیف ہے اور عربی میں آٹھ ضخیم جلدوں میں مکمل ہوئی اس میں ہندوستان کے ساڑھے چار ہزار مشاہیر اور اہل کمال کے تذکرے ہیں انہوں نے بیسویں صدی کے آغاز میں اس کام کا بیڑہ اٹھایا جب عربی مطابع کا رواج اور اشاعت کی سہولتیں نہیں تھیں تقریباً ۶۵ سال وہ اس کام میں مشغول رہے اس وقت یورپ میں بھی یہ کتاب ہندوستانی علماء فضلاء کے حالات معلوم کرنے کا سب سے بڑا ماخذ ہے اسی طرح ان کی دوسری کتاب ”الثقافة الاسلامیہ فی الہند“ جو ہندوستان میں علوم الاسلامیہ اور نصاب درس کی تاریخ اور ہندوستانی علماء کی تصنیفات کی مکمل ڈائرکٹری ہے اس کتاب کو دمشق کی رائل اکیڈمی ”المجمع العلمی العربی“ نے ۱۹۵۷ء میں شائع کیا میں نے وہاں کی علمی مجلسوں میں بڑے بڑے فضلاء کو اس کی تعریف اور مصنف کی محنت کا اعتراف کرتے ہوئے پایا۔

علم محنت بھی ہے اور انعام بھی

ایک آدمی اس وقت وہ کام کرتا تھا جو ایک اکیڈمی اس وقت انجام نہیں دیتی یہ سب ایک آدمی کی محنت کا نمونہ ایک آدمی کی محنت کا کرشمہ اور ایک آدمی کے علم سے عشق کا نتیجہ ہے آج اکیڈمیاں بڑے بڑے ادارے اور شعبے موجود ہیں لیکن سالہا سال میں وہ کوئی پیش کش نہیں کر پاتے جس کو دیکھ کر اس علم کے ماہر یہ کہیں کہ ہاں یہ اور بجٹل چیز ہے بعض کتابیں دیکھ کر غالب کا وہ مصرعہ پڑھنا پڑتا ہے

اب آبروئے شیوہ اہل نظر گئی

محنت کے معیار کو بڑھانے کی ضرورت ہے علم محنت بھی ہے انعام بھی ہے پیاس بھی ہے پانی بھی بھوک بھی ہے اور غذا بھی۔

جب تک اپنے فن سے اتنا تعلق نہ ہو کہ آدمی کو کتاب لکھنے پر اتنی خوشی ہو کہ وہ کہے اب مجھے اس ڈیپارٹمنٹ کا چیرمین بنایا جائے یا نہ بنایا جائے میں نے اپنا کام کر دیا میری محنت وصول ہو گئی۔

آج کے فضلاء اپنی کتاب اور تحقیق کو مکمل نہیں کر سکتے کہ وہ اسکے انعام کے متوقع ہو جاتے ہیں اور ان کی زہانت و توجہ کا بڑا حصہ اسی مقصد پر صرف ہوتا ہے کہ آپ بہت سے آئی ایس ایم ایس سے واقف ہے ایک نئے آئی ایس ایم کا اضافہ کر لیجئے جو ہماری دانش گاہوں اور تعلیمی مرکزوں میں تیزی سے پھیل رہا ہے اور وہ ہے (کیریئر ازم) یعنی Career کو بہتر بنانا اور تقرب اور علم کے ذریعے جاہ طلبی۔

دلچسپی اور شغف عارضی نہ ہو

دوسری چیز یہ کہ دلچسپی اور شغف عارضی نہ ہو مثلاً کسی سیمینار کیلئے ہم کسی موضوع کو اپنے اوپر تھوڑی دیر کیلئے طاری کر لیں پھر اس کے بعد جیسے جگالی کچاتی ہے پڑھ کر ہم اس کو اگل دیں اور نہ ہمیں اس موضوع سے محبت ہو اور نہ وفاداری ہو نہ فکر ہو کہ اس سلسلے میں کیا ہوا نہ اس میں اضافہ کرنے کا شوق ہو اس موقع پر اقبال سے مدد لیتا ہوں انہوں نے اس حقیقت کو خوب بیان کیا ہے۔

مقصود ہنر سوز حیات لبدی ہے
یہ ایک نفس یاد و نفس نثر کیا

علم اور تحقیق بھی ایک ہنر ہے اور اس ہنر کو زندگی بھر کا ساتھ دینا چاہئے۔ اس میں مقصدیت پیدا ہونی چاہئے وہ مثل نثر نہیں کہ بھڑکا اور بجھ گیا۔

علوم اسلامیہ کے سوتے ایمانیات سے ملتے ہیں

جہاں تک علوم اسلامیہ کا تعلق ہے آپ بیشک اجتہاد کی ضرورت پر مقالے پڑھیں ہم سب اس کو تسلیم کرتے ہیں یہ الگ بات ہے کہ اس کا دروازہ بند ہو جانے کے اسباب کیا تھے اور کہاں تک جائز تھے؟ لیکن میں ایک بات کہوں گا جہاں تک علوم اسلامیہ کا تعلق ہے اس کے کچھ سوتے ایمانیات سے ملتے ہیں بلکہ ان کا اصل سرچشمہ وہی ہے۔ اس لئے ہمارا طرز عمل ان کے بارے میں وہ نہ ہونا چاہئے جو ایک غیر مسلم مستشرق کا ہوتا ہے ہم صرف بحث کریں اور ہمیں نہ اس سے کوئی دلچسپی ہو نہ اس سے اتفاق ہو ایک حد تک اتفاق بھی ہونا چاہئے اور اگر وہ ایمانیات سے تعلق رکھتا ہے تو اس پر ایمان بھی ہونا چاہئے اور کسی حد تک عملی زندگی میں اس کی نمود بھی

ہونی چاہیے میں اپنے بچپن میں ایک حکیمانہ مقولہ سنا کرتا تھا کہ ”یک من علم راہ من عقل باید“ ایک من علم ہو تو دس من عقل ہونی چاہئے ورنہ آدمی اس کا صحیح استعمال نہ کر سکے گا تو میں ترمیم کروں گا کہ تحقیق کی کسی بڑی سے بڑی مقدار کے ساتھ کسی کتاب سے تقویٰ بھی ہونا چاہئے اس لئے کہ یہ مسئلہ علوم اسلامیہ کا ہے جس کا تعلق ایمانیات سے ہے اگر ہم اس پر اس طرح عمل جراحی کرتے ہیں جیسا کسی مردہ لاش کا پوسٹ مارٹم کیا جاتا ہے تو یہ مناسب نہیں تنقید میں کسی قسم کی توہین یا تضحیک کی شان نہیں ہونی چاہئے کہ طنزیات و تضحیک کو خالص علمی مزاج سے کوئی مناسبت نہیں آپ کا اپروچ خالص علمی خالص اکیڈمک ہو۔

حضرات! جو لوگ علم کی ذمہ داریوں اور تحقیقات و نظریات کی تغیر پذیری سے واقف ہیں وہ اپنے کسی علمی نظریے یا تحقیق کے پیش کرنے میں جزم و وثوق اور قطعیت کے الفاظ استعمال کرنے سے احتراز کرتے ہیں وہ اپنی کسی نئے خیال کو اس طرح نہیں پیش کرتے کہ وہ گویا اس موضوع پر حرف آخر اور تمام کچھلی تحقیقات پر خط نسخ پھیر دینے والا ہے وہ کہتے ہیں کہ میرے اس وقت کے مطالعہ اور تحقیق نے اس نتیجہ تک پہنچایا ہے ممکن ہے کہ آئندہ اس میں تبدیلی کرنی پڑے یا کوئی نئی بات ثابت ہو یا مجھے اندیشہ ہے کہ یہ بات اس طرح ہو مجھے بدرالدین طیب جی کا یہ جملہ پسند آیا جو انہوں نے کل ایک نشست کی صدارت کرتے ہوئے ایک مقالہ نگار سے کہا مجھے اندیشہ ہے کہ آپ کا وقت ختم ہو گیا ہو وہ یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ حضرت آپ کا وقت ختم ہو گیا ہے لیکن انہوں نے اس کو بڑے لطیف انداز سے ادا کیا ہم اس سے سبق لے سکتے ہیں قلم پکڑیں تو آپ کو اول سے آخر تک علم کا احترام اور اس شخص کا احترام بھی ملحوظ رکھنا چاہیے جس نے اپنا وقت صرف کیا جس نے اپنی آنکھیں خراب کیں جس نے اتنا مواد فراہم کیا۔

عربی زبان کی اہمیت

عربی زبان کی اہمیت بنیادی چیز ہے اگر آپ کو علوم اسلامیہ پر کوئی بھی کام کرنا ہے تو یہ بڑے کلیفکشن کی بات ہوگی آپ عربی سے نا آشنا ہوں قرآن حدیث اور اسلامیات پر لکھنے والے بہت سے مشرقی اور مغربی فضلاء سے عربی نہ جاننے کی وجہ سے نا دانستہ ایسی غلطی ہو جاتی ہے جو بعض اوقات ان کے پورے علمی کارنامے پر پانی پھیر دیتی ہے۔

مجھے ایک دوست نے بتایا کہ دہلی میں کوئی سیمینار ہو رہا تھا اس میں ایک صاحب جنہوں نے انگریزی میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا تھا تقریر کر رہے تھے تو مشہور عرب ادیبہ اور مورخہ ”عائشہ بنت الشاطی“ نے جو اس سیمینار میں شریک تھیں ان سے عربی میں خطاب کیا تو انہوں نے بے تکلفی سے کہا کہ میں عربی نہیں سمجھتا تو عائشہ نے کہا کہ قرآن مجید کا ترجمہ پھر آپ کیسے کرتے ہیں؟ اس کے بعد وطن جا کر انہوں نے مصر کے کثیر الاشاعت اخبار ”الاہرام“ میں اس پر کئی قسطوں میں مضمون لکھا کہ ”مین نے عجائبات عالم میں سے ایک عجیب چیز یہ دیکھی کہ ایک فاضل نے قرآن مجید کا ترجمہ کیا اور وہ عربی سے ناواقف تھا۔“

آپ حضرات آسانی کے ساتھ اس پر قابو پا سکتے ہیں اور عربی زبان میں وہ دسترس حاصل کر سکتے ہیں جس سے آپ غلطیوں سے بچ سکیں اس سلسلے میں عربی مدارس آپ سے بھرپور تعاون کریں گے۔

انتشار انگیزی سے احتراز کیجئے

بعض فضلاء اپنے نظریات و تحقیقات کے اظہار میں بہت عجلت سے کام لیتے ہیں ان کی اشاعت ہو جاتی ہے پھر وہ کچھ عرصہ بعد خود ہی ان سے رجوع کر لیتے ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنا اخلاقی فرض انجام دیتے ہیں لیکن جو لوگ اس عرصہ میں ان نظریات و تحقیقات کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں ان کی ذمہ داری کس پر ہے؟ یہ مسئلہ اور زیادہ سنگین ہو جاتا ہے جب اس کا تعلق ایمانیات اور عقائد سے ہو اس لئے ہمیں اپنی تحقیقات کی اشاعت و تبلیغ کے بارے میں (خاص طور پر جب ان کا تعلق عقائد اور دینیات سے ہو) عجلت اور بے صبری سے کام نہیں لینا چاہیے ان پر بار بار غور کرنا چاہیے ان کو شک شبہ کی نگاہ سے دیکھنا چاہیے ماہرین فن کے سامنے پیش کرنا چاہیے اور ان کی رائے اور مشورہ کا انتظار کرنا چاہیے پھر اس کے بعد اس کی اشاعت کی اجازت دینی چاہیے یہ دور انتشار ہے اس وقت طبیعتیں انتشار انگیزی کے لئے ہر وقت آمادہ ہیں انسان ہمیشہ سے سہولت پسند اور حیلہ جو واقع ہوا ہے جدید تمدن نے سائنسی ترقی کی رفتار نے اور معیار زندگی کی بلندی نے اس کو زیادہ سہولت پسند اور انتشار پسند بنا دیا ہے اس لئے ہم ایسی بات کہنے سے احتراز کریں جس سے لوگوں میں انتشار پیدا ہو۔

۱۹۶۷ء میں جب عربوں کو اسرائیل کے مقابلہ میں شکست فاش ہوئی تو میں نے اپنے ایک

انٹرویو میں کہا تھا کہ اس میں بہت بڑی ذمہ داری ان تشکیک پسند ادباء اور مصنفین پر ہے، جنہیں نے ہماری جدید عرب نسل کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ تمام قدیم اقدار کو انہوں نے متزلزل کر دیا۔

میں شکر گزار ہوں وائس چانسلر صاحب پرووائس چانسلر صاحب پروفیسر حقی صاحب اور ان سب حضرات کا جو اس سمینار سے تعلق رکھتے ہیں کہ انہوں نے مجھے عزت بخشی اور بڑے اعتماد کا اظہار کیا، میں پورے وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ میں نے جو کچھ اس سمینار میں کہا، مخلصانہ تھا۔ خدا کرے کہ میں بھی اسے فائدہ اٹھاؤں اور آپ بھی اپنے جواہر اور کمالات میں اضافہ کریں۔

ملک و ملت کی نوجوانوں سے توقعات

یہ تقریر مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ہاشمی ندوی نور اللہ مرقدہ نے مورخہ ۲۶ مئی ۱۹۸۲ء کو پاکستان کی عظیم ورگاہ جامعہ کراچی میں اساتذہ و طلبہ سے مخاطب ہوتے ہوئے فرمائی تھی اس باوقار جلسہ کی صدقات یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب ڈاکٹر جمیل چاہی صاحب فرما رہے تھے۔

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونعوذ بالله من شرور انفسنا ومن
سيئات اعمالنا من يهد الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادي له ونشهد
ان لا اله الا الله ونشهد ان محمدا عبده ورسوله الذي ارسله الله تعالى
بالحق بشيرا ونذيرا وادعيا الى الله باذنه وسراجا منيرا

محترم وائس چانسلر صاحب، اساتذہ، عزیز طلباء اور معززین شہر! میرے لئے بڑی مسرت اور عزت کی بات ہے کہ مجھے جامعہ کراچی کے اساتذہ اور طلباء اور شہر کے معززین سے خطاب کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ میری حقیر ذات کا جناب وائس چانسلر صاحب نے بڑی فراخ دلی اور کریم انفسی کے ساتھ تعارف کرایا ہے۔ اور میری حقیر علمی کوششوں کو سراہا ہے، جس سے خود ان کے مطالعہ کی وسعت اور تنوع کا اندازہ ہوا، لیکن میرے تعارف کا ایک گوشہ رہ گیا جس سے اس وقت کے حاضرین مجلس کو خاص طور پر دلچسپی ہونی چاہئے وہ یہ کہ میری شعوری اور علمی زندگی کا آغاز معلمی سے ہوا، میرے درجوں کے عزیز طلباء کو کتنا فائدہ پہنچا۔ ان کی کیا خدمت ہوئی؟ اس کے متعلق تو میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا لیکن مجھے خود بہت فائدہ پہنچا، بن کی ترقی اور وسعت، انسانی نفسیات کے سمجھنے اور زندگی کے مطالعہ کے سلسلہ میں مجھے اس سے بڑی مدد ملی میں نے سکھانے سے زیادہ سیکھا۔ مجھے اپنے طویل سفروں اور دوروں کی وجہ سے مختلف مجالس اور مختلف تقریبات میں بڑے بڑے مجموعوں سے خطاب کرنے کا موقع ملتا ہے۔ لیکن میرے لئے خوشگوار ترین موقع وہ ہوتا ہے جہاں مجھے

نوجوان اور اپنے ہم مشغلہ اساتذہ سے خطاب کرنے کا موقع ملتا ہے۔ آج اللہ نے ایسا ہی موقع مرحمت فرمایا ہے اور میں اس کے لئے جامعہ کے ذمہ داروں کا شکر گزار ہوں۔

حضرات! کسی ملک کی ترقی اور استحکام اور کسی معاشرہ کے تحفظ اور اس کے باعزت زندگی گزارنے کے بہت سے سرچشمے، بہت سی شرطیں اور بہت سی علامتیں ہیں۔ مثلاً کوئی ملک بڑی فوجی طاقت کا ملک ہے، کسی ملک کے پاس زندگی کے بڑے ذرائع ہیں، کسی کے پاس معدنی، حیوانی، زراعتی دولت کا بہت بڑا ذخیرہ ہے، کسی ملک میں جامعات کی بڑی کثرت ہے، کسی ملک کے تعلقات عظیم ترین سلطنتوں اور عظیم ترین ملکوں سے بڑے دوستانہ ہیں اور اس ملک کو ان پر بڑا اعتماد ہے، کسی ملک میں انسانی ذہانت کا بڑا ذخیرہ ہے، وہاں بہت انسانی توانائی پائی جاتی ہے، وہاں کے لوگ جسمانی طور پر بہت صحت مند ہیں۔ یہ سب چیزیں کسی ملک کی طاقت و استحکام اور کسی ملک کی عزت اور اسکے احترام کی علامتیں سمجھی جاتی ہیں میں انکا انکار نہیں کرتا لیکن اگر میرے سامنے کسی ملک کی بڑائی کسی ملک کے استحکام اور کسی معاشرہ کے باعزت زندگی گزارنے کا ذکر آئے اور کسی ملک کی تعریف کی جا رہی ہو تو میں ایک سوال کروں گا، وہ یہ کہ ”مجھے یہ بتائیے کہ وہاں کے اسکولوں اور کالجوں سے لے کر یونیورسٹیوں کے طلباء تک نئی نسل کے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں کس درجہ کا احساس ذمہ داری پایا جاتا ہے۔ ان میں ضبط نفس کی کتنی طاقت ہے، ان میں اپنے تاثرات کو حد اعتدال میں رکھنے کی کتنی صلاحیت ہے، ان میں کسی ملک کے صالح نظام اور جائز قوانین کے احترام کی کتنی عادت ہے، اور ان میں احساس شہریت (CIVIC SENSE) کتنا پایا جاتا ہے؟“ میں تاریخ کے ایک طالبعلم کی حیثیت سے بھی (جس کی طرف وائس چانسلر صاحب نے متعدد اشارے کئے ہیں) اور تاریخ کے حدود سے نکل کر زندہ معاشروں میں چلنے پھرنے اور لوگوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والے ایک انسان کی حیثیت سے بھی اس نتیجہ پر پہنچا ہوں۔ میں صرف کتابوں کے صفحات اور گزشتہ تاریخ پر اس کی بنیاد نہیں رکھتا۔ بلکہ اکبر الہ آبادی مرحوم کے اس شعر پر عمل کرتا ہوں۔

نقشوں کو تم نہ جانچو، لوگوں سے مل کے دیکھو

کیا چیز جی رہی ہے، کیا چیز مر رہی ہے

اعداد و شمار کے فن یعنی شماریات نے ہمارے اس زمانہ میں جواہریت اختیار کر لی ہے، اس کے

لئے جو بڑے عظیم ادارے قائم ہوئے ہیں، ان کے لئے جو انسانی توانائیاں صرف ہو رہی ہیں انکی اہمیت کو کم کئے بغیر یہ عرض کروں گا کہ میرے نزدیک کسی ملکی بقاء و ارتقاء اور اس کی سالمیت اور اس کی عزت و احترام کے جانچنے کا معیار یہ نہیں ہے جو پختہ کار و پختہ نسل اس وقت موجود ہے، یا جس نے پڑھاپے کی منزل میں قدم رکھا ہے وہ بہتر سے بہتر ہے، اس میں سے ہر شخص ہماری قدیم سوانح کی اصطلاح میں ولی ہے اور علمی اصطلاح میں فاضل اجل علامہ ہے اور دوسری اصطلاحوں میں ان کی جو تعریف کیجئے۔ یہ بالکل کافی نہیں ہے، اس لئے کہ یہ نسل جلد ختم ہو جائے گی۔ اللہ اس کی عمر میں برکت دے لیکن الہی قانون اپنا کام کر رہا ہے، اس میں نہ پیغمبروں کا استثناء اور نہ ولیوں کا استثناء ہے اور نہ عالموں کا استثناء ہے۔ ”وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ“ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے ایک رسول ہیں۔ پہلے جتنے رسول آئے چلے گئے۔) یہ موت و حیات کا قانون سب پر حاوی ہے۔ یہ بات اطمینان کے لئے کافی نہیں کہ کسی ملک کی ادھیڑ یا بوڑھی نسل بڑی پاکباز ہے، بڑی زندہ دل ہے، بڑی صلاحیتوں کی مالک ہے، دیکھنے کی بات یہ ہے کہ جس نسل کو اس نسل کی جگہ لینی ہے ملک کی باگ ڈور سنبھالنا ہے اور جس سے اس ملک کی قسمت وابستہ

ہے، جس سے اس ملک کا تاریخی تسلسل قائم رہے گا، وہ نسل کس درجہ کا اخلاقی معیار رکھتی ہے؟ کس درجہ اس کو اپنی طبیعتوں پر قابو اور کنٹرول ہے؟ کس درجہ اس کے اندر برائیوں سے بچنے کی طاقت ہے اور کس درجہ اس میں مخلصانہ و مردانہ جدوجہد پائی جاتی ہے؟

میرے نزدیک کسی ملک و قوم کی صلاحیت، عزت و طاقت کا یہ اصل معیار ہے، اگر کسی ملک کو سب کچھ حاصل ہے، لیکن اس ملک نو جوان اور خاص طور پر تعلیم یافتہ نسل صحیح اور ضروری نظام کا احترام کرنا نہیں جانتی، وہ ملک و ملت کے مفاد پر اپنے ذاتی مفاد کو ترجیح دیتی ہے، اس میں اپنے ذاتی مفادات کو ملک کے وسیع تر مفادات کے لئے قربان کرنے کی صلاحیت نہیں ہے تو وہ ملک اور قوم سخت خطرہ میں ہے۔ اس لئے کہ اس کی نئی نسل میں قابل تحفظ و قابل احترام روایت کے (جن سے اس کی اس میں عادت نہیں ہے، وہ بارود اور پیٹرول کی طرح ہے، جو فوراً آگ پکڑ لیتے ہیں۔ میں ایک مرتبہ باہر سے یوپی کے مشہور شہر کانپور آ رہا تھا۔ میرے کار کے سامنے ایک ٹینکر چل رہا تھا، بہت دور تک اس کا ساتھ رہا، ہماری کار سے آگے نہیں نکل سکتی تھی، اس

ٹینکر کی پشت پر لکھا ہوا تھا۔ (Highly Inflammable) اس لئے کہ اس میں پیٹرول بھرا ہوا تھا۔ میں اس کو دیکھتا رہا۔ یہ بے بسی کی بات تھی کہ میری نظر بار بار اس پر پڑتی تھی۔ مجھے کانپور میں دانشوروں اور تعلیم یافتہ دوستوں سے خطاب کرنا تھا۔ میں نے اس سے یہ واقعہ بیان کیا چھوٹے واقعات سے بڑے بڑے دانشوروں اور مصنفوں نے بڑے بڑے نتائج نکالے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ادب، فلسفہ اور عقلیات کا اتنا ہی حصہ قابل احترام نہیں ہے، جس میں بڑی بڑی علمی تحقیقات کی گئی ہوں بلکہ انسانی نفسیات اور ادبیات کا وہ حصہ بھی بڑا قیمتی ہے، جس میں چھوٹے چھوٹے واقعات سے بڑے بڑے نتائج نکالے گئے ہیں، میں نے اس مجموعے (جس میں نوجوانوں کی تعداد خاصی تھی) کہا کہ (Highly Inflammable) پیٹرول کی تعریف ہو سکتی ہے اور جلد آگ پکڑنے والے مادوں کی تعریف ہو سکتی ہے، لیکن ملت اسلامیہ کی یہ تعریف نہیں ہو سکتی، مگر مسلمانوں کے کسی طبقہ کی بھی حالت یہ ہو کہ کسی خلاف طبیعت چیز کو برداشت کرنا ان کے لئے ناممکن ہو اور وہ ہر مسئلہ کو وقار کا مسئلہ بنالیں تو یہ بات بڑی خطرناک ہے۔

یہ واقعہ قوموں اور ملتوں کی زندگی میں صدیوں میں کبھی کبھی آنا چاہئے جب کسی ملت کی اجتماعی توہین ہو، یا شعار اللہ اور اصول دین کا مذاق اڑایا جائے یا ذات نبوی (علیہ الف الف سلام) کی شان میں معاذ اللہ گستاخی ہو، یا کسی مسلمان کی عزت و ابر و خطرے میں پڑ جائے۔ میں اس کی مثال دیتا ہوں۔ خلیفہ معتمد اپنے پورے جاہ و جلال کے ساتھ دربار میں بیٹھا ہوا ہے، بڑے بڑے فضلاء اور بڑے بڑے ارکان سلطنت موجود ہیں، ایک شخص آ کر کہتا ہے کہ امیر المومنین! میں عمودیہ سے آ رہا ہوں (عمودیہ اسلامی سلطنت سے باہر بازنطینی سلطنت کا ایک شہر تھا، جو ابھی اسلامی قلمرو میں داخل نہیں ہوا تھا) وہاں ایک مسلمان خاتون پر کسی عیسائی نے دست داری کی، اس خاتون کی زبان سے بے اختیار جملہ نکلا ”وامعتصماہ“ معتمد کی وہائی ہے! یہ سنتے ہی معتمد نے اس کے جواب میں کہا ”لیک“ (میں حاضر ہوں) معتمد اسی وقت وصیت نامہ لکھواتا ہے، اسی وقت اپنی ذاتی چیزوں کے متعلق ہدایت دیتا ہے مجلس سے اٹھتا ہے۔ خود لشکر اسلامی کی قیادت کرتا ہے اور حاکم عمودیہ کی گوشمالی مسلمان خاتون کی دادرسی اور عمودیہ کو سلطنت اسلام میں شامل کر کے واپس آتا ہے۔ قوموں اور ملکوں کی تاریخ میں اگر

صدیوں میں کبھی ایسا وقت آئے تو غیرت اسلامی کا فتویٰ اور فرمان ہے

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبان عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

لیکن افراد کی زندگی میں اگر گروہوں میں ہر روز اور ہر گھڑی یہ وقت آئے اور وہ فوراً اشتعال میں آجائیں اور جاہلیت عرب کے اس شعر پر عمل کریں۔

لا یسئلون اخاہم حین یند بہم
فی النابات علی مقال برہانا

شاعر ایک قبیلہ کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ان کا حال یہ ہے کہ جب کوئی آواز ان کے کان میں میں پڑتی ہے قبیلہ کے کسی فرد کی طرف سے، تو وہ دلیل نہیں پوچھتے اور وہ یہ پوچھتے کہ یہ مقدمہ جائز ہے صحیح ہے یا غلط اور جس فریق کی مدد کے لئے بلایا جا رہا ہے وہ حق پر ہے یا باطل پر؟ وہ فوراً المداد کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں اور فریق ثانی پر ٹوٹ پڑتے ہیں لیکن اسلام کی یہ تعلیم نہیں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مجلس میں فرمایا: ”انصر اخاک ظالما او مظلوما“ (اپنے بھائی کی مدد کرو چاہے ظالم ہو یا مظلوم) صحابہ کرام کی اپنی ذہنی تربیت ہوئی تھی کہ ان کے ذہن سے غلط چیز کو قبول کرنے کی صلاحیت جاتی رہی۔ ان کو ذات نبوی سے جو تعلق تھا، اس کی مثال ادبیات میں ملتی ہے، نہ نفسیات و اخلاقیات کی تاریخ میں، نہ سیاسیات میں۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ”ما ینطق عن الہوی ان ہوا لا وحی یوحی“ (آپ کی زبان سے جو نکلتا ہے وہ وحی الہی ہے) لیکن خود آپ نے ان کی ایسی تربیت کی تھی کہ کسی ایسی چیز کو قبول کرنے کے لئے ان کا ذہن تیار نہیں تھا جس میں اسلام کی بنیادی تعلیمات کے خلاف کوئی بات کہی گئی ہو۔ انہوں نے کہا ”یا رسول اللہ ننصرہ مظلوما فکیف ننصرہ ظالما؟“ (یا رسول اللہ اگر وہ مظلوم ہے تو ہم اس کی مدد کریں، اگر ظالم ہو تو کیسے مدد کریں؟) انہوں نے سوچا آج ہم کیا سن رہے ہیں؟ ہماری قوت سماعت دھوکہ دے رہی ہے۔ یا ہم معنی نہیں سمجھ؟ آپ اس پر بالکل ناراض نہیں ہوئے آپ نے فرمایا! تم نے تھیک پوچھا، لیکن ظالم کی بھی مدد ہوتی ہے ظالم کی مدد یہ ہے کہ اس کا ہاتھ پکڑو، اس کو ظلم نہ کرنے دو،

اسلام کا اصول یہ ہے کہ مظلوم کی مدد سے ظالم سے چھڑانا ہے، ظالم کی مدد مظلوم کی گردن سے اس کا ہاتھ ہٹانا ہے۔

قوموں اور ملکوں کے لئے جہاں بہت سی چیزیں ضروری اور زندگی کی شرطیں ہیں، وہاں یہ بھی ہے کہ ان کے نوجوانوں میں ضبط کا مادہ ہو، افسوس ہے کہ ہمارے ادب ہمارے افسانوں، شاعری (مجھے معاف کیا جائے) پھر ذرائع ابلاغ عامہ، سنسنی خیز صحافت اور خبروں کی گرم گرم سرخیوں اور مضامین نے جذبات میں جوش اور اشتعال کی ایسی کیفیت پیدا کر دی ہے کہ آدمی ادنیٰ درجہ کی خلاف طبع چیز کو برداشت نہیں کر سکتا۔

میں ابھی چند دن پہلے پٹنہ سے درجنگہ جا رہا تھا، ایک بڑے اجلاس میں شرکت کے لئے۔ کار جب آگے چلی، تو وہاں کے کچھ سمجھدار لوگ کار کے سامنے آگئے اور کہنے لگے، براہ کرم آپ اس راستہ سے نہ جائیے، میں نے کہا کیا بات ہے؟ جہاں پہنچنا تھا اس کو وہی راستہ تھا، انہوں نے کہا وہ ایک اسکول کا لڑکا ایک سرکاری بس کے سامنے آگیا، اسے چوٹ آگئی، اس وقت سے اس اسکول کے تمام لڑکے سرکاری بسوں کو جلا رہے ہیں۔ پرائیوٹ کاروں کو بھی نہیں چھوڑتے، کوئی امتیاز نہیں ہے۔ کوئی کار بھی اس سڑک سے گزرے گی اسے آگ لگا دیں گے، ہمارے ساتھیوں نے کہا کہ ہمارے منہ پر واڑھیاں ہیں، مولوی لوگ ہیں اور ظاہر ہے کہ ہم سرکاری لوگ نہیں ہیں، ہمیں کیا خطرہ؟ انہوں نے کہا کہ نہیں اس وقت بالکل سرسامی کیفیت ہے، کوئی نہیں دیکھتا کہ کون جا رہا ہے، ہر موٹر جلائی ہے ہم نے کہا بہت اچھا، ہمارے بہار کے ایک بڑے عالم تھے۔ انہوں نے کہا کہ نہیں مولانا، اس میں بالکل اصرار نہیں کرنا چاہئے۔ چنانچہ ہم تقریباً تین گھنٹے لیٹ ہو گئے اور پہلا اجلاس ہمیں نہیں ملا، ہم دن رات دیکھتے ہیں۔ دوکاروں کی موٹر سائیکلوں کی ٹکر ہو جاتی ہے تو ایک ہنگامہ ہو جاتا ہے ایک فریق ادھر ہو جاتا ہے دوسرا فریق ادھر قانون کو فوراً ہاتھ میں لے لیا جاتا ہے یہ قانون کو ہاتھ میں لینے کی عادت جو (مجھے معاف کیا جائے) سیاسی تحریکوں نے پیدا کر دی ہے، یہ بھی ایک بڑا مرض ہے جو بوائے کی طرح پھیل گیا ہے۔

کسی ملک کے باقی رہنے کی اور اپنے مقاصد اور اپنی صحیح منزل تک پہنچنے کی ضمانت اس وقت تک نہیں دی جاسکتی ہے جب تک کہ وہاں کے نوجوانوں میں قوت برداشت اور معاملہ کو سمجھنے کی

صلاحیت نہ ہو، کچھ چیز خود اپنی مرضی کے خلاف دیکھنے اور گوارا کر لینے کی صلاحیت نہ ہو۔ جن قوموں نے دنیا میں عظیم سلطنتیں قائم کی ہیں (اس سلسلہ میں عربوں کا نام لوں گا صحابہ کرام کا اور آخر میں سلطنت عثمانیہ کا) ان میں یہ وصف نمایاں طریقہ پر موجود تھا۔ میں ترکی گیا تو میں نے دیکھا کہ ترک قوم میں ہماری مشرقی قوموں کے مقابلہ میں قوت برداشت کہیں زیادہ ہے کہیں میں نے شور ہوتے نہیں دیکھا، نظام کا احترام عام ہے، مشتعل ہو کر دو ٹوکا فساد کرنے کا کوئی واقعہ کم سے کم میرے سامنے نہیں آیا، یہ بے صبری، جلد بازی، قورا جوش اور غصہ میں آ جانا معاشرے کے مریض ہونے کی علامت ہے، اتفاق سے لندن میں مجھے ایک مرتبہ عمومی انتخاب (جنرل الیکشن) کے دیکھنے کا موقع ملا۔ میں نے دیکھا کہ ہر پارٹی کا جو جلوس نکلتا ہے، وہ خاموشی کے ساتھ بینز لگائے ہوئے تھا، جس میں اس کا منشور لکھا ہوا تھا، نہ کوئی نعرہ، نہ آواز، میں نے کہا کہ ہم نے ہندوستان میں جتنے الیکشن دیکھے ہیں تقسیم سے پہلے بھی، تقسیم کے بعد بھی ان میں کوئی سو نہیں سکتا تھا۔ نماز پڑھنا بھی مشکل تھا۔ ایک پارٹی کا آفس ادھر قائم ہے، دوسری کا آفس ادھر قائم ہے۔ اور آوازوں کی طاقت کا مقابلہ ہو رہا ہے کہ کون زیادہ زور سے کہہ سکتا ہے کس کی آواز بلند ہے میں نے کہا کہ یہ عجیب قسم کا الیکشن ہے میں پولینگ اسٹیشن گیا تو دیکھا کہ ایک صاحبزادی دروازہ پر کھڑی ہیں، انہوں نے ہمارے میزبان کو جو ووٹر تھے، تین پرچے دیئے۔ تو وہ تینوں پرچے لے کر اندر گئے، جہاں ووٹ ڈالے جاتے ہیں۔ انہوں نے ووٹ ڈالا اور آکر دو پرچے واپس کر دیئے اور ایک پرچہ رکھ لیا، میں نے کہا یہ کیا بات ہے؟ انہوں نے کہا میں نے جس پارٹی کو ووٹ دیا ہے اس کا پرچہ میں نے رکھ لیا ہے اس لئے وہ سمجھ جائے گی کہ میں نے کس کو ووٹ دیا ہے نہ میں نے کچھ پوچھا نہ اس نے کچھ کہا۔ صبح کو میں اٹھائی وی سے نتائج آنے شروع ہو گئے۔ تو معلوم ہوا کہ الیکشن ختم ہو گیا۔ فلاں پارٹی جیت گئی، ہم نے انہی لوگوں سے انتخابی سیاست کا سبق سیکھا تھا لیکن شاگرد استاد سے بڑھ گیا، ہم نے ان سے سکون تحمل ضبط و نظم کا سبق نہیں سیکھا۔

میں اس وقت آپ حضرات کی توجہ ایک تاریخی حقیقت کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس عظیم جامعہ میں اس مسئلہ پر کچھ ریسرچ کا کام ہو، میں نے جب برطانیہ کی نتائج پڑھی تو معلوم ہوا کہ سترھویں صدی کے اختتام تک برطانیہ کی اخلاقی حالت بہت کمزور تھی

اور کوئی علامتیں برطانوی معاشرہ میں ایسی نہیں پائی جاتی تھیں کہ برطانیہ ایک دن ایک عظیم عالمگیر طاقت قرار پائے گا اور ہندوستان جیسی عظیم مملکت پر اس کا قبضہ ہوگا اور بڑی کامیابی اور خوبی کے ساتھ (خواہ ہندوستانی نقطہ نظر سے وہ استبداد اور ظلم قرار دیا جائے) وہ پورے ملک کو اپنے کنٹرل میں رکھے گا، آپ اگر اس وقت کی شاعری اس وقت کے افسانے اس وقت کا لٹریچر پڑھیں اور اس وقت کے اخبارات کے قائل مل جائیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس سوسائٹی سے متعلق کوئی پیش گوئی نہیں کی جاسکتی تھی کہ یہ سوسائٹی اتنا عظیم مردار ادا کرے گی اور ایشیا میں سب سے بڑی طاقت بن جائے گی اور لوگ کہیں گے کہ برطانوی حکومت میں آفتاب غروب نہیں ہوتا لیکن ایسے انڈیا کمپنی کے ہندوستان میں قدم رکھنے کے بعد جب یہ نظر آئے لگا کہ ہندوستان برطانیہ کے تحویل میں جانے والا ہے اور برطانیہ کے قدم اس ملک میں جم جائیں گے اچانک برطانوی سوسائٹی میں ایک تبدیلی ہوئی، اس کے اندر یہ احساس پیدا ہو گیا کہ ہم ایک بہت بڑی شہنشاہیت کے مالک بننے والے ہیں، ہمیں رکیک اور اور پست حرکتوں سے اپنے ملک سے بے وفائی کرنے سے، اپنی سلطنت کا نام بدنام کرنے سے احتراز کرنا چاہئے۔ اچانک یہ انقلاب رونما ہوا، میں چونکہ برطانوی تاریخ کا طالب علم نہیں ہوں، اس لئے پورے وثوق سے اس انقلاب کے سرچشمہ اور اس تبدیلی کے پیدا کرنے والے آدمیوں تعلیم و تربیت کا کام کرنے والوں اور ذرائع کا تعین نہیں کر سکتا، جو میدان میں آئے اور جنہوں نے برطانوی قوم میں ایک نئی روح پیدا کر دی۔ میرے خیال میں چاہے اس کی کوئی دستاویز نہ ملے مگر اس میں ضرور اس احساس کو دخل تھا کہ خدا نے ہم کو اتنا بڑا ملک دے دیا ہے، اس لئے اب ہمیں اپنے کو اس کا اہل ثابت کرنا چاہئے۔ اس انگریزی دور میں، انگریزوں میں ایسا وقار، ایسی تمکنت اور ایسا رعب پیدا ہو گیا، جو آج خود انگلستان میں دیکھنے میں نہیں آتا۔ شہر کے کسی آدمی کو ہمت نہیں تھی کہ قانون کے حدود سے تجاوز کرے۔ اسٹیشنوں پر دیکھتے تھے کہ ہر کام وقت پر ہو رہا ہے۔ ہر شخص مستعد اور چست ہے، اسکولوں اور کالجوں کا تو کہنا ہی کیا۔ میں اتفاق سے لکھنؤ یونیورسٹی کا طالب علم بھی رہا ہوں۔ یہ ۲۷ء، ۲۹ء کا زمانہ تھا، یونیورسٹی میں (اس زمانہ میں وائس چانسلر عام طور پر انگریز ہوا کرتے تھے) ایک عجیب نظم و ضبط نظر آتا تھا۔ نہ کہیں شور سنائی دیتا تھا نہ عرصہ بازی و منظر ہر دیکھنے میں آیا۔

یہ بات اس سے زیادہ وسیع اور عمیق دائرہ میں عربوں کو پیش آئی کہ صحرائیں جب جب صحرا سے نکلے اور اور دنیا کی عظیم ترین سلطنتوں رومۃ الکبریٰ اور سلطنت سلسلانہ کے وارث ہوئے۔ تو اچانک ان کا ذہن بلند ہو گیا اور جیسا کہ آپ کے پاکستان کے شاعر اور اسلام کے شاعر مولانا ظفر علی خان مرحوم نے کہا ہے۔

بات کیا تھی کہ نہ روم سے نہ ایریاں سے دے
چندے بے تربیت اونٹوں کے چرانے والے
جن کو کافور پہ ہوتا تھا نمک کا دھوکہ
بن گئے خاک کو اکسیر بنائے ۔۔

عربوں کا ذہن ایک دم بلند ہو گیا کہ اب وہ عرب بسوس، داحس وغیرہ کا زمانہ نہیں رہا کہ ایک گھوڑے کے آگے بڑھ جانے پر ایک گھوڑے کے پیچھے رہ جانے پر، پہلے پانی، بعد میں پانی پینے پر، لڑائی کا سلسلہ چالیس چالیس برس تک جاری رہتا۔ بات کیا تھی آغاز کہاں سے ہوا؟ ایک قبیلہ کے سردار کا گھوڑا پیچھے رہ گیا، ایک کا آگے بڑھ گیا، بس اس نے اپنی توہین سمجھی اور سیکڑوں آدمیوں کی جانیں چلی گئیں۔ انہیں عربوں کو آپ دیکھیں گے کہ سلطنت پانے کے بعد یعنی جب مسلم اپنا تر قائم ہوا تو اسکی حالت بالکل دوسری تھی، وہ نہایت متحمل، نہایت اصول پسند، نہایت وسیع النظر اور وسیع القلب بن گئے۔ یہی ہمارے آزاد ہونے والے ممالک میں ہونا چاہئے تھا، مصر میں، شام میں، عراق میں، الجزائر میں، اور مجھے کہنے کی اجازت دیجئے کہ پاکستان میں۔ ایک دم سے ذہن بدل جانا چاہئے تھا اور احساس ذمہ داری، احساس فرض اور احترام قانون کی کار فرمائی ہونی چاہئے تھی۔

الف لیلہ کا قصہ ہے کہ کسی شخص نے بغداد کے کسی معزز آدمی کے یہاں اشرفیوں کی ہانڈی امانت رکھی اور کہا کہ میں جہاد پر جا رہا ہوں، معلوم نہیں شہید ہو جاؤں یا زندہ بچ کر آؤں۔ اگر آپ میری شہادت کی خبر سنیں تو فلاں خاندان کے حوالہ کر دیجئے گا۔ ہانڈی رکھ دی گئی، لیکن شہادت ان کے مقدر میں نہ تھی، وہاں سے صحیح سلامت واپس ہوئے تو ان صاحب کے پاس گئے اور کہا کہ ”آپ کو یاد ہوگا کہ فلاں موقع پر میں آیا تھا اور میں نے آپ کے پاس ایک ہانڈی امانت رکھی تھی، اس میں اشرفیاں تھیں، اب میں لینے آیا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ آپ کون

ہیں؟۔ میں پہنچا نہ تھا نہیں، کچھ اور یاد دلائیے، میرے یہاں تو ایسی کوئی چیز نہیں رکھی جاتیں، دیکھنیے کہیں رکھی ہو تو اٹھا لیجئے۔ ”وہ بے چارے منہ دیکھتے رہ گئے کوئی تحریر ان کے پاس تھی نہیں، انہوں نے بہت یاد دلانے کی کوشش کی، کہا شہر میں آپ کی بڑی حیثیت ہے، آپ امانت حوالہ کر دیجئے انہوں نے تجاہل عارفانہ برتا، وہ اپنا سامنہ لیکر چلے گئے۔

وہ قاضی صاحب کے پاس گئے، قاضی صاحب بہت ذہین اور نفسیات سے واقف تھے۔ انہوں نے کہا ”تم خاموش رہو، میں ایک ترکیب کرتا ہوں، انہوں نے دو چار آدمیوں سے ذکر کیا کہ فلاں صاحب کو فلاں عہدہ ملنے والا ہے ان کو فلاں جگہ کا صوبہ دار بنایا جانے والا ہے، یا ان کو وزارت ملنے والی ہے، وہ چاہتے تھے کہ اس کا چرچا ہو، ایسی کوئی بات راز نہیں رہتی، رفتہ رفتہ صاحب معاملہ نے بھی سن لیا کہ مجھے فلاں عہدہ ملنے والا ہے یہ مرحلہ طے ہو گیا تو قاضی صاحب نے ان صاحب کو بلایا اور کہا کہ اب جا کر تم ان سے تقاضا کرو۔ یاد دلاؤ، ذرا تہذیب سے کہنا کہ شاید اب آپ کو یاد آ گیا ہو، وہ صاحب گئے جیسے ہی صاحب خانہ نے ان کو دور سے دیکھا کہا آئیے آئیے، اوہ ہواتے دن کہاں رہے؟ آپ نے تو مجھے پتہ بھی نہیں بتایا میں آپ کو بلاتا۔ مجھے یاد آ گیا، وہ فلاں قسم کی فلاں رنگ کی ہانڈی تھی نا؟ وہ وہاں رکھی ہوئی ہے آپ لے لیجئے۔ وہ گئے جوں کی توں ہانڈی ان کو مل گئی۔ انہوں نے قاضی صاحب سے پوچھا، بات کیا ہوئی ان دونوں میں جوڑ کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ بات یہ ہے کہ آدمی کو جب کوئی بڑی چیز مل جاتی ہے تو چھوٹی چیز اس کی نظر سے گر جاتی ہے جب ان کو معلوم ہوا کہ مجھے اتنا بڑا عہدہ ملنے والا ہے (جاہ مال سے زیادہ حیثیت رکھتا ہے) تو انہوں نے کہا کہ کہاں کی ہانڈی کہاں کی اشرفیاں؟ اس میں میری بدنامی ہوگی ہو سکتا ہے کہ اس سے اس میں رکاوٹ پڑ جائے، کوئی صاحب خلیفہ سے جا کر کہہ دیں کہ امیر المومنین! آپ کس کو وزیر بنا رہے ہیں، کس کو آپ صوبہ دار بنا رہے ہیں؟ وہ تو خائمن ہے! چور ہے! میری ہانڈی اس نے ہضم کر لی، تو انہوں نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ ہانڈی ان کے حوالہ کر دی جائے۔

دوستو اور عزیزو! آپ کو اللہ نے اتنی بڑی مملکت عطا کی ہے اتنا بڑا اعزاز بخشا ہے، خدمت و عزت کے ایسے زریں اور نایاب مواقع دیئے ہیں۔ آپ کو اب اسی پستی یہ گراوٹ، اشتعال پذیری، خود غرضی تنگ نظری، تنگ دلی، قانونی شکنی، ایذا رسانی سے بلند ہونا چاہئے جس کو اللہ

اتنا بڑا موقع دے، اتنا عظیم ملک اس کی تحویل میں آجائے، وہ ایسی چھوٹی چھوٹی چیزوں میں پڑے؟ اللہ نے آپ کو انسانیت کی خدمت کا، اسلام کی ترقی اور نام اوچھا کرنے کا موقع دیا اور آپ اتنے چھوٹے چھوٹے مسئلوں پر مشغول ہو جاتے ہیں؟ لکھنؤ کے محاورہ میں ”کچھ آؤ تاؤ نہیں دیکھتے“ آپ کیلئے اقبال کا یہ شعر ہے۔

تو ہما کا ہے شکاری، ابھی ابتداء ہے تیری
نہیں مصلحت سے خالی یہ جہان مرغ و ماہی

آپ مرغ و ماہی کے شکاری نہیں ہیں، آپ ہما کے شکاری ہیں۔ آپ بڑی بڑی قوموں اور ملکوں کے مسئلوں کے حل کرنے کی کوشش کیجئے، ان کو حل کرنیکی صلاحیت پیدا کیجئے۔ آپ کا کام روزمرہ کے شہری معاملات میں الجھنا اور ان میں اپنی طاقت ضائع کرنا نہیں ہے، ذرا سی کوئی بات آپ کی مرضی اور معیار کے مطابق نہیں ہوئی کہ آپ بالکل آپ سے باہر ہو جاتے ہیں، یہ مسلم نوجوانوں تعلیم یافتہ نوجوانوں کے نمایان شان نہیں۔

میں جناب وائس چانسلر صاحب اور یونیورسٹی کے ذمہ داروں کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے مجھے عزت بخشی اور اپنے عزیز نوجوانوں کو خطاب کرنے کا موقع دیا، اس اعتماد اور حسن ظن کیلئے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے اس سرم (اور سرم میں ہر لحاظ سے کہتا ہوں) موسم میں میری ٹھنڈی باتیں، ٹھنڈے دل اور سکون دماغ کے ساتھ سنی۔

والسلام علیکم!

اٹھو! کہ اب گردش جہاں کا انداز اور ہے

دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ (ہندوستان) کے جمعیۃ الاصلاح کے افتتاحی جلسہ میں حضرت مولانا فی ایب یادگار اہم اور پرمغز تقریر۔

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

عزیزو! دارالعلوم کا ایک بڑا مقصد یہ تھا کہ یہاں سے طالب علم جس وقت فارغ ہو کر نکلے تو وہ باہر کی دنیا کے لئے اجنبی نہ ثابت ہو۔

ایسا نہ ہو کہ یہ مدت جو دارالعلوم کے اندر گزاری ہے، وہ ان کی باہر کی دنیا سے بالکل علیحدہ ہو بلکہ یہاں رہتے ہوئے بھی باہر کے جھونکے اندر آتے رہیں، وہ روزن اور کھڑکیاں کھلی رہیں جن سے ہم باہر کی دنیا دیکھ سکیں۔

”الاصلاح“ کا قیام ایک جرأت مندانہ اقدام تھا:

جس وقت دارالعلوم قائم ہوا اس وقت ہمارے قدیم عربی مدارس میں تدریس کے لئے ایک خاص طرح کی زبان مستعمل تھی، اور اظہار خیال کے لئے بھی ایک مخصوص اسلوب اور طرز تحریر رائج تھا، یہ قدیم اصاب تعلیم کا قدرتی نتیجہ تھا، اس کے الفاظ اور اس کی تعبیرات، اس کے محاورے اور اظہار خیال کے طریقے تمام اس طرز تعلیم سے متاثر تھے، جو اس زمانے میں رائج تھا، اس زمانے کے مدارس میں اخبارات و رسائل پڑھنے کا بھی کچھ زیادہ رواج نہیں تھا، بلکہ شاید اخبارات اور رسائل کا مطالعہ کسی درجہ میں معیوب سمجھا جاتا تھا، جو لوگ اخبار و رسائل پڑھتے تھے وہ مطعون کئے جاتے تھے، اور ان کی انگشت نمائی ہوتی تھی کہ یہ تعلیم کا حرج کر کے اخبار و رسائل دیکھتے ہیں۔ اس وقت دارالعلوم میں طلباء کی ایسی انجمن قائم کرنا جس کا ایک دارالمطالعہ ہو، اور دارالاجار بھی، جس میں ہفتہ وار خطابت کے جلسے ہوتے ہوں اور اس کا نظم و نسق سب طلبہ کے ہاتھ میں ہو، ایک بڑا حقیقت پسندانہ اور جرأت مندانہ اقدام تھا، آج تو یہ

چیز ہماری زندگی میں ایسی گھل مل گئی ہے، اور ایک ایسے سکہ رائج الوقت کی طرح ہو گئی ہے، جس میں کسی قسم کی کوئی ندرت یا جدت نظر نہیں آتی، لیکن آج سے ستر برس پہلے اس گزشتہ صدی کے بالکل آخر میں جب دارالعلوم قائم ہوا اور ہمارے ابنائے دارالعلوم نے جن کا نام اکثر کتابوں میں مل سکتا ہے، انجمن ”الاصلاح“ قائم کی، اس وقت اس اقدام کی بڑی اہمیت تھی، اور اس میں بڑی جدت تھی، اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہوں نے وہ زمانہ دیکھا ہو، اس زمانہ کے لحاظ سے یہ ایک بڑا مفید قدم تھا، اور کوئی شبہ نہیں کہ اس زمانہ میں انجمن الاصلاح نے بڑا مفید کام انجام دیا اور اس کے بعد سے لے کر اس وقت تک مفید کام انجام دیتی رہی اور اس میں بہت سے ایسے لوگوں کی تربیت ہوئی جنہوں نے یہاں سے نکل کر اپنی اس مشق اور مہارت سے بہت فائدہ اٹھایا، اس لحاظ سے دارالعلوم کے ان فرزندوں اور ”الاصلاح“ کے بانیوں کو جتنی بھی داد دی جائے، اور ان کی خدمات کو جتنا بھی سراہا جائے کم ہے۔

آج زمانہ بہت بدل چکا ہے:

لیکن میرے عزیزو! زمانہ میں ہر چیز کی قدر و قیمت اس زمانے کی ضروریات اور اس زمانے کے معیار کے لحاظ سے ہوتی ہے۔ جس زمانہ میں یہ قدم اٹھایا گیا تھا، اس زمانہ میں یہ علماء کی روشن خیالی کا ایک بہت بڑا ثبوت تھا اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہمارے ادارہ کو اس میں اولیت حاصل ہے۔ لیکن اس کے بعد سے زمانہ کا بڑا سرگرم سفر رہا ہے، وہ ایک منٹ کے لئے جامد و سہکتا نہیں ہوا، اس نے کسی منزل پر قیام نہیں کیا، خیالات بدلتے رہے، ضروریات بدلتی رہیں، تقاضے بدلتے رہے، نئے نئے مسائل پیدا ہوتے رہے، نئے نئے میدان اور نئے نئے چیلنج سامنے آتے رہے اور علماء سے اپنے جوابات مانگتے رہے، اب اس زمانہ میں اخبارات و رسائل کا مطالعہ یا کسی بزم کا قیام ایک ایسی عام چیز ہو گئی ہے کہ اس سے کوئی چھوٹے سے چھوٹا مدرسہ بھی اس وقت مشکل سے خالی ہوگا، گاؤں گاؤں قصبے قصبے ایسی انجمنیں قائم ہیں جہاں تقریروں کی مشق کرائی جاتی ہے، لوگوں نے خاندان، براہوری کی سطح پر بہت سی انجمنیں قائم کر رکھی ہیں، اور عربی مدارس میں بھی عام طور پر ایسی انجمنیں جمعیتیں پائی جاتی ہیں، بعض مدارس میں تو میرے خیال میں کئی درجن انجمنیں ہوں گی، یہاں تک کہ ضلع وار بھی انجمنیں قائم ہیں، اب زمانہ ان چیزوں سے بہت آگے بڑھ گیا ہے، اب سلیجی ہوئی تقریر کرنا، یا ان اخبارات

رسائل کا پڑھ لینا، اور اس بات سے واقف ہونا کہ کہاں کہاں سے یہ اخبارات و رسائل نکلتے ہیں، اور ان میں کیا لکھا جاتا ہے، یا ایک شستہ تقریر کر لینا، ایک رواں مضمون لکھ دینا، اپنے خیالات کو شائستہ انداز میں ادا کر لینا کافی نہیں رہا، اس میں کسی قسم کا امتیاز باقی نہیں رہا، اب یہ چیزیں دور ماضی کی ایک یادگار ہیں، اور اس توقع پر قائم ہیں، اور انکو قائم رکھا جاتا ہے، اور ہمت افزائی کی جاتی ہے کہ شاید ان میں وسعت پیدا ہو اور یہ زمانہ کے نئے تقاضوں کی تکمیل کر سکیں، ورنہ جہاں تک کسی بزم خطابت کا تعلق ہے، کسی دارالافتاء کا تعلق ہے، ان میں کوئی جدت اور کوئی فوقیت باقی نہیں رہی۔

متوسط درجہ کی لیاقت کافی نہیں:

ایک زمانہ تھا جب علماء کا شستہ اردو لکھ لینا اور اس زمانہ کے محاورہ اور اسلوب کے مطابق تصنیف و تالیف کر لینا بڑی قابل تعریف بات سمجھی جاتی تھی، بہت سے علماء اپنے خیالات کے ادا کرنے پر پوری قدرت نہیں رکھتے تھے، اور نئے خیالات کے لئے قدیم زبان ہی استعمال کرتے تھے، لیکن یہ چیزیں اب بہت عام ہو گئی ہیں، ندوۃ العلماء کا قیام جس زمانہ میں ہوا اس زمانہ میں کسی ندوی فاضل کا کسی تاریخ موضوعی پر کچھ لکھ دینا یا اس میں قدیم ماخذ میں سے تمام ضروری اور متعلق مواد جمع کرنا اور سلیقہ کے ساتھ اس کو ترتیب دینا ایک بڑا علمی کارنامہ سمجھا جاتا تھا، اس وقت کسی فاضل کے لئے یہ بابت بس تھی کہ اس نے مسلمانوں کی تہذیب کے کسی پہلو، مسلمانوں کے کسی علمی کارنامے، مسلمانوں کی کسی تہذیبی و تمدنی خدمت یا کسی دور حکومت یا کسی مسلمان حکمران خاندان پر ایک ایسی متوسط درجہ کی کتاب لکھ دی جس میں اگرچہ کوئی ریسرچ یا کوئی خاص قسم کا نظریہ ثابت نہ کیا گیا ہو، تاہم سلیقہ کے ساتھ اس کا مواد جمع کر دیا گیا ہو، یا پڑھنے والوں کو اس سے وحشت نہ ہوتی ہو، یہ بات کسی قدیم درس گاہ کے افتخار کے لئے اس وقت بہت کافی تھی۔

لیکن میرے عزیزو! اب حالات بہت مختلف ہو چکے ہیں، اگر ہماری انجمن کا مقصد یہی ہے کہ متوسط درجہ کے خطیب اور مقرر پیدا کرے، ہمارے طلباء اخبارات و رسائل سے ناواقف نہ رہیں، اور ان کو یہ معلوم ہو کہ اس زمانے میں کیا رجحانات کام کر رہے ہیں، اس زمانے میں کون ادیب اور کون مصنف ہے، اور کون کون صاحب طرز اہل قلم، تو یہ بات بالکل

نا کافی ہے۔

زمانہ کا دامن سمٹتا اور پھیلتا رہتا ہے:

زمانہ اب اس سے بہت زیادہ کا طالب ہے، زمانہ کا دامن سمٹتا اور پھیلتا ہے، زمانہ کی جھولی اور اس کا شکل و گدائی ایک ناپ کا نہیں رہتا، وہ حالات کے مطابق لوگوں کی استعداد کے مطابق نئے سیاسی تغیرات اور تبدیلیوں کے مطابق ہر دور میں ہر جماعت سے اپنے زمانہ اور پیمانہ کے مطابق رہنمائی اور رہبری کا طالب ہوا کرتا ہے، اب یہ زمانہ اس بات کا بالکل متحمل نہیں ہے، اور محض اس پر دینی درس گاہ کے طالب علم کو کسی قسم کا کوئی تصدیق نامہ دینے کے لئے تیار نہیں ہے کہ اس میں کچھ اچھے بولنے والے پیدا ہو جائیں، کچھ متوسط درجے کے لکھنے والے پیدا ہو جائیں۔

آج پہلے سے کہیں زیادہ تیاری کی ضرورت ہے:

اس وقت جو ایک عام ذہنی انتشار اور ایک قسم کی مایوسی ملت پر پھیل رہی ہے، اور ملت کی صلاحیت کی طرف اور دین میں جو صلاحیت و ودیعت کی گئی ہے، اس صلاحیت کی طرف سے یا دین کے مستقبل کی طرف سے جو بدگمانی اور بے اعتمادی پیدا ہو رہی ہے، نو جوانوں میں جدید تعلیم یافتہ طبقوں اور حاملین دین میں جو بے اعتمادی پھیل رہی ہے اس کو دور کرنے کے لئے بہت زیادہ تیاریوں کی ضرورت ہے، اس سے بہت زیادہ علمی فتوحات حاصل کرنے کی ضرورت ہے، اس سے بہت زیادہ بلند پروازیوں کی ضرورت ہے، اس سے بہت زیادہ کاوشوں، اسوزیوں اور دماغ سوزیوں کی ضرورت ہے، جو ہمارے اسلاف نے کیں، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہمارے ندوۃ العلماء کے صف اول کے مصنفین اور اہل قلم نے اس زمانے کی نسلوں کو بہت کچھ دیا، انہوں نے اس زمانے کی نسل کو بڑی حد تک مطمئن کرنے کی کوشش کی، جو مسائل اس عہد میں اہمیت رکھتے تھے، ان مسائل پر انہوں نے جو چیزیں پیش کیں، وہ اس زمانے کے لحاظ سے بہت طاقتور اور دل نشین تھیں، لیکن اگر آج ان چیزوں کو دہرایا جائے یا بالکل ان کی نقل کی جائے تو اس میں کوئی علمی استدلال نہیں ہوگا، اور لوگوں کو بڑی مایوسی ہوگی۔

تحقیق و مطالعہ کا میدان بہت وسیع ہے:

تحقیق اور مطالعہ کا میدان بہت وسیع ہو چکا ہے، قدیم ذخیرے بلکہ قدیم دہنے جو پہلے

علماء کے خواب و خیال میں بھی نہیں آتے تھے، اب عام ہو چکے ہیں، نشر و اشاعت کے اداروں نے اور طباعت و اشاعت کی تحریک نے زمین کے جگر چاک کر دیئے ہیں اور سمندر روں کے اندر سے موتی نکالے ہیں، وہ چیزیں جن کا ہم صرف نام سنتے تھے، وہ آج بازاروں میں مل رہی ہیں، سوچنے کے طریقے اور مطمئن کرنے کی صلاحیت اتنی مختلف ہو گئی ہے کہ ان میں قدیم طرز کی بالکل تقلید نہیں کی جاسکتی۔

بہت سے قدیم مباحث آج اپنی اہمیت کھو چکے ہیں:

ایک زمانہ تھا کہ مولانا شبلی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ”الجزیۃ فی الاسلام“ معرکہ لا آرا کتاب سمجھی جاتی تھی ”اور نغزیب عالمیہ پر ایک نظم“ گویا علمی فتح تھی، اسی طریقے سے ان کا ”کتب خانہ اسکندریہ“ بڑی محققانہ کتاب یا یوں سمجھئے کہ اسلام کی طرف سے ایک حجت تھی، لیکن آج یہ مباحث اپنی اہمیت اتنی کھو چکے ہیں کہ اگر ان مباحث پر لکھا جائے تو اس میں لوگوں کے لئے کوئی نئی بات اور دلچسپی نہ ہوگی، اس زمانے میں اس سے بہت زیادہ وسیع علم اور اس سے بہت زیادہ محنت و کاوش کی ضرورت ہے۔

زمانہ آسانی کے ساتھ کسی کو تسلیم نہیں کرتا:

یہ علمی معیار بھی ہمارے لئے یقیناً قابل احترام ہے، اس کے ساتھ بہت عزیز یادیں اور یادگاریں وابستہ ہیں، یہ ہماری تاریخ کا ایک جز ہے، لیکن زمانہ بڑا بے رحم ہے اور بڑا بے مروت واقع ہوا ہے، وہ بڑی سے بڑی مقدس جماعت کے ساتھ بھی مروت نہیں کرتا، وہ کسی کے سامنے آسانی کے ساتھ سر تسلیم خم نہیں کرتا، زمانہ کی فطرت ہے کہ جب تک اس کو اعتراف پر مجبور نہ کر دیا جائے وہ کسی کا اعتراف نہیں کرتا، کسی چیز کا تسلسل زمانہ کے لئے بالکل کافی نہیں ہے، زمانہ ایسا حقیقت پسند، ایسا بے مروت، اتنا غیر جانبدار ہے کہ جب تک اس کے ہاتھ کوئی نئی چیز نہ دی جائے اور اس کی گردن کو کسی بوجھ سے ایسا بوجھل نہ کر دیا جائے کہ وہ جھکنے پر مجبور ہو جائے، اس وقت تک وہ جھکنے کے لئے تیار نہیں ہوتا، زمانہ سے کسی قسم کا اقرار کر لینا، کسی قسم کی سند حاصل کرنا، کوئی تمغہ امتیاز یا خراج عقیدت حاصل کرنا بچوں کا کھیل نہیں ہے اور محض روایت پرستی اس کے لئے کافی نہیں ہے، زمانہ کو اعتراف پر مجبور کرنے کے لئے، اپنی فوقیت کا

نقش قائم کرنے کے لئے، اپنے ادارے کا احترام دلوں اور دماغوں میں پیدا کرتے کے لئے، اپنے لئے مناسب اور شایان شان مقام حاصل کرنے کے لئے آپ کو بڑی جدوجہد کرنا پڑے گی، آپ کو اپنا معیار بلند کرنا پڑے گا، اس زمانہ میں اگرچہ علم نے بڑی ترقی کی ہے، اور اس میں بہت سے نئے میدان پیدا ہو گئے ہیں، اور اس کی اہمیت و وسعت میں برابر اضافہ ہو رہا ہے، لیکن اسی کے ساتھ علمی زندگی کی مشکلات کچھ ایسی ہیں، زمانے نے ایسی نئی کڑیاں دی ہیں اور ایسے انقلابات ملک میں پیش آچکے ہیں کہ اب محض علم کی وسعت، تحریر کی شگفتگی، خیالات کی بلندی اور نظریات کی جدت کافی نہیں ہے، اب اس کے ساتھ بلند کردار کی اور درد مند و پرسوں دل کی بھی ضرورت ہے۔

آپ شاید میرے الفاظ کو بے محل سمجھیں گے اور کہیں گے کہ یہ زمانہ یا حقیقت کی ترجمانی نہیں ہے، اس لئے کہ زمانہ ان تمام قدروں سے باغی ہوتا چلا جا رہا ہے، جو ہم کو عزیز تھیں، جن کو مذہب نے پیش کیا ہے، لیکن اسی کے ساتھ آپ دیکھیں گے کہ بجائے اس کے کہ شخصیت سے، عمل سے، کردار سے، زمان کی مرعوبیت ختم ہو، بڑھتی چلی جا رہی ہے، ہر انقلاب کے پیچھے آپ کو کوئی ایسی شخصیت نظر آئے گی جس نے رفقاء کی بڑی تعداد کو متاثر کیا، ان کے افکار و خیالات پر اثر ڈالا اور ایک نئی ذہنی رو پیدا کی، اور اس کی وجہ سے واقعات اور تغیرات کا ایک نیا دھارا نمودار ہوا۔

یقین کی طاقت:

ہر انقلاب کے سرے پر جہاں سے اس انقلاب کا چشمہ پھوٹتا ہے، جہاں سے انقلاب کا سیل رواں آگے بڑھتا ہے، آپ کو ایسی شخصیت نظر آئے گی، جس کے اندر کسی چیز کا یقین و دل و دماغ کی تہہ میں پیوست ہے، اور تمام اعصاب پر پوری طرح حاوی ہے، جس کے اندر ایسی ایسی مقناطیسی برقی قوت موجود ہے جو سینکڑوں اور ہزاروں کو متاثر کرتی ہے، محض خطابت سے، دو چار اچھی تصنیفات سے، قلم کی روانی سے، خیالات کے سلجھاؤ سے، کسی نادر علمی تحقیق سے، محض کسی نئے طرز میں کسی پرانے خیال کو یا نئے جام میں کسی شراب کہن کو پیش کرنے سے زمانہ میں کوئی نیا انقلاب اور انقلاب تو بڑی چیز ہے، کوئی عمومی تبدیلی بھی پیدا نہیں ہو سکتی، اس زمانے میں ضرورت ہے کردار کی، قلب کی درد مندی اور اندرونی سوز کی، ایک ایسی حرارت کی جو اندر

اندر جا رہی ہو، اعصاب کو پگھلا رہی ہو اور پھر یہ لاوا پھوٹ کر کوہ آتش فشاں کی طرح بڑھ رہا ہو، اور اس کی تپش سینکڑوں اور ہزاروں دلوں کو گرما رہی ہو۔

جہاں تک میرا مطالعہ ہے، کم از کم اسلامی تاریخ کے حدود میں شاید کوئی انقلاب خالص خطابت اور طاقت لسانی سے پیدا نہیں ہوا، اس زمانے کا بہت بڑا مسئلہ جس کی طرف آپ کو اجمالی طور پر متوجہ کرتا ہوں بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں اشارہ کرنا چاہتا ہوں، جس کو علامہ اقبال نے چھیہ اٹھا۔

انہوں نے کہا کہ زمانہ کا مجدد کہلانے کا مستحق وہ ہوگا جو اسلامی شریعت کی برتری ثابت کرے اور زندگی سے اس کا پیوند لگائے، اور یہ ثابت کرے کہ اسلامی قانون وضع قانون اور انسانوں کے تمام خود ساختہ قوانین سے آگے ہے، وہ زمانے کے آگے کی چیز ہے، وہ زمانہ اس سے آگے بڑھ نہیں سکا اور دنیا نے خواہ کتنی ہی ترقی کی ہو، لیکن اسلامی قوانین اس کی رہنمائی کی اب بھی صلاحیت رکھتے ہیں، اس کے تمام سوالات کے جوابات دیتے ہیں اور انسانی زندگی کے پیدا ہونے والے مسائل کا ان کے اندر حل ہے، ان میں ایک بالغ معاشرے کی تنظیم کی بہترین صلاحیت ہے، انہوں نے اس سوال کو اٹھایا تھا اور ان کی بڑی تمنا تھی کہ وہ اس کا جواب دیں وہ اس سلسلہ میں ہمارے مولانا سید سلیمان ندوی سے بڑی مدد کے طالب تھے جیسا کہ انہوں نے اپنے خط میں لکھا ہے، علوم اسلامیہ کے جوئے شیر کا قریب مولانا سید سلیمان ندوی کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے جو علامہ شبلی کے صحیح جانشین ہیں، آج بھی یہ سوال اسی طریقے سے زندہ ہے، اور جواب چاہتا ہے، اسلامی قانون کی برتری ثابت کرنے کے لئے علماء کو میدان میں آنا چاہئے۔

سب سے بڑا معرکہ افکار:

اسی طریقے سے اس وقت جو سب سے بڑا فیصلہ کن معرکہ عالم اسلام میں درپیش ہے، اور جس میں بہت سے ممالک آزمائش کے دور سے گزر کر اس غلط منزل پر جا پہنچے ہیں، جس کے تصور سے بھی ہمارے اسلاف کی نیند حرام ہوتی ہوگی، اور بہت سے ممالک اب اس منزل کی طرف بہت تیزی سے گامزن ہیں وہ ہے ”اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش کا مسئلہ“ اس وقت اس طبقے کے درمیان جس کے ہاتھ میں زمام حکومت ہے اور سواد اعظم اور عامۃ المسلمین کے درمیان ایک بہت بڑی ذہنی کشمکش برپا ہے۔ اس وقت جس طبقے کے ہاتھ میں زمام کار آئی ہے، وہ مغربی

تہذیب و مثالی اور انسانی تجربات کی آخری منزل اور حرف آخر سمجھتا ہے، وہ اس کی زندگی کی تنظیم کی آخری کوشش سمجھتا ہے، اور انسانی مسائل کے حل کا آخری کامیاب تجربہ سمجھتا ہے، اور اس کو اسلام کے نظام کا قائم مقام خیال کرتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ اسلام کا نظام اپنی ساری افادیت کھوپ کا ہے، اب اس کو دوبارہ اس کارگاہ میں لانے کی رحمت دینا صحیح نہیں ہے، یہ ہے وہ زندہ سوال جو اس وقت ایک شعلہ کی طرح ایک بھڑکی ہوئی آگ کی طرح تمام اسلامی ممالک میں پھیل چکا ہے۔ اور جس کے اثر سے کوئی طبقہ اور کوئی پڑھا لکھا انسان پورے طور پر محفوظ نہیں ہے۔

آج کا تجدیدی کام:

اس وقت سب سے بڑا تجدیدی کارنامہ اور میں سمجھتا ہوں کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کا سب سے بڑا مقصد گویا اس کامجہ جواز، اس کی افادیت کا سب سے بڑا ثبوت اور اس کے اسلاف کی کوششوں کا سب سے بڑا پھل نیز ان کی محنتوں کا اور ان کی قربانیوں کا سب سے بڑا مطالبہ یہ ہے کہ ندوہ کے فضلاء اسلامی ممالک میں یا غیر اسلامی ممالک میں جہاں بھی ہوں، اس کا ایسا جواب دینے کی کوشش کریں جو لوگوں کو مطمئن کر سکے، اور مغربی فلسفہ کا وہ اثر کم کر سکے جو اس وقت پورے عالم اسلام پر اپنا سایہ ڈال چکا ہے۔ آج ان ملکوں میں اسلام کی اور مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ کیا جا رہا ہے، اور تمام اسلامی ملک کم و بیش اس مسئلہ سے دوچار ہیں۔

یہ چیلنج قبول کیجئے:

یہ وہ چیلنج ہے جسے آپ کو قبول کرنا ہے، اسی کے معیار کے مطابق اپنے آپ کو تیار کرنا ہے، اس وقت آپ کو اپنی ذہانت کا ثبوت دینا ہے اور ہم کا وہ نمونہ اور معیار سامنے لے کر آنا ہے جو زبان کے اعتبار سے، اسلوب کے اعتبار سے، مواد کے اعتبار سے، مطالعہ مذاہب اور تقابل ادیان کے اعتبار سے متوجہ کرنے والا ہو، جس کو دیکھ کر زمانہ خود اس بات کا اعتراف کرے کہ آپ نے ایسی چیز سامنے رکھی ہے جو واجب الاعتراف ہے۔

آج زمانہ زیادہ اہم چیزوں کا طالب ہے:

میں اس بات کو پھر دہراؤں گا کہ زمانہ اب آپ سے بہت سی نئی چیزوں کا طالب ہے،

ان چیزوں میں بہت زیادہ نازک اور اہم چیزوں کا طالب ہے، جن کا وہ ہمارے اسلام سے طالب تھا۔ اقبال کا شعر ہے:

نگہ بلند خن دنواز، جاں پرسوز

یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لئے

اب اس خن میں دنوازی بھی نہیں رہی، لیکن خن دنواز بھی کافی نہیں، اس کے ساتھ جان پرسوز اور نگاہ بلند بھی ہونی چاہئے، آپ جن کی طرف اپنا انتساب کرتے ہیں اور جن کی اس عزیز میراث کے وارث ہیں، میں یہ نہیں کہتا کہ وہ آسمان سے ستارے توڑ لائے، لیکن اس زمانے کے مزاج اور معیار کے مطابق انہوں نے اپنی شان قائم رکھی، اور اس میں انہوں نے ایک مقام حاصل کیا، پھر اس مقام کو انہوں نے اپنی نسلوں کی طرف منتقل کیا، آپ کو اس کے لئے بہت زیادہ محنت کرنی پڑے گی، آپ تقریروں کا معیار بلند کیجئے، تحریروں کا معیار بلند کیجئے، مطالعہ وسیع کیجئے، اور اس کے لئے اساتذہ سے، خاص طور پر مربی ”الاصلاح“ سے اور ان اساتذہ سے جن سے آپ کا رابطہ ہے، ان سے مشورہ کیجئے، مطالعہ اتنا آسان نہیں ہے کہ جس کا بی چاہے بغیر کسی ترتیب کے پڑھنا شروع کر دے، یہ دودھاری تلوار ہے، اگر اس کا صحیح استعمال نہیں کیا جائے گا تو وہ نقصان بھی پہنچا سکتی ہے، یہ ایک پل صراط ہے، اس پر بہت سبک روی اور بہت احتیاط کے ساتھ چلنے کی ضرورت ہے، اس کے لئے اپنے اساتذہ سے مشورہ کیجئے، وقت بہت کم، کام بہت زیادہ، پڑھنے کا سامان بھی روز بروز بڑھتا چلا جا رہا ہے، نہ ہر لکھی ہوئی اور چھپی ہوئی چیز پڑھنے کے قابل، نہ ہر سالہ آپ کی میز پر آنے کے لائق۔

یہ علم کا، تہذیب کا، خیالات کا اور مقاصد کا حرم ہے:

یہ علم کا، تہذیب کا، خیالات کا اور مقاصد کا ایک حرم ہے، اس حرم میں انہیں چیزوں کو آنا چاہئے اور ان چیزوں کو آنے کی اجازت دینی چاہئے جو آپ کے مقاصد سے مطابقت رکھتی ہوں، جو اس درگاہ کے بانیوں کے مقاصد سے مطابقت رکھتی ہوں، جس طرح آپ یہاں کسی بدبودار چیز کو نہیں آنے دے سکتے، اسی طریقے سے آپ کی میز پر کوئی ایسا رسالہ بھی نہیں آنا چاہئے جو اس سے زیادہ متعفن اور مضر ہے، اور یہاں کی فضا کو اس سے زیادہ متاثر کر سکتا ہے۔

یہ میز کسی پبلک لائبریری کی میز نہیں ہے، یہ ایک درس گاہ کی میز ہے، یہ ایک معمول ہے،

ایک بہت بڑی کارگاہ ہے، جہاں ان دماغوں کو ڈھلنا ہے جو امت کی رہبری کریں گے، یہاں کی الماریوں میں کسی ایسی کتاب کو رہنے کا حق نہیں ہے، جس کی پدیوان دیواروں کو توڑ کر باہر آتی ہو، جس کو ایک مرتبہ پڑھنے کے بعد انسان کئی کئی ہفتے چنی انتشار میں مبتلا رہے، اور ان خیالات، مقاصد اور ان تعلیمات سے اس کو کوئی اتفاق باقی نہ رہے، جو اس درگاہ کے بنیادی مقاصد میں داخل ہیں، اس کے لئے آپ کے دل اور ضمیر کا احتساب کافی ہے۔

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے

ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

(اقبال)

ہنگل زبان میں فاضلانہ مہارت پیدا کیجئے

۱۴ مارچ ۸۴ء کو جامعہ اداوہ شوریہ کے میدان میں ملا، طلباء کے ایک بڑے مجمع میں کی گئی ایک تاریخی اور اہمیت کا خطاب۔

الحمد لله بحمده ونستعينه ونستغفره ونعوذ بالله من شرور انفسنا ومن سيئات اعمالنا من يهد الله فلا مضل له ومن يضلل فلا هادي له ونشهد ان لا اله الا الله ونشهد ان محمدا عبده ورسوله الذي ارسله الله تعالى بالحق بشيرا ونذيرا وداعيا الى الله باذنه وسراجا منيرا

حضرات، اہل علم و فکر، مدرسین و اساتذہ، طلباء عزیز!

ملک کا رشتہ اسلام سے کمزور نہ ہونے پائے!

آپ کا پہلا فرض یہ ہے کہ ملک کا رشتہ اسلام سے کمزور نہ ہونے پائے، جس ملک کو اللہ نے آپ کے لئے انتخاب کیا ہے، اس کے بارے میں آپ کو خدا کے یہاں جواب دینا ہوگا، اگر اسلام سے اس کا رشتہ کمزور ہو گیا، اور ملک کے اندر خلاف اسلام رجحان پیدا ہوا تو رسول اللہ ﷺ کا ہاتھ ہوگا اور آپ کا گریبان ہوگا، سیاسی لوگوں سے پوچھا جائے گا یا نہیں؟ یہ بعد کی بات ہے، ہم نہیں کہہ سکتے، لیکن سب سے پہلے علماء سے سوال ہوگا کہ تمہارے ہوتے ہوئے ملک میں اسلام کیسے خطرہ میں پڑا؟ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے تھے، میرے ہوتے ہوئے دین کمزور ہو جائے یہ کیسے ممکن ہے؟ آپ کو تمام جزوی و ذیلی اختلافات کو ختم کر کے اس مقصد پر متحد ہونا چاہئے کہ آپ اس ملک کی رہنمائی کریں، آپ اس ملک کے اس طبقہ کو متاثر کریں، اپنے اخلاص سے، اور اپنے ایثار سے، جس کے ہاتھ میں زمام اختیار ہے یا آنے والی ہے، جنہوں نے اس کی تیاری کی ہے، جن کے پاس وہ وسائل و اسلحہ ہیں، جن کے ذریعہ سے اس زمانہ میں آدمی کو اقتدار حاصل ہوا کرتا ہے، آپ کا یہ فرض ہے کہ اس طبقہ سے روابط پیدا

کریں، آپ ان کی زبان میں ان کو سمجھائیں، آپ کے متعلق ان کا یہ تجربہ ہو جائے کہ آپ بے غرض ہیں، آپ ان سے اپنے لئے کچھ نہیں چاہتے ہیں، آپ کو وہ بڑی سے بڑی رشوتیں دینا چاہیں، آپ کو بڑے سے بڑے مواقع دینا چاہیں، آپ کہیں، نہیں! ہمیں کچھ نہیں چاہئے، آپ دین کی خدمت کریں۔

مادری زبان میں مہارت حاصل کرنے کی ضرورت

دوسری بات یہ ہے (ماشاء اللہ پڑھئے لکھے لوگوں کا مجمع ہے، اس لئے میں کہتا ہوں) کہ یہاں کی زبان (ہنگو زبان) کو آپ اچھوت نہ سمجھئے، ہنگو زبان کو آپ یہ نہ سمجھئے کہ اس کے چڑھنے لکھنے سے کوئی ثواب نہیں ہے، یا عربی میں ثواب ہے یا اردو میں ثواب ہے۔ آپ کو ہنگو زبان میں مہارت پیدا کرنا چاہئے، ہنگو زبان میں آپ اچھے لکھنے والے بنئے، آپ ادیب بنئے، مصنف بنئے، آپ کی زبان میں منہاس ہو، رس ہو، آپ کی زبان ایسی ہو کہ لوگ غیر مسلم ادیبوں کی تحریر پڑھنے کے بجائے آپ کی تحریر پڑھیں اور مست ہوں اور جھوٹیں۔ یہ بات لکھنؤ میں رہنے والے کی زبان سے سنئے، دلی کی زبان بولنے والے کی زبان سے سنئے اور عربی پر جان دینے والے کی زبان سے سنئے، اس وقت تک جو عمر گزری ہے، عربی زبان کی خدمت میں انشاء اللہ بقیہ عمر بھی گزرے گی، عربی ہماری زبان ہے، ہم عربی کو اپنی مادری زبان سمجھتے ہیں، الحمد للہ ہم تو ہم ہمارے بعض عزیز بچے بھی ایسے ہیں جو کسی طرح عربوں سے کم نہیں ہیں، وہ شخص آپ سے کہہ رہا ہے جو عربی زبان کا کیڑا ہے اور اردو زبان جس کے گھر کی زبان ہے، وہ آپ سے کہہ رہا ہے کہ ہنگو زبان کو غیر مسلموں کے رحم و کرم پر نہ چھوڑئیے، ان کے حوالہ نہ کیجئے کہ لکھیں وہ پڑھیں آپ۔ یاد رکھئے! قلم کے ساتھ اثر ہوتا ہے، لوگوں نے تو یہ کہا کہ کتاب اگر کسی صاحب ایمان کے قلم سے لکھی ہوئی ہے تو ایمان کا کرنٹ دوڑ جاتا ہے، حضرت تھانوی فرماتے تھے کہ خطوط کے ذریعہ سے بھی توجہ دی جاتی ہے، جب کوئی شیخ توجہ سے خط لکھتا ہے تو اس خط میں تاثیر ہوتی ہے، اور ہم نے اس کا تجربہ کیا ہے، اور آج ان مصنفین کی کتابیں موجود ہیں، جو ان کی کتاب پڑھ لے اس کی نمازوں کی کیفیت بدل جاتی ہے، کتاب کا نماز سے کوئی تعلق نہیں، کتاب کسی اور موضوع پر ہے، لیکن جب وہ صاحب لکھ رہے تھے یا بول رہے تھے تو قلب ان کا متوجہ تھا، آج ان کی کتابیں پڑھئے، ان کی تحریر پڑھئے تو آپ اس کے بعد نماز

پڑھیں گے، ذرا بھی آپ کا احساس اور قلب بیدار ہے تو آپ محسوس کریں گے اس کی کیفیت اور ہے، میں نے بار بار اس کو محسوس کیا ہے۔

آپ نے غیر مسلموں کی کتابیں پڑھیں، ان کے افسانے پڑھے، ان کی کہانیاں پڑھیں، ان کی تاریخ لکھی ہوئی پڑھیں، اور آپ پر اثر نہ پڑے؟ ضرور پڑے گا، یہ بہت بڑی کم ہمتی کی بات ہے، آپ لوگوں کے لئے ضروری ہے کہ جو مسلمان ادیب و شاعر گزرے ہیں، ان کو آپ نمایاں کریں، آپ نذر الاسلام کو نمایاں کیجئے، آپ ان کی چیزیں پڑھئے، اور ان کے ترجمے کیجئے، اللہ تعالیٰ صلاحیت دے تو ان کا کلام عربی میں پیش کیجئے، یہاں کئی ادیب گزرے ہیں، مثلاً عبدالغفور نساخ ان کا نام بچپن میں اردو ادب کی تاریخ میں پڑھا تھا، اور کئی شاعر گزرے ہیں، ان لوگوں کے حالات لکھئے، دنیا کو بتائیے کہ یہاں کیسے کیسے شاعر گزرے ہیں، خدا کے فضل و کرم سے کوئی جوہر، کوئی کمال ایسا نہیں جو آپ کو نہ ملا ہو، ہمارے مدارس میں تو بعض بنگالی طالب علم اتنے ذہین تھے کہ رشک آتا تھا اور ہمارے یوپی اور بہار کے طالب علم ان کے سامنے مات تھے، عربی سپاس نامے میں، میں سنتا چلا آ رہا ہوں، مجھے اندازہ ہی نہیں تھا کہ اتنی اچھی عربی لکھنے والے یہاں موجود ہیں، کبھی احساس کمتری میں مبتلا نہ ہوئے گا، خدا نے آپ کو سب جو ہر دیئے ہیں، مگر اس کا صحیح استعمال نہیں۔

میری بات یاد رکھئے کہ ہنگلہ زبان کی قیادت اپنے ہاتھ میں لیجئے، دو قسموں سے، ایک غیر مسلموں سے، ایک غیر اسلامی سے، دو قسمیں ہیں، ایک غیر مسلم ہے، ایک غیر اسلامی ہے، غیر اسلامی مسلمانوں میں بھی ہوتے ہیں، غیر مسلم غیر مسلموں میں ہوتے ہیں، غیر مسلموں سے غیر اسلامیوں سے دونوں سے قیادت اپنے ہاتھ میں لیجئے، اور اس میں ایسا کمال پیدا کیجئے کہ لوگ اس سے مستغنی ہو جائیں، الحمد للہ ہمارے یہاں کے علماء نے اس کی طرف توجہ کی، ادب، تنقید، تاریخ، تصنیف میں ان کے سامنے کسی کا چراغ نہیں جلا، ایک مرتبہ انعامی مقابلہ تھا، ایک بڑے اردو رسالہ کی طرف سے کہ اردو کا سب سے بڑا اثر نگار کون ہے؟ سب سے بڑا انشاء پرداز کون ہے؟ انعام ان کو ملا جنہوں نے یہ ثابت کیا کہ مولانا شبلی نعمانی اردو کے سب سے بڑے انشاء پرداز تھے، جب کوئی بڑا منتخب جلسہ ہوتا تو مولانا سید سلیمان ندوی کو، مولانا عبدالسلام ندوی کو، نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خان شروانی کو، صدارت تفویض کرتے، اردو

شاعری کی تاریخ پر دو کتابیں ہیں جو یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہیں۔ ایک ”آب حیات“ جو مولوی محمد حسین آزاد کی لکھی ہوئی ہے جو قدیم نصاب پر مبنی ہے ہوئے تھے، اور ایک ”گل رعنا“ جو ہمارے والد ماجد حکیم سید عبدالحی کی لکھی ہوئی ہے۔ اور مصنفین سے چھپی ہے۔ ہندوستان میں ہم نے اردو زبان کو دوسرے قہنہ میں نہیں جانے دیا، اور آج بھی خدا کا شکر ہے کہ کوئی وہاں یہ نہیں کہہ سکتا کہ مولویوں کو اردو نہیں آتی۔ مولوی نکلالی زبان میں بیٹھی زبان میں، ریلی زبان میں تقریر نہیں کر سکتے، لکھ نہیں سکتے، کوئی آج بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا، اب بھی ہمارے علماء، میں ایسے ایسے بولنے والے موجود ہیں کہ ان کے سامنے وہ بولنے کی ہمت نہیں کر سکتے جن کو بڑے دعوے ہیں، ایسے ہی آپ کو گھرنا چاہئے، دیکھئے (پیر دان نہیں کہتا، لیکن ایک جہاں دیدہ تجربہ کار کی یہ بات لکھ لیجئے) آپ ہنگالی زبان سے اگر قطع تعلق اور پرہیز کریں گے تو یہ ایک طرح کی معنوی خودکشی ہوگی، زبانوں میں کوئی یہ نہیں ہوتا کہ ایک زبان آئے تو دوسری زبان نہیں آ سکتی، یہ بات غلط ثابت ہو چکی ہے۔

”ہفت زبان“ کا ایک محاورہ چلا آ رہا ہے کہ سات زبانیں آتی ہیں، لیکن ایسے تو خدا کے فضل و کرم سے تین چار زبان جاننے والے تو ہمارے یہاں بھی ہیں، خدا کے فضل سے ہمارے کچھ نوجوان ایسے ہیں کہ عربی بولنے کو کہہ دیجئے تو عرب سمجھیں گے کہ شاید عرب ہیں، یہ بات غلط ہے کہ ایک نئی زبان اچھی طرح آ سکتی ہے، بلکہ بعض اوقات ایک زبان دوسری زبان کو مدد پہنچاتی ہے۔

اس ملک کی حفاظت کی ذمہ داری آپ پر ہے

بھائیو! یہ دو باتیں یاد رکھو، میں زیادہ نہیں کہنا چاہتا کہ اس ملک کی حفاظت کی ذمہ داری تمہاری ہے، اس ملک کا رشتہ اسلام سے کمزور نہ ہونے پائے، ورنہ تمہارے سب مدرسے بیکار ہیں، میں صاف کہتا ہوں، میں مدرسہ کا آدمی ہوں، مدرسہ کے تالاب کی مچھلی ہوں، میں کہتا ہوں کہ اسلام اگر خدا نخواستہ نہ رہا تو یہ سب مدرسے بیکار ہیں، یہ مدرسے کسی چیز کی دوائ نہیں، پہلا کام ہے اسلام کو باقی رکھنا، اسلام کا رشتہ اس قوم سے جوڑے رکھنا، دوسری بات قیادت کا مقام حاصل کرنا، قیادت کا مقام حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ آپ کو ہنگلہ پر عبور نہ ہو، میں نے کل استقبالیہ جلسہ میں جس میں اسلامک فاؤنڈیشن نے استقبالیہ دیا تھا، کہا کہ مجھے افسوس ہے

اور شرم آ رہی ہے کہ میں آپ سے ہنگلہ میں بات نہیں کر سکتا، میں خوش ہوتا اگر میں آپ کے سامنے ہنگلہ میں تقریر کرتا، ہمارے یہاں اسلام میں کوئی زبان غیر نہیں ہے، سب زبانیں خدا کی پیدا کی ہوئی ہیں اور ایک سے ایک زبان بڑھی ہوئی ہے، زبان کے خلاف تعصب بالکل جاہلانہ بات ہے، نہ کوئی زبان پرستش کی قابل ہے نہ کوئی زبان نفرت کے قابل ہے، یہ سمجھ لو پرستش کے قابل بھی نہیں ہے، اگر مقدس زبان کوئی ہو سکتی ہے تو عربی ہو سکتی ہے، باقی سب زبانیں یکساں ہیں، اللہ نے انسانوں میں بولنے کی صلاحیت پیدا کی اور سینکڑوں برس میں ان زبانوں میں ترقی ہوئی، اور اب وہ ہمارے پاس ترقی یافتہ شکل میں پہنچیں، ہم ان کی قدر کرتے ہیں اور ہمیں اظہار خیال کے لئے ان سے مدد ملتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے حضرت زید بن ثابتؓ کو عبرانی زبان پڑھنے کا حکم دیا جو صرف یہودیوں کی زبان تھی، اگر ہم زبان و ادب کی طرف سے بے اعتنائی برتیں گے تو غیر اسلامی عناصر ان پر اپنی اجارہ داری قائم کر لیں گے اور ان سے بڑا نقصان پہنچے گا۔ کلکتہ سے کتابیں آتی ہیں، مسموم کمیونزم کی پرچار کرنے والی، قومی ولسانی تعصب کی پرچار کرنے والی، ہندو میتھالوجی کی پرچار کرنے والی اور بڑے شوق سے ہمارے نوجوان پڑھتے ہیں، بھائی! اگر آپ کو ترمذی کی شرح لکھنی ہو اور مشکوٰۃ کی شرح لکھنی ہو اور کسی فقہی مسئلہ پر بحث کرنا ہو، اس کو آپ اردو میں لکھئے، یا عربی میں لکھئے، اگر آپ کو عوام سے باتیں کرنی ہوں تو عوام کی سطح پر بات کیجئے، میں آپ سے صاف کہتا ہوں کہ ہندوستان پاکستان میں بہت کام ہو چکا ہے، کتب حدیث کی شرحیں لکھی جا چکی ہیں، مذہب حنفی کو حدیث کے مطابق ثابت کیا جا چکا ہے، اب اس کے بعد کسی نئی بڑی کوشش کی ضرورت نہیں ہے، حضرت مولانا انور شاہ صاحب اور حضرت مولانا ظہیر احسن شوق نیویؒ یہ سب کام کر چکے ہیں، انہوں نے ثابت کر دیا کہ یہ دعویٰ کہ حنفی حدیث کے خلاف کہتے ہیں، غلط ہے، اور ان سے پہلے طحاویؒ ”معانی الآثار“ میں زیلعی نے احادیث ہدایہ کی تخریج ”نصب الراية“ میں اور دوسرے حضرات نے بھی یہ کام بڑے اعلیٰ بیانات پر کیا ہے۔ اب نیا میدان ہے جس کی طرف آپ کو توجہ کی ضرورت ہے، وہ یہ کہ عوام آپ کے اثر سے نکلے نہ پائیں، وہ آپ کو یہ نہ سمجھیں کہ آپ اس ملک میں رہ کر کے بھی غیر ملکی ہیں، اس ملک میں رہ کر کے آپ پردیسی ہیں، آپ کو تو اس ملک کے ساتھ اپنے کو وابستہ کرنا چاہئے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

ان دمانکم و اموالکم و اعراضکم حرام علیکم مکرمۃ یومکم ہذا فی بلدکم ہذا فی شہرکم ہذا الا فلیبلغ الشاہد الغائب (حدیث نبوی ﷺ)

اے مسلمانو! تمہارا خون، تمہارے مال، تمہاری عزت و آبرو ایک دوسرے پر حرام ہے، جیسے آج کا (عید کا) دن اس شہر (مکہ) کے جوار میں اس مہینہ ذی الحجہ میں جو حرمت کا مہینہ ہے۔

زبان کے لئے کسی مسلمان کی توہین کرنا، مسلمان کے دل کو دکھانا، مسلمان کا خون بہانا ناجائز اور ظلم و ستم ہے۔ نہ زبان پر ستش کے قابل ہے، نہ نفرت کے قابل "قد جعل اللہ لكل شیء قدراً" اللہ نے ہر چیز کا ایک پیمانہ بنایا ہے، اس کا بھی ایک پیمانہ ہے، محبت کرو، مال پیدا کرو، زبان و شاعری کا لطف لو، اس کا ذائقہ لو، لیکن غلو نہ کرو، خدا کی کتاب کو بھی اگر کوئی پوجنے لگے، تو مشرک و کافر ہو جائے گا، اگر قرآن کوئی سامنے رکھ کر (اس کو مسجود سمجھ کر) سجدہ کرے تو مشرک ہوگا، بات صرف خدا کی ہے، لیکن سب زبانوں سے محبت کرنا اور اس میں عبور حاصل کرنا اور سب کا حق دینا معقول ہے۔

میرے عزیزو! اگر یہ باتیں یاد رہیں تو انشاء اللہ کسی دن یاد کرو گے کہ کوئی کیا کہہ گیا

تھا:

فستذكرون ما أقول لكم وافوض امری الی اللہ ان اللہ بصیر بالعباد

جو بات میں تم سے کہتا ہوں تم اسے آگے چل کر یاد کرو گے، اور میں اپنا کام خدا کے سپرد کرتا ہوں، بے شک خدا بندوں کو دیکھنے والا ہے۔

فرشتے بھی سن لیں اور کراما کا تبین بھی سن لیں کہ ہم حجت پوری کر رہے ہیں، اگر ملک کے رہنے والے مسلمانوں پر کہ اگر تمہیں اس ملک میں رہنا ہے، اسلام کو باقی رکھنا ہے تو یہ راستہ ہے، اللہ تعالیٰ آپ کی مدد کرے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا کام اور پیغام

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على سيد المرسلين محمد وآله وصحبه اجمعين ومن تبعهم ودعا بدعوتهم الى يوم الدين اما بعد فقد قال رسول الله صلى الله عليه وسلم الا ان في الجسد مضغة، اذا صلحت، صلح الجسد كله، واذا فسدت فسد الجسد كله، الا وهى القلب

حضرات عالی مقام! مجھے تجربہ ہے کہ بس مسند پر کثیر تعداد میں ممتاز ترین شخصیتیں، ناموران قوم و ملک جمع ہوں، نام لے لے کر تقریر کا آغاز کرنا بعض اوقات بڑا خطرناک ہوتا ہے، ان میں سے کوئی ایک نام بھی رہ جائے تو بڑی کوتاہی اور نا انصافی پر محمول کیا جاتا ہے، اس لئے میں سب حضرات معززین کو جو اسٹیج پر رونق افروز ہیں، ان سب کا اجمالی طور پر شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنی تقریر کا آغاز کرتا ہوں، حضرات! میں یونیورسٹی کی اصطلاح میں امتحان کا لفظ بولتا ہوں، میں نے بہت سے امتحانات دیئے ہیں، لیکن آج بہت بڑا امتحان ہے، مجھے اس امتحان کا بالکل اندازہ نہ تھا کہ میرا اس طرح خیر مقدم کیا جائے گا۔ میری حقیر ذات کو اس قدر نمایاں کیا جائے گا، میں درحقیقت ایک خلق کے احترام میں اور ایک نسبت گرامی کا لحاظ کرتے ہوئے یہاں حاضر ہوا تھا کہ نواب عبید الرحمن خان شیروانی مرحوم کے نام پر جو یادگار قائم کی جا رہی ہے، جس عمارت کا افتتاح ہے، اس کا شرف حاصل کروں، کیونکہ یہ ایک دینی، ملی اور خاندانی فریضہ میرے دوش ناتواں پر ہے، اور میرے لئے یہی بات باعث اعزاز ہے، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرے وہم و خیال میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ میرے استقبال میں میرے اعزاز میں یا اظہار تعلق کے لئے ایسی موقر مجلسیں ہوں گی اور ایسے ممتاز حضرات جمع ہوں گے، میرے وہم و گمان میں کہیں یہ بات نہیں تھی، اس میں ایک امتحان کی بات یہ بھی ہے کہ جن الفاظ میں، نظم و نثر میں اور جس خطیبانہ و ادیبانہ انداز میں میری حقیر ذات کا ذکر کیا گیا، اس کا تقاضہ یہ ہے کہ میں صرف شکریہ پر اکتفا کروں، بلکہ میں آپ کی اور آپ کے موقر ادارہ

کی اور اس کے کارناموں کی اور اس کی خدمات کی تعریف کروں، اس کا ذکر کروں، اور اس کے بعد کوئی اور قدم آگے بڑھاؤں، میں اس کو ایک بہت بڑی ناپاسی اور حقیقت میں ایک بڑی ناشکری سمجھوں گا کہ میں صرف شکریہ پر اکتفا کروں اور انسان کا قاعدہ ہے کہ جس سے اس کو محبت ہوتی ہے اور تعلق خاطر ہوتا ہے، جس کی جتنی اہمیت ہوتی ہے اور جس کے جتنے اثرات مثبت پڑ سکتے ہیں، اس کا لحاظ کرتے ہوئے اس کے ساتھ پیش آتا ہے کہ جیسے کہتے ہیں ”مشفق است و ہزار بدگمانی۔“

محبت کا تقاضہ یہ ہے کہ مخلصانہ طور پر صرف اس کی مدح و توصیف پر اکتفا نہ کی جائے، بلکہ اس کے بارے میں جو امکانات ہیں اور لوگ اس کو جس نظر سے دیکھتے ہیں اس کا بھی اظہار کر دیا جائے، اس لئے میں اس کو شکر گزاری اور سپاس گزاری کا ایک فرض اور ایک تقاضہ سمجھتا ہوں کہ میں آپ کے سامنے اس نقطہ نظر اور اس احساس کو دیکھتے ہوئے جو احساس اس وقت پوری علمی دنیا میں اور پھر اس وقت ہندوستان کی ملت اسلامیہ میں اور پھر ہندوستان کی سرزمین میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے بارے میں پایا جاتا ہے، اور جو توقعات لوگ رکھتے ہیں۔

میں نے آپ کے سامنے ایک حدیث پڑھی ہے، آپ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ ”یاد رکھو! سن لو! کہ انسان کے جسم میں ایک مضغہ گوشت ہے، گوشت کا ایک ٹکڑا ہے کہ اگر وہ درست ہو جائے تو سارا جسم درست ہو جائے، وہ اگر بگڑ جائے تو سارا جسم بگڑ جائے، وہ کیا ہے، وہ قلب ہے، آپ سب لوگ جانتے ہیں کہ انسان کا جسم طویل و عریض بھی ہوتا ہے، انسان جسیم ہوتا ہے، مختلف اعضاء کا مجموعہ ہوتا ہے، لیکن طبیب حافظ اس کی نبض پر ہاتھ رکھتا ہے، نبض سے وہ پہچان جاتا ہے کہ اس جسم انسانی کو کیا عوارض درپیش ہیں، اس کی اندرونی حالت کیا ہے، وہ ہاتھ تو نبض پر رکھتا ہے، لیکن پورے جسم کا جائزہ لے لیتا ہے، میں مسلم یونیورسٹی جیسی عظیم الشان، عالمگیر شہرت کی حامل، جس پر ملت ہندیہ کی بہترین ذہانتیں، بہترین علمی عملی صلاحیتیں صرف ہوئی ہیں، جس کی آغوش میں ملت ہندیہ نے اپنے جگر پارے ڈال دیئے ہیں، میں تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے آپ سے کہتا ہوں کہ ہندوستان کی ملت نے جگر کے ٹکڑوں کو اپنے قابل فخر فرزندوں کو کسی اور ادارہ کے اس طرح سپرد نہیں کیا، میں کسی ادارہ کی تحقیر نہیں کر رہا ہوں، ایک حقیقت بیان کر رہا ہوں، جس طرح ہندوستان کے مسلمانوں نے اور

یہاں کے شریف خاندانوں نے، اور یہاں کے ان خانوادوں نے ان انسانی مجموعوں نے جن کی ایک قابل فخر تاریخ رہی ہے اور جنہوں نے مختلف صدیوں میں، اور تاریخ کے مختلف دوروں میں افراد پیدا کئے ہیں، اور جنہوں نے ملک اور قوم پر بڑے گہرے اثرات ڈالے ہیں، اور بعض اوقات انقلاب پیدا کر دیا ہے، ان خاندانوں نے بہترین جگر پاروں کو اور دل کے ٹکڑوں کو، اور اپنی خاندانی خصوصیات کو جو بعض اوقات صدیوں پرانی تھیں، ہزاروں سال پرانی تھیں، اور بعض بعض تیرہ سو پرانی تھی، اپنے جگر پاروں کو اگر کسی کی آغوش میں ڈالا ہے، اعتماد کے ساتھ اور امیدوں کے ساتھ، توقعات کے ساتھ، وسیع امکانات کے ساتھ اور بہت گہرے اندازوں کے ساتھ، تو وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ہے۔

مسلم یونیورسٹی کی حیثیت

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا معاملہ محض ایک یونیورسٹی کا معاملہ نہیں ہے، یہ ملت اسلامیہ ہند یہ کے نو نہالوں کی امین، ایک ذمہ دار اور ایک بہت بڑے خواب کی تعبیر کے پورا کرنے والے ادارہ کی حیثیت ہے، اگر یہاں ان کی توقعات پوری ہوئیں، اور ان فرزندوں، ان خاندانوں کے جگر پاروں کی اچھی تربیت کی، ان کو پڑھا لکھا کر ہی نہیں، بلکہ بنا کر ان کو بہترین اخلاقی تربیت دے کر، جس کو میں نے اپنی صبح کی تقریر میں بار بار کردار کے لفظ سے ادا کیا ہے، ایک نمایاں اور امتیازی کریکٹر، اخلاقی استقامت، اخلاقی حوصلہ مندی اور بلندی اور اعتماد نفس، اپنے علم پر اعتماد، اپنی صلاحیتوں پر اعتماد کے حامل کی حیثیت سے یونیورسٹی نے نکالا، تو یونیورسٹی نے اس کا ایک شریفانہ جواب دیا اور ان خاندانوں ہی کو نہیں بلکہ ملت پر احسان کیا، اس یونیورسٹی کا معاملہ کسی اصطلاحی درس گاہ کا معاملہ نہیں ہے، بلکہ یہ ایک تاریخی امانت خانہ ہے، بلکہ کہنا چاہئے کہ ایک تاریخی اور ملی خزانہ ہے، جس کو اپنے ان جواہرات کی پوری حفاظت کرنی چاہئے، ان جواہرات کو آخری حد تک چمکا کر اور تاباں بنا کر ملت کو واپس کرنا چاہئے، یہاں سے صرف گریجویٹس کا نکلنا، صرف اے۔ اے۔ اے۔ کا نکلنا، صرف ان لوگوں کا نکلنا جو ملازمتوں کے لئے فٹ پائے جائیں، موزوں پائے جائیں، اور جو صرف ملک کے انتظامیہ کو بہتر صلاحیتیں فراہم کریں، اپنے خاندانوں کی اچھی طرح پرورش کریں، یہ ہرگز کافی نہیں۔

میں ایک علمی تاریخ کے طالب علم کی حیثیت سے بھی اور ایک علمی درس گاہ اور ایک علمی

مکتب فکر کے نمائندہ کی حیثیت سے بھی اور تاریخ اسلام کا مطالعہ کرنے والے کی حیثیت سے بھی کہتا ہوں کہ ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے، اور جو حدیث میں نے آپ کے سامنے پڑھی کہ جسم انسانی میں ایک ایسا گوشت کا ٹکڑا ہے جو اگر درست ہو جائے تو سارا جسم درست ہو جائے، اور وہ اگر بگڑ جائے تو سارا جسم بگڑ جائے، اس لئے یہاں کی جو سب سے بڑی ضرورت ہے، وہ یہ کہ آپ یہاں سے نئی نسل کے وہ افراد ملک کے سامنے پیش کریں جو ایمانی حقائق پر یقین رکھنے والے ہوں، اسلامی تعلیمات کے پورے طور پر حامل، اور اس کے نمائندہ ہوں، اخلاقی صوبوں کے پابند ہوں، ایک کردار رکھتے ہوں، وہ بلند نگاہی اور خودداری کے حامل ہوں، ابھی ہمارے بزرگ قاری شبیر صاحب نے ایک واقعہ سنایا۔ محبوب الہی کا، سر دیوں کا زمانہ تھا، درس دے رہے تھے، پاؤں پھیلائے ہوئے تھے، ان سے کہا گیا کہ بادشاہ آرہے ہیں، پاؤں سمیٹ لیجئے، انہوں نے جواب دیا کہ جو پاؤں پھیلاتا ہے، وہ ہاتھ نہیں پھیلاتا، اسی طرح کا واقعہ عرب ملک کاسناتا ہوں کہ حلب میں شیخ سعد حلبی تھے، ابھی سو برس پہلے کا قصہ ہوگا، جو دمشق کی ایک مسجد میں بیٹھے ہوئے درس دے رہے تھے، اتفاق سے اس دن ان کے پاؤں میں تکلیف تھی اور وہ پاؤں پھیلائے ہوئے بیٹھے تھے اور جیسا کہ قاعدہ ہے کہ استاذ پشت بقبلہ ہوتا ہے، اور اس کے شاگرد سامنے بیٹھے ہوتے ہیں اور دروازے سے داخل ہوتے ہیں اور بیٹھ جاتے ہیں تو ان کا چہرہ دروازے کی طرف تھا اور پشت قبلہ کی طرف تھی، اور پاؤں دروازے کی طرف پھیلائے ہوئے تھے۔ اس وقت ایک مشہور بانی سلطنت مصر خدیوی سلطنت، جو ابھی فاروق پر ختم ہوئی ہے، ابھی پندرہ بیس برس پہلے تک وہ موجود تھی محمد علی پاشا بیٹا تھا۔

ابراہیم پاشا اس زمانہ میں بڑا سفاک اور جلاؤ مشہور تھا، وہ شام کا گورنر تھا اور اس کی سفاکی کے قصے لوگوں کی زبانوں پر تھے، اس کو خیال ہوا کہ کہ حضرت کا درس جا کر سنوں اور ملاقات کروں، راستہ ایک ہی تھا، اس لئے وہ دروازے کی طرف سے آیا۔ سب کو خیال تھا کہ حضرت کو ہزار تکلیف ہو اس موقع پر اپنا پاؤں سمیٹ لیں گے، اتنی دیر میں کیا ہو جائے گا۔ لیکن انہوں نے بالکل جنبش نہیں کی، نہ درس موقوف کیا، نہ پاؤں سمیٹا، اسی طرح پاؤں پھیلائے رہے اور وہ پاؤں کی طرف آکر کھڑا ہو گیا۔ اب ان کے شاگرد کہتے ہیں کہ ہم بالکل لرزاں و ترساں تھے کہ دیکھئے اب کیا ہوتا ہے۔ کیا ہمارے شیخ کی شہادت ہماری آنکھوں کے سامنے ہوگی، یا تذلیل

ہوگی۔ مشکیں باندھ لی جائیں گی اور کہا جائے گا لے چلو، وہ کھڑا رہا اور شیخ دیر تک درس دیتے رہے، التفات بھی نہیں کیا اور پاؤں بھی نہیں سمیٹا۔ مگر خدا جانے ان بزرگوں کا کیا اثر ہوتا ہے کہ اس نے کچھ نہیں کہا، کوئی سرزنش نہیں کی، کوئی شکایت نہیں کی اور چلا گیا۔

سننے والی جو بات ہے وہ یہ کہ وہ کچھ ایسا معتقد ہوا کہ اس نے جا کر اشرافیوں کا ایک توڑا غلام کے ہاتھ بھیجا اور کہا کہ شیخ کو میرا سلام کہنا اور کہنا کہ یہ حقیر نذرانہ قبول فرمائیں۔ آپ جانتے ہیں انہوں نے جواب میں کیا کہا؟ یہ آب زر سے لکھنے والا جملہ تھا جو علم کی تاریخ میں ہمیشہ روشن رہے گا۔ انہوں نے کہا۔ اپنے بادشاہ کو سلام کہنا اور کہنا جو پاؤں پھیلاتا ہے وہ ہاتھ نہیں پھیلاتا، یا پاؤں ہی پھیلا لے، یا ہاتھ ہی پھیلا لے، ایک ہی کام ہو سکتا ہے دنیا میں، جب میں نے پاؤں پھیلائے تھے اس وقت یہ طے کر لیا تھا کہ اب ہاتھ نہیں پھیلا سکتا۔ ”ان الذی یمد رجلہ لایمدیدہ“ ان ہی الفاظ کے ساتھ مؤرخ نے ان کو نقل کیا ہے:

سلم علی مولاک وقل لہ

ان الذی یمد رجلہ لایمدیدہ

بہر حال ہمیں اپنے طلباء کو اس طرح بنانا چاہئے کہ وہ ملک میں اپنے جو ہر ذاتی اور اپنی قابلیت اور اپنی زبان دانی، اپنی صلاحیت انتظامی اور اپنی ذہانت اور اپنی کارکردگی سے پہچانے جائیں۔

حضرات! میں ان لوگوں میں نہیں ہوں کہ ان کی اہمیت کا انکار کروں، واقعات پر میری نظر ہے، میں جانتا ہوں کہ یہ سب چیزیں کتنی اثر انداز ہوتی ہیں، اس کے ساتھ ساتھ وہ اس بات کا بھی نمونہ بنیں گے کہ ہم ضمیر فروش نہیں ہیں، ہم کسی حالت میں ضمیر بیچ نہیں سکتے، اس موقع پر بے اختیار علامہ اقبال کے یہ اشعار یاد آ گئے وہ کہتے ہیں:

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی

تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

من کی دنیا من کی دنیا سوز و مستی جذب و شوق

تن کی دنیا تن کی دنیا سود و سودا مکر و فن

من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں
 تن کی دولت چھاؤں ہے آتا ہے دھن جاتا ہے دھن
 من کی دنیا میں نہ دیکھا میں نے افنگی کا راز
 من کی دنیا میں نہ پائے میں نے شیخ و برہمن
 یہ شعر جو حقیقت میں آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
 تو جھکا جب غیہ کے آگے نہ من تیرا نہ تن

یہ تعلیم، یہ مسلم یونیورسٹی میں اپنے بہت قدیم تعلقات کی بناء پر عرض کرتا ہوں، آپ کو معلوم ہے کہ سید احمد خان رحمۃ اللہ کے خاندان کو سید احمد شہید رحمۃ اللہ کے خاندان سے تعلق تھا، علاوہ سیادت کے رشتہ کے میری معلومات یہ ہیں کہ ان کی والدہ بیعت تھیں سید احمد شہید سے، یہ سید احمد نام ان ہی نے رکھا اپنے پیر کے نام پر۔ ان کے والد شاہ غلام علی صاحب کے مرید تھے اور ان کی والدہ حضرت سید احمد شہید سے مرید تھیں، یہ میرے دل میں بچپن سے نقش ہو گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کی نظر اور ان کی توقعات ان کے انداز سے اور ان کی اپنی مختوں کو جو ثمر وہ سمجھتے تھے، وہ اس میں ہرگز محدود نہ تھا کہ یہ لوگ نکالے جائیں جو آسامیوں کے قابل ثابت ہوں اور ان کو عہدے دیئے جائیں اور وہ اپنے محدود خاندانوں کی پرورش کریں، اور اچھی طرح کھائیں پیئیں اور زندگی گزاریں، وہ ایک ایسی سلسل پیدا کرنا چاہتے تھے جو قیادت کرے، اور یہی وجہ تھی کہ آپ کی یونیورسٹی نے ملت اسلامیہ ہند یہ کو بلکہ برصغیر ہند کو وہ افراد دیئے جن کی مثال نہیں ملتی، مولانا محمد علی جوہر اور ان کی قربانیاں، مولانا ظفر علی خان کی ذکاوت اور ان کی شاعری، اس کے بعد پھر وہ لوگ جنہوں نے بعض سیاسی، انقلابی کام کئے ہیں، تفصیلات میں نہیں جاؤں گا۔ اس سے بدگمانیاں پیدا ہونے کا اندیشہ ہے، ان لوگوں نے اس وقت وہ کام کئے جو اس وقت ناممکن سمجھے جاتے تھے، اس کے علاوہ مفکرین، مصنفین، اہل قلم اور انگریزی پر قدرت رکھنے والے اور دانش گاہوں کے چلانے والے، سب نکلے، آپ سے یہ عرض کروں گا۔ آپ ایک ایسے طبقے کو پیدا کریں، ہمارے اساتذہ کرام اور یونیورسٹی کے اساتذہ اور دانشور ہاں سب موجود ہیں جو اس کا خاکہ بناتے ہیں، جو اس کے لئے نئے راستے پیدا کرتے ہیں،

وہ موجود ہیں ان کی موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آپ ایسے طبقے کو پیدا کریں جس کی طرف نگاہیں اٹھائیں۔

یہ بات میں نے انگلستان میں بھی کہی ہے کہ اس طرح آپ کا رہنا کافی نہیں ہوگا، بلکہ آپ کو یہاں اس طرح رہنا چاہئے کہ انگلیاں انھیں کہ گون جا رہا ہے، یہ ہم سے مختلف معلوم ہوتا ہے، اس کی نگاہیں پاک ہیں اور اس کے خیالات پاک ہیں، انسانیت کا ہمدرد ہے اور یہ ملک کے لئے باعث زینت ہے۔ میں اس موقع پر سید احمد شہید کے ذکر کی رعایت کے ساتھ ذکر کرتا ہوں، جب انہوں نے پشاور فتح کیا تو وہاں کئی دن ٹھہرنا پڑا، ایک دن پشاور کے ایک پٹھان نے ہندوستانی مجاہدین میں سے کسی کا ہاتھ پکڑ کر کہا اور ہندوستانی بھائی! آپ سے ایک بات پوچھتے ہیں صحیح صحیح بتائیے گا کہ کیا ہندوستان کے لوگوں کی دور کی نگاہ کمزور ہوتی ہے؟ انہوں نے کہا نہیں! کمزور نہیں ہوتی ہے، کہا نہیں ضرور کمزور ہوتی ہیں، انہوں نے کہا خدا کا شکر ہے، کسی کی کمزور ہو تو ہو، لیکن عام طور سے کمزور نہیں ہوتی اور نہ کوئی خصوصیت ہے لیکن میں پوچھتا ہوں کہ آپ یہ پوچھ کیوں رہے ہیں؟

اس پٹھان نے ہندوستانی مسلمان سے کہا، ہم آپ لوگوں کو جانتے ہیں کہ آپ میں سے کوئی دو برس کا نکلا ہوا ہے، کوئی چھ ماہ سے، اپنے گھر والوں، بیوی بچوں کو چھوڑ کر آیا ہے، اور آپ جوان بھی ہیں، اور ایسے مضبوط جوان کہ جہاد کے لئے نکلے ہیں، ہم نے آپ میں سے کسی کو نہیں دیکھا جو یہاں کسی عورت کو تاک رہا ہو، کسی نامحرم کو دیکھ رہا ہو، اور دوسری فطری بات تھی کہ اگر اس طرح لذت نہیں حاصل کر سکتے تو اس طرح لذت حاصل کر لیں۔ لیکن یہ بھی نہیں، تو ہم نے فیصلہ کیا کہ آپ لوگوں کو شاید دور کی چیز نظر ہی نہیں آتی۔ تو جواب میں کہا نہیں۔ ایسی بات نہیں ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قُلْ لِلْمُؤْمِنِينَ يَغُضُّوا مِنْ أَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوا فُرُوجَهُمْ

ایمان والوں سے کہہ دو کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی اور پاک رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور ہمارے امام اور مرشد کی صحبت کا فیض ہے۔

میں آپ سے یہ عرض کروں گا، معلوم نہیں اس کے بعد موقع ملے نہ ملے، زندگی کا کوئی اعتبار نہیں، اور زندگی بھی رہے تو ایسے موثر اجتماعات ایسے چیدہ اور برگزیدہ اشخاص کا ایک جگہ

جمع ہونے کا اعتبار نہیں کیا جاسکتا، آپ ایسے طلبہ کو نکالیں جو اخلاقی اور ذہنی طور پر، علمی طور پر، ہر طرح سے ممتاز ہوں، یہ سمجھا جائے کہ علی گڑھ کا گریجویٹ اور علی گڑھ کا تعلیم یافتہ رشوت نہیں لیتا، وہ نا انصافی نہیں کرتا، وہ کسی خاندان کے درمیان، کسی قوم کے درمیان کوئی امتیاز نہیں برتتا، جب وہ انصاف کرتا ہے تو بے لاگ طریقہ پر انصاف کرتا ہے، اسی طریقہ سے ذہنی طور پر بھی آپ اپنا سکہ جمادیں، کوئی قوم خاص کمر اس عہد ترقی میں اور عہد علم و فن میں، عہد سخاقت، عہد ادبیات میں، عہد تحقیقات میں، کوئی قوم، کوئی ملت عزت حاصل نہیں کر سکتی جب تک کہ وہ اپنا ذہنی سکہ نہ جمادیں، اپنی ذہانت کا، علمی تفوق، علمی امتیاز کا، اپنی محنت و کاوش کا، قوت مطالعہ کا، اپنی وسیع نظری کا، جب تک کہ وہ اپنا سکہ نہ بٹھا دے، اس وقت تک کا احترام نہیں ہوتا، یہاں سے ایسے لوگ نکلے جو ایک طرف تو انگریزی پر پوری قدرت رکھیں، اور ان کے اندر علمی و تحقیقی صلاحیت ہی نہیں بلکہ ان کے اندر اس کام کا جذبہ و جوش ہو، اخلاقی و دینی طور پر وہ ایک امتیاز رکھتے ہوں، فرائض کے پابند ہوں، میں صفائی سے کہتا ہوں کہ وہ صحیح العقیدہ مسلمان ہوں، فرائض کے پابند ہوں، لوگ کہیں کہ علی گڑھ کا ایک مچ بیٹھا ہوا ہے، جب نماز کا وقت آنے کا تو وہ نماز پڑھے گا، اطمینان رکھو وہ نماز کے لئے ضرور اٹھیں گے، ہم نے دیکھا ہے کہ کتنی بھی مصروفیت ہو جب نماز کا وقت آیا تو نماز لئے اٹھے۔

یہ بات لوگوں میں معروف و مسلم ہو اور پھر اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہ غلط فیصلہ نہیں کریں گے، رشوت کا نام بھی ان کے سامنے نہ لینا ورنہ پھر تمہارا وہاں ٹھہرنا مشکل ہو جائے گا۔ یہ بات علی گڑھ کے گریجویٹس، علی گڑھ کے فضلاء کے لئے تمغہ امتیاز ہو ایک مثال ہو، جیسے آگے آگے ایک جلوس چلتا ہے، اسی طرح سے نیک نامی کا، بلند نگاہی کا، پاک دامنی کا اور عالی نظری کا، گویا ایک جلوس آگے آگے چلے، وہ جلوس انسانی شکل میں نہیں ہوگا، لیکن ان روایات کے شکل میں ہوگا، وہ ان تجربات کی شکل میں ہوگا جو اس کے بارے میں کئے جا چکے ہیں۔ ہمارے ان حضرات میں جن کے ہاتھ میں زمام کار ہے، وہ ہمارے لئے ہر طرح سے قابل احترام ہے اور ان سے ہر طرح کی توقع قائم کی جاسکتی ہے، انہوں نے اور قابل احترام اساتذہ نے تربیت کرنے والوں نے اور ہاسٹلوں کی نگرانی کرنے والوں نے اور علمی مشورہ دینے والوں نے کام کرانے والوں نے اگر یہ فریضہ انجام دیا، یہ خدمت انجام دی، تو پھر علی گڑھ کا نام بلند

ہوگا، صرف یہی نہیں بلکہ پورے ایشیا، اور پوری دنیا میں اس کا سکھ، اور میں پورے یقین کے ساتھ کہتا ہوں سرسید علیہ الرحمہ کی نظر صرف اسی پر نہیں تھی کہ مسلمانوں کو آسامیاں نہیں مل رہی ہیں اس لئے انگریزی پڑھنی چاہئے، تاکہ ان کو نوکریاں ملیں اور اپنے گھر والوں کی پرورش کر سکیں۔ اگر آپ ”آثار الصنادید“ پڑھیں تو جس طرح انہوں نے شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ کیا ہے، جس عقیدت مندی کے ساتھ کیا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ وہ قوم و روشنائی سے نہیں لکھ رہے ہیں بلکہ دل سے بات نکل رہی ہے۔ آپ اس سے ان کے جذبات کو، ان کے مسلک کو، طرز فکر کو معلوم کر سکتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ ان کے ساتھ یہ ایک بہت بڑی ناسپاسی ہوگی، ناقدری ہوگی کہ ہم یونیورسٹی سے ان لوگوں کو نکالنا اپنا فرض سمجھیں جو ملازمت کر سکیں اور ملازمت کی اہلیت رکھ سکیں اور اچھی اچھی آسامیاں پاسکیں، اپنے محدود خاندانوں کی پرورش کر سکیں، اس سے قائدین کو نکلنا چاہئے کہ قیادت کریں اور جو اس وقت قوم پر ہسٹریا کا دورہ پڑا ہوا ہے، یہ فرقہ وارانہ فسادات کا، مادہ پرستی کا، رشوت خوری کا، بے حسی کا اور فرقہ وارانہ منافرت کا، اس دورہ کو دور کر سکیں، اس کا علاج کر سکیں اور اس کے سامنے وہ سینہ سپر ہو کر کھڑے ہو جائیں، ملک کا رخ پھیرنے کی کوشش کریں، تخریب کے بجائے تعمیر کی طرف، فساد کے بجائے صلح و صفائی کی طرف، بدگمانی کے بجائے نیک گمانی کی طرف، بجائے ایک دوسرے سے ٹکرا کر رہنے کے ایک دوسرے سے مل کر تعاون کر کے، اس ملک کا نام روشن کرنے کے لئے اس ملک میں آئندہ نسلوں کو اطمینان کے ساتھ اپنی صلاحیتوں کا اظہار کرنے کے قابل بنانے کے لئے، اپنی ذہانتیں اور اپنی توانائیاں صرف کریں، اسی کے ساتھ میں آپ کی اس مہمان نوازی اور آپ کی اس ہمت افزائی کا بھی حق سمجھتا تھا اور اس کا فرض سمجھتا تھا کہ آپ کے سامنے اپنے ضمیر کے مطابق ہی نہیں بلکہ اس عظیم الشان درگاہ کے بانی کی توقعات ان کی امیدوں، ان کے خیالات کی ترجمانی کا کسی درجہ میں فرض ادا کروں، کس طرح میں شکریہ ادا کر سکوں گا، اس سپاس نامہ کا اور اس نظم و نشر کا جو میری حقیر ذات کے بارے میں کہی گئیں اور پڑھی گئیں۔

اس کا شکریہ یہ ہے کہ میں آپ کو بتاؤں کہ یہاں سے ملت کے وہ جواہر پارے، ملت کے وہ لعل و گوہر نکلیں جو صرف اپنے محلوں کو، اپنے قصبات ہی کو نہیں بلکہ ہندوستان کو چمکا دیں،

جس کی روشنی باہر تک پہنچے، میں امید کرتا ہوں کہ میری اس حقیر گزارش کو اپنے بلند ذہن میں علمی اور تعمیری ذہن میں جگہ دیں گے اور اب یونیورسٹی کا رخ اس طرح ہوگا کہ اس ملک کو موجودہ امتحانات و مشکلات سے نکالنے کے لئے وہ افراد پیدا کرے جو اس ملک کو صحیح راستے پر لگائیں اور یہی وہ کردار ہے اور یہی وہ میدان ہے جس کو مولانا محمد علی جوہر نے بزرگ خلافت کے ممبر داروں نے یہاں سے نکلنے والے فاضل اور سر یچوئیس اور اس کا لمر نے انجام دیا۔

مجھے معاف کیا جائے کچھ عرصہ سے اس میں تھوڑا سا تعطل پیدا ہو گیا ہے، اس تعطل کو دور کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ یہی یونیورسٹی کے موجودہ ذمہ داروں کی سب سے بڑی کامیابی اور کارنامہ ہوگا کہ یونیورسٹی کا رخ اب پھر اس طرف پھیریں جس رخ پر سر سید علیہ الرحمہ اس کو چلانا چاہتے تھے، جس ماحول میں وہ افراد نکلے جنہوں نے دنیا میں ہندوستان کا نام پیدا کیا، اور وہ تحریکیں چلائیں جنہوں نے ہندوستان کا نقشہ بدل دیا، سیاسی، ہنسی، شعوری نقشہ بدل دیا، ان ہی الفاظ کے ساتھ پھر میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں بالکل توقع نہیں تھی کہ مجھے اس امتحان سے بھی گزرنا پڑے گا، یونیورسٹی کی رعایت سے کہتا ہوں کہ یہ میرے لئے ایک امتحان ہے، یہ خیال کیا کہ خواہ میں آپ کے یہاں زیادہ نمبر پانے کا مستحق نہ ہوں لیکن خدا اور رسول کے یہاں مجھ سے یہ سوال نہ ہو کہ خدا نے تم کو ایک زریں موقع دیا تھا۔ تم نے وہاں کوتاہی کی، وہاں حق بات نہیں کہی، ساتھ ہی ساتھ آپ سے معافی بھی چاہتا ہوں اور آپ کا شکریہ بھی ادا کرتا ہوں۔

وما علینا الا البلاغ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

ذاتی تعلق، ذاتی محنت اور جذبہ خدا طلبی

۲۵ رجب ۱۳۸۵ھ مطابق ۲۰ نومبر ۱۹۶۵ء بعد نماز ظہر جمالیہ ہال میں طلبائے دارالعلوم کی طرف سے فاغ ہونے والے طلبہ کے اعزاز میں الوداعی جلسہ منعقد ہوا، جس میں جانے والے طلبہ نے اپنے تاثرات پیش کئے، آخر میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے مختصر طور پر چند کلمات ارشاد فرمائے۔

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونعوذ بالله من شرور النفسنا ومن
سَيِّئات اعمالنا من يهد الله فلا مضل له ومن يضلل فلا هادي له ونشهد
ان لا اله الا الله ونشهد ان محمد عبده ورسوله الذي ارسله الله تعالى
بالحق بشيرا ونذيرا وداعيا الى الله باذنه وسراجا منيرا .

قدیم رسم:

عزیز طلباء! مشرقی تہذیب میں بہت قدیم زمانہ سے یہ رسم چلی آرہی ہے کہ جب کوئی شخص کسی دور دراز سفر پر روانہ ہوتا ہے، یا ایک دوسرے سے جدا ہوتا ہے، تو اس وقت اپنے کسی بڑے مخلص یا تجربہ کار سے کچھ نصیحتیں اور کچھ وصیتیں سننا چاہتا ہے، جو اس نے اپنی زندگی کے تجربات سے حاصل کی ہیں، اس لحاظ سے اس وقت آپ کی یہ خواہش درست اور صحیح ہے۔ میں ہوتا یا میری جگہ پر کوئی اور شخص اور وہ آپ کو اس موقع پر کچھ ایسی باتیں بتاتا جن کو اپنا کر آپ کامیابی کی منزل کی طرف بڑھ سکتے اور آئندہ زندگی میں لائحہ عمل کے طور پر کام میں لاتے تو یہ عین مناسب بات تھی، لیکن میرے عزیزو! آج میں اپنی ان عزیزوں سے کیا کہوں اور کن کن چیزوں کی طرف توجہ دلاؤں، بہر حال اس وقت میں مختصر طور پر کچھ کہوں گا، اگرچہ اس کی مثال ایسی ہی ہے کہ ”بسم اللہ“ کو نکال کر سوئے ادب سے بچنے کے لئے شروع میں ۷۸۶ کا عدد لکھ دیا جائے لیکن ظاہر ہے کہ جو برکت بسم اللہ کے اندر ہی، وہ ۷۸۶ سے نہیں حاصل ہو سکتی،

اس کی مثال ایسی ہی ہے کہ پوری کتاب سے چند سطریں لکھ دی جائیں اور اس کو مختصر کر کے پیش کر دیا جائے، لیکن جس طرح سے میں نے ابھی عرض کیا کہ بسم اللہ کی جگہ ۸۶ کے عدد نہیں لے سکتا، اسی طرح سے کتاب اور مضمون کی جگہ اس کی چند سطریں نہیں لے سکتی ہیں، پھر بھی مختصر میں تین باتیں کہوں گا کہ اگر آپ سننا چاہتے ہیں تو ان کو لوح دل پر ثبت کر لیں اور دل و دماغ کے امانت خانہ میں اچھی طرح محفوظ کر لیں، اس سلسلے میں انسان کے لئے جو سب سے زیادہ مفید اور سب سے زیادہ قابل اعتماد چیز ہو سکتی ہے، وہ اس کے ذاتی تجربات ہوتے ہیں جن میں کم سے کم شبہ کا امکان ہوتا ہے، اس لئے اس وقت میں خود اپنے ہی تجربات آپ کے سامنے پیش کروں گا۔

ذاتی تعلق:

پہلی چیز وہ ذاتی تعلق ہے، جو مجھے اپنے اساتذہ سے ہمیشہ رہا، وہ تعلق نہیں جو ضابطہ کی خانہ پری کے لئے ہو، بلکہ وہ تعلق جو شب و روز کا تھا، اس تعلق کو میرے مخلص اساتذہ بھی محسوس کرتے تھے اور میں بھی اس کو محسوس کرتا تھا، یہ وہ پہلی چیز ہے، جس نے مجھے بہت نفع پہنچایا اور میں نے جو کچھ حاصل کیا وہ اسی کا صلہ ہے، خوش قسمتی سے میری تعلیم کا نظام کچھ ایسا رہا کہ اساتذہ کی تعداد کم تھی، اور اس کی وجہ سے ان کی قدر کرنے اور ان سے خصوصی تعلق رکھنے کے مواقع زیادہ تھے۔

ایک طالب علم کے لئے یہ بہت ضروری ہے کہ اس کا رجحان جس فن کی طرف ہو، اس کے ماہر اور متخصص کے پاس رہ کر اس سے وہ اپنی صلاحیت کے مطابق استفادہ کرے، بغیر اس ربط کے وہ زیادہ فائدہ نہیں اٹھا سکتا، اگر آپ ادیب بننا چاہتے ہیں تو اس کی پیروی کریں، جس کا ادب آپ کے لئے زیادہ نفع بخش اور مفید ہو، اسی طریقہ سے اگر آپ کو تفسیر یا کسی اور فن سے لگاؤ ہے تو اس کے ماہر استاذ سے اپنا خصوصی ربط قائم رکھیں، اب آپ کے سامنے میں وہ چند باتیں پیش کرتا ہوں، جن کی رہنمائی اور روشنی میں آپ اپنے سفر زندگی کا آغاز کر سکتے ہیں۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ آپ اپنے زندگی کے لئے ایک شخصیت کا انتخاب کر لیں، یہ حقیقت ہے کہ چراغ سے چراغ جلتا ہے، اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ کوئی بھی مخلص بندہ آپ کو کہیں مل جائے تو آپ اس کو اپنا رہنما مان کر اپنی زندگی کی نئی تعمیر شروع کریں، اس میں

آپ کو پورا پورا اختیار ہے کہ جس کو چاہیں اور جہاں چاہیں ایشیا یا ایشیا سے باہر دنیا کے کسی گوشہ میں آپ اس کو دریافت کر لیں، بلکہ میں آگے بڑھ کر یہاں تک کہتا ہوں کہ زندوں میں آپ کو کوئی ایسا نظر نہ آئے تو ماضی کی شخصیتوں میں اس کی تلاش کیجئے اور جہاں کہیں یہ بندہ خدا آپ کو ملے، اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیجئے اور کچھ دنوں تک اس کی ہر چیز کو اپنے اندر منتقل کرنے کی کوشش کیجئے، انسان میں یہ صفت بہت نمایاں طور پر ہے کہ وہ جس چیز کو چاہتا ہے، اس کو نقل کر لیتا ہے، آپ اس کی ہر چیز کی نقل اتار یے اس کے بعد آپ بڑے ہو سکتے ہیں، آپ اس سے آگے بھی نکل سکتے ہیں، اور ایسی جگہ بھی پہنچ سکتے ہیں، جہاں آپ کو اس تعلق کی ضرورت نہ ہوگی، اگرچہ یہ بات بہت کم لوگوں کو حاصل ہوتی ہے۔

ذاتی محنت:

دوسری بات جو آپ سے کہنی ہے، وہ یہ ہے کہ آپ تاریخ کی شخصیتوں میں سے جس کا بھی نام لیں، جب آپ اس کی سیرت کا مطالعہ کریں گے، اس کی زندگی کی تہہ تک جانے کی کوشش کریں گے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ اس کی شخصیت کو بنانے اور ستوارنے والی سب سے اہم اور بنیادی چیز اس کی ذاتی محنت، اس کی فکر و لگن، مقصد کی دھن اور اس کی تڑپ تھی، اس کے بغیر اگر اساتذہ چاہیں یا عظیم الشان ادارے اس کے لئے کوشش کریں، کسی کے بس میں کچھ نہیں ہے، جو بھی بنا ہے، وہ اپنی ذاتی محنت اور جدوجہد سے بنا ہے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اساتذہ کی رہنمائی بھی ضروری ہے، لیکن اگر اللہ کی توفیق شامل حال ہے تو پھر اپنی ذاتی محنت سے انسان اپنے آپ کو سب کچھ بنا سکتا ہے۔

جذبہ خدا طلبی:

تیسری بات جو آپ سے کہنی ہے، وہ یہ ہے کہ انسان کو ہر وقت اس چیز کی فکر کرنی چاہئے، جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے، اور جو چیز اس کو حقیقت میں کام آنے والی ہے، وہ آخرت کی فکر، خدا کی مرضی اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کا شوق اور جذبہ ہے۔ اگر انسان کے اندر یہ چیز نہیں ہے تو خواہ وہ بڑے سے بڑا ادیب ہو، بہت بڑا مقرر و خطیب ہو، یا بہت بڑا مفسر و فقیہ ہو، اس دولت سے محروم ہی رہے گا، یہ ممکن ہے تھوڑی دیر کے لئے کچھ واہ واہ اور کچھ

ناموری اور کچھ داد و تحسین حاصل کر لے مگر آگے اس کا کچھ حصہ نہیں، حقیقت میں جو چیز کام آنے والی ہے، وہ خشیت الہی ہے، وہ آخرت کی فکر ہے وہ اللہ کی مرضی کی تلاش ہے، ایک مرتبہ مولانا فضل الرحمن گنج مراد آبادی نے ایک طالب علم سے پوچھا تم کیا پڑھتے ہو؟ عرض کیا۔ ”قاضی مبارک۔“

ارشاد ہوا۔ ”استغفر اللہ۔“ ”نعوذ باللہ! قاضی مبارک پڑھتے ہو، اس سے حاصل؟ ہم نے فرض کیا کہ تم منطق پڑھ کر قاضی مبارک کے مثل ہو گئے، پھر کیا؟ قاضی مبارک کی قبر پر جا کر دیکھو کیا حال ہے، اور ایک بے علم کی قبر پر جاؤ جس کو خدا سے نسبت تھی اس پر کیسے انوار و برکات ہیں۔“

میں نے مانا کہ آپ بڑے ادیب و دانش، پرداز بن جائیں (اگرچہ میں اس کا پروردگار ہوں اور میں نے اس سے بہت کام لیا ہے) لیکن یہ سب چیزیں اسی وقت کام آ سکتی ہے، جب ان سے مطلوب رضائے الہی ہو۔

لہذا میرے عزیزو! ہر چیز پر اس کو مقدم رکھیں اور اسی کو اپنا مقصد حیات بنائیں۔
(۲۲/ نومبر ۶۵ء کو مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے مدرسہ ثانویہ کے انعامی جلسہ میں بچوں کو جو نصیحت کی وہ بھی مختصر اور ج ذیل ہے۔)

میرے عزیزو! آج تم کو دیکھ کر بڑی خوشی ہو رہی ہے، ایسی ہی جیسے کسی خاندان کے بڑے یا بزرگ کو اپنے چھوٹے بچوں کو دیکھ کر خوشی ہوتی ہے، میں تم کو مبارک باد دیتا ہوں، اور سب سے بڑی مبارک باد اس پر کہ تم نے محنت کر کے انعامات کا استحقاق پیدا کیا اور تمہارے اساتذہ اور تمہارے ہیڈ ماسٹر صاحب نے تم کو اس کا اہل سمجھا، ان انعامات کی قیمت بازار میں کچھ زیادہ نہیں ہے جو تم کو کتابوں اور دوسری چیزوں کی صورت میں ملے ہیں، بلکہ اس لحاظ سے انعامات بہت قیمتی ہیں کہ اس وقت جب کہ تمہارے اساتذہ موجود ہیں یہ کہہ کر دیئے جا رہے ہیں کہ ہمارے ان بچوں نے مختلف چیزوں میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔

آج مجھے افسوس ہوتا ہے کہ جو چیزیں ہم نے اپنے بچپن میں بطور انعام حاصل کیں وہ بچپن کی بے خیالی میں ضائع ہو گئیں، اب میں تم کو نصیحت بلکہ وصیت کرتا ہوں کہ ان کو بہت اچھی طرح اور حفاظت سے رکھنا، آج میں نے تمہاری تقریریں سنیں اور تمہاری تقریریں ریکارڈ

کی گئی ہیں، یہ تقریریں تمہاری عمر اور تمہاری استعداد کے لحاظ سے بڑی غنیمت اور بہت اچھی ہیں، اور ایک اچھے مستقبل کی پیشن گوئی کرتی ہیں، مگر جی یہ چاہتا ہے کہ یہ تقریریں اور زیادہ بے تکلف اور سادہ ہوں، کیونکہ اچھی تقریر وہی ہوتی ہے جو زیادہ سے زیادہ سادہ اور بے تکلف ہو، یقیناً تمہاری تقریریں قابل مبارکباد ہیں، مجھے محسوس ہوتا ہے کہ تمہارے اساتذہ اپنے مقصد میں بہت حد تک کامیاب ہیں، اب چند باتیں تم سے کہنا چاہتا ہوں جو تمہارے کرنے کی ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ انسان جو کچھ بچپن میں سوچتا ہے بعینہ ان چیزوں کو اللہ تعالیٰ کسی نہ کسی موقع پر پورا کر دیتا ہے، لہذا جو خیال کرو یا جو آرزو تمنا کرو بہت سوچ سمجھ کر کرو، ایسا نہ ہو کہ بعد میں تمہیں افسوس کرنا پڑے، یہ بڑے تجربہ کی بات ہے۔ بچپن کا خیال حقیقت بن کر سامنے آتا ہے، ابھی سے تم یہ ارادہ کرو کہ تم اسلام کا نام روشن کرو گے، اللہ کا پیغام پہنچاؤ گے، اسلام کے سچے اور مخلص داعی بنو گے، ایسا نہ سوچو بعض بچے سوچتے ہیں کہ ہم ٹی ٹی آئی بنیں گے اور مفت سفر کیا کریں گے، یا ہم تھانیدار یا اسی طرح کی اور بہت سی باتیں، یہ بات بری نہیں ہیں، بلکہ تم کو اس سے بھی اونچا سوچنا چاہئے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم ٹی ٹی آئی کے بجائے گارڈ بننے کے لئے سوچنے لگو یا تھانیدار کے بجائے ایس پی بلکہ اللہ تعالیٰ کو بچپن کی معصومیت اتنی پسند ہے کہ اس وقت بچہ جو سوچتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو پورا کرتا ہے، تم اونچے سے اونچا ارادہ کرو اور اچھی سے اچھی آرزو کرو کہ اللہ نے جو پیغمبروں سے کام لیا وہ ہم کریں گے، اللہ کے ولی اور دوست بنیں گے، ہم بہت بڑے عالم و فاضل بنیں گے اور اللہ کے بندوں کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچائیں گے، دیکھو انسان کے اندر اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت رکھی ہے کہ وہ سب کچھ بن سکتا ہے، فرشتہ بلکہ فرشتہ سے بھی بڑھ سکتا ہے، اس لئے کہ انسان میں بہت سی وہ صلاحیتیں ہیں جو فرشتوں میں نہیں ہیں، جب معاملہ یہ ہے کہ آدمی بہت کچھ بن سکتا ہے اور بہت بڑا بن سکتا ہے تو تم چھوٹی اور گری پڑی آرزوئیں کیوں کرو، تم ہمیشہ یہ آرزو کرو کہ اللہ ہمیں اپنے دین کی خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے، اور تم سے وہ کام لے جس کی زمانہ کو ضرورت ہے، ہماری آرزو اور ہماری تمنا اور خواہش تم سے یہی ہے۔

شوق ترا اگر نہ ہو، میری نماز کا امام

میرا قیام بھی حجاب، میرا جود بھی حجاب

وما علینا الا البلاغ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

آج نبوت محمدی ﷺ پر الحاد و دہریت کا حملہ ہے
کوئی شاہین ہے جو اس کے مقابلہ کی سعادت حاصل کرے؟

۳ جولائی ۱۹۶۶ء کو سلیمانہ ہال میں طلبائے دارالعلوم کے سامنے حضرت مولانا سید ابوال
حسن علی ندوی نے ایک اہم تقریر کی جو مسلسل دو گھنٹے تک جاری رہی اور ریکارڈ بھی کی گئی، بعد میں
شفیق رائے بریلوی نے اس کو قلم بند کیا۔

الحمد لله فحمده ونستعينه ونستغفره ونعوذ بالله من شرور انفسنا ومن
سينات اعمالنا من يهد الله فلا مضل له ومن يضلل الله فلا هادي له ونشهد
ان لا اله الا الله ونشهد ان محمد عبده ورسوله الذي ارسله الله تعالى
بالحق بشيرا ونذيرا وذا عيا الى الله باذنه وسراجا منيرا .

طلبہ کی دو قسمیں:

میرے عزیزو! بغیر کسی تکلف و تمہید کے میں تمہارے سامنے چند باتیں رکھنا چاہتا ہوں،
عزیزوں سے کسی تکلف کی ضرورت نہیں ہوا کرتی، خاندان میں تم نے کبھی نہ دیکھا ہوگا کہ بڑا
بھائی چھوٹے بھائی سے تصنع برتا ہوا یا چھوٹا بھائی بڑے بھائی سے بات کرنے میں تکلف و تمہید
اختیار کرتا ہو۔

جو لوگ یہاں آئے ہیں اور پڑھ رہے ہیں، ان کی دو قسمیں ہو سکتی ہیں، ایک قسم تو ان
بھائیوں اور عزیزوں کی ہے جو ماں باپ کے اصرار اور تقاضہ سے یا اس تعلق سے مجبور ہو کر جو
اس معاشرہ میں والدین کا اولاد سے ہوا کرتا ہے، یہاں آئے ہیں، یعنی یہ کہ ہمارا انکار جو تعلق
ہے وہ اس بناء پر ہے کہ وہ ماں باپ کے حکم کی تعمیل میں یہاں آئے ہیں، ان کی یہاں آنے کی
نتو خواہش تھی اور نہ ان کے نزدیک اس کا کوئی فائدہ تھا، چنانچہ یہاں آنے کے بعد بجائے اس
کے یہاں ان کے دل میں اطمینان کی فضا قائم ہوتی، وہ اپنے والدین کے شکر گزار ہوتے اور

ان کی خیر خواہی کے قائل ہو جاتے کہ انہوں نے بہت صحیح جگہ کا انتخاب کیا اور ان کی زندگی سے لئے اچھا راستہ تجویز کیا، ان کے اندر مزید کشمکش پیدا ہو گئی ہے، اب یہ کسی وجہ سے بھی ہو، میں ان کے اسباب نہیں بیان کروں گا، یہاں ان تفصیلات کی ضرورت نہیں، ان کے علاج کی ضرورت ہے۔

ان کو یہاں آ کر روز بروز یہ محسوس ہونے لگا کہ ان کو فائدہ یہاں حاصل نہیں ہو رہا ہے، ان کے والدین غالباً یہاں کے حالات سے واقف نہ تھے، اور یہاں کی افادیت کا پوری طرح اندازہ انہیں نہیں تھا، وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ جتنا زیادہ یہاں قیام رہے گا اتنا ہی ہمارا وقت گزرتا جائے گا، اور کچھ حاصل نہ ہوگا، کوئی خاص چیز یہاں سے ہم لے کر نہیں جائیں گے اور ہمیں برباد کیا جا رہا ہے، مجھے اس پر تعجب نہیں کہ عربی مدرسہ میں ایسے لوگوں کی بھی کوئی قسم ہو سکتی ہے، اس لئے کہ واقعات کی دنیا میں بہت سی ایسی باتیں ہوتی ہیں، جن کو ہم پسند نہیں کرتے، یہ بالکل ممکن ہے کہ اچھے لوگ بھی جو بہت سعید اور صالح ہوں، اور بعد میں جا کر بہت ترقی کریں، علمی ترقی کریں، دینی ترقی کریں، اولیاء اللہ بن جائیں، لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ جب تک ان کے دل کو اطمینان حاصل نہیں ہے، وہ کشمکش میں مبتلا رہیں، اور اس قسم کی ذہنی کشمکش میں مبتلا رہیں جو ہر وقت ان کے ساتھ رہتی ہے، اور کسی وقت ان کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔

ان سے مجھے یہ کہنا ہے کہ وہ اپنے فیصلہ میں بالکل آزاد ہیں، وہ اگر یہاں آ کر بھی مطمئن نہیں ہوئے، اگر وہ یہاں کے نظام کے ساتھ، یہاں کے قواعد، قوانین، ضوابط اور یہاں کی فضا کے ساتھ اشتراک عمل نہیں کر سکتے، اور اس کے ساتھ خوشدلی کے ساتھ نہیں رہ سکتے، انہیں یہاں الجھن ہے، اور دن رات ان کو یہ الجھن ستاتی ہے، اور یہ ان کے لئے ایک مسئلہ بن گیا ہے تو میں ان سے بہت ہی آزادی کے ساتھ، خلوص اور صاف دلی کے ساتھ کہوں گا کہ وہ طلباء، ہمت اور اخلاقی جرأت سے کام لیں۔ اخلاقی جرأت سے بہت مدد ملتی ہے، اس سے لوگوں نے بڑے بڑے کام کئے ہیں، اس سے بڑے بڑے فیصلے صادر ہو چکے ہیں، اور وہ اپنے فیصلہ میں آزاد ہیں، وہ اپنے والدین کو صاف صاف لکھ سکتے ہیں کہ یہاں آ کر ہمیں اطمینان حاصل نہیں ہوا، ہم یہاں آ کر کوئی فائدہ حاصل نہیں کر رہے ہیں اور ہمیں یہ محسوس ہو رہا ہے کہ ہمارا وقت ضائع ہو رہا ہے، آپ بڑے مغالطہ میں مبتلا ہیں اور خود کو دھوکہ میں رکھے ہوئے ہیں،

آپ سمجھ رہے ہیں کہ ہم یہاں بڑی محنت سے پڑھ رہے ہیں، لیکن واقعہ یہ نہیں ہے، کس وجہ سے؟ یہ ہم آکر بیان کریں گے، یا پھر کسی موقع پر ذکر کریں گے۔ بہر حال حقیقت یہی ہے کہ یہاں ہمارا دل نہیں لگ رہا ہے، یہاں ہمیں کوئی فائدہ محسوس نہیں ہو رہا ہے، ان بھائیوں سے تو یہ کہنا تھا کہ وہ فیصلہ کر لیں، ہمیں انشاء اللہ ان سے نہ کوئی شکایت پیدا ہوگی، اور نہ آئندہ ہمارے ان کے تعلق میں انشاء اللہ کوئی فرق واقع ہوگا، اور نہ ہم ان کے لئے خدا نخواستہ کوئی بات زبان سے نکالیں گے۔

ہماری طرف سے اجازت ہے کہ وہ بخوشی اپنے گھر جائیں، والدین کے سامنے ذرا جرأت و ہمت سے پوری بات رکھ دیں کہ آپ نے ہمیں جس دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم پانے کے لئے بھیجا تھا، وہاں جا کر ہم مطمئن نہیں ہوئے، ہمارے لئے آپ کوئی دوسرا راستہ تجویز کیجئے۔

دوسری قسم:

اب دوسری قسم وہ ہے جو یہاں آنے کے بعد یا یہاں آنے سے پہلے یہاں سے مطمئن ہو گئی ہے، اور جو یہ سمجھتی ہے کہ ہم مدرسہ سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس نے ہمیں زریں موقع عطا کیا ہے، علوم دینی میں مہارت پیدا کرنے کے لئے دین کے مطالب کو اور اس کے مقاصد کو سمجھنے کے لئے، اس کے حقائق و معارف کو جاننے اور ان کے اندر تعمق پیدا کرنے کے لئے اللہ نے بہت اچھا موقع عنایت فرمایا، اس کے تمام سامان یہاں مہیا ہیں، تمام ضروری شرائط جو اس کے لئے ضروری ہیں، یہاں موجود ہیں، جن لوگوں کا کسی درجہ میں اس پر اعتقاد ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ ہم دارالعلوم کی تعلیم سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور علوم دینیہ میں کمال حاصل کر سکتے ہیں اور یہاں ہم ان مضامین میں جو پڑھائے جاتے ہیں، اچھی سمجھ اور اعلیٰ دستگاہ پیدا کر سکتے ہیں، اور بہت سے پہلے اپنے لئے سوال ہے ”قُواْ اَنْفُسَكُمْ وَهَلِیْكُمْ نَارًا“ اور ہر شخص اپنا ذمہ دار ہے۔ ”لَا تَنْزِرُواْ زُرَّةَ وَزْرًا اٰخَرٰی“ اس کے بعد اپنے اپنے والدین کے لئے خاندان کے لئے، ہستی کے لئے پھر اللہ اگر ہمت و توفیق دے تو اپنے صوبے کے لئے اور توفیق و صلاحیت مزید عطا کرے تو ملک کے لئے اور اگر اللہ تعالیٰ اس سے بڑا حوصلہ اور ظرف عطا فرمائے تو پوری انسانیت کے لئے مفید ہو سکتے ہیں، اور نہ صرف یہ کہ ہم کو

اللہ کا راستہ معلوم ہو جائے بلکہ ہم اس راستہ کی طرف دوسروں کو بلانے کی بھی صلاحیت اپنے اندر پیدا کر سکتے ہیں، جو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ نبوت (ﷺ) کی نیابت ہے، جو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ وہ دولت ہے جو اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے اس کے مخصوص بندوں کو جن سے وہ امامت اور ہدایت کا کام لیتا ہے، ملتی ہے۔ ارشاد ہے "وَجَعَلْنَا هُمْ اٰئِمَّةً يَهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لِمَا صَبَرُوْا وَكَانُوا بِآيَاتِنَا يُوقِنُوْنَ" (ہم نے ان کو پیشوا بنایا، امامت کا منصب عطا کیا کہ ہمارے حکم سے وہ دوسروں کو بھی ہدایت کرتے ہیں) جو یہ سمجھتے ہیں کہ صلاحیت و توفیق جس کسی کو نصیب ہو جاتی ہے، اس سے سو آدمی، ایک ہزار اور ایک لاکھ آدمی اور اللہ تعالیٰ کی فیاضی اور شان کریمی سے کچھ بعید نہیں کہ لاکھوں اور کروڑوں آدمی ہدایت پاتے ہیں اس کے نامہ اعمال میں لاکھوں اور کروڑوں آدمی لکھتے جاتے ہیں، جیسا کہ خولجہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے حساب میں لکھے گئے ہیں، حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے حساب میں لکھے گئے، حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے حساب میں لکھے گئے، امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے حساب میں لکھے گئے، آج ساری دنیائے اسلام میں جتنے مسلمان ہیں، ان میں سے بہت تھوڑی تعداد مستثنیٰ کر کے تمام مسلمان چار مسلکوں میں بٹے ہوئے ہیں، مسلک حنفی، مسلک شافعی، مسلک مالکی اور مسلک حنبلی!

اب آپ یہ دیکھئے کہ ایک ایک کے حساب میں کتنے لوگ آئے، کروڑوں انسان ایک ایک امام کے حساب میں لکھے گئے، اگر ان کے اس زمانہ سے جس وقت انہوں نے مسائل کا استنباط کیا، اور لوگوں نے اس سے فائدہ حاصل کرنا شروع کیا، اس وقت تک جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے حساب میں کتنے کروڑ بلکہ کتنے ارب انسان لکھے گئے اور یہ بھی تو دیکھو کہ کس خانہ میں لکھے گئے؟ نماز کی فرد میں لکھے گئے، روزہ کی فرد میں لکھے گئے، زکوٰۃ کی فرد میں لکھے گئے، ارکان اربعہ کی فرد میں لکھے گئے۔ ائمہ اربعہ کی فہرست میں جو لوگ لکھے گئے، کس کس عنوان کے ماتحت ان کا اندراج ہوا، کتنی نمازیں ان کے حساب میں آئیں، اربوں انسانوں کے اعمال خیران کے نامہ اعمال میں لکھے گئے، آج ابھی ظہر کی نماز آپ پڑھیں گے، یقین کیجئے اس بات پر کہ اس کا ثواب امام ابوحنیفہ، امام شافعی کی روح کو پہنچے گا، اس میں ذرا بھی کام نہیں، قرآن اس پر شاہد! حدیث اس پر شاہد! افتد اس پر شاہد! اور تمہارے سامنے یہ علماء

بیٹھے ہوئے ہیں، ان سے پوچھو کہ کیا اس کا ثواب امام ابو حنیفہ، امام ابو یوسف، امام محمد کو نہیں پہنچا؟ کیا اس کا ثواب امام شافعی، امام مالک، امام احمد بن حنبل کو نہیں پہنچا؟ جن کے مسئلہ کے مطابق تم نے اپنی نمازیں درست طریقہ پر ادا کیں، جن کی محنت و استنباط کے نتیجے میں تم میں سے کسی نے اپنی نماز میں دعائے قنوت پڑھی اور کسی نے چھوڑ دی، ان کو بھی ثواب ملا اور تم کو بھی ثواب ملا۔

کیا کوئی اندازہ بھی کیا جاسکتا ہے، ان کے اجر و ثواب کا؟ آج کون ریاضی داں ہے، جو ان ائمہ اربعہ اور ان محدثین کرام اور ان فقہائے عظام اور ان مشائخ کبار کے ثواب کا حساب جوڑ سکے، اور اس کی کوئی میزان متعین کر سکے، کیا کسی کو بھی یہ قابلیت ہے کہ امام شافعی، امام غزالی کے ثواب کا حساب جوڑ سکے؟ امام ابو حنیفہ کے ثواب اسیدنا عبدالقادر جیلانی، مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ کے ثواب کی میزان مرتب کر سکے؟ کسی میں ہمت نہیں! یہ وہ جگہ ہے جہاں یورپ کی ساری مشینیں عاجز ہیں، اور ساری دوربینیں عاجز ہیں اور یورپ کے سارے سائنسٹ اور ریاضی داں عاجز ہیں۔

عصر حاضر کے فتنے:

میرے عزیزو! خوش قسمتی سے تمہارا تعلق اسی قسم سے ہے جو یہ سمجھتی ہے کہ ہم عربی مدرسہ میں کیوں آئے؟ یہاں آنے کا کیا فائدہ ہے؟ جس کو یہ اطمینان ہے (خواہ کسی بھی درجہ میں سہی) کہ ہم یہاں رہ کر ان اماموں کی صف میں تو نہیں (کہ اس کی کوئی جرات نہیں کر سکتا) اس کے خادموں اور کفّش برداروں کی صف میں شامل ہو سکتے ہیں، لیکن اللہ کے احکام جو دو سزا میں کوئی فرق نہیں، ان کا فرمان اور اعلان ہے (کلا نمد هؤلآء وهولآء من عطاء ربک وما کان عطاء ربک محظورا) وہ پھر کوئی نیا امام پیدا کر دے تو وہ اس پر قادر ہے، اور اگر پھر کسی کو ہدایت کا وہی ثواب عطا کرنے لگے اور وہی کام لے تو بالکل ممکن ہے!

آج کتنے بڑے بڑے فتنے ہیں، جو اس وقت جہنم کے شعلوں کی مانند بھڑک رہے ہیں اور پورے پورے اسلامی ملکوں کو جلا کر خاکستر کر دینا چاہتے ہیں، اور صحابہ کرام کے کارناموں پر پانی پھیر دینا چاہتے ہیں۔

آج قسم قسم کے اسلام سوز، ایمان سوز، اخلاق سوز، انسانیت سوز فتنے ابھر رہے ہیں،

مادیت، الحاد، قوم پرستی، نبوت محمدی ﷺ سے آنکھیں ملاتے کے لئے تیار ہے، آج مسلمہ کذاب نئے نئے روپ میں آ رہا ہے اور نبوت محمدی کو چیلنج کر رہا ہے۔

آج رسول اللہ ﷺ کے سرمایہ پر ڈاکہ ڈال رہا ہے، آپ کے قلعہ میں شگاف پیدا کئے جارہے ہیں، آپ کے دارالسلطنت پر حملہ کیا جا رہا ہے، اگر آج امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ، امام احمد بن حنبلؒ ہوتے تو یقین کرتا ہوں کہ شاید وہ فقہ کی تدوین بھی تھوڑی دیر کے لئے روک دیتے اور اس مسئلہ کی طرف توجہ کرتے، تم خوش قسمت ہو کہ فقہ حنفی، فقہ شافعی کی تدوین کی خدمت تمہارے ذمہ نہیں ہے، اللہ کی حکمت بالغہ اور اس کی قدرت کاملہ نے اس کے لئے پہلے ہی انتظام کر دیا، اور امت کو امام شافعیؒ، امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ اور امام احمدؒ جیسے ائمہ عطا کئے، جب کہ ایک لمحہ اور ایک منٹ کی تاخیر کی گنجائش نہیں تھی، تم خوش قسمت ہو، خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہو، آج تمہارے لئے کام کے دوسرے میدان ہیں، آج تمہارے لئے الحاد سے بچہ آزمائی کا موقع ہے۔

تمہارے لئے الحاد اور مادیت سے آنکھ ملانے کا موقع ہے، یقین مانو کہ اس سے امام حنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ و امام احمدؒ کی روح نہیں۔ محمد عربیؐ کی روح خوش ہوگی، آج کب سے یہ صدائیں لگ رہی ہیں کہ:

گوئے توفیق و سعادت در میان افگندہ اند
کس بہ میدان در نمی آید سواراں راچہ شد

تمہارا میدان:

آج عالم اسلام کی نگاہیں ان درسگاہوں کی طرف لگی ہوئی ہیں، جوان باتوں کو سمجھنے کی اہلیت و صلاحیت رکھتی ہیں، جن کے بانیوں نے اپنے نصاب و نظام میں اس کی صلاحیت پیدا کرنے کی کوشش کی تھی کہ جب عصر حاضر کا کوئی نیا فتنہ پیدا ہو تو ہمارے فضلاء اس کو سمجھ سکیں اور اس کا مقابلہ کر سکیں۔

نبوت محمدی ﷺ پر الحاد و دہریت کا حملہ:

میرے عزیزو! تمہارے لئے کام کے کتنے وسیع میدان ہیں، اور ان میدانوں میں تھوڑی

سی محنت سے آج کیا کچھ مل سکتا ہے، اس لئے جن لوگوں کو یہاں کا قیام عزیز ہو، یہاں کا نظام عزیز ہو، نصاب عزیز ہو، جن کو یہاں کی تعلیم و تربیت اس لئے عزیز ہو کہ نئے خالد اور نئے ابو عبیدہ پیدا ہوں، اللہ کی لاکھوں اور کروڑوں رحمتیں ہوں، ان کی پاک روحوں پر لیکن ان کی بے چین روئیں زبان حال سے کہہ رہی ہیں کہ وہ قیامت تک نہیں پیدا ہو سکتے، ہم نے تلوار چلانے اور گردن کٹانے میں ایک لمحہ کا تامل نہیں کیا، ہم نے اپنا کام ختم کر لیا، لیکن آج سر کٹانے اور کانٹے کی ضرورت نہیں، آج تو باطل سے آنکھیں ملانے کی ضرورت ہے، آج نبوت محمدی ﷺ پر تلواروں کا حملہ نہیں، دلیلوں کا حملہ ہے، مادیت کا حملہ ہے، قوم پرستی کا حملہ ہے، ہمارے جو عزیز طلبہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہاں رہ کر اس سلسلہ میں کچھ کیا جاسکتا ہے، ان کے لئے یہ سعادت مقدر ہے، وہ اس میں حصہ لے کر ان ابرار و اخیار اور ان شہداء و اتقیا کی صف میں جگہ پاسکتے ہیں، جو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ دعوت کا ایک ایسا میدان ہے، کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے محض اپنی اس حکمت کی بناء پر جس کار از کوئی نہیں جانتا۔ اس زمانہ کے پست ہمتوں کے لئے مقدر کیا ہے کہ اس میں تھوڑی سی محنت سے تم بہت کچھ پاسکتے ہو (من احی سنتی عند فساد امتی فله اجر مائة شہید) کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ سنت کوئی ہے، بے شک اگر کوئی ایک سنت زندہ کرے گا تو سو شہیدوں کا اجر پائے گا، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ”سنتی“ میں سنت کی اضافت جو آپ ﷺ نے اپنی طرف کی ہے، اس کے معنی ہیں میرا چلن، میرا طریقہ، میرا دین اور میرا مسلک، اب ذرا غور کرو کہ رسول اللہ ﷺ جو دین لے کر آئے اس کی دعوت پر جو آج حملے ہو رہے ہیں، ان کے مقابلہ کے لئے اگر کوئی سر بکف ہو کر میدان میں اتر آئے اور ان حملوں کے لئے سپر بن جائے تو اس کا مقام کیا ہوگا، یہ مدرسہ جس کو تم حقارت کی نظر سے دیکھتے ہو، یہاں کی ناتمام عمارتیں، یہاں کی متواضع اور خاکسار اساتذہ، یہاں کی بے سروسامانیاں اور یہاں کی بہت سی خامیاں اور یہ کھانے کی خرابیاں ”واللہ العظیم“ اسی بناء پر ہو سکتا ہے کہ یہاں سے ایسے ایسے لوگ پیدا ہوں جو حق و باطل کے معرکہ کارزار کے لئے شہسوار ہوں، اور جانباز ہوں، اور رسول اللہ ﷺ کے جھنڈے کو پھر سے بلند کریں، اور ملحدانہ اور مادہ پرستانہ تحریکوں اور ایمان سوز فتنوں کا جرأت کے ساتھ مقابلہ کریں، جس کے لئے روح نبوی ﷺ بے چین و مضطرب ہے، اگر ایک ایسی جیتی جاگتی مثال بھی یہاں موجود ہے، اگر ایک دھڑکتا ہوا دل، ایک دیدہ بینا اور ایک گوش

شنو! یہاں حاضر ہے، اور ایک متنفس بھی ایسا ہے، جس کو اس بات کا احساس ہے کہ یہاں رہ کر یہ کام ہو سکتا ہے، جو یہ سمجھتا ہے کہ وہ دن ہماری عمر، ہمارے خاندان اور ہماری بستی کی زندگی میں بلکہ ہماری اس پوری آبادی کی زندگی میں بڑا مبارک تھا، جس دن ہمارے والدین نے ہم کو دارالعلوم بھیجا، ان سے ہم کہتے ہیں کہ آج وہ فیصلہ کر کے اٹھیں کہ یہاں وہ اپنے وقت کو صحیح طور سے صرف کریں گے، یہاں کے درخت سے وہ بہتر سے بہتر پھل توڑیں گے، جس کی توقع کی جاسکتی ہے، وہ یہاں کتاب و سنت کا گہرا اور عمیق علم حاصل کریں گے اور وہ زندگی گزاریں گے جو ایک داعی اور عالم بانی کی زندگی سے مطابقت رکھتی ہے۔

یکسوئی کی ضرورت:

کتنا بڑا ظلم ہے کہ لوگ ساری دنیا کے راستے بند کر کے اور ساری کشتیاں جلا کر یہاں آ کر پڑ گئے ہوں، تم یہاں رہ کر یہ معاملہ کرو کہ تمہارا ایک پاؤں یہاں رہے، اور ایک پاؤں خدا کے دشمنوں کے ساتھ، دشمنان اسلام کے قلعہ میں! جسم یہاں رہے، اور تمہارا دل باہر! تم یہاں رہو، تمہاری آنکھیں باہر رہیں، اس کی کون اجازت دے سکتا ہے؟ کوئی چھاؤنی اس کی اجازت دے سکتی ہے؟ مدرسہ بھی ایک چھاؤنی ہے؟ کوئی درس گاہ اس کی اجازت دے سکتی ہے؟ کوئی نظام اس کی اجازت دے سکتا ہے؟ اشتراکی نظام؟ سرمایہ دارانہ نظام؟ کوئی نظام اس کی اجازت نہیں دے سکتا کہ آدمی روس میں رہے، اور امریکہ کا خواب دیکھے یا امریکہ میں رہے اور روس کی طرف دیکھے، تو جب ان آزاد لوگوں میں جن کے لئے دنیا میں کوئی قید و بند نہیں، شراب پیو، جو اکھیلو، بد معاشیاں کرو، جب ان کے یہاں بھی اس بات کی اجازت نہیں ہے، اور اب تو اس کی بھی اجازت دینے کے لئے لوگ تیار نہیں ہیں کہ ہندوستان میں رہ کر آدمی پاکستان کی طرف دیکھے تو بتاؤ ہم تمہیں کیسے اجازت دیں کہ تم یہاں رہ کر کالج کی طرف دیکھو، یونیورسٹی کی طرف دیکھو، رہو یہاں اور تیاری کرو وہاں کے لئے یہ کہاں کی دیانت داری اور کیسی تقسیم ہے؟ کہ ہم تمہارے لئے ایک ایک دانہ مانگ کر لائیں (یہ یقیناً احسان نہیں ہمارا فرض ہے) اور تم اس سے ناجائز فائدہ اٹھاؤ۔

جو لوگ ہدایت و دعوت کا کام کریں گے ان کے متعلق قرآن کا ارشاد ہے:

”وامر اہلک بالصلوة واصطبر علیہا لانسلک رزقاً نحن

رَزَقْکَ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰی

بھلا بتائے یہاں کیا موقع تھا، ”نحن نرزقک“ کہنے کا؟ بڑے بڑے علماء موجود ہیں، ان سے پوچھو کہ فرمایا تو یہ جارہا ہے کہ اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دو اور اس پر جسے رہو اور پھر ”لانسک رزقا“ ہم آپ سے رزق کے طالب نہیں!

یہ تو ظاہر ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ رزق کے طالب نہیں ہوتے، پھر اس کی کیا ضرورت تھی؟ اس کے وسیع معنی ہیں، یعنی ہم اس کے بھی طالب نہیں کہ آپ بھی رزق کے خود کفیل اور قمدار بن جائیں ”نحن نرزقک“ ہم اس کے ذمہ دار ہیں! آپ اس کے ذمہ دار نہیں۔ معلوم ہوا کہ امر بالصلوٰۃ اور اس پر محافظت و استقامت سے اللہ کے یہاں رزق کا استحقاق پیدا ہو جاتا ہے، جس کا مطلب یہ نکلا کہ داعی کو اللہ تبارک و تعالیٰ انشاء اللہ بے یار و مددگار اور فاقہ کش کبھی نہیں رکھے گا، بلکہ اس کے طفیل میں ہزاروں آدمی کھائیں گے، ایک شیر شکار کرتا ہے، اس کے طفیل میں سینکڑوں جنگل کے جانور کھاتے ہیں، حضرت نظام الدین اولیاء کے دسترخوان کو دیکھو، اس عہد آخر میں مظاہر علوم میں حضرت شیخ الحدیث کے دسترخوان کو دیکھو! اور جن خوش قسمتوں نے حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے دسترخوان کو دیکھا، ان سے پوچھو کہ ایک شیر شکار کرتا تھا اور کتنے جنگل کے اس کے ہم جنس کھاتے تھے۔

اللہ کی ضمانت ہے، کچھ دن تم محنت کرلو، سعید ہونہار، محنتی اور جفاکش طالب علم بن جاؤ اور اپنے اندر اخلاص پیدا کرلو، پھر اللہ کی قدرت و رحمت کا تماشا دیکھو!

ایک فیصلہ:

بس بھائی! سمجھنے والوں کے لئے اور جن کے لئے اللہ نے سعادت اور خوش بختی مقدر کی ہے، اتنا ہی بہت کافی ہے، بلکہ کافی سے بھی زیادہ ہے، لیکن آج جو کچھ آپ نے سنا ہے، اس سے فائدہ اٹھائیے اور فیصلہ کیجئے! ”جانے کا فیصلہ“ یا رہنے کا فیصلہ“ جانے کا فیصلہ ہے تو شریفوں کی طرح اور انسانوں کی طرح! اور رہنے کا فیصلہ ہے تو وہ بھی شریفوں کی طرح اور جوانمردوں کی طرح، طالب علموں کی طرح، صاحبِ عزم اور صاحبِ ہمت نوجوانوں کی طرح!!

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پاکیزہ ذوق، علم و مطالعہ کی کنجی ہے

مولانا محمد اولیس صاحب گرامی ندوی، شیخ الانصیر، دارالعلوم کی تحریک اور کوشش سے دارالعلوم میں توہمینی خطبات کا ایک سلسلہ شروع کیا گیا، اس سلسلے کا آغاز ۳۳ مئی ۱۹۶۷ء کو ہوا، جلسہ کی صدارت جناب مولانا شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی نے فرمائی اور حضرت مولانا محمد اولیس صاحب ندوی کی تعارفی تقریر کے بعد مفکر اسلام نے اس سلسلے کا آغاز کرتے ہوئے حسب ذیل تقریر فرمائی۔

نصاب تعلیم کا دائرہ عمل:

ہمارے نصاب تعلیم کا یہ ایک اہم مسئلہ ہے کہ یہ نصاب اپنی خوبیوں اور امتیازات کے باوجود دیگر ضروریات کو مکمل نہیں کرتا، کوئی ایسا شخص جو ذمہ دار اور حقیقت پسند ہو یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہمارا نصاب تعلیم زندگی کی تمام ضروریات پر حاوی ہے، ہمارا نصاب تعلیم بھی اس کا مدعی اور ضامن نہیں، نصاب تو درحقیقت اس ملکہ خاص کا ضامن ہے جو انسان کی زندگی میں قدم قدم پر رہنمائی و قیادت کا کام انجام دے سکے، وہ انسان کے اندر اتنی استعداد پیدا کر دے کہ وہ کتابوں سے فائدہ اٹھا کر نتائج اخذ کر سکے، وہ زندگی کے تمام تقاضوں اور ضروریات کی تکمیل کا ضامن نہیں ہو سکتا، قدیم نصاب تعلیم نے بھی یہ دعویٰ نہیں کیا، اگرچہ ہمارے نصاب میں ملکہ پیدا کرنے کی خصوصیت ہے، لیکن زندگی کے ہر مرحلے میں ہر انسان کی صحیح رہنمائی کر سکے اس کا وہ بھی مدعی نہیں، آج ماہرین تعلیم کے سامنے یہ مسئلہ بڑا اہم ہے کہ نصاب تعلیم کے علاوہ طلباء کے لئے ایسی کیا چیز مہیا کی جائے جو زندگی اور منصب و مرتبے کے تقاضوں کو پورا کرے، اور جس ماحول میں ان تقاضوں کی تکمیل ہوتی ہو اس ماحول سے صحیح رابطہ پیدا کر سکے، یہ مسئلہ مغرب کے دانشوروں سے لے کر مشرق کے عالموں تک سب کے لئے ایک اہم مسئلہ بن گیا ہے۔

ذوق کیسے پیدا کیا جائے؟

ایک صورت تو یہ ہو سکتی ہے کہ طلباء کے لئے کتب خانے مہیا کئے جائیں اور پھر اساتذہ

کتابوں کے مطالعہ میں طلباء کی رہنمائی کریں تاکہ طالب علم زندگی کے کاررواں سے بچھڑے نہ پائیں، اور جب وہ کسی کتاب کا مکمل مطالعہ کر لیں اور اس پر حاوی ہو جائیں تو ان کی زندگی سے اجنبیت محسوس نہ ہو، ایک راستہ یہ ہے کہ طلباء کو وقتاً فوقتاً ایسے ماہرین تعلیم اور علم و فن کے فضلاء، مہیا کئے جائیں جو ان کے سامنے نئے زاویے اور نئے حقائق سے طلباء کو آشنا کریں، اس طریقے کو ہمارے ملک میں بھی آزمایا جا رہا ہے، یہ سلسلہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جامعہ ملیہ اور مشرق وسطیٰ کے علمی مرکزوں میں بھی رائج ہے، اور حقیقت میں یہ بات انتہائی لائق تحسین و توصیف ہے کہ مشاہیر علم و فن یہاں آکر اپنے خطبات و مقالات سے علم و تعلیم کا نچوڑ آپ کے سامنے پیش کر دیں، اور آپ بھی اہل علم کی مجلسوں اور محفلوں میں شریک ہوں، کیونکہ علم و فن کا ذوق جب بھی بنتا ہے، جب اہل علم کی مجلسوں سے ربط قائم رکھا جائے، اس کے بعد انسان بہت تھوڑے مواد سے کام لے سکتا ہے، لیکن ایسا ملک جب ہی پیدا ہوگا جبکہ مختلف مجالس اور محافل میں شرکت کی جائے، یہ سب باتیں وہی سمجھ سکتا ہے، جو علامہ شبلی اور سید سلیمان ندوی کی محفلوں میں شریک ہوا ہو، مولانا سید سلیمان ندوی، علامہ شبلی کی مجلسوں میں شریک ہوتے رہے اور ان کے چشمہ علم سے سیراب ہوتے رہے اور اس کی وجہ سے ان میں وہ شعور اور ذوق اور ملک پیدا ہو گیا، جو بہت کم لوگوں کو حاصل ہوتا ہے۔

ذوق کا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ کے سامنے کوئی شعر پڑھا جائے تو آپ اپنے ادبی ذوق سے یہ بتلا دیں کہ یہ فلاں شعر ہے، ایسا نہ ہو کہ آپ کے سامنے انیس و دبیر کے اشعار پڑھے جارہے ہوں اور ان کو آپ غالب و ذوق کی طرف منسوب کریں، یا مومن کا شعر ہو اور آپ اس کو کسی اور کا سمجھ رہے ہوں، لیکن یہ سب باتیں مختلف مجلسوں میں شرکت کے بعد پیدا ہوں گی۔ ہمارے لئے یہ بات افسوسناک ہوگی کہ ہم اس تیز رفتار دور میں طبعیات، سائنس وغیرہ کی ابتدائی معلومات سے بھی نا آشنا ہوں جو اس دور میں لازمی اور ضروری ہے، بلکہ اخبارات و رسائل کے سمجھنے کے لئے ان کا علم ناگزیر ہے۔ اس کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ ہم اس قسم کی محفلوں میں شریک ہوں اور معلومات حاصل کریں۔

ایک مثال:

انسان کے ذہن میں جب مراتب کا علم نہیں ہوتا اور وہ موٹی بات نہیں جانتا تو اس حیا دار

آومی کے لئے شرفاء کی مجلس میں شریک ہونا بھی دو بھر ہو جاتا ہے، جب میں نوعمر تھا اور میں نے ”ترتیب الخواطر“ میں مشاہیر ہند کے حالات نہیں پڑھے تھے، اس زمانے میں مولانا سلیمان اشرف صاحب کی مجلس میں شریک ہوا، اس مجلس میں مفتی یوسف صاحب کا ذکر آیا، تو اس تذکرے میں مجھ سے نہ رہا گیا، اور میں بول اٹھا کہ ”مفتی صاحب مولانا عبدالحی صاحب کے داماد تھے“ تو مولانا سلیمان اشرف صاحب نے فوراً کہا مولوی صاحب! چپ رہو، اس وقت میری بہت سبکی ہوئی، لیکن اس سے غیبت حاصل کیجئے، کیونکہ ہو سکتا ہے اس تذکرے میں مفتی صاحب سے اور کوئی مراد ہوں، یہاں یہ سمجھئے کہ اگر آپ کے سامنے مولانا سلیمان صاحب کا تذکرہ ہو تو کون مراد ہوگا، کئی سلیمان ہیں جو علم و فضل میں بہت ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ اسی طرح قاضی مبارک کا تذکرہ ہو، اور کسی کو نہ معلوم ہو کہ قاضی مبارک تین ہیں، اب وہ اس محفل میں بول اٹھے تو کتنی سبکی ہوگی، اور شرم و ندامت کا سامنا کرنا پڑے گا۔

میں نے علماء کی چند ہی ایسی مجالس دیکھی ہیں، جہاں خالص علمی گفتگو ہوتی تھی، شروع سے آخر تک تذکرہ ہوتا تو علم ہی کا ہوتا تھا، مولانا سید سلیمان ندوی کی مجلس، شاہ حلیم عطا صاحب کی مجلس اور علامہ اقبال کی مجلس، اگرچہ علامہ اقبال کی مجلس میں صرف دو مرتبہ شریک ہونے کا اتفاق ہوا، مجھے بہت خوشی ہوگی کہ اہل کمال یہاں آئیں جو اپنے جگر کو آپ کے سامنے نکال کر رکھ دیں اور علم کا نچوڑ پیش کر دیں لیکن اس کے بعد بھی اگر آپ میں کوئی تغیر نہ ہو اور آپ کی زندگی میں کوئی انقلاب نہ آئے تو یہ بہت بڑی بد نصیبی اور بدنامی کی بات ہے۔

اگر یہاں تاریخ اور علوم اسلامیہ کے ماہرین کو بلایا جائے تو میرا خیال یہ ہے کہ علوم جدیدہ کے ماہرین کو بھی دعوت دی جائے جو فزکس، طبیعیات اور فلکیات وغیرہ پر آپ کے سامنے تقریر کریں۔ اسی طرح ادبی ذوق کی نشوونما کے لئے ادیبوں اور شاعروں کو بھی دعوت دی جائے۔

یہ زمانہ اختصاص کا ہے، آپ کو تمام ایسی معلومات ہونی چاہئیں کہ آپ یونیورسٹی کے طلباء کو کیا اگر وہاں کے پروفیسروں کے سامنے بیٹھیں تو بے تکلفی سے گفتگو کر سکیں، اور اس کے پاس بیٹھنے میں اجنبیت یا ہچکچاہٹ محسوس نہ کریں۔ ”الاصلاح“ بھی اسی لئے ہے کہ آپ کے اندر ذوق علم پیدا ہو اس ”الاصلاح“ کے فائدے کا بڑے بڑے لوگوں نے اقرار کیا کہ اس نے سب کچھ دیا، مولانا نے کتابوں کے مطالعے کے متعلق فرمایا کہ انتخاب بھی بہت بڑی چیز

ہے۔ مطالعہ کے لئے انتخاب کے ساتھ مولانا نے ان مجلسوں میں شرکت کے فائدے کو بیان کرتے ہوئے شعر پڑھا کہ

چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو

بہتی نہیں ہے باد و ساع کے بغیر

پھر فرمایا کہ دینی ذوق بھی اسی طرح بنتا ہے کہ آپ اہل اللہ کے پاس بیٹھیں، مولانا سے فرمایا کہ ذوق کی تشریح نہیں کی جاسکتی یہ تو خدا جس کو دیتا ہے، وہی سمجھ سکتا ہے، ہر چیز کا ایک ذوق ہوتا ہے جو صرف اہل ذوق سے پیدا ہوتا ہے، ذوق ہر چیز کا بڑی مشکل سے پیدا ہوتا ہے، آج حیات انسانی کا ذوق مفقود ہے، صاف ستھری پاکیزہ زندگی گزارنے کا ذوق بھی مفقود ہے، امریکہ اور یورپ اپنی عروج و ترقی کی منزلوں کے باوجود انسانی زندگی کا ذوق پیدا نہیں کر سکے، آج بھی وہاں مشینوں کی کثرت کے باوجود انسان کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے، اور اس کو مرکزی اہمیت حاصل ہے، خوب یاد رکھئے کہ یہاں جو آپ کے اساتذہ ہیں، انہیں سے آپ کا کام چلے گا، انہیں ٹٹماتے ہوئے چراغوں سے آپ کا چراغ روشن ہوگا، انہیں سے آپ اپنے دل کا چراغ منور کریں گے، آپ یہ چاہیں کہ کسی اور طریقے سے یا دوسرے چراغوں سے اپنی زندگی اور دل کے چراغ روشن کر لیں تو یہ ناممکن ہے۔

اعتماد، اعتقاد اور اتحاد:

خوب سمجھ لیجئے کہ ان ہی اساتذہ کی محفلوں میں شرکت کر کے آپ صحیح ذوق و شوق پیدا کر سکتے ہیں، لیکن شرط یہ ہے کہ آپ اعتماد اور ایک حد تک اعتقاد اور اتحاد کے ساتھ بیٹھیں، یاد رکھئے کہ مخلص و غیرہ مخلص اچھے اور برے بلکہ انسان اور غیر انسان کا فرق سمجھنے کے لئے کہیں بھی اصول و ضوابط منضبط نہیں ہوتے بلکہ بات صرف ذوق ہی سے معلوم ہوتی ہے۔

آج تمام مدارس میں ایک خلا ہے اور وہ یہ کہ اساتذہ اور طلباء میں ربط نہیں ہے، بلکہ ان کے درمیان ایک خلیج حائل ہے، اور وہ صرف درس کے اساتذہ اور درس کے طلباء ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس خلا کو پر کر دینے کی اور اس خلیج کو پانے کی ضرورت ہے، اس میں مدارس کی کامیابی و ترقی مضمحل ہے۔

وما علینا الا البلاغ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مدرسہ کیا ہے؟

یہ تقریر ۲۲ شوال ۱۳۹۶ھ ۱۱ اکتوبر ۱۹۷۶ء کو جامعہ ہدایت جے پور کے سنگ بنیاد کے موقع پر لائی تھی

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونومن بن وتوكل عليه
وهو الذي ينزل الغيث من بعد ما قنطوا وينشر رحمته وهو الولي الحميد

راجستھان کا ایک یادگار دن:

جناب صدر، حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب، مولانا عبدالحی فائز، سید فاروق حسن صاحب وزیر اوقاف، علماء کرام، معززین راجستھان و حاضرین مجلس! میں آپ حضرات کی اس عزت افزائی کا شکر گزار ہوں، اور اس سے مجھ کو اور شرمندہ بھی کہ آپ نے اس بڑے اعزاز کے لئے میری حقیر ذات کا انتخاب کیا، میں آپ کو کس طرح یقین دلاؤں کہ جب میں خطبہ استقبالیہ میں اپنے متعلق بلند الفاظ سن رہا تھا تو کس قدر پانی پانی ہو رہا تھا، ایاز قدر خود را شناس، اگر آدمی اپنی حقیقت نہیں پہچانتا تو وہ کچھ نہیں پہچانتا، میں اس لحاظ سے اس نوخیز و نو مولود جامعہ کی خدمت انجام دینے کی ضرور اہلیت رکھتا ہوں کہ میں ایک طالب علم ہوں، میرا ایک علمی خاندان سے تعلق ہے، اس میں کسی تواضع اور خاکساری کی ضرورت نہیں سمجھتا، اس راجستھان کے ایک مردم خیر علاقہ سے بھی۔ میرا قدیم تاریخی تعلق رہا ہے، یہ چیزیں میرے لئے ضرور سفارش کرتی ہیں، لیکن جتنا بڑا اعزاز مجھے عطا فرمایا ہے، وہ ایک بڑی قبا ہے، جو ایک حقیر جسم پر راست نہیں آتی اور جسم کی کوتاہ قاستی کا اعلان کرتی ہے اور اس کے لئے باعث شرمندگی ہے، لیکن:

بر کریمیاں کارہا دشوار نیست

میں اس سے زیادہ کچھ عرض کرنا نہیں چاہتا کہ شاید یہ بھی کسی تصنع اور بے جا خاکساری پر

محمول کیا جائے۔

خزائن رسیدہ انسانیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ:

حضرات! میں نے بھی جو آپ کے سامنے آیت پڑھی ہے، اس کا انتخاب میں نے قرآنی صاحبِ قرأت سے کیا ہے اور اس نے میری رہنمائی کی ہے اور قرآن مجید اسی طرح ہمیشہ رہنمائی اور مشکل کشائی کرتا رہا ہے، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے ہُوَ الَّذِي يَنْزِلُ الْغَيْثَ مِنْ بَعْدِ مَا قَنَطُوا وَيَنْشُرُ رَحْمَتَهُ وَهُوَ الْوَلِيُّ الْحَمِيدُ (الشوریٰ ۲۷) اللہ وہ ہے جو بارش کو نازل فرماتا ہے، حقیقت میں غیث کا ترجمہ بارش پورا ترجمہ نہیں ہے، غیث اس چیز کو کہتے ہیں جو عین وقت پر مدد کرے، عین وقت پر مشکل کشائی کرے، فریاد رسی کرے، دست گیری کرے، تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جس طرح کسی جاں بلب مریض کے حلق میں آبِ حیات کے کچھ قطرے پکاوئے جائیں، اس کو کوئی داروئے حیات مہیا کر دیا جائے، اسی طرح سے تپتی ہوئی، سلگتی ہوئی، جلتی ہوئی اور دم توڑتی ہوئی زمین پر اللہ تعالیٰ آبِ حیات کے قطرے برسایا کرتا ہے ہُوَ الَّذِي يَنْزِلُ الْغَيْثَ مِنْ بَعْدِ مَا قَنَطُوا وَهُوَ فَرِيْدٌ رَحِيْمٌ فرماتا ہے، اور زندگی کا سامان مہیا کرتا ہے، انسانوں کے لئے اس کے بعد کہ وہ مایوس ہو چکے ہوتے ہیں، ان کی آنکھیں آسمان سے لگی ہوتی ہیں، وہ بڑے ارمان اور حسرت کے ساتھ آسمان کی طرف دیکھتے ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ پانی برسا کر سوکھی کھیتی کو ہرا کر دے ہُوَ الَّذِي يَنْزِلُ الْغَيْثَ مِنْ بَعْدِ مَا قَنَطُوا وَيَنْشُرُ رَحْمَتَهُ وَهُوَ الْوَلِيُّ الْحَمِيدُ اور اپنی رحمت کا دامن پھیلا دیتا ہے اور اپنی رحمت کی ہوا میں چلاتا ہے اور وہ ”الولیٰ الحمید“ ہے، یہاں پر جن صفات کا انتخاب کیا گیا ہے، وہ بڑی معنی خیز ہیں، اللہ کے سب نام اچھے ہیں وَلِلّٰهِ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰی اللہ کی سب صفات اعلیٰ اور بالا و برتر ہیں وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰی لیکن یہاں ”الولیٰ الحمید“ کی صفات کا انتخاب اس لئے کیا گیا کہ اس مضمون سے اور انسانیت کی چارہ سازی اور مسیحائی سے اس کا خاص تعلق ہے۔ یہ انسانیت کس کی ہے؟ اللہ کی ہے! وہی اس کا والی اور وارث ہے، کوئی اپنی کھیتی کو سوکھا نہیں دیکھ سکتا، کوئی یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ اس کی لگائی ہوئی کھیتی سوکھ جائے، وہ ”الولیٰ“ ہے، وہی اس کا مالک بھی ہے ”الحمید“ بھی ہے، وہ حمد کا مستحق ہے، جس کی شان حمید کی ہے، جس کی صفت حمید کی ہے، اس کی شان سے یہ بات بعید ہے کہ وہ اپنی پیدا کی ہوئی مخلوق کو

اس طرح بے یار و مددگار چھوڑ دے۔

مرض اور مسیحائی کے درمیان اٹوٹ رشتہ:

حضرات! پیاس اور سیرابی، ضرورت اور اس کی تکمیل، مرضی اور اس کی مسیحائی کے درمیان ایک ایسا رشتہ ہے جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا، یہ ازلی اور ابدی رشتہ ہے، جب تک پیاس ہے، سیرابی ضرور ہے، جب تک ضرورت ہے، تکمیل ضرور ہے، جب تک مرض ہے اس کے لئے دوا اور علاج کا سامان ضرور ہے، اسی طریقہ سے صحرا اور علم، صحرا اور ہدایت، ریگستان اور ہدایت کے درمیان بھی ایک ایسا مخفی، ایسا لطیف اور ایسا قدیم اور دائمی رشتہ ہے جس کی شہادت قرآن مجید سے بھی ملتی ہے، اور انسانی تجربات سے بھی ملتی ہے، آپ اس وقت کو یاد کیجئے جب ہماری دنیا پر خزاں کا دور دورہ تھا، جب انسانیت کی پوری کھیتی، انبیاء کی لگائی ہوئی کھیتی اور انبیاء کی ہزاروں برس کی کوششوں پر پانی پھر رہا تھا، جب انسانیت کی یہ کھیتی سوکھ رہی تھی، جب انسانیت دم توڑ رہی تھی، اور دیکھنے والوں کو صاف نظر آ رہا تھا (اس کے لئے کسی خاص بصیرت کی بھی ضرورت نہیں تھی، معمولی بصارت بھی کافی تھی) کہ کوئی گھڑی ہے کہ ٹل رہی ہے، چند گھنٹوں، چند منٹوں میں یہ انسانیت دم توڑ دے گی اور یہ اس کا دم واپس ہے، اس وقت دنیا میں بڑے لہلہاتے ہوئے ملک تھے، گل و گلزار شہر تھے، وہ ملک بھی تھے جو ہزاروں برس سے تہذیب و تمدن کا مرکز چلے آ رہے تھے، جہاں علم کی ہوائیں چلتی تھیں، جہاں علم کی عطر بیزی تھی، جہاں کی زمین سے علم اگلتا تھا اور جہاں کا آسمان معلوم ہوتا ہے کہ علم برساتا تھا، لیکن سارے ممالک انسانیت کی چارہ سازی اور انسانیت کی مسیحائی سے قاصر ہی نہیں تھے بلکہ باغی تھے، منکر تھے، بلکہ وہ انسانیت کے درد میں اضافہ کرنے والے تھے، آپ اگر اس وقت تک کی تاریخ پڑھیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ انسانیت جس سے فریاد کر رہی تھی، انسانیت جس کے خلاف مدعی بنی ہوئی تھی، انسانیت جس کے گریباں گیر تھی، یہ وہی بگڑا ہوا تمدن تھا، یہی منحرف علم تھا، یہ وہی شاطر عقل تھی، وہی چالاکی تھی، وہی دانشمندی تھی، جس نے غلط رخ اختیار کر لیا تھا، جس نے تعمیر کے بجائے تخریب کا رخ اختیار کر لیا تھا، اس وقت یونان بھی تھا، ایران بھی تھا اور ہمارا ملک ہندوستان بھی تھا، چھٹی صدی مسیحی یا ساتویں صدی مسیحی میں یہ ملک تہذیب و تمدن کا بڑا مرکز تھا، ان لوگوں کی طرف انسانیت کی نگاہیں لگی ہوئی تھیں کہ ان کی طرف سے کوئی باد بہاری کا

جھونکا آئے، ان کی طرف سے کوئی جاں نوازی، مسیحا نفسی کی کوئی کوشش ہوگی، یونان کی طرف آنکھیں لگی ہوئی تھیں، اس نے فلسفہ دیا، لیکن وہ انسانیت کے درد کا درماں نہ تھا، ہندوستان کی طرف نگاہیں لگی ہوئی تھیں، اس نے حساب اور علم ریاضی دیا، مگر یہ انسان کے مرض کی دوا نہ تھی، ایران کی طرف اس کی نظر لگی ہوئی تھی، اس نے سپہ گری اور شاعری دی، مگر یہ بھی انسانیت کے درد کی دوا نہ تھی۔

صحرا بہار کا پیغام دیتا ہے:

اس وقت تقدیر الہی کا فیصلہ ہوا کہ صحرائے عرب سے اللہ کی رحمت کے وہ بادل اٹھے، اللہ کی رحمت کے بادل جوش میں آئے اور وہاں سے وہ موج نور چلے جو ساری دنیا کو زندہ کر دے، صحرا کا انتخاب صرف اللہ تعالیٰ نے اس لئے نہیں کیا کہ وہ سب سے زیادہ محتاج تھا، اللہ تعالیٰ کو اپنی قدرت کا یہ تماشا دکھانا تھا کہ وہ صحرا جو ایک قطرہ پانی کو ترستا ہے، ساری دنیا کو سیراب کر سکتا ہے، وہاں خدا نے کسی دانشمند اور فلسفی کو بھی نہیں پیدا کیا، صحرا کا بھی انتخاب کیا، اور صحرا کے نبی کا بھی انتخاب کیا۔ اس صحرا میں اور صحرا کے نبی میں بھی ایک لطیف رشتہ تھا اور خاص مناسبت تھی، صحرا عرب کا اور نبی امی! کوئی چیز بھی ایسی نہ تھی کہ دنیا کے دانشور اس کی تاویل کر سکیں، اور کوئی علت معمول کا ایسا مخفی رشتہ تلاش کر سکیں اور اس کی ایسی تشریح کر سکیں کہ جس کو علم و فلسفہ قبول کر سکے، آپ کہہ سکیں کہ ایک عالم نے دنیا کو علم دیا اور ایک گل و گلزار ملک نے دنیا کو بہار کا پیغام دیا۔ صحرا بہار کا پیغام دیتا ہے، اور نبی امی وہ علم عطا کرتا ہے جو علم ہی نہیں علم گراور علماء گراہے، وہ علم تنہا علم نہیں تھا بلکہ وہ تعلیم بھی تھا، اس میں معلم بنانے کی بھی طاقت تھی، کسی ایک شخص کو معلم نہیں پوری امت کو معلم بنانے کی اس میں صلاحیت تھی۔ صحرا عرب کا سا صحرا اور پیغمبر نبی امی جیسا پیغمبر، اللہ تعالیٰ نے یہ دکھا دیا کہ ہماری قدرت اور ہماری کار سازی اسباب کی محتاج نہیں، وہ بلا سبب اور ساری دنیا کے تجربات اور ساری دنیا کے قیاسات کے خلاف کام کر سکتی ہے، پھر کیا ہوا، اقبال سے بہتر الفاظ میں اس کو ادا نہیں کیا جاسکتا۔

از دم میراب آں امی لقب ﷺ

لالہ رست از ریگ صحرائے عرب

اس امی لقب کے نوشیں سے آب حیات کا وہ قطرہ پڑکا جس نے صحرائے عرب کے جگر کو

پھاڑ کر وہ پھول کھلایا جس نے ساری دنیا کو معطر کر دیا۔

ہری ہو گئی ساری کھیتی خدا کی:

حضرات! اللہ تعالیٰ اپنی یہ نشانی ہمیشہ دکھاتا رہا ہے، اور جب سے علم کی دنیا میں پھیلنے کا اور سیرابی کا عام ہونے کا یہ سلسلہ صحرا سے شروع ہوا اس کے بعد سے صحرا اور گلزار کی کوئی قید نہیں رہی، نبی امی کا یہ معجزہ مختلف زمانوں میں، مختلف ملکوں میں، مختلف وقتوں میں، مختلف حالات میں برابر ظاہر ہوتا رہا، آپ اسی ہندوستان کو لے لیجئے، بلکہ اس صحرائے راجستھان کو لیجئے جس کو ہم پہلے راج پوتانہ کا صحرا یا ریگستان کہتے تھے، یہاں بھی جب مسلمان آئے تو انہوں نے علم کی دریا بہا دیئے۔

رہے اس سے محروم آبی نہ خاکی

ہری ہو گئی ساری کھیتی خدا کی

انہوں نے صرف دہلی کو، صرف لاہور کو، ملتان کو یا صرف لکھنؤ اور جون کو ہی شیراز کا ہمسر نہیں بنایا بلکہ ناگور اور آخردور میں قریبی شہر ٹونک کو بھی انہوں نے علم کا ایک مرکز بنادیا، آپ اپنے اس راجستھان کو حقارت کی نظر سے نہ دیکھیں، ہماری تاریخی بے مائیگی اور ہمارے علم کی کوتاہی ہوگی اگر ہم یہ سمجھیں کہ راجپوتانہ کا ہندوستان کی علمی تحریک اور ہندوستان کے علمی کوششوں کی تاریخ میں کوئی حصہ نہیں ہے، اس نے ایک قائدانہ کردار ادا کیا ہے، دور اول میں ناگور اور دور آخر میں ٹونک نے اپنے امتیاز کا سکہ بٹھادیا، اپنے علماء کی ذہانت اور تبحر کا اور ان کے علمی شغف کا لوہا منوالیا، ناگور کے متعلق مجھے کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ دربار اکبری کی زینت وہ فاضل نوجوان ہیں جن کو دنیا ابوالفضل اور ابوالفیضی کے نام سے جانتی ہے جو مبارک ناگوری کے بیٹے تھے اگرچہ ہمیں ان کے خیالات سے پورا اتفاق نہیں اور ان کی تاریخ پر تاریخ ہی میں بہت سے پردے پڑے ہوئے ہیں، ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کہ اب وہ خدا کے یہاں پہنچ گئے ہیں، لیکن جہاں تک ان کے تبحر علمی، ان کے علمی تفسن اور ان کی ذہانت کا تعلق ہے، جہاں تک فیضی کی شاعری اور ابوالفضل کے زور قلم اور تاریخ نویسی کا تعلق ہے، اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا، آخری دور میں جب ٹونک میں ایک چھوٹی سی ریاست قائم ہوئی تو ہمارا قریب کا یہ شہر جس کو شاید راجستھان کے باہر بہت کم لوگ جانتے ہیں، وہ بہت بڑا علمی مرکز بن

گیا اور وہاں ایسے علماء پیدا ہوئے کہ جن سے فیض حاصل کرنے کے لئے ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے لوگ آتے تھے، علامہ حیدر علی ٹوکنی اور پھر ان کے بعد مولانا حکیم برکات احمد صاحب کے علمی و تعلیمی فیوض و برکات ہندوستان اور ہندوستان کے حدود سے متجاوز ہیں، ان کے علاوہ ٹوکنک میں جو جید اور سرآمد روزگار علماء پیدا ہوئے اگر آپ ان کے حالات پڑھنا چاہتے ہیں تو اردو ہی میں بلکہ عربی کی کتابوں میں بھی ان کے حالات ملیں گے، جو اس وقت عالم اسلام کے تمام کتب خانوں میں موجود ہیں، آخری دور میں مولانا محمود حسن خان صاحب ٹوکنی کا نام لیتا ہوں، جن کے ذکر سے ہمارا سر فخر سے اونچا ہو جاتا ہے جیسا کہ میرے تعارف میں کہا گیا ہے کہ میں مشرق وسطیٰ کے عرب ملکوں سے قریبی تعلق رکھتا ہوں اور میں وہاں آتا جاتا رہتا ہوں، وہاں کی علمی مجلسوں اور وہاں کے جامعات کو بھی خطاب کرنے کا مجھے موقع ملا ہے، جب بھی مولانا محمود حسن خان ٹوکنی کے علمی امتیاز اور علمی کارنامہ کا ذکر کیا گیا تو لوگوں کے چہرے پر ایک حیرت اور آنکھوں میں ایک تجسس کی کیفیت پیدا ہو گئی، ہندوستان کی سر زمین میں وہ ٹوکنک کو نہیں جانتے وہ راجستھان کو بھی نہیں جانتے، وہ ہندوستان کو جانتے ہیں (الہند) تختی برا عظیم ہندوستان نے اتنا بڑا مصنف پیدا کیا، جس نے بہت سے مصنفین کو زندہ کر دیا، مصنفین ہی نہیں بلکہ ان مصنفین کے کارناموں کو بھی زندہ کر دیا۔ ”مجمع المصنفین“ کے نام سے انہوں نے ایک کتاب لکھی، جہاں تک میری تحقیق اور میری معلومات ہے، بیس ہزار صفحات میں وہ کتاب لکھی گئی، کیا کوئی یقین کر سکتا ہے کہ یہ ایک تنہا شخص کا کارنامہ ہے، میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ یورپ میں ایک اکیڈمی جو کام کیا کرتی ہے، ہمارے یہاں مسلمانوں میں ایک آدمی کام کیا کرتا تھا، اس ایک آدمی نے ایک اکیڈمی کا کام کیا، مجمع المصنفین نے صرف ہندوستان ہی کے مصنفین کو زندہ نہیں کیا بلکہ تمام عالم اسلام کے مصنفین کو جن کا زمانی رقبہ پہلی صدی ہجری سے لے کر چودھویں صدی ہجری تک اور جن کا مکانی رقبہ مکہ اور مدینہ سے لے کر انڈونیشیا، بدخشاں، ختن اور تاشقند تک ہے، ان کے حالات پر سے پردہ اٹھایا، افسوس ہے کہ اس کی چند ہی جلدیں شائع ہو سکیں ہیں، لیکن پھر بھی اس کتاب کی کوئی نظیر نہیں ہے، یہ میں آپ کے اس راجستھان ہی نہیں بلکہ اسی جے پور جہاں آج جامعہ ہدایت کا سنگ بنیاد رکھا جائے گا، اس سے چند میل کے فاصلے پر جو ایک گمنام سا شہر ہے، میں اس کی ایک تنہا شخصیت کا کارنامہ بیان کر رہا ہوں، تو

صحرا کا علم اور تصنیف سے اور تحقیق سے ایک خاص رشتہ ہے اور یہ رشتہ جو عرب کے ایک نبی امی کے ذریعہ قائم ہوا ہے، یہ ہمیشہ قائم رہے گا اور آج بھی آپ اس جنگل میں جو منگل دیکھ رہے ہیں، آج آپ کو جواتی صورتیں یہاں نظر آرہی ہیں، آج آپ کو اس اسٹیج پر معززین نظر آ رہے ہیں، یہ بھی درحقیقت اس نبی امی کا فیض ہے، قیامت تک جو کچھ ہوگا اسی کے طفیل ہوگا، اس نے جو علم کی شمع روشن کی تھی۔

یک چراغیت دریں بزم پر تو آں

ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

جہاں بھی آپ کو کوئی علم کی شمع جلتی نظر آئے گی اس شمع، اس دیئے سے جلایا ہوا دیا ہوگا، یہاں جو شمع ہدایت آپ دیکھ رہے ہیں اور جس جامعہ ہدایت کے نام سے آپ یہاں جمع ہوئے ہیں، یہ اسی ہادی برحق اور اسی ہادی کامل کی شمع ہدایت کا پرتو ہے جو آپ کو نظر آ رہا ہے۔

علماء ہند کی علمی خدمات:

حضرات! یہ جامعہ ہدایت کن بنیادوں پر قائم ہو رہا ہے؟ اس کی کیا ضرورت ہے؟ اس کا کیا پیغام ہے؟ یہ کس ضرورت کی تکمیل کرے گا؟ یہ کس خلا کو پر کرے گا؟ اس کے متعلق میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مدرسہ ہے کیا چیز! مدرسہ کی کیا ضرورت ہے؟ مدرسہ کی معنویت اور اس کی قدر و قیمت کیا ہے؟ کیا ان بلند وبالا جامعات کی موجودگی میں جن کا ایک نمونہ یہاں آپ کو راجستھان یونیورسٹی کی شکل میں بھی نظر آئے گا اور یہاں کالجوں کی شکل میں بھی نظر آئے گا، ان عصری جامعات کی موجودگی میں ایک جامعہ ہدایت کی ضرورت ہے، ایک عربی مدرسہ کی ضرورت ہے، اس کے متعلق نہایت موزوں طریقہ پر مولانا عبدالحی صاحب فائز نے بلایا، عربی زبان کی اہمیت بتلائی، عربی زبان کی اہمیت اب سب کو تسلیم ہے، ایک زمانہ تھا کہ ندوۃ العلماء نے عربی زبان کی اہمیت کی آواز بلند کی اور آج سے ۸۵-۹۰ سال پہلے یہ کہا کہ عربی زبان ایک زندہ زبان ہے، اس کو ایک زندہ زبان کی حیثیت سے سیکھنا چاہئے، اور اہل زبان کی طرح اس میں کمال پیدا کرنا چاہئے، یہ اس وقت اس طرح بلند کی گئی جیسے کوئی جنگل میں آواز لگائے اور اس کا کوئی سمجھنے والا نہ ہو، آج زمانہ نے، سیاسی انقلابات نے ثابت کر دیا اور دنیا کی ترقی نے اس بات کو سچ ثابت کر دیا ہے اور عربی زبان کی اہمیت پر جوان روشن ضمیر علماء نے آج سے

تقریباً ایک صدی پہلے سمجھی تھی، زمانہ نے مہر تصدیق ثبت کر دی، آج عربی زبان کے بغیر گاڑی نہیں چلتی، آج عربی زبان کسی کو آتی ہے تو وہ ابن بطوطہ کی طرح دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سفر کرتا چلا جائے تو عربی زبان سے کام لے سکتا ہے۔ آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ جب میں کالی کٹ گیا تو میں مجبور تھا کہ وہاں عربی زبان کے ذریعہ تبادلہ خیال کروں، اردو وہ حضرات سمجھتے نہیں، اردو جس پر ہم کو آپ کو بڑا ناز ہے، اور جس میں آپ نے ایسا فصیح و بلیغ سپاس نامہ یا خطبہ استقبالیہ سنایا اردو کیرالہ کی حد تک بالکل نامانوس ہے، میں ہندوستان کا ایک شہری اپنے ہندوستانی بھائیوں سے اپنے اظہار ماضی الضمیر کے لئے، اپنے خیالات ان کو پہنچانے کے لئے اس پر مجبور تھا، جدید تعلیم یافتہ لوگوں سے انگریزی میں گفتگو کروں اور وہاں کے دیندار لوگوں اور مسلمانوں سے عربی میں گفتگو کروں۔ خود اس ملک میں عربی زبان کا سد چل رہا ہے، اور اس عربی زبان میں یہاں ہندوستان میں جو کچھ کام ہوا، اس کے متعلق اس وقت کیا عرض کروں کہ اس وقت کا یہ موضوع نہیں ہے، اس پر مستقل تصنیفات ہیں کہ ہندوستان نے عربی زبان کو مالا مال کر دیا، اور بعض گوشے ایسے ہیں کہ جس پر تنہا ہندوستان کا کنٹری بیوشن ہے، ہندوستانی مسلمانوں نے اس موضوع کو شروع بھی کیا اور ختم بھی کیا۔

میں مثال کے طور پر کہتا ہوں علمی اصطلاحات نہایت نازک مسئلہ ہے۔ جس طریقہ سے کہ جہاز کا قطب نما یا جہاز کا درست کرنے والا آلہ ہوائی جہاز کا یا بحری جہاز کا ہوتا ہے اس میں اگر سوئی بال برابر بھی ہٹ جائے تو جہاز راستہ بھول جائے گا، غلط راستہ پر پڑ جائے گا، اس طرح علمی اصطلاحات کی نوک پلک اتنی نازک ہے کہ ان کی تشریح میں ذرا سی بھی غلطی ہو جائے تو پورا کا پورا فن آدمی کے لئے چیستان بن جائے گا، اس نازک فن کے موضوع پر دو بہترین کتابیں تیرہ سو برس میں دنیا میں لکھی گئی ہیں، وہ ہندوستانی عالموں کی ہے۔

(۱) ”کشاف اصطلاحات الفنون“ مولانا محمد علی تھانوی کی جو بارہویں صدی کے ایک

عالم تھے۔

(۲) ”دستور العلماء“ مولانا قاضی عبدالنبی احمد نگری کی جو غالباً گیارہویں صدی کے

ایک عالم تھے۔

یہ دونوں کتابیں تنہا ہندوستانی عالموں کے قلم سے نکلی ہیں، اس طریقہ سے حدیث کے

مفردات کی شرح میں سب سے مستند، سب سے وسیع اور سب سے بڑی کتاب جو جامع ہے تمام کتابوں کی وہ ایک ہندوستانی عالم، فخر ہندوستان علامہ محمد طاہر پٹنی گجراتی کے قلم سے ”مجمع بحار الانوار“ کے نام سے لکھی ہے، جس کو سارا احباب جانتا ہے اور اس موضوع پر جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں، سب سے اس نے مستغنی کر دیا ہے، اور میں بڑے فخر اور شکر کے ساتھ آپ کے سامنے اس حقیقت کا اظہار کرتا ہوں کہ خدا نے ہندوستانی مسلمانوں کو جو سعودی عرب میں ڈیڑھ سو دو سو برس سے رہتے ہیں، لیکن ہندوستان سے انہوں نے اپنا رشتہ توڑا نہیں ہے، نہ ہندوستان کی زبان سے، نہ ہندوستان کی تہذیب سے، خدا نے انہیں کو توفیق دی کہ پہلی بار خوبصورت عربی نائپ میں وہ اس کتاب کو شائع کریں، میرا اندازہ یہ ہے کہ پچاس ہزار سے ایک لاکھ کے درمیان رقم اس پر صرف ہوئی ہوگی، یہ آپ کے چینی تاجروں کا کارنامہ ہے کہ جن کا جدہ میں اور مکہ میں اور ریاض میں اور مدینہ میں بڑا تجارتی کاروبار ہے، اس کا سحر خاص طور پر نورولی خاندان اور اس کے بزرگ الحاج عبدالقادر نورولی صاحب کے سر ہے۔

مدرسہ کس درد کی دوا ہے؟

میں آپ سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مدرسہ کس درد کی دوا ہے، یہ مدرسہ جو قائم ہو رہا ہے، خدا اس پودے کو پروان چڑھائے اور اس کو ایک شاداب اور مسایہ دار درخت بنائے، جس کے نیچے نسلیں آرام پائیں اور اس سے ہدایت حاصل کریں۔ یہ جامعہ کس خلا کو پر کرتا ہے، کس ضرورت کی تکمیل کرتا ہے؟

حضرات! صحیح دینی مدرسہ کے بارے میں میرا نقطہ نظر بہت سے بھائیوں سے اور ان پڑھے لکھے دوستوں سے مختلف ہے جو مدرسوں سے واقفیت کا دعویٰ رکھتے ہیں یا اس سے تعلقات رکھتے ہیں۔ میں مدرسہ کو پڑھنے پڑھانے اور پڑھا لکھا انسان بنانے کا کارخانہ نہیں کہتا، میں مدرسہ کی حیثیت کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں، میں اس سطح پر آنے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ مدرسہ اسی طریقہ سے پڑھنا لکھنا سکھانے یا یوں کہنا چاہئے کہ پڑھنے لکھنے کا ہنر سکھانے کا ایک مرکز ہے، جیسے کہ دوسرے اسکول اور کالج ہیں، میں اس کو مدرسہ کے لئے ازالہ حیثیت عرفی کے مترادف سمجھتا ہوں، یعنی اگر میں مدرسہ کا وکیل ہوں یا میں خود مدرسہ بن جاؤں تو میں اس پر ازالہ حیثیت عرفی کا مقدمہ قائم کر سکتا ہوں۔ اگر کوئی مدرسہ کو صرف اتنا حق

دینے اور مدرسہ کو صرف اتنا ماننے کو تیار ہے کہ صاحب! جیسے پڑھنے لکھنے کا ہنر سکھانے کے لئے بہت سے کارخانے ہیں، بہت سے مرکز ہیں، کوئی اسکول کہلاتے ہیں، کوئی کالج کہلاتے ہیں، ان کے مختلف معیار اور مختلف سطح ہیں، اسی طریقہ سے مدرسہ بھی عربی زبان یا عربی علوم و فنون، فقہ اور دینیات تفسیر و حدیث سکھانے کا ایک مرکز یا کارخانہ ہے، میں مدرسہ کو ناہین رسول و خلافت الہی کا فرض انجام دینے والے اور انسانیت کو ہدایت کا پیغام دینے والے، تحفظ و بقاء کا راستہ دکھانے والے افراد پیدا کرنے والوں کا ایک مرکز سمجھتا ہوں، میں مدرسہ کو آدم سری اور مردم سازی کا ایک کارخانہ سمجھتا ہوں، جس طرح فیکٹریاں کرتی ہیں مختلف قسم کی۔ کوئی گن فیکٹری ہوتی ہے، کوئی شوگر فیکٹری ہوتی ہے، کوئی کسی اور قسم کی مشین ڈھالتی ہے، بیوی الیکٹرک کے سامان پیدا کرنے کے بہت سے کارخانے ہیں، ہم ان کی بہت قدر کرتے ہیں، ہم ان کی ملک میں ضرورت تسلیم کرتے ہیں، ہم ان کی تحقیر نہیں کرتے، لیکن چیزوں کے مختلف درجے ہوتے ہیں، مدرسہ اس طرح کے پڑے لکھے آدمی پیدا کرنے کا مرکز نہیں، مدرسہ ایسے لوگوں کے پیدا کرنے کا مرکز ہے جن کا ابھی آپ کے سامنے ذکر کیا گیا ہے، یہ الگ بات ہے کہ مدرسہ ایسا کر رہا ہے یا نہیں اور ہر مدرسہ یہ کرنا چاہتا ہے یا نہیں؟ اس کا اس اصولی بحث سے کوئی تعلق نہیں، میں مدرسہ کے ایک خادم کی حیثیت سے اور مختلف مدارس سے تعلق رکھنے والے کی حیثیت سے اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ بہت سے مدارس یہ فرض انجام دینے سے قاصر ہو گئے ہیں، پہلے یہ فرض انجام دیا کرتے تھے، اب یہ فرض وہ انجام نہیں دے رہے ہیں، کیوں؟ لیکن مدرسہ کو کیا فرض انجام دینا چاہئے؟ مدرسہ کا فرض کیا ہے؟ مدرسہ کے سپرد کونسا کام ہے؟

مدرسہ کا شجرہ نسب:

حقیقی مدرسہ کی بنیاد اور پہلے مدرسہ کی بنیاد کہاں رکھی گئی ہے، پہلے مدرسہ کی بنیاد قرطبہ اور غرناطہ میں نہیں رکھی گئی تھی، قیروان اور قاہرہ میں نہیں رکھی گئی، دہلی اور لکھنؤ میں نہیں رکھی گئی، فرنگی محل، ندوۃ العلماء اور دارالعلوم دیوبند میں نہیں رکھی گئی، پہلے مدرسہ کی بنیاد مسجد نبوی میں رکھی گئی، اور مدرسہ کا نام ”صفہ“ تھا، آپ مجھے معاف کریں میں مدرسوں میں صحیح النسب مدرسہ اور عالی نسب مدرسہ اسی کو سمجھتا ہوں جس کا شجرہ نسب صفہ نبوی پر جا کر ختم ہو اور میں اسی مسجد کو صحیح النسب مسجد سمجھتا ہوں جس کا شجرہ نسب کعبہ ابراہیمی پر جا کر ختم ہو اور مسجد نبوی پر ختم ہو۔ میں اس

کے مقابلہ میں دوسرے الفاظ بولنا نہیں چاہتا کہ وہ مسجد کہلائے گی، لیکن قرآن مجید نے بتا دیا ہے ہمیں، اور آپ کو کوئی لقب ایجاد کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ مسجد، مسجد ضرار کہلائے گی جس کا شجرہ نسب ابراہیم و محمد علیہما السلام کی بنائی ہوئی مسجد پر ختم نہیں ہوتا اور وہ مدرسہ، مدرسہ نہیں بلکہ انسانیت کی قتل گاہ کہلائے گا جس کا شجرہ نسب صفہ نبوی ﷺ پر ختم نہیں ہوتا۔ مسجد نبوی ﷺ پر ختم نہیں ہوتا اور ابوذرؓ و سلمانؓ پر ختم نہیں ہوتا۔ صدیقؓ و علیؓ پر ختم نہیں ہوتا۔ زیدؓ اور سیدہ عائشہؓ پر ختم نہیں ہوتا۔ ان مبلغان دین، ان ہادیان انسانیت، ان پیشوایان عالم پر ختم نہیں ہوتا، جنہوں نے ہدایت کا پیغام دیا، جنہوں نے قربانی کا پیغام دیا، جنہوں نے خود نقصان اٹھا کر دوسروں کو نفع پہنچانے کا پیغام دیا کہ اپنا زیاں مقصود ہے اور اپنا زیاں وارا ہے، لیکن دوسروں کا زیاں وارا نہیں، جنہوں نے یہ پیغام دیا کہ اپنے گھر میں اندھیرا رکھ کر دوسروں کے گھروں میں روشنی کا انتظام کرو، اپنے پیٹ پر پتھر باندھ کر (اس لئے ان کا سلسلہ انہیں پر ختم ہوتا ہے، جنہوں نے غزوہ خندق میں پیٹ پر دو دو پتھر باندھے تھے) دوسرے کے بچوں کا پیٹ بھرنے اور ان کو کھلانے کا انتظام کرو۔ جنہوں نے یہ پیغام دیا کہ مدرسہ کا کام ملازمت دلانا نہیں، مدرسہ کا کام آسمانیاں بانٹنا نہیں ہے، مدرسہ کا کام ایسا پڑھا لکھا انسان بنانا جو اپنی چرب زبانی سے لوگوں کو مسحور نہ کرے، مدرسہ کا کام قرآن سنانا ہے، جب کہ دنیا میں ہر حقیقت کا انکار کیا جا رہا ہے، اور یہ کہا جا رہا ہے کہ دنیا میں صرف ایک حقیقت زندہ ہے، اور سب حقیقتیں مرچکیں، اخلاقیات مرچکے، صداقت مرچکی، صرف ایک حقیقت باقی ہے، اور وہ نفع اٹھانا اور اپنا کام نکالنا ہے، وہ ہر قیمت پر، عزت بیچ کر، شرافت بیچ کر، ضمیر بیچ کر، اصول بیچ کر، خودداری بیچ کر صرف چڑھتے سورج کا پجاری بننا ہے۔ اس وقت مدرسہ اٹھتا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ انسانیت مری نہیں ہے۔ اس وقت مدرسہ اعلان کرتا ہے کہ نقصان میں نفع ہے، ہار جانے میں جیت ہے، بھوک میں وہ لذت ہے جو کھانے میں نہیں، اس وقت مدرسہ یہ اعلان کرتا ہے کہ ذلت میں بعض مرتبہ وہ عزت ہے جو بڑی سے بڑی عزت میں نہیں، اس وقت مدرسہ اعلان کرتا ہے کہ سب سے بڑی طاقت خدا کی طاقت ہے، سب سے بڑی صداقت حق کی صداقت ہے، یہ ہے مدرسہ کا کام، اور اگر مدرسہ یہ کام اور دنیا کے سارے کام کرنے لگے تو وہ مدرسہ، مدرسہ کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جامعہ ہدایت کا صحیح سنگ بنیاد اسی پر رکھا جا رہا ہے۔ میرے

گناہگار ہاتھوں سے نہیں رکھا جا رہا ہے۔ محمد رسول اللہ ﷺ کے ہاتھوں سے رکھا جا رہا ہے، اور رکھا جا چکا ہے۔ یہ کوئی نیا واقعہ نہیں، یہ واقعہ سینکڑوں بار پیش آچکا ہے، اور دنیا کے چپے چپے پر جامعہ ہدایت موجود ہے، جب تک یہ زندہ ہے، جب تک انسانیت کے اندر کوئی سانس اور رمتی باقی ہے، اس کے اندر حقیقی انسانیت کی رمتی باقی ہے، اس وقت تک دنیا کا کوئی گوشہ جامعہ ہدایت سے خالی نہیں، یہ جامعہ ہدایت درحقیقت ان حقیقی جامعات ہدایت کے خاندان کا ایک فرد ہے، یہ کسی چیز کا آغاز نہیں، ایک تسلسل ہے، وہ تسلسل جو دنیا میں کسی بڑی سے بڑی چنگیزی، بڑی سے بڑی کسری قیصر، بڑی سے بڑی شہنشاہی اور زور شمشیر سے اس کی لائی ہوئی مصیبت کے زمانے میں بھی کبھی نہیں نوتا، مدرسہ کا کام یہ ہے کہ وہ انسان پیدا کرے جو اس پست سطح سے بلند ہوں کہ قیمت لگائیے، ہم سب کچھ بیچنے کو تیار ہیں، آج دنیا نیلام کی مندی کے سوا کچھ نہیں، کہاں کا مدرسہ اور کہاں کا کتب خانہ، کہاں کے اصول اور کہاں کے معیار، ہم تو یہ دیکھ رہے ہیں کہ دنیا ایک بازار ہے، اس میں ہر ایک اپنا جنس ہنر اور اپنا جنس کمال ہاتھ پر رکھے ہوئے بیچنے کے لئے آیا ہے۔ لیکن ہم اس نقطہ نظر کو تسلیم نہیں کرتے، ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ دنیا محض ایک بازار ہے، ایک مندی ہے، یہاں جو آئے مال لے کر جائے اور بیچے، صرف مسئلہ قیمت کا ہے، البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ کسی کو بیچنے میں کچھ دیر لگ جائے، اس لئے نہیں کہ اس کو اپنا جنس کمال اور اپنا جنس مذہب اور اپنا جنس اخلاق زیادہ عزیز ہے، بلکہ اس کی اس کے منہ مانگے دام نہیں مل رہے ہیں، جب انسانیت پر زوال آیا، جب اخلاقیات پر زوال آیا اور جب لوگوں کو یہ نظر آنے لگا کہ یہ جو حق و باطل کی بات کہی جاتی تھی، یہ محض زیب داستان کے لئے کہی گئی ہے، اور اس کا کہیں وجود نہیں ہے، حق و باطل کوئی چیز نہیں ہے، حلال و حرام کوئی چیز نہیں ہے، کفر و ایمان کوئی چیز نہیں ہے، غلط، صحیح، صواب و ناصواب کوئی چیز نہیں۔ اصل چیز تو پیسہ ہے، اصل چیز تو طاقت ہے، اصل چیز تو عہدہ ہے، اصل چیز تو مواقع ہیں، اس وقت مدرسہ نے ایسے لوگ پیدا کئے، کوئی ایسا آدمی لاکھڑا کر دیا، ایسا بلند قامت انسان، ایسا کوہ پیکر انسان، جس نے کہا کچھ نہیں! ہم نہیں جاتے! اور اگر کسی کو اعتبار نہیں آتا تو ہمیں خرید کر دیکھ لے، اگر وہ ہمیں خرید سکتا ہے تو ہم مان لیں گے کہ دنیا میں اخلاقیات کوئی چیز نہیں، اور ان سب پر مکمل زوال آچکا ہے۔ مدرسہ نے ہمیشہ ایسے لوگ پیدا کئے ہیں میں آپ کو چند مثالیں دیتا ہوں کہ مدرسہ

کیسے آدمی پیدا کرتا ہے، اس تھوڑے سے وقت میں جبکہ آپ کو اس تقریب میں شرکت کرنا ہے، اور آپ دیر سے بیٹھے ہوئے ہیں، میں مدرسہ کی پوری کارگزاری آپ کو نہیں سنا سکتا، اگر اس کو آپ کو لکھنا ہو تو مدرسوں کی تاریخ پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں، ایک ایک مدرسہ پر ضخیم جلدیں لکھی گئی ہیں، میں مراثی لکھا تھا، رباط گیا تھا تو مجھے کئی جلدوں میں جامعۃ القرویین کی تاریخ دی گئی۔ نہایت اعلیٰ درجہ کے آرٹ پیپر پر چھپی ہوئی اور تصویروں سے مزین، کئی ضخیم جلدوں میں سرف جامعۃ القرویین کی، ایسے ہی ازہر کی تاریخ آپ پڑھیں، ہمارے یہاں آپ دارالعلوم دیوبند کی تاریخ آپ پڑھنا چاہیں، ندوۃ العلماء کی تاریخ آپ پڑھنا چاہیں، فرنگی محل کی تاریخ آپ پڑھنا چاہیں تو موجود ہیں، میں آپ کے سامنے چند مثالیں دیتا ہوں۔

یہ ہے مدرسہ کی شان:

امام مالک کا زمانہ ہے اور ساری دنیا میں علم کی دھوم مچی ہوئی ہے اور بڑے فخر کی بات سمجھی جاتی ہے، کوئی شخص یہ کہے کہ ”حدثنا مالک بن انس، حدثنا مالک“ یہ اس وقت کا سب سے بڑا اعزاز تھا۔ دنیا کے کسی گوشہ میں کوئی کہے ”حدثنا مالک“ سب کے کان کھڑے ہو جاتے تھے اور سب سراٹھا کر دیکھنے لگتے تھے کہ وہ کونسا خوش نصیب انسان ہے، جس کو امام مالک سے تلمذ کا شرف حاصل ہے۔ یہ امام مالک آخری اموی اور ابتدائی عباسی خلافت کے زمانے میں اپنی مسند درس بچھائے بیٹھے تھے، مدینہ طیبہ کے محد و شہر میں، ان کے پاس پیام آتا ہے کی آپ دربار میں زحمت فرمائیں اور خلیفہ کے صاحبزادوں کو سبق پڑھا دیں۔ یعنی شہزادہ امین و ماموں کو کچھ سبق پڑھا دیں۔ انہوں نے فرمایا کہ آپ کے گھر سے اس علم کی توقیر و عزت کا سلسلہ شروع ہوا ہے، آپ کے گھر سے لوگوں نے علم کی توقیر کا سبق سیکھا ہے اور آپ ہی کے ہاتھوں اس کی تذلیل ہو یہ آپ کے لئے مناسب نہیں ہے۔ علم کے پاس آیا جاتا ہے، علم کسی کے پاس نہیں جاتا، چنانچہ امین و ماموں وہاں گئے اور انہوں نے امام مالک سے درس لیا، یہ ہے مدرسہ کی شان، یہ میں نے آپ کے سامنے ایک نمونہ رکھا۔

دوسرا نمونہ دیکھئے:

حضرت عطا کا یا طاؤس کا واقعہ ہے کہ انہوں نے منصور کو ایک مرتبہ نصیحت کی، اور لوگ

بھی وہاں مجلس میں بیٹھے تھے، وہ کہتے ہیں کہ ہم نے کپڑے نمینے شروع کئے، اپنا دامن سمیٹنا شروع کیا کہ ابھی جلا کو حکم ہوتا ہے اور ان کا سر قلم کر دیا جاتا ہے تو کم سے کم ان کے خون ناحق کی چھینٹیں ہمارے دامن پر تو نہ پڑیں۔ وہ کہتے تھے کہ ہم بس سہم کھڑے ہوئے تھے کہ کیا حکم ہوتا ہے؟ منصور نے کہا ذرا یہ قلم دوات رکھا ہوا ہے وہ ان کے قریب تھا۔ انہوں نے کہا کہ میں نہیں اٹھا سکتا، کیوں؟ انہوں نے کہا مجھے یہ اطمینان نہیں ہے کہ آپ اس سے کیا لکھیں گے؟ ممکن ہے کہ آپ خدا کو ناخوش کرنے کی چیز لکھیں، میں اس میں شریک ہونا نہیں چاہتا، وہ کہتے ہیں کہ پھر ہم نے اپنا دامن سمیٹا کہ اب حکم ہوتا ہے جلا کو، لیکن ہیبت حق کا یہ حال تھا کہ منصور نے کوئی حکم نہیں دیا، یہ میں نے آپ کو دوسرا واقعہ سنایا، اب میں آپ کو تیسرا اور آخری واقعہ سناتا ہوں۔ اس سے آپ سمجھیں گے کہ علم کی کیا شان ہے؟ ایک بزرگ تھے شیخ سعید حلبي ابھی سو برس پہلے کا قصہ ہوگا جو دمشق کی ایک مسجد میں بیٹھے ہوئے درس دے رہے تھے۔ اتفاق سے ایک دن ان کے پاؤں میں تکلیف تھی اور وہ پاؤں پھیلائے ہوئے بیٹھے تھے اور جیسا کہ قاعدہ ہے کہ استاذ پشت بہ قبلہ ہوتا ہے اور اس کے شاگرد سامنے بیٹھے ہوتے ہیں اور دروازہ سے داخل ہوتے ہیں اور بیٹھ جاتے ہیں تو ان کا چہرہ دروازے کی طرف تھا اور پشت قبلہ کی طرف تھا اور پاؤں دروازے کی طرف پھیلائے ہوئے تھے۔ اس وقت ایک مشہور بانی سلطنت مصر خدیوی سلطنت جو ابھی فاروق پر ختم ہوئی ہے، ابھی پندرہ بیس برس پہلے تک وہ موجود تھے وہ محمد علی پاشا کا بیٹا تھا، ابراہیم پاشا اس زمانے میں بڑا سفاک اور جلا دشہور تھا۔ وہ شام کا گورنر تھا اور اس کی سفاکی کے قصے لوگوں کی زبانوں پر تھے، اس کو خیال ہوا کہ میں حضرت کا درس جا کر سنتوں اور ملاقات کروں، راستہ ہی وہ تھا اس لئے پہلے دروازے کی طرف سے آیا۔ سب کو خیال تھا کہ حضرت کو ہزار تکلیف ہو، اس موقع پر اپنا پاؤں سمیٹ لیں گے۔ اتنی دیر میں کیا ہو جائے گا۔ انہوں نے بالکل کوئی جنبش نہیں کی، نہ درس موقوف کیا، نہ پاؤں سمیٹا، اسی طرح پاؤں پھیلائے رہے اور وہ پاؤں ہی کی طرف آ کر کھڑا ہو گیا۔ اب ان کے شاگرد کہتے ہیں کہ ہم بالکل لرزہ و ترساں تھے کہ دیکھئے اب کیا ہوتا ہے؟ کیا ہمارے شیخ کی شہادت ہماری آنکھوں کے سامنے ہوگی یا تذلیل ہوگی، مشکیں باندھ لیں جائیں گی اور کہا جائے گا لے چلو، وہ کھڑا رہا اور وہ دیر تک درس دیتے رہے۔ التفات بھی نہیں کیا اور پاؤں بھی نہیں سمیٹا، مگر خدا جانے ان لوگوں کا کیا اثر

ہوتا ہے کہ اس نے کچھ کہا نہیں، کوئی سرزنش نہیں کی، کوئی شکایت نہیں کی اور چلا گیا۔ سننے والی بات یہ ہے، وہ یہ کہ وہ کچھ ایسا معتقد ہوا کہ اس نے جا کر اثر فیوں کا ایک توڑ انعام کے ہاتھ بھیجا اور کہا کہ شیخ کو میرا سلام کہنا اور کہنا کہ یہ حقیر نذرانہ قبول فرمائیں۔ آپ جانتے ہیں انہوں نے جواب میں کہا۔ یہ اب زر سے لکھنے والا جملہ تھا جو علم کی تاریخ میں ہمیشہ روشن رہے گا۔ انہوں نے کہا اپنے بادشاہ کو سلام کہنا اور کہنا کہ جو پاؤں پھیلاتا ہے، وہ ہاتھ نہیں پھیلاتا۔ یا پاؤں ہی پھیلا لے یا ہاتھ ہی پھیلا لے۔ ایک ہی کام ہو سکتا ہے دنیا میں۔ جب میں نے پاؤں پھیلائے تھے، میں اسی وقت سمجھ گیا تھا کہ اب میں ہاتھ نہیں پھیلا سکتا۔ (ان الذی یمدرحلہ لایمدیدہ) انہی الفاظ کے ساتھ مورخ نے اس کو نقل کیا ہے۔

جامعہ ہدایت کے طلبہ اور فضلاء کو ہدایت:

میرے دوستو اور بھائیو! ہمیں ایسے مدرسہ کی ضرورت ہے، اور ہم توقع کرتے ہیں کہ جس مدرسہ کا نام ہی جامعہ ہدایت ہے، وہاں کے طلبہ اور فضلاء کو اس سے یہ ہدایت ملے گی کہ وہ غیرت اور خودداری سیکھیں، ان علماء ربانین سے اور علماء حق سے جن کے واقعات سے تاریخ لبریز ہے، اس خودداری کا سبق سیکھیں کہ پاؤں پھیلا لیں یا ہاتھ پھیلا لیں۔

آج ہمیں ایسے آدمیوں کی ضرورت ہے جو چاہے پاؤں نہ پھیلائیں، میں نہیں کہتا کہ پاؤں پھیلائیں، میں نہیں کہتا کہ آج زمانہ اس جرات کا محمل ہے، میں نہیں کہتا کہ اس زمانہ کی تہذیب اس کو گوارا کرے گی یا اسلام نے یہ تعلیم دی ہے کہ بے ضرورت پاؤں پھیلائے جائیں، بے ضرورت پاؤں پھیلانے کی میں تبلیغ نہیں کرتا، مگر یہ ضرور کہوں گا کہ ہاتھ نہ پھیلائے۔ عالم وہ ہے کہ جو ہاتھ نہ پھیلائے، آج ہمارے مدرسوں کو ایسے آدمیوں کو پیدا کرنے کی ضرورت ہے، اور دنیا کو اور انسانیت کو ان عالموں کی ضرورت ہے جن کے متعلق تحریک ہو جائے کہ یہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے والے نہیں ہیں اور آج جس بزرگ اور گرامی ذات سے اس جامعہ کا انتساب کیا جا رہا ہے، انہوں نے ہمیں اسی کی تعلیم دی ہے، وہ ہاتھ پھیلانے والے نہیں تھے اور ان کی روح جب ہی خوش ہوگی، جب اس جامعہ سے وہ لوگ نکلیں جو دنیا کے سامنے ہاتھ نہ پھیلائیں، آج ہمیں یہ منظر نظر آ رہا ہے کہ سب نے کسی نہ کسی شکل میں ہاتھ پھیلا رکھا ہے، کسی کے ہاتھ پھیلائے ہیں، اس لئے کہ ہاتھ پھیلانے کا ان کو

موقع نہیں ملا، لیکن پھیلنے کے لئے تیار ہیں، مصیبت یہ ہے کہ جو ہاتھ پھیلے نہیں ہیں، وہ پھیلنے کے لئے بے چین و بے قرار ہیں، آج کونسا ہاتھ ہے جو تڑپ نہیں رہا ہے کہ مجھے پھیلنے کا موقع ملے۔ آج دنیا ذبیہوں کو نہیں ترس رہی ہے، فلسفیوں کو نہیں ترس رہی ہے۔

میرے دیکھے ہوئے ہیں مشرق و مغرب کے میخانے

میں یورپ میں بھی دیکھ آیا ہوں اور مشرق وسطیٰ کا وہ وہ میں سے چھانا ہے، آج بڑے بڑے عالموں کی، ادیبوں کی، مصنفوں کی، خطیبوں کی، شاعروں کی، دانشوروں اور فلسفیوں کی کوئی کمی نہیں ہے، آج کمی ہے ان اللہ کے بندوں کی، ان قدی نفوس کی جو کسی شکل میں بھی ہاتھ پھیلانے کے لئے تیار نہیں، وہ موت و ترجیح دیں گے، لیکن ہاتھ نہ پھیلائیں گے، وہ اپنے ضمیر کا سودا کرنے کے لئے تیار نہیں۔

دنیا میں سیاسی انقلابات آئیں اور گزر جائیں، حکومتیں قائم ہوں، اور نکل جائیں، ہوا چلے اور بند ہو جائے، کچھ بھی ملک میں ہو لیکن ان کا ہاتھ کسی کے سامنے نہیں پھیل سکتا، وہ ضمیر کا سودا کرنے کے لئے تیار نہیں اور آپ یقین جانیجے کہ یہ زمین اور آسمان اس وقت تک صحیح طور پر قائم ہے، جب تک کسی نہ کسی شکل میں تھوڑی تھوڑی تعداد میں خواہ ان کو دیکھنے کے لئے دور بین کی یا خورد بین کی ضرورت پیش آئے، لیکن ان کا وجود تو ہو، خورد بین بھی تو اسی کو دیکھ سکتی ہے، جس کا وجود ہے، جس کا سرے سے وجود ہی نہیں، اس کو خورد بین کہاں سے دیکھے گی، آج اتنی چھوٹی شکل میں، ایسی غیر مرئی شکل میں سہی، ان لوگوں کا وجود کہیں تو ہوتا جن کو خورد بین سے دیکھا جاسکتا، خدا کا شکر ہے ایسا تو نہیں ہوا کہ دنیا ان کے وجود سے یکسر خالی ہو جائے، لیکن یہ جنس بہت نایاب ہے، اگر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔

بس میرے بھائیو! میرے نزدیک مدرسہ کا صرف ایک کام ہے کہ وہ ایسے حقانی اور ربانی علماء پیدا کرے جو صرف یہی نہیں، یہ تو ان کی شان سے بہت بعید ہے کہ وہ اپنے ضمیر کا سودا کریں، بلکہ وہ دنیا کو جو ضمیر کا سودا کر رہی ہے، اس کو سرزنش کر سکیں، اس سے کہہ سکیں کہ انسان کا ضمیر اس سے بہت زیادہ قیمتی ہے کہ وہ روز بکے، روز نیلام پر چڑھے، ایک عہدے پر بک جائے، ایک عہدہ، ایک کرسی، ایک خوشنودی، ایک تبسم اس کو خرید لے۔

حضرات! آپ نے انہی ریاستوں میں، اپنے انہی مرکزوں میں ایسے قصے سنے ہوں

گے کہ لوگوں نے اپنی شرافت پر آنچ نہیں آنے دی، اپنی عزت پر میل نہیں آنے دیا، بڑے سے بڑے نقصان کو گوارہ کر لیا، لیکن اس کے لئے تیار نہیں کہ وہ اپنی اس عزت، اس سطح اور معیار سے نیچے اتر آئیں، میں صرف ہندوستان کو نہیں کہتا میری نگاہ ساری دنیا پر ہے، میں ساری دنیا کو اپنے سامنے دیکھ رہا ہوں اور یہ میں جو آپ کے سامنے کہہ رہا ہوں یہ میں ہر جگہ کہہ آیا ہوں، یہ نہیں کہ میں آج آپ کے سامنے پہلی مرتبہ کہہ رہا ہوں، میں نے عربوں کے سامنے یہی بات کہی، میں نے ان سے کہا کہ ہم نے، تم سے خودداری کا سبق سیکھا تھا، ہم نے تم سے ایمان کا سبق سیکھا تھا، ہم نے تم سے استقامت کا سبق سیکھا تھا، میں ناصر کے زمانہ میں جب عرب اپنے آپ میں نہیں تھے، سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ان میں باقی نہیں رہی تھی، اس وقت میں نے ان کا گریبان پکڑ پکڑ کر ان سے کہا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ آپ ایک چیز کو غلط سمجھتے ہیں، اور آپ اس کے پیچھے اس طرح دیوانہ وار دوڑ رہے ہیں۔

عالم ہر زمانہ میں قبلہ نما رہے:

مدرسہ کا کام یہ ہے کہ وہ ایسے باضمیر، باعقیدہ، ایسے باایمان، ایسے باحوصلہ اور ایسے باہمت فضلاء پیدا کرے جو اس ضمیر فروشی اور اصول فروشی اور اخلاق فروشی کے دور میں روشنی کی مینار کی طرح قائم رہیں کہ وہ کہیں نہیں جاتا، اپنی جگہ پر کھڑا ہے، راستہ بتاتا ہے، جیسے قبلہ نما کہ آپ کہیں ہوں وہ آپ کو قبلہ بتا دے گا، ہندوستان میں بتائے گا، دوسرے ملک میں بتائے گا، پہاڑ پر رکھیں تو بتائے گا، پل پر رکھیں تو بتائے گا، یہ عالم کا کام ہے کہ ہر زمانہ میں ہر جگہ قبلہ نما رہے۔

یہ جامعہ ہدایت جہاں تک میں سمجھتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ ان مقاصد عالیہ پر اس کی بنیاد رکھی جا رہی ہے اور حقیقت میں ہر دینی مدرسہ کی بنیاد اس پر رکھی گئی ہے اور یہی اس کی اصل قدر و قیمت ہے، ان کو آپ ان کی عمارتوں سے نہ پہچانے، آپ ان کے بورڈوں اور وہاں کے فرنیچر کی کمی اور وہاں کے پڑھنے والوں اور پڑھانے والوں کی تہی دامن کی بے بضاعتی سے ان کا درجہ قائم نہ کیجئے جیسے کہ کہنے والوں نے کہا گدائے شاہی میں اور دلق فقیری میں وہ شاہانہ مزاج رکھتے ہیں، ان کا مزاج شاہانہ ہے اور ان کا لباس فقیرانہ ہے، یہ ہمارے علماء سلف تھے، اور آج انہیں علماء سلف کی اس وقت ضرورت ہے۔

مدرسوں نے ہوا کے رخ پر چلنا قبول نہیں کیا:

خدا کا شکر ہے کہ ہوا کے رخ پر چلنا مدرسہ کا اصول نہیں ہے، اگر مدرسہ کا یہ اصول ہوتا تو وہ کب کے انگریزی کے، عربی کے کالج بن چکے ہوتے، لیکن جو اس وقت چند گنے چنے مدرسے باقی ہیں، وہ اس بات کا ثبوت دیتے ہیں کہ مدرسوں نے ہوا کے رخ پر چلنے کو قبول نہیں کیا۔

حضرات! میں ان الفاظ کے ساتھ آپ حضرات کی عزت افزائی کا اور بانیان مدرسہ خاص طور پر حضرت مولانا شاہ عبد الرحیم صاحب اور مولانا عبدالحی صاحب فاضل کی ذرہ نوازی کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے اس اہم اور مقدس اور اس بابرکت اور عالی مرتبہ کام کے لئے مجھ جیسے طالب علم کا انتخاب کیا، جو کچھ میرے متعلق کہا میں اللہ سے دعا کرتا ہوں، آپ بھی کیجئے کہ اس دن مجھے رسوائی سے بچائے جس دن (یوم تسلی السرائر) کا ظہور ہوگا۔ اب میں ان الفاظ کے ساتھ اپنی گزارش کو ختم کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ اس جامعہ کو ہمیشہ سرسبز و شاداب رکھے اور صحیح معنی میں اس کو مرکز بنائے۔ آمین۔

و آخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین

دار ارقم جو مسلمانوں کی پناہ گاہ تھا

ذیل کا مضمون حضرت مولانا رحمۃ اللہ کی وہ اہم تقریر ہے جو ۳ جنوری ۱۹۹۴ء کو فتح پور میں ”مدرسہ دار ارقم“ کی درگاہ اور مسجد کے سنگ بنیاد کے موقع پر کی گئی۔

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم . اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم . واذکروا اذ انتم قلیل مستضعفون فی الارض تخافون ان یتخطفکم الناس فاواکم وایدکم بنصرہ ورزقکم من الطیب لعلکم تشکرون .

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مسلمانوں کو خطاب کر کے ”واذکروا اذ انتم قلیل مستضعفون فی الارض“ یاد کرو جب تم تھوڑے تھے برائے نام تھے، انگلیوں پر گنے جاسکتے تھے اور بہت کمزور سمجھے جارہے تھے جو کمزور کے ساتھ معاملہ کیا جاتا ہے وہ تمہارے ساتھ کیا جاتا تھا، تم کو جو چاہتا تکلیف دیتا اور جو چاہتا پریشان کرتا اور روئے زمین پر تم کو کمزور سمجھا جاتا تھا، ”فاواکم“ تو اللہ نے تم کو پناہ دی ”وایدکم بنصرہ“ اور تمہاری مدد کی اپنی نصرت خاص سے، اور تمہاری حفاظت فرمائی اور دست گیری کی ”ورزقکم من الطیبات“ اور تم کو عطا کیں بڑی بڑی نعمتیں تاکہ تم شکر کرو۔

جب میں قرآن مجید کی اس آیت کو پڑھتا ہوں تو ذہن ”دار ارقم“ اور شعب ابی طالب کی طرف جاتا ہے، وہ ”دار ارقم“ کون سی جگہ تھی، ”دار ارقم“ وہ گھر تھا جس میں مسلمان کفار کی اذیت سے اور ان کی سنگ دلی سے اور ان کے وحشت ناک معاملات سے بچنے کے لئے، اللہ کا نام اطمینان کے ساتھ لینے اور نماز ادا کرنے کیلئے پناہ لیتے تھے اور بہت بڑے بڑے جلیل القدر نامی گرامی صحابی وہیں جا کر اسلام لائے، جہاں تک مجھے یاد ہے حضرت سیدنا عمر بن خطابؓ بھی وہیں گئے اور انھوں نے بھی کلمہ پڑھا، یہ تھا ”دار ارقم“ جو مسلمانوں کی پناہ گاہ تھا اور شعب ابی طالب وہ جگہ تھی جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کو پناہ لینا پڑی اور ان کا مقاطعہ اور بائیکاٹ کیا گیا تاکہ کوئی سودا بیچنے والا ان کے پاس نہ پہنچے کوئی غذائی سامان نہ پہنچائے لیکن اس

میں بعض شریف انسان مکہ مکرمہ کے تھے جو کسی طرح سے کچھ غذا پہنچا دیتے جس سے ان کی زندگی قائم رہے ورنہ ان کی موت کا پورا سامان کیا گیا تھا اور چاروں طرف ایسے پہرے بٹھائے تھے اور ایسا حصار قائم کیا تھا کہ باہر کی دنیا سے ان کا کوئی رابطہ اور تعلق نہ پیدا ہو پائے۔

تو میں عرض کر رہا تھا کہ جب تک یہ آیت پڑھی جائے گی جو لوگ میرت پاک سے واقف ہیں یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک پڑھیں گے اور جنہوں نے اسلام کی تاریخ پڑھی ہے اور ادیان کی بھی تاریخ پڑھی ہے، مذاہب اور انقلاب کی تاریخ پڑھی ہے، ان کو ”دارالرم“ ضرور یاد آئے گا، آج ساری دنیا میں شروع عہد صحابہ ہی سے اور اس کے بعد خلفائے راشدین کے زمانے میں اور پھر سلطنت امویہ اور پھر سلطنت عباسیہ کے زمانے میں بڑے بڑے محلات بنے خلفائے راشدین کے زمانہ میں تو قیصر و کسریٰ کے محلات تھے لیکن جب نبی امیہ خلافت کی کرسی پر آئے تو دمشق میں بڑے بڑے محلات بنائے، عباسیوں تک جب خلافت پہنچی تب بغداد میں بڑے شاندار شاندار محلات بنائے گئے اور بڑے بڑے علمی مرکز قائم کئے گئے اس کے بعد جب اسلام اسپین میں گیا اور اندلس میں گیا تو وہاں کے محلات کا اور قصور کا تو کہنا ہی کیا، میں ان خوش قسمت لوگوں میں سے ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اندلس مرحوم اور اسپین کو دیکھنے کا موقع عطا فرمایا، وہاں ہم نے قصر الحمراء دیکھا اور بہت بڑے مبصر اور مؤرخ نے بتایا کہ اس کے سامنے تاج محل وغیرہ کی بھی کوئی حقیقت نہیں ہے اور مغلوں کے محلات بھی بھی اس کے سامنے کم درجے کے معلوم ہوتے ہیں، ہم نے قصر الحمراء بھی دیکھا ہے اور ”جامع بنی الزہراء“ کو بھی دیکھا قرطبہ اور پھر اس کے بڑے بڑے مدارس، آج بھی مصر کا جامعہ ازہر جو قاہرہ میں ہے اور جو عالم اسلام کا سب سے قدیم تر اور سب سے شاندار اور سب سے زیادہ کثیر التعداد طلباء کا مرکز ہے۔

میں تو مصر کا جامع الزہراء اور پورے اعتماد کے ساتھ کہتا ہوں، معذرت کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ دیوبند کا دارالعلوم، مظاہر العلوم اور ندوۃ العلماء، جس کا میں خادم اور ناظم ہوں سب اس دارالرم کے سامنے بیچ ہیں، یہ ”دارالرم“ وہ تھا جہاں سے دنیا میں پھر سے ایمان کی روشنی پھیلی اور انسانوں کو معلوم ہوا کہ ہم کو کس نے پیدا کیا اور کس لیے پیدا کیا ہمارا خالق کون ہے اور غرض اور مقصد خلقت کیا ہے ”وما خلقت الجن والانس الا ليعبدون“ میں نے جن

والس کو صرف اس لئے پیدا کیا تا کہ یہ میری عبادت کریں اور اس دار ارقم کا جو رقبہ تھا اور اس عمارت کی جو حیثیت تھی اور اس کی جو وسعت تھی وہ سب اہمیت نہیں رکھتیں بلکہ اہمیت تو اس کی ہے کہ وہاں سے کون سی تعلیم دی گئی اور وہاں سے کون سا نور اور روشنی پھیلی جس سے انسانوں کو اپنے پیدا کرنے والے کا علم ہوا۔

اس سے بڑھ کر غضب، ناشکری اور جہالت کی بات کون سی ہو سکتی یہ کہ انسان اپنے پیدا کرنے والے ہی کو نہ جانے، اگر یہ کوئی نہ جانے کہ اس مدرسہ میں انتظام کس نے کیا اور یہ جلسہ کس نے کیا اور اس میں اتنے دور دور سے لوگ آئے اور ہمارے دارالعلوم کے مدرسین بھی ہیں، جن کا جانا ہر جگہ آسان نہیں ہوتا لیکن ان کو کس نے بلایا اور اگر کوئی شخص یہ سمجھے کہ یہاں کھانے پینے کی دعوت ہونے والی ہے یا نکاح ہونے والا ہے تو آپ سب یہ کہیں گے کہ اس کی عقل کو کیا ہو گیا ہے یہ اتنا نہیں جانتا کہ سنگ بنیادی پڑی ہے۔

لیکن انسان کھائے پئے بڑا ہو اور اس کی نسل چلے اور بعض اوقات علم میں آسمان کے تارے توڑ لائے اور بڑے بڑے سمندر و صحراء طے کر لے، لیکن اپنے پیدا کرنے والے ہی کو نہ پہچانے، اس سے بڑھ کر جہالت کیا ہو سکتی ہے لیکن دنیا میں یہی ہو رہا تھا، کروڑوں انسان اپنے پیدا کرنے والے کو نہیں جانتے تھے، باپ کو جانتے تھے لیکن باپ کو کس نے پیدا کیا پھر اس کے باپ کو کس نے پیدا کیا؟ پھر اس کو اور حضرت آدم تک چلے جائے یہ کوئی نسب نامہ نہیں ہے لیکن ہم کو کس نے پیدا کیا، کائنات کو کس نے بنایا، زمین و آسمان کی کس نے خلقت کی، پہاڑ کس نے کھڑے کئے؟ یہ باغ کس نے آگائے؟ اور روزی کون دیتا ہے؟ اور اچھی بری تقدیر کس نے بنائی ہے اور کون موت و زندگی کا مالک ہے؟ آج اگر کوئی شخص ہندی نہیں پڑھا ہے تو لوگ کہیں گے کہ ان پڑھ ہے اور اگر اردو نہیں پڑھا ہے تو مسلمان کے حلقہ میں ناخواندہ کہیں گے اور عربی نہیں پڑھا ہے تو عرب کہیں گے امی ہے جاہل ہے لیکن اس سے بڑھ کر کیا جہالت ہو سکتی ہے کہ اپنے پیدا کرنے والے ہی کو نہ جانے کہ وہی عبادت کا مستحق ہے دنیا اس سے بالکل نا آشنا تھی اور پھر اس کے بعد یہ حالت تھی کہ انسان کا خون ان کے نزدیک کوئی چیز نہیں، عربی میں ایک شعر ہے۔

اذا لمهرة السفراء ادرک طهرها

فشب الاله الحرب بين القائل

اس سے عربوں کا مزاج سمجھئے اور ان کے سوچنے کا طرہ ایقہ کہ شاعر اپنے وقت کا پڑھا لکھا ہوتا ہے کہتا ہے کہ جب میرا گھوڑا جو سرخ رنگ کا ہے اس کی پیٹھ پر اری ہو جائے اور تخت ہو جائے تو اللہ کسی نہ کسی قبیلہ میں جنگ چھیڑ دے تو میں اپنے جوہ دکھاؤں اسے شرم نہیں آئی کہ صرف اپنے گھوڑے کی تیزی دکھانے اور اپنی تلوار کی کات دھانے اور اپنا نام چیلانے کے لئے جہت ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی نہ کسی بہانے سے ان قبائل میں لڑائی چھیڑ دے جس پر مڑے آئیں گے یہ ان کی عقل کا حال تھا اور اللہ کے علاوہ سینکڑوں چیزوں کی پوجا جاتی جا رہی تھی، ہم نے ہندوستان کے آثار قدیمہ کجرات اور بڑے بڑے دور دراز علاقوں میں مہاراشٹر میں ہر جگہ دیکھے ہیں کہ دریا بھی پو جے جاتے تھے اور بعض جانور اور بلکہ ہم نے تو بعض آثار قدیمہ میں انسان کے اعضاء تناسل کی تصویر بھی دیکھی تو معلوم ہوا کہ کسی دور میں ان کی بھی پرستش ہوتی تھی اور انسانوں کے ساتھ ساتھ انسانوں کا کیا سلوک تھا، کہ کسی کی جان، جان نہیں سمجھی جاتی تھی اور کسی کی عزت، عزت نہیں سمجھی جاتی تھی عورتوں کے ساتھ کیا معاملہ ہوتا؟

”واذا المؤودة سنلت“ بچیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے کہ یہ بڑے جھگڑے کی چیز ہے کہ کہیں شادی ہوگی پھر ہماری نسبت کرنی پڑے گی کہ یہ داماد ہیں، ان کی یہ بیٹی ہے، اس لئے زندہ ہی درگور کر دیتے تھے، ہنستی بولتی بچی کو اپنے ہاتھوں سے زمین میں گدھا کھود کر مٹی ڈال دیتے کہ کہیں رحم نہ آ جائے اس وقت انسانیت اپنے زوال، اپنے تنزل، اپنی پستی کے بلکہ حیوانیت کے آخری درجے تک پہنچ چکی تھی تو اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب پیغمبر خاتم الرسل کی بعثت فرمائی، آپ حرم شریف میں نماز پڑھتے اور دعا کرتے تو آپ پر اوجھڑی ڈال دی جاتی اور نہ جانے کیا کیا چیزیں ڈالی جاتیں اور پتھر اور ڈھیلے بھی آپ پر پھینکے جاتے تھے، جب آپ راستے سے گزرتے تھے اس وقت دارا رقم ہی ایک جگہ تھی کہ جہاں پناہ لیتے تھے مسلمان اور ان کو کلمہ پڑھنا ہوتا تھا تو وہاں چلے جاتے تھے اور اسلام لاتے اور نمازیں پڑھتے یہ تھا اس وقت کا نقشہ کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس دین کے ذریعہ ”من الظلمات الى النور“ اندھیروں سے روشنی کی طرف نکالا یہاں یہ ظلمت کا لفظ نہیں کہا قرآن نے اس لئے کہ ظلمتیں ہزار ہو سکتی ہیں

لیکن نور ایک ہی ہوگا، عربی زبان کے جو عالم ہیں ان کو معلوم ہوگا کہ قرآن میں نور کی جمع کہیں نہیں آئی، یہاں تک کہ بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ نور کی جمع بلاغت کے خلاف ہے نور کی جمع انوار ہو سکتی ہے، لیکن اس لئے نہیں آئی کہ نور ہے ہی ایک، جب کوئی چیز ایک ہو تو اس کی جمع ہو ہی نہیں سکتی اگر کہیں مثلاً ایک عالم ہو تو یہ نہیں کہیں گے کہ یہاں علماء ہیں، ایک حافظ ہے تو یہ نہیں کہیں گے کہ یہاں حفاظ ہیں اور اگر ایک مدرسہ ہو تو دار ارقم جیسا، ہمیں معلوم نہیں غالباً اس کے آس پاس کوئی بڑا مدرسہ نہیں ہوگا، تو سارے قرآن مجید میں ظلمت کو جمع کے لفظ سے لایا گیا ہے، ”یخرجکم من الظلمات“ اللہ تعالیٰ تم کو ظلمتوں سے نور کی طرف نکال لایا ہے تو نور ایک ہے اور وہ نور عرصہ کے بعد تقریباً ۱۵ اور ۶ سو سال کے بعد جب حضرت عیسیٰ کے آسمان پر تشریف لے جانے کے بعد اور وہی کا سلسلہ منقطع ہو جانے کے بعد تقریباً ۱۵ اور ۶ سو سال نکلتے ہیں کہ نور پہلی مرتبہ چمکا اور مکہ معظمہ سے چمکا اور دار ارقم اس کی پناہ گاہ بن گیا اور وہی مسلمانوں کا مرکز بن گیا پھر اس کے بعد یہ نور تمام دنیا میں پھیلا اور آج اس کو پھر پھیلانے کی ضرورت ہے، کہ آج بہت سے علاقوں میں بہت سی قوموں میں اور بہت سے ملکوں کی آبادی میں یہاں تک کہ بڑے بڑے ترقی یافتہ ممالک امریکہ اور برطانیہ جیسے ملکوں کو دیکھا ہے کہ جیسے نہ دنیا کا کوئی پیدا کرنے والا ہے نہ اسے مرکز کہیں جانا ہے اور نہ حساب دینا ہے، ہم نے واشنگٹن میں ایک تقریر ملیں کہا تھا جب قاری صاحب نے یہ آیت تلاوت کی ”ولولا اذ دخلت جنتک قلت ما شاء اللہ لا قوۃ الا باللہ“ ایسا کیوں نہیں ہوادو بھائی تھے دوست تھے، ایک کے کچھ باغات تھے کچھ کھیتی تھی ایک کچھ پیسے والا تھا وہ فخر کرنے لگا کہ میرے پاس یہ اور یہ ہے تو دوسرے نے کہا ارے تم جب اپنے باغ میں آئے تھے ایسے پھلتے پھولتے باغ میں گلزار میں آئے تھے تو اللہ کو یاد کرتے اور یوں کہتے ”ولولا اذ دخلت جنتک.....“ اللہ جو چاہے جس کو چاہے دے تو ہم نے کہا کہ آج امریکہ کا یہی حال کہ اللہ نے سب نعمتیں دی ہیں لیکن کوئی ماشاء اللہ کہنے والا نہیں ہے یہ کوئی نہیں کہتا کہ یہ اللہ کا دین ہے، یہ اللہ نے دیا ہے، ہم کو۔

آج بھی دنیا میں بہت سے ترقی یافتہ ممالک ہیں کہ وہاں نہ اپنے خالق کی پہچان ہے اور نہ پیدا کرنے والے کی، اگر ہے تو عیسائیوں میں کہ ہاں ہم کو اللہ نے پیدا کیا ”گاڈ“ کہیں یا اور کچھ کہیں مختلف ملکوں میں الگ الگ نام ہیں لیکن اس کی ہدایت پر چلنا اس نور انہی کرنے کی

کوشش کرنا اس کے خلاف کرنے میں ڈرنا، اور بچنا اور اس کے پیدا کئے ہوئے انسانوں کو اپنا بھائی سمجھنا ان کی عزت کرنا اور ان کی مدد کرنا جب کوئی ایسا موقع آئے مدد کرنے کا، ان کی مدد کرنا، جب کوئی ایسا موقع آئے مدد کرنے کا، ان کی حفاظت کا، ان کو ہلاکت سے بچانے کا، تو آگے بڑھنا یہ سب چیزیں پورے پورے ملک میں بعض جگہ نہیں پائی جاتیں۔ یہ سب فیض ہے نبوت محمدیؐ کا اور نور محمدیؐ کا اور وہی دارالافتاء اور شعبہ ابی طالب کی قربانیوں کا، بدر، احد، حنین اور جو غزوات ہوئے ہیں ان سب کا کہ اللہ تعالیٰ نے آج اسلام و مادی دنیا میں پھیلا دیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے میدان بدر میں فرمایا تھا یا اللہ یہ مٹھی بھر لوگ ہیں ان میں مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہے اگر گنتی پر فیصلہ ہو یا ہتھیاروں پر فیصلہ ہو یا جنگ کے تجربہ پر فیصلہ ہو تو یہ مقابلہ نہیں کر سکتے لیکن ابکہ، بات حضورؐ نے فرمائی اور یہ آپ ہی فرما سکتے تھے ہر ایک کی جرأت نہیں ہے، ”وان تھلک.....“ میں کہتا ہوں کہ اگر تو نے اس مٹھی بھر جماعت کو ہلاک کر دیا اور یہ فیصلہ ہوا کہ چھوڑ دو اسباب پر کہ اگر طاقتور ہیں تو کمزوروں کو ختم کر دیں، یہی دنیا میں اکثر ہوتا ہے ”وان تھلک هذه العصابة لن تعبد“ اگر تو نے اس مٹھی بھر جماعت کی ہلاکت کا فیصلہ فرمالیا تو ایک کی یعنی تیری عبادت نہیں ہوگی، یعنی عبادتیں تو ہوں گی لیکن تنہا تیری عبادت نہیں ہو سکے گی، یہ آپ ہی فرما سکتے تھے، یہ آپ ہی کا مقام تھا لیکن یہ واقعہ ہے تاریخ اس کی تصدیق کرتی ہے، کہ آج یہی خدائے واحد کا نام لینے والی امت جو کہتی ہے ”لا الہ الا اللہ“ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں، کوئی خالق نہیں، کوئی نفع و ضرر کا مالک نہیں، کوئی قسمت بنانے بگاڑنے پر قادر نہیں، کوئی جلانے مارنے کی طاقت رکھنے والا نہیں کوئی رزق دینے والا نہیں یہ صرف یہی امت کہتی ہے اور آج ضرورت ہے دو چیزوں کی ایک تو اس کی کہ اپنے اندر اس ایمان کو تازہ کیا جائے اور اس نور کو پہلے اپنے قلب و دماغ میں بسایا جائے پھیلا جائے اور اس کے بعد اس کو باہر نکالیا جائے، وہ نور دوسروں تک پہنچے جہاں تک تعلق ہے نجات کا نجات کیلئے شاید کافی ہو جائے لیکن رفع درجات کیلئے کافی نہیں ہے اس کے لئے ضرورت ہے دوسروں میں کوشش کرنے کی کہ اپنے آس پاس کے گاؤں میں جو ہمارے غیر مسلم بھائی رہتے ہیں انسانیت کے لحاظ سے ہمارا ان سے رشتہ ہے اور ان کا ہم سے رشتہ ہے اور ہم ان کو بھی ایک خدائے واحد کی معرفت عطا کرنے کی اور ان کو یہ یقین دلانے کی کوشش کریں کہ اس کائنات کا زمین و آسمان کا اور ان سارے ملکوں کا، خشکی

وتری کو اور پہاڑوں اور دریاؤں کا درختوں اور پھلوں کا یا جو کچھ بھی ہے جن کو اپنے اپنے وقت پر معبود بنایا گیا سب کا پیدا کرنے والا ہے ایک وہی جلاتا اور مارتا ہے، ”کنجی و میت“ وہی رزق دیتا ہے تو ان دو چیزوں کی ضرورت ہے، بڑی خوشی کی بات ہے کہ جب ہم نے دارالرقم کا کپرا (بیسر) لگا ہوا دیکھا تو اس پر یہ مضمون ہمارے ذہن میں آیا کہ دارالرقم کا کتنا بڑا احسان ہے کہ آج وہ کسی بڑے سے بڑے دارالعلوم اور جامعہ ”اسلامک یونیورسٹی“ کی دانشگاہ کا کسی تحقیقی مرکز کا کسی کا کوئی احسان کا کوئی نسبت نہیں ہے اور سو کی بھی نہیں ہے جو دارالرقم سے اللہ تعالیٰ نے فیض پہنچایا یہ بہت مبارک نام ہے لیکن ضرورت ہے کہ ایسے دارالرقم کئی نہیں وہ تو ایک تھا لیکن یہ کہ معنوی حیثیت سے اور کلام کی نوعیت کی حیثیت سے اور دعوت و مقصد کی حیثیت سے جا بجا دارالرقم ہونے چاہیے مدارس و مکاتب ہونے چاہیے اس میں پہلا کام یہ ہے کہ مسلمان بچوں کو وہ ذریعہ حاصل ہو جائے جس سے وہ دینی کتابیں پڑھ سکیں اور اللہ و رسولؐ سے واقف ہو سکیں ان کا زیادہ تر ذخیرہ اردو میں ہے جو عربی کے بعد سب سے زیادہ علمی ذخیرہ اور دینی و دعوتی ذخیرہ ہے، ہماری معلومات کے اعتبار سے وہ اردو میں ہے اردو فارسی سے بڑھ گئی اردو یا عربی نہیں ہے، یا پھر اس کے بعد اردو میں ہے اور اردو میں بھی بعض بعض ایسی چیزیں ہیں کہ عرب ترجمہ کرنے کے خواہشمند ہیں ہم سے بارہا کتنی کتابوں کے متعلق لوگوں نے کہا جب کہ سیرۃ النبی کے متعلق کہا اور خطبات مدراس کا ترجمہ تو ہو چکا ہے، بچیوں کو وہ تعلیم دیجئے جس سے وہ بے تکلف اردو پڑھ سکیں، قرآن شریف کی تلاوت کر سکیں اور کفر و ایمان کا، توحید و شرک کا فرق سمجھ سکیں اور معصیت و طاعت کا فرق سمجھ سکیں، اللہ کے محبوب پیغمبر حضورؐ کے حالات پڑھ سکیں اور معلوم کر سکیں اور دوسروں کو بتا سکیں یہ رسم الخط یعنی ”اسکرپٹ“ یہ کنجی ہے یہ ایک بڑے مغربی مورخ فلسفی نے لکھا ہے کہ اب کسی کتب خانے کو چلانے کی ضرورت نہیں جیسا کہ بعض زمانوں میں ہوا ہے اور جیسا کہ لوگوں نے مسلمانوں پر بھی الزام لگایا ہے، اسکندر یہ کتب خانہ کے متعلق اور وہ غلط ثابت ہوا، تو اب کسی کتب خانے کو چلانے کی ضرورت نہیں، اب صرف رسم الخط بدل دینا کافی ہے، ہم نے ترکی میں دیکھا ہے پوری نسل عربی رسم الخط سے عربی کتابوں کو براہ راست پڑھنے سے قاصر و محروم ہے۔

ایک کام تو یہ کہ بچوں کو دینی تعلیم حاصل کرنے کا ذریعہ ”کنجی“ ان کو دی جائے، کنجی کیا

ہے؟ وہ ہے اردو کی تعلیم، اردو لکھنے پڑھنے کی قابلیت ہو پھر اس کے بعد اللہ توفیق دے تو عربی مدارس میں بھیجے، اس طرح مکاتب قائم کیجئے اور جال پھیلا دیجئے، پھر اس کے بعد علم کی تکمیل کے لئے ایسے لوگوں کا انتخاب کیجئے، جو ذہین ہوں، محنتی ہوں، سعید ہوں ان کو بھیجئے کسی بڑے مدرسہ میں تاکہ وہ اس قابل ہوں کہ وہ آپ کو مسئلہ بتائیں اور آپ وحلال و حرام کا فرق بتائیں، آپ سے ناواقفیت میں کوئی غلطی نہ ہو جائے، روزہ نماز کے مسائل اور نماز کا سیکھنا سکھانا بھی ہوگا، اور پھر نکاح و طلاق کے مسائل میں اور عائلی زندگی کا قانون ہے، یہ سب اس میں رہنمائی کرسکیں اور پھر اس سے بڑھ کر یہ کہ اللہ و رسول کی باتیں بتائیں جس سے آپ کا ایمان تازہ ہو، اپنے آس پاس کے جو غیر مسلم بھائی ہیں، ان کو آپ اسلامی اخلاق کا نمونہ دکھائیں، ان کو یہ محسوس کرائیں کہ کیا مسلمان ایسے بھی ہوتے ہیں، اس موقع پر ہم نے انگلستان میں بھی سنایا تھا کہ حضرت سید احمد شہید ممکن ہے کہ کچھ لوگ ان کی جماعت میں ان کے اطراف بھی شامل ہوئے ہوں جب انھوں نے پشاور فتح کیا تو وہاں کئی دن ٹھہرنا پڑا۔ ایک دن ایک پشاور پٹھان نے ہندوستان کے ان قصبات کے کسی مسلمان کا ہاتھ پکڑ کر کہا کہ او ہندوستانی بھائی، آپ سے ایک بات پوچھتے ہیں، صحیح صحیح بتائیے گا کہ کیا ہندوستان کے لوگوں کی دور کی نگاہ کمزور ہوتی ہے، انھوں نے کہا کہ نہیں کمزور نہیں ہوتی ہے، کہا نہیں ضرور کمزور ہوتی ہے، انھوں نے کہا کہ نہیں خدا کا شکر ہے کسی کی کمزور ہو تو ہو، لیکن عام طور پر کمزور تو نہیں ہوتی اور نہ خصوصیت ہے، لیکن میں پوچھتا ہوں کہ یہ آپ پوچھ کیوں رہے ہیں، تو کہا ہم آپ لوگوں کو جانتے ہیں کہ آپ میں سے کوئی دو برس کا نکلا ہوا ہے کوئی چھ ماہ سے اپنے گھر والوں، بیوی، بچوں کو چھوڑ کر آیا ہے اور آپ جوان بھی ہیں اور ایسے جوان ہیں مضبوط کہ لڑنے کیلئے جہاد کے لئے نکلے ہیں ہم نے آپ میں سے کسی کو نہیں دیکھا جو یہاں کسی عورت کو تاک رہا ہو کسی نامحرم کو دیکھ رہا ہو، اور دوسری فطری بات تھی کہ اگر اس طرح لذت نہیں حاصل کر سکتے اس طرح لذت حاصل کر لیں لیکن یہ بھی نہیں تو ہم نے فیصلہ کیا کہ آپ لوگوں کو شاید دور کی چیز نظر ہی نہیں آتی، تو جواب میں کہا کہ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”قل للمؤمنین یغضوا من ابصارہم“ ”مومنوں سے ایمان والوں سے کہہ دو کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور یہ ہمارے جو امام اور مرشد ہیں ان کی صحبت کا فیض ہے۔“

اس لئے آپ بھی اپنے اخلاق میں افتخار و امتیاز پیدا کریں کہ آپ کو دیکھ کر سمجھ جائیں کہ مسلمان یہ نہیں کرے گا۔ اس سے اطمینان ہو، دوسری بات یہ کہ یہ احساس دلائیں کہ وہ جائیں کہ ان کو پیدا کرنے والا امن ہے۔ وہی عبادت کا حق ہے۔

وہی نفع و نقصان پہونچی سمجھتا ہے اس کا نام ایسے سے فائدہ ہے یہ دوسرا فرض ہے، آپ کا یہ فریضہ بھی دار ارقم سے ادا ہوا تھا، خدا کرے دار ارقم اس ہدایت کا اس توفیق کا مرکز بن جائے اور جا بجا ایسے دار ارقم بنیں چاہے نام مختلف ہوں لیکن مقصد ایک ہو اور کام ایک ہو کہ پہلے اپنے بچوں کو دین کی تعلیم دینا اور ان چیزوں سے بچنے کی ان کی صلاحیت پیدا کرنا جو خدا کے عذاب کے مستحق بناتی ہیں اور جہنم واصل ہوتی ہیں ان چیزوں سے بے خوف دور رہیں بلکہ ان سے ڈر ہو خوف ہو اور وہ طہارت کی، انسانیت کی اور شرافت کی اور پھر ایمان اور دین کی زندگی گذاریں اور پھر یہ روشنی ہمارے آس پاس پھیلے۔

وقت کا سب سے بڑا جہاد

ذیل کا مضمون حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی معروف خطبہ جمعرات سے جو نقل چند روز قبل
تقریباً ۲۰۰۰ نمبر 2، 93، کو دارالعلوم ندوۃ العلماء دہلی شری لائبریری کے دستخط
ہال میں پڑھا گیا۔

الحمد لله رب العالمين

و الصلاة والسلام على رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم

حضرات! ہمارا آپ کا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی رہنمائی اور تعلیم کے لئے
اور اپنی ذات کی معرفت عطا کرتے اور اس کا صحیح تعارف کرانے کیلئے (جو عقل و قیاس سے
ماوراء ہے اور جس کی کوئی مثال اور نظیر اس دنیا میں موجود نہیں ہے) انبیاء علیہم السلام کے گروہ کو
منتخب فرمایا۔ اپنے کلام اور پیغام کے ذریعہ پہلے ان کو پھر ان کے ذریعہ اپنی مخلوق کو اپنی ذات
وصفات کا صحیح اور مستند علم عطا فرمایا اور اپنے منشا اور احکام اور زندگی گزارنے کے پسندیدہ طریقہ
سے آشنا کیا، اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے۔

وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَحْكُمُ فِي رَسُولِهِ فِي مَا كَانَ

اللہ تعالیٰ کا یہ طریقہ نہیں کہ تم کو غیب پر مطلع کر دے غیب کی باتیں بتائے کیلئے تو اپنے
رسولوں میں سے جس کو چاہتا ہے منتخب کر لیتا ہے۔

اللہ کی ذات وصفات اس کی زندگی کے صحیح فائدے اور زندگی گزارنے کے پسندیدہ
طریقہ کو معلوم کرنے کا اور ان پیغمبروں کی اطاعات اور تعلیمات کے علاوہ اور کوئی ذریعہ نہیں یہ
عقل و قیاس آرائی اور طبع آزمائی خواہشات اور قومی رسم و رواج کا میدان نہیں ہے اس
کے اسے سوائے طریقہ نہیں کہ اس دنیا کو پیدا کرے والا خود اس کی خبر دے اور وہ اس کی
خبر پیغمبروں کے ذریعہ ہی دیتا ہے اس لئے کہ اس علم و ہدایت کا ذریعہ صرف انبیاء علیہم السلام ہی
ہیں، قیامت تک کے انسانوں کی ہدایت بطریقہ زندگی کے صحت انمال کی قبولیت

اور کامیاب انفرادی اجتماعی زندگی گزارنے کی صلاحیت اسی گروہ انبیاء علیہم السلام کی

تعلیمات کے ساتھ وابستہ کر دی گئی ہے انہیں کی تعلیم کئے ہوئے عقائد انہیں کے دیئے ہوئے حقائق، انہیں کا طرہ بقہ زندگی انہیں کی تعلیم کی ہوئی معاشرت اور اخلاق و اصول افران کی نجات و مقبولیت اور معاشرہ (SOGIFTIES) اور ملکوں و معاشرہ میں ملائقی اور اتنی و امان کی ضمانتیں۔

اس زمانہ کا پیشینہ یہ ہے کہ اسلام و اس کی جداگانہ تہذیب اس کی مخصوص معاشرت، اس کے عائلی قانون، اس کے وسائل معرفت اس ملک اس کے عائنے والوں کی نسلی زبان و ادب رسم الخط اور اس کے پرے دینی و تہذیبی ورثہ سے الگ کر دیا جائے اور اسلام چند عبادات اور چند رسوم و آئینہات (جو بعض مذاہب کا کل سرمایہ اور بعض قوموں کا واحد مذہبی نشان ہے) اسلام انہیں مذہبی و معاشقی رسوم کا مجموعہ بن کر رہ جائے۔ مسلمانوں سے کہیں اشارہ نہ کیا جائے اور کبھی صاف صاف کہا جاتا ہے کہ مسلمان اپنے رشتہ و فریت سے اپنی جداگانہ تہذیب اور رسم اس چیز سے بے تعلقی اختیار کریں جو ان میں الگ مدت اور ایک مستقل تہذیب کا ورثہ ہونے کا احساس پیدا کرتی ہے۔ وہ خود ہی اعلان کر دیں کہ ہم کسی جداگانہ تہذیب کے حامل نہیں۔ وہ خود اپنے عائلی قانون (Personallaw) میں اصلاح و ترمیم کا مطالبہ کریں یا پیش کیا جائے تو اس کو قبول کریں وہ اپنے تمام تعلیمی مرزوں کو انہوں نے اپنی پسند اور ضرورت کے مطابق قائم کئے تھے حکومت کی تحویل و انتظام میں دے دیں اور ان کے نظم و نسق سے خود دست بردار ہو جائیں تاکہ ان سے ایک نئی طرح کے نمونے (MODELS) تیار سے باہمیں اصل خطہ و نسل کشی کا نہیں معنوی ارتداد اور پستی و تہذیبی سطح کشی کا ہے اس خطرہ کو دیکھتے اور اس کو محسوس کرنے کیلئے کسی بڑی فرائض اور مہربانی کی ضرورت نہیں یہ تو دیوار کا نوشتہ ہے جس کو ہر ایک پرھ سکتا ہے اور اب تو بعض برسر اقتدار پارٹیوں اور علاقائی حکومتوں نے نصاب تعلیم کی تبدیلی ہندی زبان کو لازمی قرار دینے اور اس کی جو یہ تعلیم اور ایک نئی تاریخ ترتیب دینے کے اعلان کے ذریعے اس کا فیصلہ اور پالیسی کے طور پر اعلان بھی کر دیا ہے۔

”یہ سلطانی جمہور“ کا زمانہ ہے جو کہ اوپر پارلیمنٹ اور ریاستوں میں اسمبلیوں کی حکومت ہے اور ان کو آئین سازی کا پورا اختیار ہے پھر حکومت کا دائرہ چبے کی طرح دفاع امن قائم کرنے اور ٹیکس وصول کرنے کی حد تک محدود نہیں وہ زندگی کے تمام شعبوں اور تعلیم و

تربیت کے تمام ذرائع پر حاوی ہے آپ کو معلوم ہے کہ پرانی حکومتیں پرائیویٹ معاملات میں دخل نہیں دیتی تھیں ذاتی ملکیتوں سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا آزاد اور گاہوں سے ان کو کوئی سروکار نہیں تھا پرنسپل اے سے ان کا کوئی ملاقات نہیں تھا تعلیم میں کسی خاص عقیدہ، کسی خاص فکر و مقصد و پران و اسے ارنہ تھا لیکن اب یہ صورتحال نہیں۔

ایک ایسے ملک کی جمہوری حکومت جیسے باشندے اور اس کی آبادی کے مختلف عناصر نسلوں اور صدیوں سے مختلف مذاہب کے ماننے والے اور مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں (Cultures) اور طرز معاشرت کے نہ صرف عادی بلکہ ان پر عقیدہ رکھتے ہوں اور وہ ان کو جان و مال سے عزیز رکھتے ہوں نیز وہ حکومت و اشرمندانہ اور تجربہ کارانہ نقطہ نظر سے نانڈہیت (Sehularism) اور عدم تشدد (Non Violence) کے اصول کو تسلیم کر چکی ہو اور اسی ملک کے اتحاد و یگانہ پن کا اعتماد امن سکون اور ترقی و خوشحالی کے امکانات کے لئے ضرورت سمجھی ہو اور انہیں تینوں اصولوں (جمہوریت نانڈہیت اور عدم تشدد) کو ملک کی آزادی کیلئے جدوجہد کرنے والوں اور اسکیمیں کامیاب ہونے والے دانشمندانہ بنیادوں نے اپنی وسیع مطالعاتی فکر و نظر اور حقیقت پسندی اور حب الوطنی کی بنیاد پر اس ملک کے لئے ضروری سمجھا ہو اور اس کی بنیادی اصول کا درجہ دیا ہو جس کی صداقت اقوام متحدہ اور مل کی وسیع تاریخ اور عملی تجربہ سے حاصل ہو چکی ہو اور اس کا کوئی متبادل طریقہ کار نہ ہو یہ ضروری ہے کہ ملک کے آئین عدالتوں کے فیصلے اور نظم و نسق (Administration) کی مساوات اور فیہ جانبدانہ طرز عمل کے ساتھ اس ملک کی تعلیم گاہوں پرائمری اور سیکنڈری (Primary and Secondary) ایجوکیشن سے لے کر کالجوں اور یونیورسٹیوں تک مہیا نصاب تعلیم کسی ایک فرقہ کے (خواہ وہ کھلی اکثریت میں ہوں) عقائد، روایات تہذیب و تمدن اور رسم و رواج کا ترجمان وکیل اور انہیں کا آئینہ دار نہ ہو اور نہ وہ ملک کی تاریخ کو اس طرح پیش کرے کہ کسی فرقہ اور مذہب کے ماننے والوں سے پڑھنے والوں میں نفرت اور کم سے کم ان کی حقارت دل و دماغ میں پیوست ہو کر اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اکثریت کے مابعد الطبیعیاتی (Metaphysical) خیالات و روایات بلکہ عقائد دیومالا (Mythology) کی تلقین ہوتی ہو اس طرز عمل سے ملک کی آبادی مختلف عناصر میں جن کو اپنا مذہب عزیز ہے یا تو شدید منافرت پیدا ہوگی یا بعض فرقوں میں احساس کمتری

(Inferiority Complex) پیدا ہوا۔ جو ملک کی ترقی و خوشحالی اور جوش و خروش سے کام لے کرے اور ایک دوسرے سے ساتھ تعاون کر کے تیس مزاحم ہو جائیں اور اس کا بھی اندیشہ (اور اندیشہ ہی نہیں اس کا تجربہ بھی ہو چکا) ہے کہ اقلیتی فرقہ اور ملک کے ایک بڑے باصلاحیت اور مفید طبقہ میں اس کا شدید رد عمل (Reaction) پیدا ہو، اور وہ ملک کی ترقی اور اس کی شہریت اور ناموری میں مزاحم ہو، اور بات یہاں تک پہنچے کہ جن واپس ماند رہ گئے تہذیب بلکہ اپنی تاریخ بھی مزاحم ہے وہ اس نظام تعلیم اس کے مہذبوں سے متصادم ہے جو وہ اور اپنی نئی نسل کی تعلیم کا متبادل و تقاضا کریں اور اس میں ان کی توانیاں اور وسائل ہمیشہ اور اس سے بڑھ کر ان کی توجہ و وقت مل جائیں اور اس پر سرف ہو۔

اس سے ساتھ اس کا بھی خطرہ ہے کہ جمہوری ملک ہونے کی وجہ سے آبادی کا کوئی ایسا منہ اقتدار میں آجائے جس کے مذہبی عقائد اور تہذیب و معاشرت سے سابق صاحب اقتدار جماعت سے اختلاف رکھتے ہوں تو وہ اس پورے نصاب و تبدیل کرنے کا ارادہ کرے اور اس میں ملک قوم کی توجہ اور توانائی کا بڑا حصہ (جو دوسرے میدانوں میں صرف ہونا چاہئے تھا) اس پر صرف ہو اور اس طرح ملک کا نصاب تعلیم مہذبہ و عہد تہذیبوں اور تجربوں کا نشانہ اور اختلاف کا بڑا میدان بن جائے بلکہ اس کا اندیشہ ہے کہ وہ "بچے اطفال" اور تنگ آئیں اور جارجاؤ و ہزیت کا آلہ کار نہ ہو جائے۔

افسوس ہے کہ ملک کے آزاد ہونے کے بعد ہی اس ملک کے اقلیتی فرقوں، بالخصوص مسلمانوں کو (جو اس ملک میں ہی نہیں بلکہ دنیا کے مذہبی، ثقافتی تہذیبی تاریخی اور سیاسی نقشہ میں کم سے کم دوسری سب سے بڑی حیثیت کے مالک ہیں) اس افسوسناک صورتحال کا 47ء کے بعد ہی تجربہ ہوا اس وقت خطے سے بچنے کیلئے ایک ممتاز دانشمند و دردمند قائد و مفکر قاضی محمد عدیل عباسی صاحب مرحوم کی دعوت و تحریک پر 1959ء میں دینی تعلیمی کونسل کا قیام مل میں آیا، اور اس کی پہلی صوبائی دینی کانفرنس 30/31 دسمبر 1959ء یکم جنوری 1960ء میں بستی میں منعقد ہوئی کچھ عرصہ کے بعد اس تنظیم کے ایک بڑے مخلص اور اہل کار کن ظفر احمد صاحب صدیقی وکیل مرحوم نے اس وقت کے مربیہ انصاف کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیا اور اس کے ان حصوں کو پیش کیا جو مسلمان عائد و مسلمات اور ان کے دین و مذہب سے نہ صرف کھلا تضاد

رکتے تھے اور جن کو قبول کر لینے کے بعد (ایسی حالت میں کہ کتاب ایک بڑی سند کا درجہ رکھتی ہے۔ اور جب کسی چیز کو حق بجانب ثابت کرنا ہوتا ہے تو اتنا اہم دینا کافی ہوتا ہے کہ یہ کتاب میں لکھا ہوا ہے) طالب علم مسلمان نہیں رو سکتا تھا، یا تم سے کم و نہنت چینی شمش اور اپنے وقت اور خاندان سے کٹ جانے پر مجبور ہوتا تھا، یہ وہ اہم مقامات تھے جن کو پڑھ کر انصاف پسند آدمی یہی فیصلہ کرے گا اور جو ریاضی کے نتائج کی طرح ظن و قیاس اور اختلاف رائے سے دور اور بے گانہ ہے اور جس کو سن کر اس بارہ میں دورائیں نہیں ہو سکتیں کہ ان چیزوں کے مان لینے کے بعد طالب علم کا مسلمان رہنا بھی مشکوک ہو جاتا ہے اور اگر وہ نہیں مانتا اور اختلاف کرتا ہے تو اس نصاب تعلیم پر سے اعتماد اٹھ جاتا ہے اور وہ اپنے مقاصد میں ناکام ثابت ہوتا ہے جو کسی تعلیمی نصاب اور منصوبہ کے لئے کوئی خوش آئند اور قابل مبارکباد نہیں بلکہ اس کی ناکامی دلیل ہے۔

پورے نصاب تعلیم کی تبدیلی ایک نئی تاریخ کی وضع و تدوین تو بڑے وسیع اور انقلاب انگیز منصوبے ہیں۔ رسم الخط (SCRIPT) کی تبدیلی ہی قدیم تہذیبی، علمی اور مذہبی سرمایہ سے رشتہ ختم کر دینے اور ان سے بیگانہ بنا دینے کے لئے کافی ہے، آرنلڈ ٹو آئن بی (ARNOLD TOYIN BEE) جو اس زمانہ کا فلسفی مورخ ہے، نے لکھا ہے، (PHILOSOPHER HISTORIAN) کہ اب کسی کتب خانہ کو آگ لگانے کی ضرورت نہیں رسم الخط (SCRIPT) بدل دینا کافی ہے، اس سے اس قوم کا رشتہ اپنے ماضی سے بالکل ٹوٹ جائے گا اور اس کی پوری تہذیب اس کے لئے بے معنی ہو کر رہ جائے گی، پھر جس طرح چاہو اس کو لے جاؤ، جو چیز کسی ملت کو اس کے ماضی سے اس کے مذہب سے، اس کی تہذیب سے، اس کے کلچر سے ملاتی ہے، وہ رسم الخط ہے، رسم الخط بدلائل بدل گئی، آج ہندوستان میں یہی ہو رہا ہے، فرقہ وارانہ فسادات محض ملک کو بدنام کرتے ہیں، فائدہ ان کا کچھ نہیں ہے، تعلیم کا نظام کافی ہے، آج سے ۶۰، ۷۰ بس پہلے اکبر مرحوم نے کہا تھا۔

شیخ مرحوم کا قول اب مجھے یاد آتا ہے

دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

۳۔ سے زیادہ لطیف انداز میں انھوں نے اس حقیقت کو اپنے مشہور شعر میں بیان کیا

ہے۔

یوں قتل سے بچوں سے وہ ہدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

ان کے ذہن میں کالج کا وہ تصور رہا ہوگا، جس میں صرف قبطی زبان پڑھائی جاتی ہو اور ایسی تاریخ جس میں فرعون کی الوہیت ان کے غیہ محدود و غیر مشروط اختیارات کا اور مصری دوسری نسلوں اور قوموں (بنی اسرائیل اور یہودن مصر سے آئی ہوئی قوموں) کی تحقیر آمیز تصویر اور نفرت انگیز تاریخ پیش کی گئی ہو۔

حضرات: آج ہندوستان کے مسلمانوں کے مستقبل کا اہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی آئندہ نسل ویسے چلایا جائے، کیسے مسلمان رہے؟ اس ملک کے باشندے کی حیثیت سے انہیں یہاں آزادی و عزت سے ساتھ ملنے کا پورا حق حاصل ہے، یہ اس ملک کی جمہوریت و دستور آئین کا بھی فیصلہ ہے، لیکن یہ مطلب اس کا یہ نہیں ہے کہ اپنی خصوصیات، اپنے عقائد و شعائر، اپنی زبان، تہذیب، اور اپنی ان چیزوں کو چھوڑ کر جو ہم کو جان سے زیادہ عزیز ہیں اس ملک میں رہیں کہ اس طرح رہنے سے وطن و وطن نہیں رہ جاتا بلکہ ایک جیل خانہ اور قفس بن جاتا ہے، جس میں گویا پوری قوم کو زندگی کی محنتوں اور لذتوں سے محروم رکھ کر سزا دی جاتی ہے، ہمارا تہذیب و اس ملک کی خاک سے تیار ہونا ہے اور یہ خاک ہم کو بہت عزیز ہے لیکن ہمارا تہذیب، اسلامی تعلیمات، اسوۂ رسول، کتاب و سنت اور اسلام کی اس معیاری، قابل فخر اور بینظیر تاریخ کا سائنس پر داختہ ہے، جو پوری انسانیت کا قابل فخر سرمایہ اور لائق تقلید نمونہ ہے، ہماری تہذیب ابراہیمی متمدنی ہے، جس کی بنیاد تو حید خالص، خوف و خدا، بنقیدۂ آخرت انسانیت کے احترام اور خاندان و نام و نسب، نسل و وطن کے اختلاف سے آزاد ہو کر نسل انسانی کی مساوات پر ہے، مسلمان جس ملک میں بھی رہے گا، اس کی وطنیت خواہ کچھ ہو، اس کی تہذیب ابراہیمی متمدنی ہو گی، ہم یہاں زندہ اور باعزت انسانوں کی طرح رہنا چاہتے ہیں، ہم اس ملک میں آزاد ہیں، اس کی تعمیر و ترقی میں شریک اور اس کی دستور سازی میں ذخیل ہیں اس لئے اس کا کوئی سوال نہیں کہ ہم دوسرے درجہ کے شہریوں کی طرح زندگی بسر کریں، اپنے ملک میں آزادی کے ساتھ زندگی گزارنا ہر شخص کا فطری، انسانی، اخلاقی اور قانونی حق ہے، اور اس حق کو جب بھی

پہننے کی کوشش کی گئی اس سے ہمیشہ سنگین نتائج نکلتے۔

جہاں تک مسلمان کا تعلق ہے، اس کے لئے دینی تعلیم اور دین کی واقفیت کی وہی حیثیت ہے جو ایک انسان کیلئے ہوا، پانی کی ہے، ایک مسلمان کو مسلمان کی حیثیت سے زندہ رہنے کیلئے، مسلمان بنانے کے لئے اور پھر آخرت میں خدا اور اس کے رسول کو منہ دکھانے اور نجات حاصل کرنے کیلئے بنیادی دینی عقائد کے جاننے کی ایسی ہی ضرورت ہے جیسے ایک انسان کو زندہ رہنے کیلئے ہوا پانی کی، اس میں قطعاً کوئی مبالغہ نہیں، یہی وہ نسبت ہے، جس کا منتہی یعقوب علیہ السلام دنیا سے کوچ کرتے وقت (حالت استحضار میں) اطمینان حاصل کرنا چاہتے تھے، انھوں نے اپنے سب فرزندوں، پوتوں، نواسوں کو جمع کر کے (اور وہ مائتہ اللہ شیر اولاد تھے) دریافت فرمایا کہ ”ما تعبدون من بعدی“ (میرے بعد تم کس کی عبادت کرو گے؟) یہ بات انھوں نے کس سے کہی تھی؟ ان سے کہی تھی جو نبی زادے تھے، نبی کے پوتے تھے، نبی کے پڑپوتے تھے، گویا انھوں نے زبان حال سے کہا کہ میری پیٹھ قبر کی زمین سے نہ لگائی جب تک دنیا سے یہ اطمینان لے کر نہ جاؤں کہ تم خدائے واحد کی پرستش کرتے رہو گے۔

آج اہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ اس نسل کو کیسے بچایا جائے، سرکاری تعلیم کی اصلاح کی کوشش کے ساتھ دینی تعلیم کا کوئی متوازی نظام بھی چلانا چاہیے، اسی بنیاد پر دینی تعلیمی کونسل قائم ہوئی اور اس کی دعوت جدوجہد سے ہزاروں مکاتب و مدارس قائم ہوئے ملک کی موجودہ سیاسی تبدیلیوں، اور انتخابی نتائج اور مذہبی عصبيت پیدا کرنے کی بعض مواقع کے بہم ہو جانے یا پیدا کر لینے کی وجہ سے اس دینی، ذہنی اور تہذیبی نسل کشی کا خطرہ کئی گنا بڑھ گیا ہے، اس وقت کا اہم ترین کام نظام تعلیم کی اصلاح کا مطالبہ اور اس کے لئے جدوجہد کے ساتھ آزاد دینی مکاتب و مدارس کے قیام اور مساجد اور گھروں میں ضروری دینی تعلیم اور مبادی دین کی تلقین، اردو پڑھنے لکھنے کی صلاحیت پیدا کرنے کے مراکز اور مواقع پیدا کرنے کی جدوجہد ہے اور اس کو مقبول ترین عبادت، رضائے الہی کا ذریعہ اور اس ملک میں حفاظت دین کا واحد طریقہ سمجھنے کی ضرورت ہے۔

آزاد مکاتب و مدارس، صباچی و شبیہ حلقہائے تعلیم اور گھر کی دینی تعلیمی تربیت، اسلامی

اسواں اور اخلاق کی پابندی، راست کوئی و راست روی اور یہ ت و اقیما ت نبوی سے واقفیت کے نمونی و مؤثر انتظامات سے سہ ف م ت ہن و فائدہ میں پہونچے گا، بلکہ یہ پورے ملک اور جمہور یہ پبند کے مفاد میں بھی ہے، ہوتی تہی سے اخلاقی و دواں، خود پرستی، دولت پرستی اور نمونی بد نظمی اور سرپرشن کی طرف جارہا ہے، اس اسلامی تعلیم و تربیت کے اثر سے خاصی تعداد میں وہ طبقہ پیدا ہوگا جو اس حد تک دولت کا پیجاری نہیں ہوگا جو اس حد تک یہ و با ملک میں پھیل گئی ہے، اس کو کسی نہ کسی درجہ میں خدا کا خوف اور خدا کے سامنے جوابدہ ہونے کا عقیدہ اس انتہا تک پہنچنے سے باز رکھے گا، جس انتہا تک خالص مادی تعلیم نے پہنچا دیا ہے، نبی رحمت کی امت کو اپنے ملک، ماحول اور مان کے لئے امت رحمت اور اس کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو بچانے کے لئے ایک فرض شناس، رحم دل اور مایہ ملاح (کشتی بان) کا کردار (PART) ادا کرنا ہے، جس کی موجودگی میں اس ملک کو تباہ ہونا اور اس کی کشتی کو ڈوبنا نہیں چاہیے، اس لئے یہ کام تنہا مسلم فرقہ کے مفاد میں نہیں، ملک کے مفاد میں ہے اور اس کو انجام پانا چاہیے۔

حضرات: آپ اس تعلیمی مسئلہ کو اپنے ایمان و یقین، اپنے عزم و فیصلہ، جوش و ولولہ کار سے حل کرنے کی کوشش کریں، اگر آپ نے یہ شرطیں پوری کر دیں تو یہ مشکل آسان اور یہ عقدہ حل شدہ ہے، اقبال نے سچ کہا ہے۔

نشان یہی ہے زمانہ میں زندہ قوموں کا
کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں
کمال صدق و مروت ہے زندگی ان کی
معاف کرتی ہے فطرت بھی ان کی تفصیریں
خودی سے مرد خود آگاہ کا جمال و جلال
کہ یہ کتاب ہے باقی تمام تفسیریں
حکیم میری نواؤں کا راز کیا جائے
درائے عشق ہیں اہل جنوں کی تدبیریں

چراغ زندگی اور دستور العمل

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمہ اللہ نے مدرسہ ضیاء العلوم تکیہ کلاں
رائے بریلی میں مدرسہ کے طلباء و اساتذہ کرام کی موجودگی میں پراثر تقریر فرمائی جو مدارس
اسلامیہ کے طلباء کے لئے مشعل راہ اور دستور العمل ہے۔

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان
الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم وان لیس للانسان الا ما سعی وان
سعیہ سوف یری ثم یجزاہ الجزاء الاوفی۔“

میرے عزیزو! میں سوچتا رہا ہوں کہ آپ سے خطاب کرنا ہے اور بہت عرصہ کے بعد آپ
سے بات کرنی ہے حق ادا کرنے کی کوشش کرنی ہے جو حق ہم پر عائد ہوتا ہے وطنیت کا بھی جو ار
کا بھی اور علمی اشتراک کا بھی اور مقصد کے اتحاد کا بھی اور دعوت کے تقاضوں کا بھی کیا کہا جائے
کہنے والی باتیں تو بہت ہیں وقت تھوڑا ہے اللہ تعالیٰ نے یہ آیت دل میں ڈالی جس میں پورا
پیغام ہے آپ کی زندگی کا پورا نظام اس کے اندر ہے زندگی کس طرح گزارنی چاہیے زندگی کے
لئے کیا سامان پیدا کرنا چاہیے زندگی دینی زندگی ہو علمی زندگی ہو دعوتی زندگی ہو اصلاحی زندگی ہو
و سب کے لئے کس طرح تیاری کرنی چاہیے اور اس تیاری کا کیا نتیجہ نکلے گا؟ اس لئے کہ
انسان کی اقلیت میں ہے کہ اس کو فائدہ بھی معلوم ہوتا چاہیے کوئی کوشش کا کیا فائدہ ہے؟ فلاں
وہاں کا کیا خاصہ ہے؟ فلاں بیج کا کیا مادہ ہے؟ اور فلاں میدان کا کیا تقاضا ہے؟ یہ انسان کی
فصرت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت ذہن میں القاء فرمائی اور دل میں ڈالی جس میں پوری زندگی
کا نظام آگیا ہے اور پورا قانون آگیا ہے اور آپ اس آیت کو سمجھیں اس کو اپنا دستور العمل بنیں
اپنا رہنما بنالیں اور اس آیت کی صداقت پر آپ ایمان لے آئیں اور یقین کر لیں اور دل میں
اس کو اتار لیں اس لئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اللہ تعالیٰ کا فرمایا ہوا ہے دنیا کے تمام حکماء اور

بڑے بڑے ذہین لوگ بھی کوئی بات کہتے ہیں کہ یہ ہوگا اور ایسا ہوگا اس کا یہ نتیجہ نکلے گا تو اس کا پورا سو فیصدی اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ زندگی کا تجربہ ہے اور تاریخ کا مطالعہ ہے کہ کتنے آدمیوں کی پیشین گوئی غلط نکلی اور کیسے کیسے فائدے فلاں فلاں چیزوں کے بتائے گئے تھے ان میں سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوا۔ پوری تاریخ اس سے بھری ہوئی ہے لیکن جب اللہ تعالیٰ فرمادے کہ اس کا یہ خاصا ہے یہ کرو گے تو اس کا یہ نتیجہ نکلے گا۔ تو پھر اس کے خلاف ہو ہی نہیں سکتا پھر ایسی کیا بات ہے کہ کہی جائے کہ اس کو آپ اپنے دستور العمل بنالیں اس کو اپنا چراغ زندگی بنالیں اور اس کی روشنی میں آپ چلیں۔

کوشش کا نتیجہ ضرور نکلے گا

یہ آیت جو ہم نے پڑھی ہے یہ خاص طور پر ہماری تعلیم گاہوں کے لئے اور اصلاحی مراکز کے لئے اور خاص کر ان مرکزوں کے لئے جہاں پر نوجوان ہوں امت کے اور ملت کے بچے و فرزند ہوں جن کی اٹھتی ہوئی عمر ہے اور چلتی ہوئی کشتی ہے تو ان کے لئے اس آیت میں پورا دستور العمل ہے۔ اور ایک چراغ راہ ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وان لیس للانسان الا ما سعی انسان کو وہی ملے گا جس کی اس نے کوشش کی ہے یہ اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں وہ جب کہہ رہا ہے کہ کوشش شرط ہے اور انسان کی کوشش ہی کا نتیجہ نکلے گا تو پھر دوسرا انسان کیا کہہ سکتا ہے۔ نہیں ہے انسان کے لئے مگر جس چیز کی اس نے کوشش کی ہے۔ ”وان سعیہ سوف یری“ اور اس کی کوشش کا نتیجہ ظاہر ہوگا اس کی کوشش کا نتیجہ دکھائی دے گا آنکھوں کو دکھائی دے گا کہ جو کوشش کی تھی اس کا نتیجہ یہ نکلا پھر اس کے بعد بڑی بشارت سناتا ہے۔

”ثم یجزاہ الجزاء الاولی“ ”الاولی“

اسم تفصیل کا صیغہ ہے اتنا آپ جانتے ہوں گے؟ پھر اس کو بدلہ دیا جائے گا بھر پور بدلہ زیادہ سے زیادہ بدلہ ایک تو انسان کی کوشش کا نتیجہ اس کی توقع ہے اس کے استحقاق سے اس کی محنت کی مقدار سے بھی بڑھ کر نکل سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ بشارت سناتا ہے کہ ہوگا ایسا! اور ساری تاریخ بتاتی ہے علم کی تاریخ بتاتی ہے دعوت و اصلاح کی تاریخ بتاتی ہے کاموں سے اشتراک کی تاریخ بتاتی ہے۔ تحقیقات و تصنیفات کی تاریخ بتاتی ہے اصلاحی کاموں کی تاریخ بتاتی ہے کہ کوشش کا نتیجہ نکلا بعض اوقات ہی نہیں بلکہ اکثر اوقات کوشش سے زیادہ نکلا کوشش کا جو پیمانہ تھا

اس کا جو سائز تھا اس سائز سے بہت بڑھ کر نتیجہ نکلا وہ نتیجہ کوشش کے سائز سے بہت بڑھا ہوا تھا اس سے بڑھ کر بشارت کیا ہو سکتی ہے؟ آپ اگر پکڑ لیں اس بات کو اور دل پر لکھ لیں کہ ہم کوشش کریں گے تو کوشش کا نتیجہ ضرور نکلے گا امید ہے کہ کوشش کی حیثیت سے بڑھ کر نکلے گا توقع سے بڑھ کر قیاس سے بڑھ کر نکلے گا اور اس کے لئے نہ کسی بہت بڑی جگہ کی ضرورت ہے نہ کسی بڑی دانش گاہ کی ضرورت ہے نہ کسی بڑے اونچے خاندان کی ضرورت ہے نہ بہت اعلیٰ درجہ کے اساتذہ خاندان کی ضرورت ہے۔ نہ بہت وسیع کتب خانہ کی ضرورت ہے اس کے لئے کوشش کی ضرورت ہے نیت کی ضرورت ہے سنجیدگی اور دیانت داری کی ضرورت ہے۔

درس نظامی اور ملا نظام الدین سہالوی

تاریخ اسلام تو بہت بڑی ہے اس کی مثالیں دینے پر آئیں تو دن بھی کافی نہ ہوگا، ہندوستان ہی کو لیجئے کہ جن لوگوں کا آج دنیا میں نام ہے جن لوگوں کا اس وقت دنیا میں کارنامہ سمجھا جاتا ہے وہ ایک پورے کے پورے دور کے بانی ہیں اور ساری دنیا نے ان کے علم کے آگے سر جھکا دیا ہے وہ کہاں کے رہنے والے تھے؟ کہاں پڑھا؟ آج ان بستیوں کا شاید بہت کم لوگ نام جانتے ہوں یہ درس نظامی جو ہندوستان میں کئی صدیوں تک چلا ہے اور یہی شرط اور معیار تھا قابلیت کا علمیت کا یہ ملا نظام الدین کا بنایا ہوا اور ترتیب دیا ہوا ہے اس کی پوری تاریخ ہے کبھی آپ پڑھئے گا ہمارے والد صاحب کی کتاب ”درس نظامی کی تاریخ“، لیکن جس کی طرف اس کی نسبت ہے وہ ملا نظام الدین ہیں، کہاں کے رہنے والے ہیں؟ سہالی کے رہنے والے تھے۔ سہالی کہاں ہے؟ شاید اس مجمع میں کوئی بھی نہ جانتا ہو یہ بارہ بنکی میں ایک چھوٹا سا قصبہ ہے وہاں کے رہنے والے ہیں پھر بعض بعض کتابیں درس نظامی کی ایسی ہیں کہ جن کی بلندی کو اور جن کے مضامین کی نزاکت کو مضامین کی سنجیدگی کو مضامین کی وقعت کو ساری دنیا نے مان لیا ہے وہ ایسے قصبات کے رہنے والوں نے لکھی ہیں کہ خیال بھی نہیں ہو سکتا۔ مثلاً درس نظامی میں سب سے اونچی کتاب جو سب سے زیادہ دقیق سمجھی جاتی ہے وہ ہے شمس بازغہ شمس بازغہ گوپا منو کے ایک عالم کی لکھی ہوئی ہے لیکن بڑے بڑے استادوں نے سر جھکا دیا اس کو پڑھنا اس کو سمجھنا ایک معیار سمجھا جاتا تھا درس نظامی آپ نے پڑھا ہے؟ درس نظامی میں شمس بازغہ آپ نے پڑھ لی ہے؟ سمجھ گئے؟ اسی طرح سے ملا حسن کی کتابیں درس نظامی میں بڑی

اہمیت کی حامل ہیں یہ سندیلہ کے آدمیوں اور فرنگی محل کے چند لوگوں کی لکھی ہوئی ہیں بات تو یہ ہے کہ محنت اور حسن نیت و اخلاق یہ دو چیزیں جمع ہو جائیں تو پھر وہ ضائع نہیں ہوگا اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے جو کہ عالم الغیب اور قادر مطلق ہے دیکھئے ایک تو عالم الغیب ہونا یہی ایک بڑی بات ہے لیکن وہ قادر مطلق بھی ہے عالم الغیب بھی ہے مخبر صادق بھی ہے اور رب العالمین بھی ہے وہ جب فرماتا ہے اعلان کرتا ہے اور اس کی ذمہ داری لیتا ہے ”وان سعيہ سوف یری“ اور اس کی کوشش کا نتیجہ ظاہر ہو کر رہے گا تو پھر دنیا میں اس کے بعد کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں رہی کچھ اس میں اضافہ ہو ہی نہیں سکتا۔

علم اور کمال

رب العالمین ارحم الراحمین اقدر القادرین عالم الغیب والشہادہ رب الاولین والآخرین وہ جب کہتا ہے کہ انسان کی کوشش کا نتیجہ ظاہر ہو کر رہے گا بس آپ اس چیز کو پکڑ لیجئے پلو میں باندھ لیجئے دل پر لکھ لیجئے کہ آپ کو محنت کرنی ہے پھر ہم خانہ خدا میں بیٹھ کر کہہ رہے ہیں کہ اس کوشش کا نتیجہ ظاہر ہو کر رہے گا اور بڑے بڑے اہل کمال اس کو مانیں گے مثلاً صحیح عبارت پڑھنا کہ صرف دشمنی کے قواعد آپ جانتے ہوں اور ان کی آپ کو مشق ہو اُمر فروع کو مرفوع پڑھنا منصوب کو منصوب پڑھیں اور مجرد کو مجرد پڑھیں اور جائیں کہ کہاں (الف لام) پڑھیں کہاں نہیں آنا چاہیے اگر آپ عبارت صحیح پڑھیں تو یہ بہت بڑا کمال ہے ہمارے ہمسایہ ملکوں میں خاص طور پر یہ بڑی بات چیز ہے سب کچھ آپ جانتے ہیں بڑا علم بہت فہم ہے کہ آپ نے کہا ہے مجھ سیکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں لیکن اگر عبارت پڑھنے لگے کسی اور زبان کے سامنے کسی اہل علم کے مجمع میں تو بعض مروجہ علمی و باطنی ہے کہ سب پر پانی پھیر جاتا ہے سب کچھ بالکل ختم ہو جاتا ہے جو آدمی جانتا ہے اب بات آگئی تو ہم آپ سے کہیں گے ہم 51 میں دمشق کے شریعہ عالم ابن سبیر پاکستان کی تشریح لے گئے تھے اس نے کہا کہ آپ کی تقریر یونیورسٹی میں ہونا چاہیے یونیورسٹی سب سے بڑی داس گاہ ہوتی ہے سب سے بڑا مرکز ہوتا ہے ہم انجمن ہندی یہاں رائے بریلی کے رہنے والے اور وہاں دمشق یونیورسٹی ہمارا تقریر ہوگی ہمیں معلوم ہوا کہ اس میں پارلیمنٹ کے ممبران بھی شامل ہوں گے اور یونیورسٹی کے پروفیسر صاحبان اور بڑے بڑے چوٹی کے علماء بھی شامل ہوں گے ہم چونکہ

عربوں کو دیکھے ہوئے تھے اور پڑھے ہوئے بھی تھے تو ہم نے یہ مناسب سمجھا کہ پہلے بہت بڑے عالم کو اپنا مضمون سنا دیں کہ خدا نہ خواستہ کہیں ہم نے فتح کی جگہ پر کسرہ پڑھ دیا یا کسرہ کی جگہ پر فتح پڑھ دیا تو سب پر پانی پھر جائے گا لوگوں کا بیٹھنا اور سننا مشکل ہو جائے گا یہ آپ کو بتاتے ہیں کہ غلطی کا مزاج اور ماحول پر اثر پڑتا ہے جیسے ہوا کا اثر ہوتا ہے ایک دم سے گرم جھونکا آگیا یا ایک دم سے ٹھنڈا جھونکا آگیا یا پانی برسنے لگا تو آدمی کا بیٹھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ویسے ہی ایک غلطی آپ نے کی نحوی غلطی یا صرفی غلطی یا منصوب کو آپ نے مرفوع پڑھ دیا یا جہاں الف لام نہیں داخل ہونا چاہیے وہاں الف لام داخل ہو گیا تو چاہے جتنی ہی آپ کی تحقیقات ہوں کتنا ہی آپ کے متعلق کہا گیا ہو کہ ایسے فاضل ہیں فلاں جامعہ کے ہیں اندوۃ العلماء کے فاضل ہیں یا دیوبند کے فاضل ہیں سب بے کار ہو جاتا ہے ہم نے مضمون لکھا وہاں کے حالات کے مطابق ”العوامل الاساسیۃ لکارتہ فلسطین“ جو وہاں کے حسب حال تھا کہ جو المیہ پیش آیا فلسطین میں مسجد اقصیٰ اور قدس شہر عربوں کے ہاتھ سے نکل گیا اور یہودیوں کے پاس پہنچ گیا اس کے حقیقی اسباب کیا تھے؟ اس کے بنیادی اسباب کیا تھے؟ لوگ تو ایسے ہی سطحی اسباب سوچ لیتے ہیں تجویز کر لیتے ہیں لیکن اس میں حقیقی اسباب کیا ہیں؟ کیا چیز اللہ کو ناپسند ہوئی کہ جس کی وجہ سے اس نے نقشہ ہی بدل دیا الٹ دیا بالکل اور وہ یہودی جو کئی ہزار برس سے حکومت کرنے سے محروم تھے ان کو حکومت مل گئی ہمیں اس پر غور کرنا چاہیے قرآن کی روشنی میں حدیث کی روشنی میں ہم نے مضمون لکھا العوامل الاساسیۃ لکارتہ فلسطین کتابیں پڑھ کر تیار کیا اس کو کہ مسلمان اور غیر مسلم عیسائی بھی اگر ہوں تو وہ بھی متاثر ہوں اور قائل ہوں پھر ہم نے کہا اتنے بڑے فاصلوں کے سامنے اور بڑے بڑے اساتذہ کے سامنے پروفیسر صاحبان کے سامنے پارلیمنٹ کے ممبران کے سامنے اور ادیبوں کے سامنے مضمون پڑھیں گے ہم ہندوستانی ملک کا اثر پڑتا ہی ہے خدا خواستہ اگر ذرا سی غلطی ہو گئی تو پھر لوگوں کا بیٹھنا مشکل ہو جائے گا سننا مشکل ہو جائے گا اور احترام اگر بیٹھے رہے تو پھر اثر کچھ نہیں لیں گے تو ہم علامہ نجمۃ البیطار کے پاس گئے جو اس عہد کے چوٹی کے عالموں میں سے تھے شاید سب سے بڑے عالم ہوں علامہ رشید رضا مصری صاحب مجلہ ”المنار“ کا جب انتقال ہوا ان کی تفسیر نامکمل رہ گئی تھی تو انہیں کا انتخاب ہوا تھا کہ یہ مکمل کریں البلاغ بھی ان کی ادارت میں دیا گیا ہم ان کے پاس گئے ہم نے کہا کہ شیخ ایک

مضمون پڑھنا ہے دمشق یونیورسٹی میں ہم چاہتے ہیں کہ پہلے کے آپ کو سنالیں آپ کا انتخاب اس لئے کرتے ہیں کہ آپ ہمارے استاد ہمارے مخدوم اور ہمارے سرپرست علامہ سید سلیمان ندوی کے دوستوں میں ہیں (یہ ہمیں معلوم تھا) تو آپ کو سنانے میں کوئی شرم ہمیں نہیں آتی چاہیے انہوں نے کہا نہیں! نہیں! آپ کو سنانے کی کیا ضرورت؟ آپ کی کتاب ”ماذا خسر العالم“ ہم نے پڑھی ہے آپ تو مصنف ہیں (جیسے شریف آدمیوں اور منتظم لوگوں کو کہنا چاہیے) ہم نے کہا نہیں آپ سن لیجئے انہوں نے سنا اول سے آخر تک الحمد للہ کوئی غلطی نہیں نکلی پھر وہ ایک لطیفہ سنانے لگے کہ آپ تو الف لام کے استعمال میں بڑے محتاط ہیں ورنہ بہت سے لوگ یہ نہیں جانتے کہ کس ملک پر الف لام آتا ہے کس پر نہیں آتا ہے یہ بالکل سماعی چیز ہے قیاسی نہیں عربوں نے جس پر الف لام داخل کر دیا تو اس پر قیامت تک الف لام رہے گا اور جس پر داخل نہیں کیا اس پر کوئی داخل نہیں کر سکتا۔ مصر پر الف لام داخل نہیں ہو سکتا مصر کو مصر کہیں گے مصر نہیں کہیں گے لیکن عراق پر داخل ہوتا ہے تو العراق کہیں گے عراق نہیں کہیں گے۔ فارس پر نہیں داخل ہوتا ہے عرب پر داخل ہوتا ہے اس لئے العرب کہیں گے سندھ پر الف لام آتا ہے اس لئے السندھ کہیں گے لیکن ملتان پر نہیں آتا اس لئے ملتان ہی کہیں گے الملتان نہیں کہیں گے تو اس کا کوئی قاعدہ نہیں ہے صرف دیکھیں گے کہ کس طرح عربوں نے استعمال کیا ہے اور کس طرح کتابوں میں ہے بس اتنا ہی کافی ہے تو ہم کو ایک لطیفہ سنایا کہ آپ کے ہندوستان کے ایک عالم مکہ مکرمہ کے ایک طالب علم کے پاس گئے اور انہوں نے عربی میں کہا انا زاہب یا انا ذہب من المکتۃ الی مدینۃ میں المکتۃ سے مدینہ جا رہا ہوں کوئی ضرورت ہے؟ مکہ پر الف لام نہیں آتا کیوں نہیں آتا یہ کوئی پوچھ نہیں سکتا یہ طے شدہ بات ہے اور مدینہ پر آتا ہے کہ ہر شہر کو مدین کہتے ہیں تو المدینہ معلوم ہونا چاہیے کہ کون سا مخصوص شہر ہے تو انہوں نے کہا بس ہمارا اتنا کام ہے کہ مکہ کے سر سے الف لام اٹھا کر مدینہ کے سر پر ڈال دیجئے انہوں نے اصل میں ان کی تنبیہ تہذیب کے ساتھ کی پھر جب آپ پوچھتے ہیں کیا کام ہے؟ تو اتنا کام ہے وہ سمجھ گئے کہ ہم سے غلطی ہو گئی۔

زبان کی حسیت اور خاصہ لسانی سے واقف ہونا ضروری ہے

زبان کا احساس زبان کی حسیت خاصہ لسانی یہ بڑا نازک مسئلہ ہوتا ہے زبان ایسی چیز

ہے کہ وہ معاف نہیں کرتی اور زبان کی غلطی معاف نہیں کی جاتی اگر کہیں کوئی نقل میں غلطی ہو گئی ہو تو کہا جائے گا کہ یاد سے لکھ دیا لیکن اگر ایک لفظ بھی غلط آپ بول گئے تو پانی پھر جاتا ہے تقریر پر ہم سے خود عربوں نے کہا جدہ کے لوگوں نے کہا کہ آپ کے یہاں کے بعض لوگ آتے ہیں عالم ہوتے ہیں مبلغ ہوتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ آج تقریر ہوگی سب لوگ بیٹھ جائیں سب بیٹھ جاتے ہیں لیکن چند جملے سن کر ہم نہیں بیٹھ سکتے اٹھ کر چلے جاتے ہیں تو آپ سے ایک بات یہ کہتے ہیں کہ یہاں عبارت صحیح پڑھنا سیکھیں اور کس پر الف لام داخل ہوتا ہے اور کس پر نہیں ہوتا کس کو منصوب پڑھنا چاہیے کس کو مرفوع یہ سیکھیں اور اس کے ساتھ یہ کہ ”ث“ ”کو“ ”ث“ کس طرح پڑھیں اگر ”ث“ ”کو“ ”س“ کہہ دیا ”ص“ ”ث“ ”یا“ ”س“ کہہ دیا تو سب پر پانی پھر گیا عربی زبان مختلف المخارج بھی ہے مختلف الاصوات بھی ہے ث ”س“ ”ص“ یہ ملتی جلتی آوازیں ہیں لیکن ث ”ث“ کس طرح ادا ہوگا س ”س“ کس طرح اور ص ”ص“ کس طرح ادا ہوگا مخارج عربی زبان کی خصوصیت ہے انگریزی یا کسی دوسری زبانوں میں یہ چیزیں نہیں ہیں تو اگر بڑی تحقیقات آپ نے کی ہیں بڑی نئی نئی باتیں آپ نے پیش کی ہیں لیکن آپ نے ث کو ص پڑھ دیا ص کو س پڑھ دیا تو عربوں کو سننا مشکل ہو جائے گا تو ایک تو یہ کہ آپ یہاں کوشش کریں کہ صحیح عبارت پڑھ سکیں صرف ونحو آپ کی مضبوط ہو آپ اعراب سے واقف ہوں اور آپ کا لہجہ درست ہو اور جو بھی حروف حلقی ہوں ان کو حروف حلقی کس طرح ادا کریں اور جو حروف حلقی نہیں ہیں ان کو اسی طرح ادا کریں یہ کام یہیں سے ہو سکتا ہے اس کی بنیاد یہیں پڑے گی اگر یہاں نہ پڑی تو پھر آپ دارالعلوم ندوۃ العلماء چلے جائیں دارالعلوم دیوبند جائیں کہیں جائیں پھر اس کا درست ہونا مشکل ہے یہیں کوشش کریں کہ آپ کو معلوم ہو کہ کس کو منصوب پڑھنا چاہیے کس کو مرفوع پڑھنا چاہیے اور کیوں پڑھنا چاہیے؟ سب عوامل اور ان کے جو اثرات ہیں ان سے واقف ہوں۔

مسائل کا استحضار

دوسری بات یہ کہ آپ دینیات میں فقہ میں جو ابتدائی مسائل ہیں جو کتابیں آپ کے یہاں پڑھائی جاتی ہیں مثلاً شرح وقابہ یا دوسری فقہ کی کتاب دوری وغیرہ ان کے مسائل آپ کو مستحضر ہوں نماز کے مسائل آپ کو معلوم ہوں زکوٰۃ کن پر فرض ہوتی ہے اس کا کیا نصاب ہے

سب معلوم ہوا اگر خداجج کو لے جائے تو اس کے ارکان اور مسائل بھی پہلے سے مستحضر ہوں زکوٰۃ کے مسائل آپ کو معلوم ہوں اور اگر کوئی موٹا مسئلہ آپ کے خاندان میں کوئی پوچھے گاؤں میں کوئی پوچھے تو آپ بتا سکیں اس کو معلوم ہو کہ ہمارے گاؤں کے ایک صاحبزادہ کے جانے کا فائدہ یہ ہوا کہ وہ مسئلہ بتاتا ہے یہ بات آپ کو یہیں سے آنی چاہیے اس کی مشق کریں اور پھر اس کے ساتھ ساتھ جو دینی رنگ ہونا چاہیے جو دینی سطح ہونا چاہیے ایک دینی عربی مدرسہ کے طالب علم کی یعنی نمازوں کی پابندی وقت سے آنا بلکہ وقت سے پہلے آنا اور خشوع و خضوع کے ساتھ اور احترام کے ساتھ بیٹھنا دنیا کی باتیں نہ کرنا قرآن مجید کی تلاوت کا جو معمول مقرر کیا ہے اس کو پورا کر لینا اذکار و تسبیحات جو آپ کو بتائی ہیں یا آپ کو معلوم ہیں اور آپ کا معمول ہے ان کو پورا کر لینا پھر استادوں کا ادب، تواضع، خاکساری، خدمت کا جذبہ یہ سب باتیں ہونی چاہئیں یہ چیزیں یہیں سے پیدا ہو سکتی ہیں اور یہاں نہ ہوئیں تو پھر آپ جامعہ ازہر چلے جائیے وہاں بھی یہ بات پیدا نہیں ہوں گی اور یہ تجربہ کی بات ہے کہ جب کسی طالب علم میں یہ بات شروع سے پیدا نہ ہوئی تو پھر بعد میں پیدا ہونی مشکل ہے ہم نے بڑی بڑی جامعات کو دیکھا ہے کئی جگہ تقریر کرنے کا موقع بھی ملا ہے وہاں کے بڑے طالب علموں سے اور اساتذہ سے بے تکلف باتیں ہوئیں، صحبتیں رہیں، دمشق میں، قاہرہ میں، بغداد میں اور مراکش و رباط میں سب جگہ علمی حلقہ سے الحمد للہ واسطہ پڑا ہے لیکن دیکھا ہے کہ جن لوگوں کی تربیت ہو گئی اور طالب علمی کے زمانے میں ان کا سانچہ بن گیا وہ بڑے باکمال نکلے اور انہوں نے بڑے دینی کام کئے لیکن جن کا سانچہ وڈھانچہ طالب علمی کے زمانے میں نہیں بنا وہ کسی کام کے نہیں رہے تو یاد رکھئے سانچہ وڈھانچہ ان مدرسوں میں بن سکتا ہے اس کو بنائیے اور پھر اساتذہ سے رابطہ آپ کا رہے ان سے پوچھیں کہ ہم خارج اوقات میں کیا پڑھیں؟ یہ بہت اہم بات ہے ہم دعوے سے نہیں کہہ سکتے مگر اللہ کا شکر ہے کہ اللہ نے آپ کو ایسے اساتذہ دیئے ہیں اور پھر جواز بھی عطا فرمایا ہے کہ آپ ان سے پوچھ سکتے ہیں کہ ہمیں سیرت پر کونسی کتابیں پڑھنی چاہئیں؟ صحابہ کرام کے فضائل و خصائص پر کون کون سی کتابیں پڑھنی چاہئیں؟ اپنی اصلاح کے لئے ہمیں کون کون سی کتاب پڑھنی چاہیے جو دستور العمل ہو اور پوری زندگی کے لئے اس میں رہنمائی ہو اور اسلاف کے حالات سے واقف ہونے کے لئے کون سی کتاب پڑھنی چاہیے۔

مادر علمی سے محبت

آپ سے یہ بات بھی کہنا چاہوں گا کہ آپ کو یہ بھی احساس ہونا چاہیے کہ آپ کہاں تعلیم پا رہے ہیں یہ کون سی جگہ ہے کیا جوار ہے؟ یہ ہر جگہ کے لئے ضروری ہے دیوبند میں اگر کوئی پڑھتا ہے تو اس کو معلوم ہونا چاہیے کہ دارالعلوم کس نے قائم کیا؟ حضرت مولانا قاسم نانوتوی جو کہ قاسم العلوم و الخیرات کہلاتے ہیں اور ایک دور کے بانی ہیں ان کے حالات سے واقف ہونا چاہیے اور پھر ان کے بعد ان کے جانشینوں میں ان میں سب سے بڑھ کر مشہور و مبارک شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندی ہیں جو انگریزوں کی نظر میں کانٹے کی طرح کھٹکتے تھے انگریزوں نے ان کو گرفتار کیا پھر ان کو مالٹا بھیجا گیا ان کے ساتھ مولانا حسین احمد مدنی بھی تھے مولانا عزیز گل اور کوڑا جہان آباد کے جہاں ہماری قرابت بھی ہے۔ مولانا حکیم سید نصرت حسین صاحب بھی تھے ان کا وہیں انتقال ہو گیا اور یہ حضرات جیل سے رہائی کے بعد واپس آئے اسی طرح مولانا انور شاہ صاحب جیسا محدث اس کو ملا اور مولانا اشرف علی تھانوی جیسا حکیم الامت اور شیخ طریقت پیدا کیا۔ مولانا حسین مدنی صاحب شیخ العرب والعجم جو بڑے عالم مجاہد غازی اور اہل اللہ میں سے تھے اور سہارنپور کے رہنے والوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ مدرسہ کس نے قائم کیا ہے یہاں کے سب سے بڑے رہنما اور سرپرست مولانا خلیل احمد صاحب ایٹھوی پھر ان کے بعد حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی اور دوسرے جو بڑے بڑے اہل اللہ پیدا ہوئے جیسے مولانا اسعد اللہ صاحب وغیرہ۔ اسی طرح جو ندوۃ العلماء میں پڑھے اس کو معلوم ہونا چاہیے کہ کس نے اس کی بنیاد ڈالی، مولانا محمد علی مونگیری، مولانا سید ظہور الاسلام فتح پوری پھر اسکے بعد علامہ شبلی نعمانی، مولانا عبدالحی صاحب جو ہمارے والد اور یہیں کے رہنے والے تھے پھر مولانا خلیل الرحمن صاحب سہارنپوری، مولانا مسیح الزماں صاحب، نواب صدربار جنگ صاحب، مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی صاحب اور اس کے مایہ ناز فرزند علامہ سید سلیمان ندوی جن کو فخر ندوہ کہا جاتا ہے۔ مولانا عبدالسلام صاحب ندوی، مولانا عبدالباری صاحب ندوی، اور اخیر میں مولانا محمد ادریس صاحب گرامی ندوی جیسا ماہر قرآن اور عالم ربانی ان سب کے بارے میں معلوم ہونا چاہیے اسی طرح آپ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ آپ کہاں ہیں؟ آپ کس بستی میں ہیں یہ دائرہ شاہ علم اللہ ہے یہ وہ جگہ ہے جہاں

چوٹی کے علماء اور بڑے بڑے مسائخ آنا اپنی سعادت سمجھتے تھے اور فخر سمجھتے ہیں مولانا حسین احمد مدنی تشریف لائے کسی نے کچھ کہا تو فرمایا کہ ہمارا تو یہاں چلہ گزارنے کا دل چاہتا ہے اور ایک رات تو ضرور یہاں گزارنے کو جی چاہتا ہے جیسا کہ میاں جینور جھنجھانوی کے حجرہ میں اور مولانا الیاس صاحب یہاں آئے تو اپنی حیرت کا اظہار کیا اور شیخ الحدیث مولانا محمد ذکریا صاحب کے سامنے کہا کہ شاہ علم اللہ صاحب تو بہت بڑے آدمی تھے پھر شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری جو ہمارے شیخ و مربی اور مرشد تھے تشریف لائے اور بڑے ادب و احترام سے رہے اور بہت ہی خوش ہوئے مولانا اشرف علی تھانوی صاحب یہاں سے گزرے تو رائے بریلی کے اسٹیشن پر بڑے بلند الفاظ کہے مولانا عبدالغنی صاحب پھولپوری نے ہمیں خود سنایا کہ مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کی گاڑی یہاں کھڑی تھی پتہ نہیں کیا بات ہو گئی تھی دیر تک ٹھہری تو اتر کر چلنے لگے میں ساتھ ہو گیا مجھ سے فرمایا کہ حضرات تکیہ کے انوار یہاں تک ہیں اور یہاں آنے کا ارادہ فرمایا مگر موقع نہیں ملا ایسے ہی حضرت شیخ الحدیث ایک سے زائد مرتبہ تشریف لائے اور شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی بھوپالی شریف لائے تو آپ کو واقف ہونا چاہیے کہ شاہ علم اللہ صاحب کون تھے؟ کب پیدا ہوئے؟ تعلیم و تربیت اور اصلاح کا تعلق ان کا کن سے تھا ان کے بارے میں ان کے معاصر کیا کہتے تھے؟ کیا ان سے پہنچا؟ کون سی اور اتباع سنت تھی یہی اس جگہ کا پیغام بھی ہے اور اس جگہ کا خاصا بھی ہے اور یہاں کی ہوا میں جو بات ہوئی چاہیے خدا کرے وہ اب بھی ہو، وہ ہے توحید خالص الا للہ الدین الخالص۔

عقیدہ توحید اور اتباع سنت

دائرہ شاہ علم اللہ کا پیغام عقیدہ توحید اور اتباع سنت کا پیغام ہے سارے عالم کے لئے اور خاص کر ہندوستان کے لئے۔ اتباع سنت میں تو شاہ علم اللہ صاحب اتنے بڑھے ہوئے تھے کہ ایک واقعہ تاریخ میں لکھا ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر نے ایک دن خواب میں دیکھا کہ اچانک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی تو بہت گھبرائے معلوم ہوتا کہ مغلیہ سلطنت کا زوال ہونے والا ہے گھبرا کے علماء سے پوچھا کہ آج میں نے یہ خواب دیکھا ہے اللہ خیر کرے انہوں نے کہا کہ آپ گھبرائیے نہیں تاریخ لکھ لیں اسی تاریخ کو شاہ علم اللہ صاحب کا رائے بریلی میں انتقال ہوا ہوگا اس لئے کہ ان سے پڑھ کر قبح سنت کوئی نہیں چنانچہ یہاں سے چٹھی گئی جو واقعات نگار رہا

کرتے تھے انہوں نے بادشاہ کو اطلاع دی کہ آج فلاں تاریخ کو شاہ علم اللہ صاحب کا انتقال ہو گیا۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے یہاں ایسی ہستی کو پیدا کیا یعنی حضرت سید احمد شہید کو جن کا ڈنکا اب بھی بج رہا ہے خاص طور پر ہندوستان میں ہم تاریخ کے طالب علم بھی ہیں، مصنف بھی ہیں، ہمیں نہیں معلوم کہ کس ہستی سے اتنا بڑا انقلاب ہوا ہوائی بڑی اصلاح ہوئی ہو جتنی بڑی اصلاح سید صاحب سے ہوئی تیس لاکھ آدمی تو ان کے ہاتھ پر بیعت ہوئے بیعت کے معنی یہ سننے کہ ابھی ہاتھ پر ہاتھ رکھا شرک سے نفرت ہو گئی بدعت کے روادار نہیں رہے، معاصی سے نفرت ہو گئی، تاریخ میں اس کے بیسیوں واقعات ہیں وقائع احمدی اور منظور السعداء میں اس طرح کے واقعات بھرے پڑے ہیں۔

بیعت کر لیجئے

لکھنؤ میں ٹیلہ والی مسجد میں قیام تھا لوگ کہنے لگے بھائی کہاں آ گئے؟ آپ نے فرمایا کیا بات ہے بولے بڑے بدنام ہیں، ڈاکو ہیں، رہزن ہیں، ان کا یہاں کیا کام ہے؟ آپ نے کہا کچھ کہنا نہیں چور آئے اور کہنے لگے ہم کو بیعت کر لیجئے فرمایا جلدی کیا ہے پھر کر لیں گے، کہا نہیں ابھی کر لیجئے، بیعت ہوئے اس کے بعد گھر گئے اسی دن یا ایک دو دن کے بعد ان کی پارٹی کے لوگ آئے کہا بہت دنوں سے ہم نے کام نہیں کیا ہے یعنی ڈاکہ نہیں ڈالا ہے آج کل تنگی ہو گئی ہے چلو کہیں کام کریں، انہوں نے کہا اب نہیں ہوگا یہ کام پوچھا کیا بات ہے اب نہیں ہوگا یا کبھی نہیں ہوگا اب کبھی نہیں ہوگا، کہا کیا بات ہے بولے ایک بزرگ رائے بریلی سے آئے ہیں ان کے ہاتھ پر ہم نے بیعت کی ہے کہ ہم چوری نہیں کریں گے۔ انہوں نے بھی توبہ کی کہا ہم بھی بیعت ہو سکتے ہیں؟ کہا ہاں وہ بھی بیعت ہوئے۔

ہدایت اور انقلاب

ہدایت کا یہ معاملہ ہے کہ نواب بہادر یار جنگ صاحب نے جو مہدوی فرقہ کے مصنف ہی نہیں بلکہ مہدوی فرقہ کے بہت بڑے لیڈر اور قائد مقرر تھے وہ لکھنؤ آئے مولانا عبدالباری صاحب ندوی حیدرآباد میں رہ چکے تھے۔ ان سے واقف تھے بھائی صاحب سے کہا کہ ان کو

دارالعلوم گھمانا چاہیے اور ان کا خطاب ہونا چاہیے ہم ان کو لائے انہوں نے مسجد کے صحن میں خطاب کیا تو انہوں نے بہت سی باتیں کہتے ہوئے کہا کہ مولانا کرامت علی صاحب سید صاحب کے بڑے خلفاء میں تھے مولانا کرامت علی صاحب کے ہاتھ پر میری معلومات کے مطابق دو کروڑ آدمیوں کو ہدایت ملی۔

جب ہم بنگلہ دیش گئے سفر میں ہمارے ساتھ عزیزان محمد رابع اور محمد واضح اور مولوی سعید الرحمن بھی تھے تو وہاں کے واقف عالموں نے کہا کہ دو کروڑ سے بھی زیادہ لوگوں کو مولانا کرامت علی صاحب کے ذریعہ ہدایت ملی اور چالیس ہزار سے اوپر آدمی مسلمان ہوئے اور یہ حالت تھیکہ جب رائے بریلی سے کلکتہ جانے لگے دریا سے سفر کیا گنگا کنارے کی بستی ڈلمو اترے اور پھر ڈلمو سے آگے جہاں جہاں جاتے وہاں بس بالکل انقلاب آ جاتا تھا تعزیے کے چبوترے توڑ دیئے جاتے تھے تعزیے توڑ دیئے جاتے تھے لوگ غیر مشروع مراسم سے تائب ہوتے تھے اور آپس میں حق کی لڑائیاں تھیں وہ اتحاد کر لیتے تھے بنارس گئے تو اور بھی زیادہ کلکتہ گئے تو ایک طوفان اٹھا معلوم ہوتا تھا کہ شہر بل گیا شراب خانوں سے انگریزوں نے ٹیکس مانگا۔ انہوں نے کہا کہ ہم کہاں سے ٹیکس دیں؟ کوئی بھول کر بھی ہمارے شراب خانے کی طرف نہیں آتا۔ بولے کیا بات ہے۔ کہا جب سے رائے بریلی سے سید صاحب آئے ہیں اس وقت سے کوئی ہمارے شراب خانے کا رخ ہی نہیں کرتا۔ انہوں نے کہا اچھا اب یہی حالت رہے تو معاف کر دیں گے اور ان کے جانے کے بعد پھر آنے لگیں تو پھر ٹیکس دینا پڑے گا ایسے انقلاب کے واقعات تاریخ میں ہیں جو صدیوں میں نظر نہیں آتے تو یہ بھی آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ آپ کہاں ہیں؟ اور آپ کو اس پر خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے فخر کرنا چاہیے کہ ہم ایسی جگہ پر پڑھ رہے ہیں جو بالکل اس کے جوار میں ہے وہاں کی ہوا کے جھونکے یہاں آتے ہوں گے اور انشاء اللہ اس میں کچھ نہ کچھ برکتیں بھی ہوتی ہوں گی اور اس کے بعد ہم آپ سے یہ کہتے ہیں کہ دو چیزیں ضرور پڑھئے گا موقع ہو تو یہیں پڑھ لیجئے ایک تو سیرت سید احمد شہید اور ایک تذکرہ سید شاہ علم اللہ تذکرہ شاہ علم اللہ بڑے بڑے ادیبوں نے پڑھی پروفیسر رشید احمد صدیقی تو بہت متاثر ہوئے تذکرہ سید شاہ علم اللہ سیرت سید احمد شہید اور حیات عبدالحی اگر ہو سکے تو یہاں پڑھ لیجئے ورنہ نوٹ بک پر لکھ لیجئے کہ انشاء اللہ ہم یہاں سے جانے کے بعد ان کتابوں کو ضرور پڑھیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہاں کون لوگ پیدا ہوئے تھے۔

دعوت اور پیغام

میرے عزیزو! یہاں کا پیغام آپ لے کر جائیں صرف یہاں سے کتابی علم لے کر نہ جائیں شخصی علم لے کر نہ جائیں بلکہ یہاں کی دعوت بھی لے کر جائیں پیغام بھی لے کر جائیں اور آخری بات یہ کہ یہاں کا مزاج بھی لے کر جائیں ہر جگہ کا ایک مزاج ہوتا ہے ہر دعوت کا ہر ادارہ کا ہر مقام کا ایک مزاج ہوتا ہے اور یہاں کا مزاج ہے تو حید خالص اتباع سنت قرآن کی پابندی اور تبلیغ کا جذبہ اصلاح کا جذبہ جہاد کا شوق اور اعلاء کلمۃ اللہ کا ارادہ اس کے لئے جو کچھ ہو سکے وہ ہم کریں گے۔ بس یہ سب باتیں ہیں ان کو ذہن میں رکھ لیں پھر آپ سے کہتے ہیں کہ پختہ استعداد پیدا کیجئے عبارت صحیح پڑھنا سیکھیں اور سمجھنا سیکھیں اس کے بعد فرائض میں پابندی نماز میں خشوع و خضوع ہو دعا ہو یہاں بیٹھ کر دعا کریں کہ یہ اولیاء اللہ کا جوار ہے انشاء اللہ دعا میں اثر رہے گا اور پھر اس کے بعد یہ کہ استادوں کی خدمت کریں قدر کریں ذہن میں کچھ چیزوں کو محفوظ کریں کہ یہاں سے جانے کے بعد یہ کام کرنا ہے جو کام یہاں نہیں ہو سکا وہ گھر جا کر یا دوسرے مدرسے میں جا کر کریں گے اور پھر اس کام کو جاری رکھیں گے اور یہ کہ دعوت و تبلیغ کا ارادہ کریں کہ یہاں سے یا کسی دوسرے مدرسے سے فارغ ہو کر دعوت و تبلیغ کا کام کرنا ہے مسلمانوں کی اصلاح کا کام کرنا ہے عقائد کی اصلاح کا اعمال کی اصلاح کا تنظیم و رواج کی اصلاح کا کام کرنا ہے۔ شادی بیاہ کی رسوم ان کی فضول خیر جیاں اور دنیا طلبان سب کے خلاف آواز بلند کرنا ہے خود بھی بچتا ہے اور دوسرے کو بھی پاتا ہے۔ مسلمانوں پر سب کے جو دست درازیاں ہوتی ہیں اور اس کے لئے جو خطرات ہیں ان کا اقبال کرنا ہے۔ اس کی دعا اور کوشش کرنی ہے کہ مسلمانوں کو ہندوستان میں شرعی قانون پر شرعی قوانین اور اہل قانون وراثت پر پرنسپل لاء پرنسپل کرنے کی آزادی ہے اور جو تنظیمیں جو تنظیمیں جو تنظیمیں کام کو کر رہی ہیں اس کا بیڑا جنہوں نے اٹھایا ہے ہمیں ان کا راقم ویرانہ ہے مسلم پرنسپل لاء پرنسپل کا مرکز پلٹن میں ہے اور صدر میں بنایا گیا ہے یا دینی تعلیم کو اس سے یا علمی تعلیم سے یہاں سب تنظیموں میں اور پھر تبلیغی جماعت جو ساری دنیا کے لئے عالمی جماعت ہے اس کے لئے کوشش کرنا ہے اور اسلام کی بقاء و تحفظ اور سر بلندی کیلئے کام کرنا ہے۔

وما علینا الالبلاغ المبین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نزول قرآن کا مقصد اور حاملین قرآن کی ذمہ داریاں

حضرات! حضرت مولانا نے ۱۹۶۰ء میں برما (میانمار) کا دورہ فرمایا اسی سفر میں برما کے مختلف مقامات پر حضرت کی تقاریر ہوئیں۔ یہ تقریریں بھی برما کے جمعیۃ الحفاظ کے ایک جلسہ میں کی گئی تھی جس میں نزول قرآن کا مقصد اور حاملین قرآن کی ذمہ داریوں کو اجاگر کیا گیا ہے اللہ تعالیٰ اس بیان کو نافذ ثابت فرمائے۔

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونعوذ بالله من شرور انفسنا ومن
سيئات اعمالنا من يهد الله فلا مضل له ومن يضلل فلا هادي له ونشهد
ان لا اله الا الله ونشهد ان محمد عبده ورسوله الذي ارسله الله تعالى
بالحق بشيرا ونذيرا وادعيا الى الله باذنه وسراجا منيرا

حضرات! جمعیۃ الحفاظ کے اس جلسہ میں شریک ہونا میرے لئے عادت بھی ہے اور ایک طرح کی عبادت بھی، اللہ تعالیٰ کے کلام سے تعلق رکھنے والی ہر چیز خواہ وہ حفظ ہو یا تجوید، تفسیر ہو یا قرآن مجید کی تلاوت، بڑی معزز اور مکرم چیز ہے، اللہ تبارک و تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ اور ساتھ ہی آپ کے منصب نبوت کے فرائض، اور اس کی ذمہ داری کے سلسلہ میں فرمایا ہے، ہوا الذی بعث فی الامیین رسولا منهم يتلوا عليهم آياته وركيهم ويعلمهم الكتاب والحكمة وان كانوا من قبل لفی ضلل مبين۔ (الجمعة) وہ پاک ذات ہے جس نے کہ ان پڑھوں میں ایک ایسا پیغمبر مبعوث فرمایا جو ان کو قرآن مجید کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور ان کی تربیت فرماتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اگرچہ وہ اس سے پہلی بڑی کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔

منصب نبوت اور اس کا کام:

رسول اللہ ﷺ کے منصب نبوت کے چار شعبے ہیں، جو گویا فرائض چہارگانہ ہیں۔

تلاوت آیات:

تلاوت آیات پہلا فریضہ اور پہلا شعبہ ہے، یہ بھی اتنی اہم چیز اور ایسا بلند فریضہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے منصب نبوت کے شعبوں میں سب سے پہلے اسی کو ذکر فرمایا ہے۔

تزکیہ نفس:

دوسرا شعبہ ہے یرکبھم، نفوس کی تربیت کرنا، مہذب بنانا۔ اخلاق روئیدہ نکالنا اور اخلاق فاضلہ پیدا کرنا۔ اور وہ صفت پیدا کرنا جس کا قرآن مجید میں دوسری جگہ ذکر ہے۔

ولكن الله حب اليكم الايمان وزينه في قلوبكم وكره اليكم الكفر والفسوق والعصيان اولئك هم الراشدون۔

اور لیکن اللہ تعالیٰ نے تم کو ایمان کی محبت دی اور اس کو تمہارے دلوں میں مرغوب کر دیا۔ اور کفر اور فسق اور عصیان سے تم کو نفرت دے دی ایسے لوگ راہ راست پر ہیں۔

نزول قرآن کا اہم ترین مقصد:

قرآن مجید کے نزول کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ الفاظ اور حروف کی شکل میں کتابوں میں اور ان کے بعد سینوں میں محفوظ ہو جائے کہ لوگ اس کو پڑھ سکیں اور اس کو سناسکیں۔ اہم ترین مقصد یہ ہے کہ عقائد کی اصلاح اور نفوس کی اصلاح ہو، رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں فریضوں کی تکمیل فرمائی۔ ان کے بعد ان کے لیے اس محنت کا زندہ ثبوت بنے ان کے نفوس کی اصلاح کے لیے سختی تھی، ان کی کسی تربیت نہ تھی، ان کے کفر و شرک کی نفرت ان کے دلوں میں بچھڑ چکی تھی اور ایمان کی محبت اور ایمان کا جذبہ ان کے اندر بیہوش ہو چکا تھا۔ عبادت کا ذوق ان پر غالب آچکا تھا، خدمتِ خلق کا جذبہ ان میں کم ہو چکا تھا، ان کے اندر سے نفسیات کا کاٹا گیا، جب دنیا ان کے اندر سے بالکل باہر ہو چکی تھی، جب جاہ کا خاتمہ ہو چکا تھا، صحابہ کرام میں سے ایک ایک رسول اللہ ﷺ کی تزکیہ کا زندہ ثبوت ہے۔

حضرت ضرار بن عمرو رضی اللہ عنہ ایک صحابی ہیں کہتے ہیں کہ میں شرک کی حالت میں اس

نیت سے نکلا کہ وہ کام کروں جو قریش نہیں کر سکے یعنی معاذ اللہ رسول اللہ ﷺ کے وجود گرامی پر دست درازی کروں، موقع اچھا تھا، آپ تنہا طواف کر رہے تھے۔ میں نے بھی طواف کرنا شروع کر دیا اور اس فکر میں رہا کہ ذرا کچھ موقع ہو کہ آپ کا اور میرا سامنا ہو جائے، تو میں اپنا کام کروں۔ آپ نے مجھ کو دیکھ کر بلایا۔ میں حاضر ہوا۔ آپ نے فرمایا، ضرار تمہارا کیا ارادہ تھا؟ میں نے کہا کچھ نہیں طواف کر رہا تھا۔ آپ ہنسے، اور آپ نے میرے سینے پر ہاتھ رکھا۔ خدا کی قسم آپ نے ہاتھ نہیں اٹھایا تھا۔ کہ گویا سینے کے اندر کی ساری آلائش نکل گئی، اس کے بعد میں وہاں سے گھر چلا آیا، ایک عورت جس کے یہاں جلسہ ہوا کرتا تھا اور محفل گرم ہوا کرتی تھی اور اس میں داستان آرائی و قصہ گوئی ہوتی تھی، میں رند مشرب تھا، اس عورت نے مجھے دیکھا تو آواز دی، میں نے کہا اب کچھ نہیں ہو سکتا، اب میں مسلمان ہو گیا ہوں، ایسی فوری تبدیلی کے واقعات بھی بہت ہیں، حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مجھ پر تین دور گزرے ہیں، ایک دور مجھ پر ایسا گذرا ہے کہ روئے زمین پر کوئی ہستی آپ سے بڑھ کر مغبوض نہ تھی، معاذ اللہ! اگر اس وقت مجھے موقع مل جاتا تو میں اپنی عاقبت خراب کر لیتا، اللہ نے فضل فرمایا، موقع ہی نہیں ملا، اس کے بعد دوسرا دور مجھ پر ایسا گذرا کہ روئے زمین پر کوئی پستی آپ سے بڑھ کر محبوب نہیں تھی۔ خدا کی قسم میں آپ کو آنکھ بھر کر دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ اگر مجھ سے کوئی حضور اکرم ﷺ کا حلیہ پوچھے تو میں بیان نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ میری نظر آپ کے چہرہ مبارک پر جمی ہی نہیں تھی۔ اور مجھ میں آپ کو دیکھنے کی تاب ہی نہیں تھی۔ جب میں نے آپ کے ہاتھ میں ہاتھ دیا، اور بیعت کی تو میں اپنا ہاتھ نکالتا ہی نہیں تھا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ میرا ہاتھ کیوں نہیں چھوڑتے؟ میں نے کہا، یا رسول اللہ! فرمائیے کہ میرے گزشتہ گناہوں کا کیا ہوگا؟ میں تو بہت سیاہ کار انسان ہوں آپ ﷺ نے فرمایا۔ کہ تم کو معلوم نہیں کہ اسلام اپنے ماقبل کو بالکل ختم کر دیتا ہے۔

ایسے بہت سے واقعات ہیں، وحشی جنہوں نے حضرت حمزہ بن عبدالمطلب اللہ کے شیر کو خود شہید کیا تھا، اور ان کے ساتھ جو سلوک کیا گیا وہ آپ کو معلوم ہے، حضور ﷺ کے سامنے جب وہ آئے اور انہوں نے بیعت کا ارادہ کیا تو آپ ﷺ نے ان کی بیعت قبول کی، انہوں نے کلمہ پڑھا اور ایمان لائے، آپ ﷺ نے فرمایا وحشی! اگر تم میرے سامنے بار بار نہ آؤ

تو اچھا ہوگا۔ اس لئے کہ مجھے اپنے چچا یاد آ جاتے ہیں، یہ قدرتی بات بھی ہے، اور بہت لطیف جذبہ، احساس اور اعلیٰ درجہ کی انسانیت، لیکن انہوں نے جو کلمہ پڑھا اور آپ کے ہاتھ پر اسلام لائے۔ اس نے ان کے اندر ایسا انقلاب پیدا کر دیا، ایسی روحانیت پیدا کر دی، اور ایسی ایمانی طاقت پیدا کر دی جس پر آج بڑے بڑے اولیاء اللہ رشک کر رہے ہیں، یہی وحشی ہیں جنہوں نے مسلمہ کذاب کو قتل کیا، میں جب اس واقعہ کو پڑھتا ہوں تو کہتا ہوں کہ حضرت وحشیؒ کی بھی نگاہ انتخاب کو داد دینی چاہئے کہ انہوں نے ایک ایسی ہستی سے اسلام اور مسلمانوں کو محروم کیا تھا جو اسلام کے لئے تقویت کا باعث تھی اور رسول اللہ ﷺ کو بہت محبوب تھی تو اس کی تلافی اور کفارہ کے لئے انہوں نے ایسی ہستی کا انتخاب کیا جو سب سے بڑھ کر حضور ﷺ کے نزدیک مبغوض تھی، ایک وہ شخص تھا جو نبوت کا بہت بڑا حامی اور مددگار تھا، پھر ایک وہ شخص تھا جو اس نبوت کے مقابلہ میں سینہ تان کر آیا تھا اور منصب نبوت کا گویا حریف اور رقیب تھا۔ انہوں نے گناہ کے کفارہ کے لئے جو بہترین انتخاب ہو سکتا تھا انتخاب کیا، یقیناً حضور ﷺ کی روح مبارک ان سے خوش ہوئی ہوگی، یہ سب ان کی ایمانی قوت کا نتیجہ ہے یہ تو فوری انقلاب کی چند مثالیں ہیں، باقی صحابہ کرامؓ کے اندر جو تبدیلی تربیت اور صحبت سے پیدا ہوئی اس سے وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ گئے اخلاقی پستی سے، اعمال کی پستی سے، عقائد کی تاریکی سے اور جاہلیت سے روحانیت اور ایمان و اخلاق اور تربیت و علم کے بلند مقام تک پہنچ گئے۔

تعلیم کتاب:

تیسرا شعبہ تعلیم کتاب و حکمت، یعنی کتاب کی تعلیم دینا ہے، پہلے قاری تلاوت کرتا ہے پھر اس کے ترکیب کا عمل کرتا ہے اس میں قرآن مجید کی تفسیر، اس کے حقائق کا بیان، اس کے علوم کا اظہار اور مقاصد قرآن کی تشریح و تفصیل سب شامل ہے۔ یہ ہے يعلمہم الکتاب والحکمة ان کو سکھاتے ہیں کتاب اور حکمت۔

پھر اس کی بھی ضرورت ہے کہ قرآن مجید کے طالب علموں، اس کے حاملین اور سامعین میں تفقہ پیدا کیا جائے، یہ وہ چیز ہے جس کی طرف اشارہ ہے۔ من یرد اللہ بہ خیراً یفقہہ فی الدین۔ اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ خیر کا ارادہ کرتا ہے اس کو دین کی سمجھ عطا فرماتا ہے۔

یہ درحقیقت حامل قرآن کے فرائض چہارگانہ اور حامل قرآن کی ذمہ داریاں اور اس کے

کمالات اور اس کی سیرت ہے اس کے بعد صحابہ کرام جو علماء تھے، اور جن کے علم کی خود رسول اللہ ﷺ نے تعریف کی اور جن حضرات کی طرف آپ ﷺ نے اشارے فرمائے، امت کو ان کی طرف رجوع ہونے کا مشورہ دیا، مثلاً حضرت ابی بن کعب آپ ﷺ نے ان کی بہت تعریف کی ہے اور ان کی خصوصیت بیان کی ہے کہ قرآن مجید سے ان کو خاص مناسبت تھی۔ حضرت زید بن ثابتؓ کا تب وحی تھے، قرآن مجید کا بہت بڑا علم رکھتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے قرآن مجید پڑھنے کی تعریف آپ نے خود فرمائی تھی۔ حضرت علی بن ابی طالبؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے متعلق آپ ﷺ نے دعاء فرمائی۔

اللہم علمہ الكتاب و فقهہ فی الدین .

اے اللہ ان کو کتاب کا علم عطا فرما۔ اور دین کی سمجھ دے۔

یہ حضرات بھی ان چاروں صفات کے جامع تھے، یعنی قرآن مجید کے ”قاری“ بھی تھے اور ”معلم الکتاب“ بھی تھے اور ”معلم حکمت“ بھی اور ”مزکی“ بھی تھے، یہ چاروں شے ان حضرات میں جمع تھے، پھر تابعین کا دور آیا، اس دور میں بھی کثرت سے ایسے لوگ تھے جو ان چاروں چیزوں کے جامع تھے مثال کے طور پر حضرت حن بصری کا نام لے سکتا ہوں کہ وہ ان چاروں شعبوں کے جامع تھے۔ اسی طرح حضرت سعید بن جبیر اور محمد بن سیرین اور حضرت سعید بن مسیب، یہ وہ فضلاء تابعین تھے جو ان چاروں کمالات کے منظر اور ان چاروں شعبوں کے جامع تھے۔ تبع تابعین میں بھی اسی طرح کی بے شمار ہستیاں پیدا ہوئیں جو ان چاروں چیزوں کی جامع تھیں۔ جیسے ائمہ اربعہ، محدثین، فقہاء اور صوفیاء تابعین جیسے حضرت فضیل بن عیاضؓ، حضرت معروف کرخیؓ، اور امام احمد بن حنبلؓ اسی طرح سے جنید بغدادیؓ، یہ سب حضرات ان چاروں چیزوں کے جامع تھے، پھر انحطاط کا دوسرا دور شروع ہوا، اور شعبوں کی تقسیم ہونے لگی، نتیجہ یہ نکلا کہ امت میں مختلف گروہ بن گئے اور ایک شعبہ سنبھال لیا۔ بعض نے تلاوت آیات کو اپنا شعار بنالیا۔ انہوں نے قرآن مجید کو حفظ کیا اور اس کی تجوید اور مخارج کی تصحیح کی، اور اتقان کے ساتھ پڑھنا انہوں نے اپنا فرض سمجھا۔ اللہ تعالیٰ امت کی طرف سے ان کو جزائے خیر دے کہ بہت بڑا فرض کفایہ ادا کیا اور قرآن مجید کے لطف اور طریقہ ادا کو محفوظ کر دیا۔ جس طرح اس کے حروف کو اللہ تبارک و تعالیٰ کے حکم سے حضور ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جمع کیا تھا اور

حضرت عثمان غنیؓ نے اس کی نقلیں کرا کے عالم اسلام میں بھیجی تھیں۔

بعض حضرات نے تعلیم کتاب و حکمت کو اپنا شعار بنایا۔ وہ علماء ظاہر کی جماعت ہے جنہوں نے قرآن و حدیث کے رموز کو بیان کیا، ان کے مضامین کی اشاعت کی، اور ان کے مشکلات کی تشریح کی۔

تربیت و تزکیہ:

بعض حضرات نے تزکیہ اپنے ذمہ لیا، وہ حضرات صوفیاء کرام ہیں، جنہوں نے اپنے مریدین کی اور جو لوگ ان کی طرف رجوع کرتے تھے ان کے نفوس کی اصلاح و تربیت کا کام اپنے ذمہ لیا اور اس کو تہذیب و اخلاق اور اصلاح باطن کا ایک فن بنادیا، ان حضرات کی تعداد خدا کے فضل سے اتنی بڑی ہے کہ ان کا ذکر کرنا مشکل ہے، مثال کے طور پر سیدنا حضرت عبدالقادر جیلانیؒ، خواجہ بہاؤ الدین نقشبندیؒ اور خواجہ معین الدین چشتیؒ اور حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ رحمہم اللہ۔

تجدید سلوک:

پھر ان کے بعد جنہوں نے فن سلوک کا کام کیا اپنے زمانہ کی پھیلی ہوئی بدعتوں کو اور تحریفات کو انہوں نے دور کیا اور اپنے زمانہ کی طبعیتوں کا لحاظ کر کے انہوں نے طب نبوی ﷺ کی تجدید کی، ان میں سے خاص طور پر حضرت شیخ امام ربانی مجدد الف ثانیؒ، شیخ احمد سرہندیؒ ان کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ، حضرت سید احمد شہدؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور مولانا اشرف علی تھانویؒ وہ حضرات ہیں جنہوں نے فن سلوک کی تجدید کا کام انجام دیا، اور اپنے زمانہ کے مطابق ان کو بنایا، اور ان کے فائدہ کو عام کیا۔

حامل قرآن کی ذمہ داریاں:

اصل میں حامل قرآن کا کام صرف تلاوت اس کو پڑھ کر سنا دینا، صحیح طور پر یاد کر لینا اور اس کو صحت کے ساتھ ادا کر دینا، اور کسی مجلس میں، کسی جلسہ میں قرآن مجید پڑھ دینا نہیں ہے بلکہ حامل قرآن کی بہت بڑی ذمہ داری ہے، حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ اس شخص کو عذاب دیا

جائے گا، جس کو اللہ نے قرآن مجید کا علم دیا، وہ رات کو سویا اور سوتا رہا، یہاں تک کہ صبح کی نماز قضا ہو گئی۔ قرآن مجید کی ذمہ داری بہت بڑی ذمہ داری ہے، اس کو یاد کرنے کی اور اس کو یاد رکھنے کی، اس پر عمل کرنے کی، یہی وجہ تھی کہ جب جنگ یمامہ پیش آئی جو اسلام کی شدید ترین جنگوں میں ایک جنگ ہے جس میں زور کارن پڑا، اور زور کی لڑائی ہوئی، اور کشتوں کے پستے لگ گئے بس ایک موت کا بازار گرم تھا اور کسی طرح فیصلہ نہیں ہوتا تھا کہ میدان جنگ میں ایک صحابی نے للکارا، اور کہا اے حاملین قرآن، اور وہ لوگ جن کے سینوں میں قرآن ہے، آج قرآن پر عمل کر کے دکھاؤ، اور قرآن پر قربان ہو جاؤ، اس کے لئے اگر یہ ارتداد کا فتنہ نہ ختم ہوا، تو قرآن مجید کا باقی رہنا مشکل ہے، چنانچہ جو حفاظ تھے وہ آگے بڑھے اور فیصلہ کر لیا، بے جگرئی کے ساتھ لڑے، اور پر دانوں کی طرح نثار ہوئے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

فی صحف مكرمة مرفوعة مطهرة بايدي سفرة كرام بررة.

قرآن مجید بڑی عزت والے صحیفوں میں سے ہے اونچے اور پاک کئے ہوئے ایسے سفیروں کے ہاتھوں میں جو بڑے شریف اور پاک باز ہیں۔

معلوم ہوا کہ حاملین قرآن کی یہ تصویر ”کرام بررة“ ہونا چاہئے، حاملین قرآن کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ فرشتوں کی صفت ہے، بلکہ معلوم ہوا کہ جو قرآن مجید کو اٹھانے اور سینے میں رکھنے کا حوصلہ کرے اس کو ایسا بننا چاہئے۔ لا یمسہ الا المطہرون، اللہ تعالیٰ کا منشا یہ ہے کہ اس قرآن مجید کو مطہر ہی چھویں، صحابہ کرام میں سے جو لوگ قرآن مجید کے حافظ ہوتے تھے اور جن میں قرآن مجید کا علم خاص ہوتا تھا، وہ ممتاز اور اپنے اخلاق و تقویٰ اور عبادت میں دوسروں سے بڑھے ہوئے ہوتے تھے، اس لئے حضور ﷺ جب میدان احد میں شہداء کی لاشوں کو دفن کرنے لگے تو قرآن مجید جس کو زیادہ یاد ہوتا اس کو پہلی صف میں رکھتے جاتے تھے، اور فرمایا کرتے تھے:-

یؤمکم من اقراکم.

امامت وہ کرے جو زیادہ پڑھا ہوا ہو

تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ خالی حافظ ہو، جس کو قرآن مجید کا علم زیادہ ہو میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ حفاظ کی بہت بڑی ذمہ داری ہے۔

عبرت آموز واقعہ:

دیکھئے! جس شخص کو کوئی بڑی چیز ملتی ہے وہ چھوٹی چیزوں سے بلند ہو جاتا ہے، پھر چھوٹی چیزوں کی طرف اس کی نگاہ نہیں جاتی، میں نے ایک مرتبہ اپنے مدرسہ میں ایک قصہ سنایا، وہ قصہ آپ کو بھی سناتا ہوں۔ بڑا عبرتناک قصہ ہے، بڑے کام کی بات ہے۔

ایک شخص نے کہیں سفر پر جاتے ہوئے شہر کے کسی معزز آدمی کے یہاں اپنی امانت رکھوا دی، اچھی خاصی رقم تھی، کئی ہزار روپیہ کی، اور کہا کہ میں سفر پر جا رہا ہوں، وہاں سے آ کر لے لوں گا، انہوں نے کہا اچھا رکھ دو، اللہ مالک ہے، آنا تو پھر لے لینا۔ وہ بے چارہ سفر کر کے آیا، عرصہ کے بعد اس نے ان سے جا کر کہا کہ ہماری امانت دے دیجئے تو وہ بالکل انجان بن گئے، کہنے لگے کہ میں تم کو پہچانتا نہیں کہ تم کون ہو اور کب آئے تھے اور کب رکھوایا تھا؟ بے چارہ حیران ہو گیا، شریف سمجھ کر نہ اس نے کوئی لکھا پڑھی کی تھی، نہ دستاویز لکھوائی تھی۔ اب وہ جتنا یاد دلاتا، وہ بھولتے جاتے یہاں تک کہ ناراض ہو گئے، اور کہنے لگے کہ ایک شریف آدمی کو بدنام کرتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی۔ تم مجھے چور بناتے ہو، اس کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا، اس نے جا کر قاضی سے شکایت کی۔ قاضی صاحب بہت ہی سمجھ دار اور ماہر نفسیات تھے، انہوں نے کہا کہ اس کا علاج میں کروں گا۔ تم کسی سے ذکر نہ کرنا، تھوڑے دنوں کے بعد ایک شخص کو بھیجا اور کہلویا کہ آپ قاضی بننے والے ہیں، وہ سن کر بہت خوش ہوئے، بڑا اعزاز تھا، اس دن کے بعد اس شخص سے کہا کہ جا کر اپنی امانت مانگو، وہ گیا اور اس نے کہا کہ شاید آپ کو یاد آ جائے کہ میں فلاں وقت آیا تھا۔ کہا۔ ہاں مجھے یاد آ گیا اور تمہارے جانے کے بعد ہی مجھے یاد آ گیا تھا اور میں تمہارا منتظر تھا، تمہارے گھر کا پتہ مجھے معلوم نہیں تھا بہت اچھا کیا کہ تم آ گئے، تمہاری امانت وہاں رکھی ہوئی ہے جا کر لے لو، جیسے تم رکھ کر گئے تھے ویسے ہی رکھی ہوئی ہے وہ گیا اور لے آیا اس کو بڑا تعجب ہوا، اور ان دو باتوں میں تعلق سمجھ میں نہیں آیا، اس نے قاضی سے کہا جو قاضی القضاۃ تھے، خیر میری امانت مجھے مل گئی۔ مگر یہ انتظام آپ نے کیسے کیا؟ اور انہوں نے اقرار کیسے کیا؟ اور وہ انکار کے بعد اقرار! قاضی صاحب نے کہا۔ کہ بھائی بات یہ ہے کہ ان کو اس سے بڑی چیز ملنے والی تھی۔

اصل میں اس اعلیٰ چیز سے اس کا گراوٹ کا کوئی جوڑ نہ تھا جس کو قضاۃ مل رہی ہو یا

وزارت مل رہی ہو، تو وہ کسی کے پانچ سو یا دو سو روپے کیا مارے گا، اب ان کے ذہن کی سطح ایک دم سے بلند ہوگئی، تو وہ سوچنے لگے کہ میں قاضی ہوں، اب قاضی کی حیثیت سے معاملہ کو سوچنے لگے، تو یہ حرکت ان کو بہت گری ہوئی معلوم ہونے لگی، اور انہوں نے سوچا کہ پانچ سو کی کیا حقیقت ہے۔

تو میں نے اپنے طلبہ سے کہا کہ تم یہ سمجھو کہ تم عالم ہونے والے ہو، وقت یہ چھوٹی چھوٹی باتیں تم کو اتنی گری ہوئی معلوم ہوں گی، کہ تمہیں ان کے تصور کرنے سے تکلیف ہوگی، کہ ہم عالم ہو کر ایسی بات کر سکتے ہیں، ہمارے سینے میں جو اللہ کا کلام ہے، حدیث ہے اور حضور ﷺ کا کلام ہے تو ہم ایسی اچھی اور گری ہوئی بازاری باتیں کر سکتے ہیں۔

قرآن کی دولت سب سے بڑی دولت ہے:

یہی میں آپ سے کہتا ہوں کہ جب آپ یہ سوچ لیں کہ آپ کے سینہ میں اللہ کا کلام ہے تو پھر آپ میں جو کم درجہ کی باتیں ہیں، کوئی بھی گناہ، کوئی بھی گراوٹ کی بات، کوئی بھی سوقیانہ اور اچھی حرکت، جیسے مال کی محبت، عہدہ کی محبت اور تراویح کا تھوڑا تھوڑا معاوضہ لینا یہ ساری چیزیں آپ کی نظر سے ایسی گر جائیں کہ اگر آپ اپنی حیثیت پہنچان لیں، جس طرح سے وہ شخص جس نے صاف کہ دیا کہ میں تمہیں نہیں جانتا کہ تم نے کب امانت رکھوائی؟ پھر اقرار کر لیا۔ کہ ہاں! ہاں! تم نے امانت رکھوائی تھی اور پھر دے دیا، اسی طرح سے آپ یہ سمجھ لیں کہ آپ کے پاس کیا دولت ہے، تو پھر کبھی کسی گناہ کی طرف، کبھی کسی ادنیٰ کام کی طرف، کبھی کسی پست خیالی کی طرف آپ کا ذہن نہیں جاسکتا، بس آپ یہ سمجھ لیں کہ آپ کے سینہ میں کیا ہے۔

برخود نظر کشاز تہی دامنی مرغ

در سینہ تو ماہ تمامے نہادہ اند

شاعر نے تو چاند کو خطاب کر کے کہا، کہ ہلال جب باریک ہوتا ہے، تو بے چارہ حقیر معلوم ہوتا ہے، تب اپنے اوپر، اپنے مستقبل پر نظر ڈالو، اپنی تہی دامنی پر رنج نہ کرو کہ تو خالی ہے بالکل بال کی طرح۔

در سینہ تو ماہ تمامے نہادہ اند

تیرے سینہ میں چودھویں کا چاند سو رہا ہے، اور چودھویں کے چاند کی کیا حقیقت ہے، آپ کے سینہ میں اللہ کا کلام ہے، سر الہی ہے، علم الہی ہے، علم اعظم ہے، لوگ اسم اعظم کے پیچھے پڑتے ہیں، آپ کے سینہ میں علم اعظم ہے، اسی علم اعظم میں اسم اعظم بھی ہے، آپ تو حامل علم اعظم، حامل اسم اعظم ہیں، رسول اللہ نے قرآن کریم کی فضیلت میں فرمایا، ہر حرف کے بدلہ دس نیکیاں ملیں گی اور میں نہیں کہتا کہ الم ایک ایک حرف ہے بلکہ الف ایک حرف، لام ایک حرف ہے، میم ایک حرف ہے۔
دوسری جگہ ارشاد ہے:-

خیر کم من تعلم القرآن و علمہ

دیکھ لیجئے قرآن مجید کے کیسے کیسے فضائل ہیں، اگر حافظ تم میں پارے پڑھے اور رمضان المبارک جیسے مقدس مہینے میں پڑھے، اور مسجد میں رمضان کی راتوں میں پڑھے، اور اس کے بعد سو دو سو پانچ سو روپیہ معاوضہ لے، حیرت کی بات یہ ہے کہ کیسے ایک انسان اس پر تیار ہو سکتا ہے۔

ایک بزرگ کا واقعہ ہے ایک روز بہت جوش میں آ کر کہنے لگے، خدا کی قسم اگر کوئی پورا ایک ملک پیش کرے اور کہے کہ پوری سلطنت لے لو اور ایک مرتبہ اللہ کہنے کا ثواب مجھے دے دو، واللہ میں راضی نہ ہوں گا۔ اور قرآن تو اللہ کے ذکر سے بھرا ہوا ہے، ایک ایک حرف اللہ کا کلام ہے، اور اس عالم میں سب سے بڑی قیمتی چیز، جس کا براہ راست اللہ سے تعلق ہے وہ قرآن مجید ہے اور جو سب سے بڑی دولت اس آسمان کے نیچے ہے، وہ قرآن مجید ہے، اس لئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی نسبت ہے، اللہ کا کلام، اس کو کلام قدیم کہتے ہیں، یعنی اللہ تبارک و تعالیٰ متکلم ہے اور یہ اس سے بڑھ کر تو کوئی چیز ہو ہی نہیں سکتی، اس لئے اپنی قدر خود کرنا چاہئے، اور سمجھنا چاہئے کہ آپ کے پاس کیا دولت ہے؟ اگر آپ کو پتہ چل جائے کہ آپ کے پاس کیا دولت ہے تو آپ کے قدم زمین پر نہ پڑیں، کسی امیر کی کسی دولت کی وقعت آپ کے دل میں نہیں ہو سکتی، اگر ہوتی تو ہزار بار استغفار کرتے، ارے میرے دل میں، میرے سینہ میں اللہ کا پورا کلام ہے اور میں اس تاجر کو اس وزیر کو معزز سمجھتا ہوں۔

حضرت حافظ ابن تیمیہ فرماتے تھے کہ میرے دشمن میلا کیا بگاڑیں گے، میری جنت تو

میرے سینہ میں ہے، وہ مجھ سے کیا چھین لیں گے، میں تو اپنی جنت لئے پھر رہا ہوں اللہ کا کلام، اللہ کا علم میرے سینہ میں ہے، میرا باغ تو میرے ساتھ ہے، وہ مجھے کیا قید کریں گے، میں تو بالکل آزاد ہوں، جہاں بھی رہوں گا آزاد رہوں گا۔

روحانیت پیدا کرنے کے لئے عظمت اور اکتساب ضروری ہے:

کیوں ایک شخص کے اندر اتنی روحانیت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اتنی ترقی کرتا ہے اور ایک شخص وہ ترقی نہیں کرتا، فرق صرف عظمت اور اکتساب کا ہے، کلام اپنی جگہ عظیم ہے، لیکن اس کی عظمت کا استخراج بھی ضروری ہے، شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی مثالوں کے بادشاہ تھے، عجیب عجیب مثالیں دیتے تھے، وہ اس کی مثال دینے لگے، کہنے لگے کسی چیز کا ہونا اور چیز ہے، اور اس کا علم حضوری اور چیز ہے، نواب محبوب علی خاں جو شاہ دکن تھے، موجودہ نظام کے والد، ان کی یہ عادت تھی کہ کبھی کبھی وہ بھیس بدل کر شہر میں گشت کیا کرتے تھے، تو ایک دن یونہی بھیس بدل کر شہر میں گشت کر رہے تھے، ایک تانگہ میں بیٹھ گئے ان کے ساتھ دوسرے صاحب بھی تانگہ میں بیٹھے چلے جا رہے تھے، دونوں یہ بات کرنے لگے، کہو بھائی! آج کل کیا خبر ہے، دوسرے صاحب یہ جان نہ سکے کہ یہ کون صاحب ہیں انہوں نے کہا کہ آج کل گلی کوچہ میں محبوب علی خاں جو ہمارے نواب ہیں، کے منہ پر ہر شخص تھوک رہا ہے اور ان کو برا بھلا کہہ رہا ہے اور ایک قصہ جو اس زمانہ میں مشہور ہوا تھا وہ ذکر کر کے اس نے کہا کہ آج کل یہ مشہور ہو رہا ہے کہ وہ یہ کر رہے ہیں اور جو منہ میں آیا کہنا شروع کیا، محبوب علی خاں وہیں بیٹھے رہے، اس کے بعد انہوں نے بیڑی نکالی، اور کہا دیا سلائی ہے؟ اس نے کہا جی ہاں، ہے، رات کا اندھیرا تھا اس نے جو ماچس جلائی تو پہچان لیا کہ یہی محبوب علی ہیں، بس اس کی ہاتھ پاؤں پھول گئے اور ریشہ پیدا ہو گیا۔ انہوں نے کہا گھبراؤ نہیں۔

بزرگان دین چھوٹے چھوٹے واقعات سے بڑے بڑے نتائج نکالتے ہیں، انہوں نے کہا کہ محبوب علی خان تو وہی تھے جو آ کر بیٹھے، اس وقت محبوب علی خاں صاحب تھے، جب پوچھا تب بھی محبوب علی خاں تھے، جب اس نے کہا تب بھی محبوب علی خاں تھے، اور اس وقت جب ماچس جلائی اور منہ دیکھا تو محبوب علی خاں بدل گئے، تو اس پر ہیبت کیوں طاری ہوئی، وجود پہلے سے تھا، علم اب حاصل ہوا، حالت ہی بدل گئی، تو وجود قرآن تو وہی ہے جو آج سے تیرہ سو سال

پہلے تھا، جو آپ نے بچپن میں پڑھا، آپ نے جوانی میں پڑھا، جو آپ بڑھاپے میں پڑھ رہے ہیں یا پڑھیں گے، جو آپ تہجد میں پڑھتے ہیں، جو آپ تلاوت کرتے ہیں وہی قرآن مجید ہے، اس میں ایک نقطہ کا اضافہ نہیں۔ لیکن جو آپ کے اندر یہ بات پیدا ہوگئی کہ یہ اللہ کا کلام ہے اور کسی اللہ کا کلام، جس کی صفت یہ ہے اور کون سا کلام جس کی یہ شان ہے، اب آپ کی کیفیت اور کیفیت ہوگئی۔

لو انزلنا هذا القرآن علی جبل لرأیته حاشعاً متصدعاً من خشية الله
 الله نزل احسن الحديث کتباً متشابهاً مثانی تقشعر منه جلود الذين
 یخشون ربهم ثم تلین جلودهم وقلوبهم الی ذکر الله
 اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو آپ اس کو دیکھتے کہ اللہ کے خوف سے
 دب جاتا، پھٹ جاتا۔

اللہ نے بہترین کلام نازل کیا ہے ایک کتاب باہم ملتی جلتی ہوئی، اور بار بار دہرائی ہوئی،
 اس سے ان لوگوں کی جلد جو اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں کانپ اٹھتی ہے پھر ان کی جلد اور ان
 کے قلب اللہ کے ذکر کے لئے نرم ہو جاتے ہیں۔
 تو معلوم ہوا کہ دو چیزیں پیدا کرنا ہیں۔ ایک کلام اور صاحب کلام کی عظمت، دوسرے
 ثواب کی نیت اور ثواب کا یقین کہ ثواب مل رہا ہے، بس یہ دو چیزیں ہیں جن کی وجہ سے ایک
 شخص اعلیٰ مقام ولایت تک پہنچ جاتا ہے۔

قرب الہی کا سب سے بڑا ذریعہ قرآن کریم ہے:

بعض حضرات نے یہ فرمایا ہے کہ سلوک کا آخری درجہ قرآن ہے، اور نوافل میں قرآن
 مجید پڑھنے سے حاصل ہوتا ہی، جب سالک تمام مقامات طے کر لیتا ہے جو ذکر سے طے
 ہوتے ہیں، اس کے بعد جو آخری درجہ ہے قرب الہی کا، وہ کلام الہی کی کثرت تلاوت سے
 حاصل ہوتا ہے، حضرت مولانا فضل الرحمن رکنج مراد آبادی فرماتے ہیں کہ جو قرب قرأت کے
 ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے اس قرب کو کوئی نہیں پہنچ سکتا، اور یہ قرب استحضار سے، عظمت سے
 اور ثواب کے یقین سے حاصل ہوتا ہے، پڑھتے جائے اور یقین کرتے جائے کہ ثواب مل رہا
 ہے، ہر حرف پر دس نیکیاں مل رہی ہیں، اس کا شوق آپ کے دل میں زیادہ ہونا چاہئے، جتنا

زیادہ پڑھیں گے، اتنی زیادہ نیکیاں ملیں گی، بس بھائیو! اگر اپنے اندر یہ صفت پیدا کر لیں تو قرآن مجید کی تلاوت میں روح پیدا ہو جائے۔

قرآن کو بطور پیشہ پڑھنا گناہ ہے:

اور اگر اس کو پیشہ بنائیں تو اس سے بہت اچھا ہے کہ دنیا کو آدمی ذریعہ بنائے کسب معاش کا، قیامت کے دن وہ لوگ جو حلال روزی حاصل کرتے تھے اور جائز طریقوں سے کاروبار کرتے تھے، ان دنیا دار قاریوں، حافظوں اور عالموں سے بدرجہا آگے ہوں گے، جنہوں نے دین کو ذریعہ بنالیا تھا اپنا پیٹ بھرنے کا اور دنیا کمانے کا، تاجروں میں بکثرت اولیاء اللہ نکلے ہیں جو سمجھتے تھے ہم دنیا دار ہیں، صرف بچوں کے پالنے اور اپنا پیٹ پالنے کے لئے ایک دھندہ کیا ہے، اور اس میں ذکر کرتے تھے، نماز پڑھتے تھے، ڈرتے رہتے تھے، استغفار کرتے رہتے تھے، وہ کئی عالموں اور حافظوں سے بڑھ کر نکلیں گے، جنہوں نے قرآن مجید اور علم حدیث کو صرف دنیا کمانے کا ذریعہ بنایا۔

قرآن سے فائدہ حاصل کرنے کے لئے صحبت اور محنت ضروری ہے:

اللہ تعالیٰ نے جہاں آپ کو یہ دولت عطا فرمائی ہے، تو اس میں روح بھی، خشیت بھی اور تقویٰ بھی پیدا کرنے کی کوشش کریں، اور یہ بات بغیر صحبت کے اور بغیر محنت کے حاصل نہیں ہوتی، قرآن مجید کے یاد کرنے میں آپ نے جتنی محنت کی ہے، اب اس یاد میں جان ڈالنے اور موزونیت پیدا کرنے کے لئے بھی آپ کو محنت کرنی چاہئے، اگر آپ نے قرآن مجید کے یاد کرنے میں دو برس لگائے تو سچی بات یہ ہے کہ اس میں چار برس لگائیے، اس لئے کہ وہ الفاظ ہیں جس کو کافر و مومن سب پڑھ سکتے ہیں، اور بے شک کافر کو یاد ہونا مشکل ہے، لیکن یاد ہوتا ہے، اب بھی مصر و شام میں کتنے غیر مسلم ایسے ہیں، جن کو قرآن مجید یاد ہے، المنجد کا مصنف جو عیسائی تھا وہ حافظ تھا، تو معافی قرآن، علوم قرآن اور قرآن مجید کو دل میں راسخ کرنے کے لئے، اپنے اخلاق کو صحیح کرنے کے لئے، آپ کو وقت لگانے اور محنت کرنے کی ضرورت ہے۔

ایک مرتبہ حضرت مولانا محمد الیاسؒ کے ساتھ ایک گاڑی میں بیٹھا ہوا جا رہا تھا، میں نے عرض کیا کہ حضرت اس سفر میں قرآن مجید میں جو بات حاصل ہوتی ہے اور سمجھ میں آتی ہے وہ

گھر پر نہیں آتی، تو حضرت بہت خوش ہوئے، اور دوسروں کو مخاطب کیا کہ دیکھو مولانا کیا کہہ رہے ہیں؟ یہی سچی بات ہے۔ میدان جہاد میں جن لوگوں نے قرآن مجید کو سمجھا تھا، اور خدمت کے میدانوں میں جنہوں نے قرآن مجید کو سمجھا تھا اور محنت کے میدانوں میں جنہوں نے قرآن مجید کو سمجھا تھا، ان کی سمجھ تو ہمارے یہاں قرآن مجید پڑھنے سے حاصل نہیں ہو سکتی۔

قرآن مجید سے مناسبت پیدا کرنے کے لئے مجاہدہ کی ضرورت ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ آپ کو قرآن مجید کی تعظیم کرنے کی، اس پر عمل کرنے کی، اور اس کا لطف لینے کی، اور اس سے قرب حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وما علینا الا البلاغ

متنوع اور گہرے مطالعہ کی ضرورت

ذیل کی مضمون حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ رحمۃ واسعۃ کی اس لموئل تقریر کا دوسرا جز ہے جس میں طلبہ کو مطالعہ پڑھانے اور حالات و زمانہ کی نبض پہچاننے اور اس کے مطابق دعوتی کام کرنے کی صلاحیت پیدا کرنے کی دعوت دی گئی۔

الحمد لله نحمده و نستعينه و نستغفره و نو من به و نتوكل عليه و نعوذ بالله من شرر انفسنا و من سيأت اعمالنا من يهده الله فلا مضل له و من يضل الله فلا هادي له و نشهد ان لا اله الا الله و حده لا شريك له و نشهد ان سيدنا و مولانا محمد ا عبده و رسوله صلى الله تعالى عليه و على آله و اصحابه اجمعين اما بعد .

عالم اسلام کی موجودہ صورتحال کا تقاضا

عزیز طلبہ: عالم اسلام کی جس صورتحال کی تصویر ہم نے پیش کی ہے، اس نے ہمارے لئے ایک زبردست چیلنج کھڑا کر دیا ہے، وہ چیلنج یہ ہے کہ ہم کیسے اس کا مقابلہ کریں اور ان چیلنجوں کا جواب کیسے دیں، ظاہر ہے اس کے لئے بڑی تیاری کی ضرورت ہوگی، اس سلسلہ میں ایک باخبر تعلیم و تدریس کا کام کرنے والے تجربہ کار کی حیثیت سے آپ کو علمی تیاری کے سلسلے میں مطالعہ کا مشورہ دوں گا۔

کورس کی کتابوں اور مطالعہ کی کتابوں میں فرق

عزیز دوستو: یہ بات یاد رکھئے کہ کورس کی کتابوں اور مطالعہ کی کتابوں کے درمیان ایک نازک فرق ہے وہ یہ کہ کورس کی کتابوں اور نصاب تعلیم پر ایک خاص قسم کی سرکاری مہر یا کسی خاص جماعت کی اور اس کے انتساب کی مہر لگی ہوتی ہے، اس لئے وہ ایک طرح سے حجاب بن جاتا ہے، لیکن مطالعہ کی کتابوں میں ایسا نہیں ہوتا، مطالعہ کی کتابیں اپنے شوق رغبت سے خریدی جاتی ہیں اور ان کا انتخاب مرضی کے مطابق کیا جاتا ہے اور آزادی کے ساتھ وہ پڑھی

جاتی ہیں، اس لئے ہم مطالعہ کی کتابوں اور ان کے مواد کے نتائج کو نظر انداز نہیں کر سکتے، کورس کی کتابوں کی تنقیص یا اس کی تحقیر کوئی کیسے کر سکتے ہے، کورس بہر حال کورس ہے، اس پر محنت کرنی چاہئے، وہی کامیابی و ناکامی کا امتحان اور پیمانہ ہے۔

اسلام کے بارے میں موجودہ دانشور طبقے کے خیالات

غلط کتابوں کے مطالعہ سے جو ذہن تیار ہو رہے ہیں اور جو طبقہ اس وقت دانشور کہلاتا ہے، وہ اس بات کا قائل نہیں کہ اسلام ایک زندہ اور ابدی مذہب ہے اور وہ ہر زمانہ اور تغیر پذیر دنیا میں قیادت کی صلاحیت رکھتا ہے، بلکہ اس کا عقیدہ اور خیال یہ ہے کہ بانی اسلام ایک اچھا مذہب تھا، اس نے آج سے چودہ سو سال پہلے اچھا کام کیا تھا، اس نے زندہ درگور ہونے والی لڑکیوں کو مزید زندہ درگور ہونے سے بچایا تھا، علم کو اس نے عام کیا تھا، لیکن اس جدید دور اور سائنس و ٹیکنالوجی کے اس عہد میں اس کا کوئی کام صحیح نہیں ہے اس زمانہ میں بار بار اسلام کا نام لینا اور شریعت پر عمل کرنے کی دہائی دینا صحیح نہیں ہے، اس طرح کی دعوت گویا زمانہ سے ناواقفیت کی بات ہے، ایسی کتابوں کے مطالعہ کے برعکس ایک صالح و مصلح اور ایک ایمان افروز اور یقین آفرین ادب اور انسانیت ساز اور اخلاق ساز ادب کا مطالعہ اور اس کے نتائج کو دیکھئے کہ ایسے ادب کا مطالعہ اتنا ہی مؤثر اور مفید ہے جتنا وہ مضر اور نقصان دہ ہے، جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔

چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ اللہ تعالیٰ جن سے کام لے رہا ہے اور جن سے اس نے کام لیا ہے، ان میں صلاحیت اور استعداد پیدا ہونے اور ان صلاحیتوں کو بروئے کار لانے میں بہت دخل اس صالح ادب کے مطالعہ کو تھا، جس نے ہمیشہ آڑے وقتوں میں ہلاکت کے آغاز میں گرنے سے بچایا ہے، اس کی میں چھوٹی سے مثال دیتا ہوں۔

جس زمانہ میں الندوہ، مولانا عبدالسلام قدوائی اور ہماری ادارت میں نکل رہا تھا، ہم نے مشاہیر اہل علم سے درخواست کی تھی کہ آپ حضرات ایک مضمون لکھ کر یہ بتائیں کہ آپ کی محسن کتابیں کون سی ہیں تاکہ ہمارے رسالہ کے پڑھنے والے اور طلبہ اس سے فائدہ اٹھائیں، چنانچہ مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا حبیب الرحمان کال شیروانی، مولانا مناظر احسن گیلانی،

مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا اعجاز علی صاحب جیسے علماء ادباء کے ساتھ جدید طبقہ کے بعض اہل علم اور فضلاء کے مضامین اس موضوع پر آئے، یہ تمام مضامین بعد میں الگ سے بھی کتابی صورت میں شائع کر دیئے گئے تھے۔

ان تمام مضامین میں ایک مضمون لاہور کے مشہور فاضل بشیر احمد (آکسن) کا بھی تھا، انھوں نے لکھا کہ جب میں آکسفورڈ میں پڑھتا تھا تو مجھ پر بار بار تشکیک اور الحاد کا حملہ ہوتا تھا، کبھی کیونز م کا حملہ ہوتا تھا، ایسے موقع پر علامہ شبلی کی کتاب الفاروق ہمارے سامنے آ کر کھڑی ہو جاتی تھی کہ وہ شخصیت جس کے بارے میں یہ کتاب لکھی گئی ہے، وہ گمراہ نہیں ہو سکتی۔ وہ شخصیت جس دین پر بھی اور جس کے قلم سے یہ لکھی گئی ہے، اس کو ہم گمراہ نہیں مان سکتے، حق اس کے ساتھ ہے، ہم کو تو اس کی زندگی گزارنی چاہئے اور اس پر مرنا چاہئے، ایسے ہزاروں اور لاکھوں واقعات ملیں گے کہ صحیح مطالعہ بلکہ زبان و علم افروز مطالعہ نے ان کی زندگی میں انقلاب برپا کر دیا۔

کتاب کے اندر علمی وزن، طرز نگارش اور

نفسیات شناسی بھی ضروری ہے

میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ بعض اوقات تنہا ایمانی طاقت کو غذا پہنچانے والی اور ایمان کے نام سے اپیل اور مطالعہ کرنے والی چیزیں کافی نہیں ہوتیں اس کے ساتھ علمی وزن اور طرز نگارش اور نفسیات شناسی بھی چاہئے، جن کتابوں میں ان امور کا لحاظ رکھا گیا، انھوں نے زندگیوں کو بنادیا اور اپنی زندگیوں کے ذریعہ انھوں نے پورے معاشرے پر اثر ڈالا۔

میں دوسروں کے سنے سنائے واقعات کے بجائے خود اپنا واقعہ بیان کرتا ہوں کہ جب میں اردو پڑھنے کے قابل ہو گیا تو سب سے پہلے جس کتاب نے ہمیں متاثر کیا وہ سیرت خیر البشر تھی۔ مین چونکہ مکتبات کی فہرست دیکھنے کا عادی تھا، لکھنؤ میں شبلی بکڈ پو اور بمبئی میں عربی کتب کا واحد مکتبہ قیمہ تھا میں نے فہرست اور رحمۃ للعالمین نامی کتاب کا اشتہار دیکھا جو قاضی سلیمان منصور پوریؒ کی قلم سے لکھی ہوئی تھی، میں نے اس کتاب کا آرڈر دیدیا جب وہاں سے کتاب کی وی پی آئی تو میرے پاس اس کے چھڑانے کے لئے پیسے نہیں تھا، والد صاحب کا

انتقال ہو چکا تھا، والدہ صاحبہ کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ وہ دیتیں، حالانکہ اس زمانہ میں کتابوں کی قیمت بہت کم ہوا کرتی تھی، والدہ صاحبہ نے قیمت دینے سے معذرت کر دی، اب کیا کروں، اس نازک صورتحال دیکھ کر میں ابھی ان خورد سال صحابہ کرام کی طرح رونے لگا جو جہاد میں شامل نہ کئے جانے پر رو رہے تھے، والدہ صاحبہ نے مجبور ہو کر کہیں سے اس کا انتظام کیا اور وہ وی پی ہم نے چھڑالی، ہم نے اس کتاب کو پڑھا، بلکہ ہم اس کتاب میں ڈوب گئے، اس زمانہ میں ہمارے ایک عزیز میڈیکل کالج میں داخل تھے، ہم وہاں رہتے تھے، ایک استغراق کا عالم تھا، کالج کی شاندار عمارت کے بیچ اور سڑکوں پر آنے جانے والوں کی ہمیں کوئی خبر نہیں ہوتی تھی، ہماری آنکھیں ان کے بجائے بدر واحد کے میدانوں کو زیادہ دیکھتی تھیں اور وہاں کی شہادت گاہوں کو دیکھتی تھیں، پروفیسروں اور طلبہ کو دیکھنے کے بجائے ہماری آنکھوں میں بدر واحد کے مجاہدین اور خلفائے راشدین اور صحابہ کرام کا تصور بسا ہوا تھا، ایک طرح سے اس میں اس کتاب میں فنا ہو گیا تھا۔

یہ بھی ایک معمہ ہے جو ابھی تک سمجھ نہیں سکے کہ کانپور میں ۱۹۲۶ء میں ندوۃ العلماء کا سالانہ جلسہ تھا اس میں مولانا سلیمان منصور پوری بھی آئے تھے، انھوں نے ہمارے بھائی صاحب مرحوم سے پوچھا کہ ہم نے آپ کے چھوٹے بھائی ابوالحسن کو کتاب رحمت للعالمین بھیجی تھی وہ ملی یا نہیں ان کے دل میں یہ کیسے خیال کہ ان کا چھوٹا بھائی اس کتاب کو پڑھے گا اور اسے فائدہ ہوگا۔

ہمارے گھر پر اللہ تعالیٰ کا خاص فضل تھا کہ ہمارے چچا سید فاروق صاحب کے گھر میں مولانا شبلی، مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا حالی وغیرہ کی کتابیں تھیں، ان میں الفاروق اور الغزالی بھی تھی، اور حیات سعدی بھی، ایک اور کتاب تھی، ارشاد رحمانی جو مولانا سید محمد علی مونگیری بانی ندوۃ العلماء کی کتاب تھی، جس میں انھوں نے اوّل زمانہ مولانا فضل الرحمن گنج مراد آبادی کی خدمت میں اپنی حاضری، ان کی نگاہ شفقت اور ان کی تاثیر اور برکتوں کا ذکر کیا ہے، اس کتاب نے بھی پر بڑا اثر ڈالا پھر اور کتابیں دیکھنے میں آئیں، اس کے بعد زمانہ آیا جب ہم نے انگریزی اتنی پڑھ لی کہ جدید مغربی مصنفین کی کتابوں سے استفادہ کر سکیں۔

ہم یہاں آپ کو ایک حقیقت سے باخبر کرنا چاہتے ہیں، ایک چیز ہوتی ہے،

فیکٹر FACTOR اور دوسری چیز ہوتی ہے ایکٹر ACTOR، ہم نے اپنی کتاب مازا خسر العالم یا خطاط المسلمین کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ عام طور پر یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ مسلمان خربوزہ کی طرح ہے، وہ چھری پر گرے تو اس کا نقصان اور چھری اس پر گرے تو خربوزے کا نقصان یعنی مسلمانوں میں صرف اثر قبول کرنے کی صلاحیت ہے اثر ڈالنے کی نہیں، ہمارے گھر میں جو ما حول تھا وہ اعتدال اور توازن اور حقیقت پسندی کا تھا ایک طرف ہمارے بھائی صاحب تھے جو ندوہ کے فاضل، دیوبند کے فاضل، دوسری طرف سائنس کے بہترین طالب علم میڈیکل کالج میں امتیاز کے ساتھ انھوں نے امتحانات پاس کئے، اور انھیں سونے کا تمغہ بھی ملا تھا، دوسری شخصیت ہمارے پھوپھا مولانا سید طلحہ صاحب کی تھی جو ایک طرف ایم اے تھے تو دوسری طرف شرقی علوم کے فاضل ان دونوں کی گفتگو میں بڑا توازن اور حقیقت پسندی تھی۔

مغربی تہذیب کا سو فیصدی انکار صحیح نہیں ہے

یہ نکتہ آپ یاد رکھئے کہ محض مبالغہ اور رادعا سے کام نہیں چلتا، یہ چیز اکثر مضمر ہوتی ہے، مثلاً یہ کہہ دیا جائے کہ مغربی تہذیب کچھ نہیں، اس میں کوئی چیز قابل استفادہ نہیں، بھوک مارنے کی چیز ہے، لیکن جب آدمی کو اس کے خلاف کوئی ثبوت ملے گا یا اس کو تجربہ ہوگا، سائنس کی ترقی اور اس کے فوائد کا وہ پھر منکر ہو جائے گا، اس لئے یہ حقیقت ان لوگوں کے سامنے رکھنی چاہئے جو دعوت تربیت کا کام کرتے ہیں، کہ انھیں توازن و اعتدال اور حقیقت پسندی سے کام لینا چاہئے، نہ یہ کہ انکار پر آئے تو سو فیصدی انکار کہ اس مغربی علوم میں کوئی خوبی نہیں، مغربی علوم میں بہت سی چیزیں قابل استفادہ ہیں اور قابل قدر ہیں، ان کی ضرورت ہے، لیکن وہ انسانیت کی رہنمائی کے لئے کافی نہیں ہیں، ان کی اخلاقی عنصر اور ان کے اندر تربیتی صلاحیت، خوف خدا پیدا کرنے اور ضمیر کو بیدار کرنے کی صلاحیت نہیں ہے، یہ حقیقت بھی یاد رکھئے کہ عدم توازن بعض اوقات ارتداد تک پہنچا دیتا ہے، اور یہ آدمی کا رخ بدل دیتا ہے، ان دونوں حضرات کی محبت اور گفتگو سے حقیقت پسندی پیدا ہوئی، میں نے امریکی مصنف ڈریپر کی مشہور کتاب ”معرکہ مذہب و سائنس اور لیبکی کی ”تاریخ اخلاق یورپ“ پڑھی ان دونوں کتابوں کے مطالعہ سے یورپ ذہن کو سمجھنے میں بڑی مدد ملی، مغربی تہذیب اور اس کے عوامل و محرکات کو سمجھنے کے

لئے ان دونوں کتابوں کا مطالعہ بہت ضروری ہے، مذہب و سیاست کے درمیان کشمکش کے موضوع پر علامہ اقبال نے کہا ہے۔

خصوصیت تھی سلطانی و راہبی میں
کہ وہ سر بلندی ہے یہ سر بزیری
سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا
چلی کچھ نہ پیر کھیا کہ پیری
ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی
ہوں کی امیری ہوں کی وزیری
یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشین کا
بشیری ہے آئینہ دار نذیری
اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی
کہ ہوں ایک جنیدی دارو شیریں

مسیحی مذہب اور اس کے اجارہ دار کلیسا کے اندر یہ صلاحیت ہی نہیں تھی کہ وہ زندگی کی رہنمائی کرتا اس کی وجہ سے کلیسا اور سیاست کے درمیان ایک رقابت بلکہ محاذ آرائی ہونے لگی، کلیسا میں کیا کمزوریاں تھیں اور سیاست کیا چاہتی تھی اور اس دور میں سیاست تھی اس کتاب میں معرکہ مذہب و سائنس سے ہمیں بڑا فائدہ پہونچا۔

دوسری کتاب تاریخ اخلاق یورپ کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوا کہ یورپ کے اخلاق اور اس کے معاشرہ کی تشکیل میں مادہ پرستی کا جو کردار رہا ہے، اس کے اسباب و عوامل کیا ہیں، وہ اس کتاب سے معلوم ہوا۔

پھر ایک تیسری کتاب لندن یونیورسٹی میں شعبہ کے صدر کی کتاب AGUIDTO MODERN WICKEDNESS پڑھنے کو ملی جس میں اس نے بتایا ہے کہ اس وقت کی خباثت کیا ہے، دوسری کتاب A NEW PHILOSOPHY FOR OUR TIMES پڑھنے کو ملی جس سے بڑا فائدہ ہوا۔

یہ دونوں کتابیں مولانا عبدالماجد دریا بادی کے ذریعہ ملیں۔

یہ توجہ جملہ معترضہ تھا، بتانا آپ کو یہ ہے کہ ان کتابوں کے مطالعہ نے یہ صلاحیت ہی بلکہ داعیہ اور داعیہ ہی نہیں بلکہ ایک اضطراری کیفیت پیدا کی، ہم ایسی کتاب لکھیں جس میں یہ بتایا گیا ہو کہ مسلمانوں کا ارتقاء اور عروج کا اور مسلمانوں کا انحطاط دنیا کے اخلاقی، انسانی، معنوی، دینی، مذہبی، معاشرتی اجتماعی، اور سیاسی ہر طرح کے انحطاط کا سبب ہے، یہ موضوع بالکل نیا تھا، بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ یہ القاء تھا اللہ تبارک تعالیٰ کی طرف سے اس کو لکھا ہماری حقیر ذات سے کچھ کام لینا تھا، ممالک عربیہ میں، یہ کتاب اللہ تعالیٰ نے لکھوائی، عرب نو جوانوں اور دانشوروں اور مفکرین نے پڑھا، سید قطب جیسے چوٹی کے لوگ جو وہاں تھے، انھوں نے جس نظر سے دیکھا پھر اس کتاب سے نئے طبقہ پر جو اثر پڑا جس احساس کمتری میں عرب ممالک کے نو جوان ادیب اور اہل قلم مبتلا ہو رہے تھے، اس میں فرق پڑا اس کے بعد اور کتابوں کے لکھنے کی توفیق ہوئی۔

چند بنیادی کتب جن کا مطالعہ ضروری ہے

اب میں چند کتابوں کے نام لیتا ہوں، آپ ان کتابوں کا ضروری مطالعہ کریں، ایک تو آپ سیرت کے موضوع پر علامہ شبلی اور مولانا سید سلیمان ندوی کی کتابیں ہیں، اس کتاب ”سیرت النبیؐ“ کو اول درجہ کی کتاب عرب ممالک میں مانا گیا ہے، سید صاحب کی کتاب خطبات مدراس کا ضروری مطالعہ رکھیں، اس کے ساتھ صحابہ کرام، خلفائے راشدین کی سیرت پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں، انہیں اپنے مطالعہ میں رکھیں، علامہ شبلی کی الفاروق، مولانا حبیب الرحمن خان شیروانی کی سیرۃ الصدیق اور ہماری حقیر تصنیفات میں المرتضیٰ، ماذا خسر العام اور اس کا ترجمہ انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر مسلمان ممالک میں اسلامیت و مغربیت کی کشمکش ضرور پڑھیں، یہ وہ بنیادی کتابیں ہیں، جو آپ کے ذہن سے اپنے نظام تعلیم، نظام فکر اور اس سے آگے بڑھ کے اسلامی تعلیمات اور اسلامی ہدایات کے بارے میں اگر احساس کمتری ہے اس کو دور کریں گے، تاریخ دعوت و عزیمت کے پانچوں حصے بھی آپ پڑھیں، میں بغیر کسی تواضع اور معذرت کے کہتا ہوں کہ یہ اپنے موضوع پر بالکل منفرد کتاب ہے، ابھی تک کسی اسلامی زبان میں اس طرح تاریخی تسلسل، دینی و تاریخی، نقطہ نظر اور بحث و تحقیق کے ذریعے پھر مؤثر طریقے سے مصلحین امت اور مجددین ملت کا تذکرہ نہیں لکھا گیا،

اس کا انگریزی، عربی، ترکی و فارسی میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔

نقوش اقبال یا روائع اقبال بھی آپ پڑھیں ابھی جو نظم پڑھی گئی اس سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ اقبال کو عشق رسول سے حصہ وافر ملا تھا، میں دو مرتبہ ان سے ملا ہوں اس وقت بہت کم لوگ زندہ ہوں گے جو اقبال سے ملے ہوں، اللہ تعالیٰ نے مجھے موقع دیا، میں ان کی مجلس میں بیٹھا، ان کی باتیں سنیں، ان کے انتقال سے چند مہینے پہلے ان سے ملا تھا، مدینہ منورہ کا نام سن کر ان کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے تھے۔

ایک مار مدینہ منورہ میں مجھے بعد نماز مغرب تقریر کے لئے مدعو کیا گیا، مجھے شرم آئی کہ میں اللہ کے محبوب رسول کے علاوہ اگر کسی اور شخصیت بارے میں یہاں تقریر کروں تو یہ زمین میں گڑ جانے کی بات ہے اور سخت شرمندگی اور تائب ہونے کی بات ہے، میں نے اپنی تقریری میں کہا کہ جو ار رسول میں غیر رسول پر تقریر کرنے کا اگر جواز ہے تو یہ کہ جس شخصیت (اقبال) کے بارے میں میں تقریر کرنے جا رہا ہوں وہ عاشق رسول تھے، پھر میں نے دو شعر ان کے فارسی کے پڑھے۔

بایں پیری رہ میرت گر فتم
نواخوں از سرور عاشقانہ
چو آں مرغی کہ در صحرای سر شام
کشاید پر بہ فکر آشیانہ

میں بڑھاپے میں مدینہ کی طرف چلا تو لوگوں نے کہا کہ یہ عمر اور مدینہ کا سفر، یہ عمر اور عرب کا سفر کہاں جا رہے ہو اور کیا سوچ رہے ہو، میں نے کہا کہ پرندہ دن بھر اڑتا رہتا ہے، مارا مارا پھرتا ہے، لیکن شام ہوتے ہی وہ تیز کی طرح اپنے آشیانہ کی طرف جاتا ہے، میں بھی اپنے آشیانہ کی طرف جا رہا ہوں۔

مولانا مودودی نے لکھا ہے کہ مہاراجہ کیپور تھلہ نے فارسی میں کسی قانونی دستاویز پر انگریزی میں ترجمہ کرائے کیلئے ڈاکٹر اقبال کو بلایا ان کی رہائش کے سارے انتظامات کئے، رات کو اچانک مہاراجہ کو خیال آیا کہ کہیں ڈاکٹر صاحب کو کوئی ضرورت نہ ہو یہ دیکھنے کیلئے جب گئے تو دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب مسہری پر آرام کرنے کے بجائے زمین پر لیٹے ہوئے ہیں، مہاراجہ نے

کئی بار پوچھا تو انہوں نے کہا کہ مجھے خیال آیا کہ میرے آقا تو زمین پر لیٹتے تھے میں چارپائی پر لیٹوں، مجھ سے لینا نہیں گیا۔

کلیات اقبال ضرور پڑھئے

اس لئے آپ کو مشورہ دوں گا کہ کلام اقبال میں بال جبرئیل اور ضرب کلیم ضروری پڑھئے، فکر کا بھی فائدہ ہوگا، اور ادبی فائدہ بھی ہوگا، ہم نے بعض عرب فضلاء کو دیکھا ہے کہ وہ روائع اقبال کے صفحے کے صفحے زبانی پڑھتے تھے، ان میں عمان کے مفتی خلیلی بھی ہیں۔

حیۃ الصحابہ کی افادیت

مولانا یوسف صاحب کی مقبول ترین کتاب ”حیۃ الصحابہ“ آپ ضروری پڑھیں، اس میں صحابہ کرام کے مؤثر اور طاقتور ترین واقعات ہیں اس کتاب کے پڑھنے سے احساس کمتری کے دور کرنے میں مدد ملے گی۔

ہمارا رسالہ اسلامی بیداری کی لہر یا عربی تحریر ترشیدہ الصحوة الاسلامیہ ضرور پڑھیں، اس وقت دینی جماعتوں میں کیا کمزوریاں ہیں، مسلمانوں کے کیا طبقات ہیں، اور ان کی ضرورتیں کیا ہیں، ان کے عقلی مدارک کیا ہیں اور کس زبان اور کس مواد کی روشنی میں ان سے بات کرنی چاہئے، اور کس لہجہ میں ان سے خطاب کرنا چاہئے، اس میں بتایا گیا ہے کہ بہت سی تحریکیں جمود توڑنے کے لئے پیدا ہوئی ہیں لیکن خود جمود کا شکار ہو جاتی ہیں، ان پر کافی جم جاتی ہے، جیسے ساحل پر کافی جم جاتی ہے، اس کا کافی کوئی مرتبہ ہٹانا کافی نہیں ہوتا بلکہ بار بار دیکھنا چاہئے، آپ کو چونکہ دعوتی کام کرنا ہے، اس لئے ان کتابوں کو پڑھنے سے آپ کی ذہن سازی ہوگی، اور آپ کو فکری غذا فراہم ہوگی، دعوت کے موضوع اور مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ اور نشاۃ اسلامیہ پر ہمارے مقالات اور تقریروں کا مطالعہ کریں۔

والخر وعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

مدرسہ دینیہ سے فارغ ہونے والے طلباء کے نام

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسن ندوی نور اللہ مرقدہ نے دارالعلوم ندوۃ العلماء سے فارغ ہونے والے طلباء کے سامنے درود بھرے لہجے میں ناسخانہ اور عالمانہ انداز میں یہ فکر انگیز الوداعی تقریری ۸ دسمبر ۱۹۹۶ء میں فرمائی، جو افادۂ عام کی غرض سے بدیہ ناظرین کی جارہی ہے

الحمد لله نحمده و نستعينه و نستغفره و نو من به و نتوكل عليه و نعوذ بالله من شرر انفسنا و من سيأت اعمالنا من يهده الله فلا مضل له و من يضل الله فلا هادي له و نشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له و نشهد ان سيدنا و مولانا محمد اعبده و رسوله صلى الله تعالى عليه و على آله واصحابه اجمعين اما بعد .

فرزندان عزیز! میں اس مجلس کے لئے اور یہاں سے فارغ ہو کر جانے والوں کے لئے اس سے بہتر پیغام اور اپنے مطالعہ و معلومات اور اپنے علمی ذوق و جستجو میں اسے بڑھ کر کوئی وصیت نہیں پاتا جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر پر جانے والے صحابہؓ سے فرمایا تھا ”استودعک اللہ دینک و امانتک و خواتیم اعمالک“ میں اللہ کے حوالے کرتا ہوں تمہارا دین، تمہاری امانت اور تمہارے خواتیم اعمال۔ ان الفاظ میں لفظ امانت ایسا ہے جس کے مفہوم کو ایک مفرد لفظ سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ ضمیر کی بیداری، احساس فرض، فرائض کی ادائیگی، اللہ تعالیٰ کا خوف، انسانوں سے محبت، احکام الہی کا احترام اور ان پر عمل، یہ سب مفاہیم اس ایک لفظ میں شامل ہیں، قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، ”انا عرضنا الامانتہ علی السموات و الارض و الجبال فابین ان یحملنها و اشفقن منها و حملها الانسان انه کان ظلوماً جهولاً“۔

ہم نے (بار) امانت آسمانوں اور زمین پر پیش کیا تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور انسان نے اسے اٹھالیا بے شک وہ ظالم اور جاہل تھا (انزاب)

عزیزو! میں آپ سے کہتا ہوں کہ آپ ان تینوں چیزوں کو گرہ میں باندھ لیجئے بلکہ لوح دل پر لکھ

لیجئے دین امانت اور حسن خاتمہ، ان میں خواتیم اعمال کی ذمہ داری آپ پر اس طرح نہیں ہے جس طرح دین و امانت کی ذمہ داری آپ پر ہے یہ اللہ تعالیٰ کے کرنے کی چیز ہے، لیکن اس کے لئے بھی کچھ اسباب ہیں، کچھ صفات و خصوصیات ہیں جن کا آپ کے اندر ہونا ضروری ہے۔ وہ ہے آپ کا طرز عمل، آپ کا عقیدہ اور آپ کا عمل ہوگا تو اللہ کی طرف حسن خاتمہ کا فیصلہ ہوگا۔ وہی حسن خاتمہ نصیب کرے گا شرط یہ ہے کہ ان بنیادی صفات سے آپ متصف ہوں جن پر حسن خاتمہ کا انحصار ہے۔

اپنا وقار بلند کریں

عزیزو! میں صاف صاف آپ سے کہتا ہوں اور اس میں کسی اشارے کنائے سے کام نہیں لیتا، آپ نماز پنجگانہ کی پابندی کریں، نوافل تسبیحات، کو بھی ترک نہ کریں، تاکہ معلوم ہو کہ آپ کسی دینی درس گاہ سے پڑھ کر آئے ہیں مسجد کی طرف جانے میں، بلکہ تمام کاموں میں ثواب کی نیت سے کریں۔ یہ اس لئے کہہ رہا ہوں کہ جو منزلیں اور جو امتحان و آزمائشیں آپ کو پیش آنے والی ہیں۔ اور یہ ملک بلکہ ملت اسلامیہ جس راستہ سے گزر رہی ہے۔ پھر معاشی ذمہ داریاں، خاندان کی پرورش کا مسئلہ، پھر جو اخلاقی بیماریاں اور امراض ہیں وہ سب نماز کی ادائیگی میں فرق پیدا کر سکتے ہیں اور اس کی طرف سے توجہ ہٹا سکتے ہیں۔ مگر اس نماز سے بھی پہلے بنیادی اہمیت عقیدہ توحید کی ہے آپ کا عقیدہ خالص اور بے آمیز توحید کا عقیدہ ہو اس سلسلہ میں مسلک ولی اللہ آپ کا معیار اور شاہ اسماعیل شہید کی کتاب تقویۃ الایمان آپ کا دستور العمل ہو۔ اس عقیدہ پر ہماری جماعت کی بنیاد پڑی ہے۔ اس دور میں کم سے کم ہندوستان بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ ایشیاء اور پورے مشرق میں جو فکر سب سے زائدہ عمیق اور علمی بنیادوں پر استوار اور اسلام کی کلی تعبیر اور صحیح تعبیر کے لحاظ سے، نیز سب سے زیادہ مفید، قابل عمل اور وقت کے اعتبار سے زندہ اور طاقتور بھی ہے شاہ ولی اللہ کے مسلک سے بہتر کوئی مسلک نہیں، آپ حجتہ اللہ البالغہ کا مطالعہ بھی کریں جس میں نظام عبادات کی مربوط تشریح کی گئی ہے ہمارے کتاب دعوت و عزیمت کا وہ حصہ خاص طور پر پڑھیں جو شاہ ولی اللہ دہلوی سے متعلق ہے اس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ فکر ولی اللہ سے بڑھ کر ترقی یافتہ عالمانہ، محققانہ، حقیقت پسندانہ کوئی اور مکتب تجدید و اصلاح اور مکتب دعوت نہ صرف ہندوستان بلکہ پورے عالم اسلام میں ان کی نظیر

نہیں آپ اس مسلک کو اپنائیں اور اس کو دستور العمل بنائیں۔

زہد و استغنا کی ایسی مثال قائم کریں کہ.....!!

تیسری بات یہ ہے کہ آپ زہد و استغنا کی ایسی مثال قائم کریں کہ بڑی سے بڑی حکومت و سلطنت آپ کو خرید نہ سکے، اس دین کے اب تک باقی رہنے کا راز بھی یہ ہے کہ ربانی و حقانی علماء کو آج تک کوئی خرید نہیں سکا۔ شیخ سعید حلبی کا مشہور واقعہ ہے کہ وہ جامع اموی میں بیٹھے درس دے رہے تھے، ان کے پاؤں میں تکلیف تھی جس کی بناء پر پاؤں پھیلائے ہوئے تھے۔ کہ اتنے میں شام کا گورنر آیا جو بڑا سفاک اور جبار قسم کا حکمران تھا اور معمولی بات پر گردن اڑا دیا کرتا تھا شیخ اسی حالت میں درس دے الگ رہے تھے کہ گورنر اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ آیا۔ وہ کچھ دیر تک حلقہ درس کے پاس کھڑا دیکھتا رہا، شیخ بے نیازی سے اپنے کام میں مصروف تھے، یہ صورت دیکھ کر طلباء نے کپڑے سمیٹ لئے کہ کہیں اسی مجلس میں ہمارے شیخ صاحب کی گردن نہ اڑا دی جائے۔ جس کے خون کے چھینٹے ہمارے کپڑوں پر پڑ جائیں۔ گورنر تھوڑی دیر کھڑا رہ کر واپس چلا گیا۔ اس نے وہاں سے اشرافیوں کا توڑا شیخ کو بھیجا کہ یہ قبول کر لیں، شیخ صاحب نے وہ توڑا یہ کہتے ہوئے واپس کر دیا کہ تم اپنے آقا سے سلام کہنا اور یہ کہنا کہ پاؤں پھیلاتا ہے وہ ہاتھ نہیں پھیلاتا۔“

”سلم علی مولاک و قل له من یمدرجلہ لا یمدیده“

اسی طرح کا ایک قصہ خولجہ نظام الدین اولیا کا ہے کہ ان کو سردیوں میں دھوپ لینے کی ضرورت تھی۔ سڑک کے کنارے کی طرف رخ کر کے پاؤں پھیلائے ہوئے بیٹھے تھے۔ معلوم ہوا کہ بادشاہ کی سواری گزرنے والی ہے، لوگوں نے عرض کیا کہ ابھی بادشاہ کی سواری گزرنے والی ہے آپ پاؤں سمیٹ لیتے تو اچھا تھا آپ نے یہ سن کر بڑا بلغ جملہ کہا ”جو ہاتھ سمیٹ لیتا ہے اس کو پاؤں سمیٹنے کی ضرورت نہیں“ یعنی بادشاہ کی مدد سے جو ہاتھ سمیٹ لے اس کی کوئی مدد قبول نہ کرے تو پھر اس کو پاؤں سمیٹنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

آپ اپنے کو پوری طرح آزاد رکھئے۔ کسی حکومت کی سرپرستی، اور کسی مالی سرچشمہ اور سرپرستی سے آزاد رہئے۔ اس وقت یہ عام ہوا چلی ہوئی ہے عربی پڑھنے والے خلیجی ملکوں میں جاتے ہیں اور خاص طور پر سعودی عرب جاتے ہیں تاکہ بڑی نوکری تلاش کریں۔ میں بڑی

صفائی سے کہتا ہوں کہ اس ملت کا سب سے بڑا فریضہ اور وقت کا جہاد یہ ہے کہ جس کی اللہ تعالیٰ کے یہاں بڑی قدر و قیمت ہوگی۔ آپ بلاد عربیہ دعوت دینے کیلئے جائیں، جہاں سے ہمیں ایمان کی دولت ملی، ان عربوں کو ان کا فریضہ یاد دلانے کیلئے جائیں، آپ کے عربی پڑھنے کی یہی قیمت ہے، الحمد للہ یہاں ایسا لڑیچر تیار ہو گیا ہے جس نے وہاں تک ہماری آواز پہنچائی۔ عرب قوم پرستی کے خلاف سب سے زیادہ مؤثر اور طاقتور آواز ندوۃ العلماء سے بلند ہوئی۔

اپنے ضمیر کو آزاد رکھیں

عزیزو! آپ اپنے ضمیر کو آزاد رکھیں اور اپنے جسم کو بھی آزاد رکھیں، اس وقت بہت بڑا خطرہ پیدا ہو گیا ہے وہ خطرہ یہ ہے اماموں اور مؤذنین کی تنخواہوں کیلئے باقاعدہ تحریک چلائی جا رہی ہے۔ کہ انہیں حکومت کے خزانے سے تنخواہیں اور تمام سہولتیں دی جائیں۔ اس کا مطلب یہی ہوگا کہ اماموں سے الیکشن کے موقع پر کام لیا جائے گا۔ مسلم پرسنل لاء سبورڈ کے خلاف کام لیا جائے گا۔ اس لئے کہ جب مساجد محکمہ اوقاف کے ماتحت ہوں گی اور وہ سرکاری ملازم قرار پائیں گے تو ایسے ائمہ مساجد کے منبروں سے آزادی کے ساتھ دین کی بات نہیں کہہ سکیں گے۔ اس لئے آپ اپنے دین کی حفاظت کیجئے، عقائد کے لحاظ سے بھی اور اعمال کے لحاظ سے بھی، حقوق کے لحاظ سے بھی اور فرائض کے اعتبار سے بھی

امانتک: کا مطلب یہ ہے کہ ملت کی طرف سے، اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے آپ پر کیا ذمہ داریاں ڈالی گئی ہیں ملت کن خطرات سے گزر رہی ہے، کس وادی خار سے گزر رہی ہے۔ آج مسلم پرسنل لاء کو مٹانے کی کیسی کیسی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ مشرکانہ تعلیم کے ذریعہ، جبری طور پر نئی نسل کو کس طرح غی سانچہ میں ڈھالنے کی سر توڑ کوشش ہو رہی ہے۔ اور یہ منصوبہ ہر جگہ تیار ہے کہ مسلمان صرف نام کے باقی رہیں باقی ان کی تمام خصوصیتیں ختم ہو جائیں۔ اس ملک کو اسپین بنانے کی زبردست سازش کی جا رہی ہے۔ آپ کو اصلاح معاشرہ کا کام بھی کرنا ہے۔ کہ یہ بھی ونیکم میں شامل ہے۔ اس وقت جاہلی رسوم و رواج و با کی طرح پھیلے ہوئے ہیں ہیں دولت پرستی اس حد تک بڑھ چکی ہے کہ معمولی چیز کی خاطر جانیں لی جا رہی ہیں۔ آپ کو اس مہم کے خلاف بھی مہم چلانی ہے۔ بلکہ اس مہم کی پوری ذمہ داری آپ کو قبول کرنی ہے، پھر ثقافتی اور فکری لحاظ سے ہندوستان میں ملت اسلامیہ کی آپ کو حفاظت کرنی ہے،

رسم الخط اور کلچر کے لحاظ سے بھی اور زبان کے اعتبار سے بھی، اگر آپ قربانیاں دیں گے زہد و استغنا سے کام لیں گے تو اللہ تعالیٰ آپ کی مدد فرمائے گا۔ یہ ملت اپنے تشخصات کے ساتھ باقی رہے گی، اور یہ دین باقی رہنے کے لئے آیا ہے، اس وقت یہودیت، عیسائیت، ہندو ازم، بودھ ازم، یہ تمام ادیان و مذاہب نہ صرف بدل گئے بلکہ ان کی اصل شکل ایسی بگڑ گئی کہ ان کو پہچاننا ممکن ہو گیا ہے، پھر ان مذاہب و ادیان میں طویل عرصہ سے اصلاح و تجدید کی کوئی تحریک بھی نہیں اٹھی ہے، اسی وجہ سے یہ سب مٹ گئے۔ صرف اسلام اپنی اصل شکل میں روح کے ساتھ باقی ہے، عائد سے لے کر فرائض تک، سنن سے لے کر مستحباب تک، اخلاق سے لے کر معاملات اور تہذیب تک سب باقی ہے قرآن باقی ہے اور اس کی زبان باقی ہے۔ اس کے ایک ایک حرف بلکہ حرکات و سکنات تک باقی ہیں، اس کی بنیادی وجہ ایک تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی بقاء کی ذمہ داری لی ہے اور فرمایا کہ اسلام ایک مکمل اور پسندیدہ دین ہے ”ان الدین عند الاسلام“ اور ”الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم اسلام دینا“ (دین تو خدا کے نزدیک اسلام ہے) (آج ہم نے تمہارے لئے تمہارا دین کامل کر دیا اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کر دیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ مجددین اور مصلحین کا تسلسل ہے جو اس امت کی تاریخ میں کبھی ٹوٹے نہیں پایا۔ یہ واحد دین ہے جس میں کوئی صدی اور کوئی ملک خالی نہیں رہا اگرچہ اس کا پورا استیعاب نہیں کیا گیا لیکن ہندوستان کی حد تک استیعاب سے کام لیا گیا ہے ہماری کتاب دعوت عزیمت میں دوسرے ملکوں کے مجددین کا بھی ذکر ہے۔

اسی مادر علمی سے رشتہ نہ ٹوٹے۔

آخر میں آپ سے کہوں گا کہ اپنے ادارے سے تعلق رکھئے، بہت سے لوگ ہیں جو فارغ ہونے کے بعد یہاں آئے بھی نہیں، اس کا منہ نہیں دیکھا اور نہ معلوم کیا اس پر کیا گزری اور کیا گزر رہی ہے، اس کے ساتھ میں یہ بھی کہوں گا کہ اپنا مطالعہ جاری رکھئے کہ علم کا سفر کبھی ختم نہیں ہوگا، علم برابر تازہ ہوتا رہتا ہے، اس میں ترقی بھی ہے، تغیر بھی ہے، پھیلاؤ بھی ہے، یہاں کے ترجمان ”البعث“ ”الرائد“ اور تعمیر حیات کا مطالعہ کیجئے، دارالمصنفین اور مجلس تحقیقات و نشریات اسلام نے ماشاء اللہ اچھا خاصا لٹریچر تیار کر دیا ہے، آپ اس کو پڑھیں اور فائدہ

اٹھائیں۔ ندوۃ العلماء کے قیام میں وقت اور نبض شناسی اور ملت کی حاجت جیسے محرکات شامل ہیں، یہی محرکات تھے جنہوں نے عالم ربانی مولانا محمد علی مونگیریؒ کے دل میں تحریک پیدا کی، چونکہ وہ عیسائیت کے رد میں مناظرے بھی کرتے تھے۔ اس سے اندازہ ہوا کہ انگریزی زبان سے اور انگریزی مصنفین کے اسالیب سے واقفیت ضروری ہے۔ چونکہ مشتر قین ایک خاص مقصد کیلئے کام کر رہے ہیں اور بڑی ذہانت اور ہوشیاری سے مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ کو متاثر کر رہے ہیں، اس لئے کہ وہی طبقہ اقتدار میں آتا ہے۔ بلا دعر بیہ میں اس وقت وہی طبقہ پر سر اقتدار ہے جو یورپ امریکہ کا تعلیم یافتہ ہے اس لئے ایسی صورت میں ہمیں اس کی خاص طور پر تیاری کرنی ہوگی کہ ایسا لٹریچر تیار کریں جو تعلیم یافتہ طبقہ کے ذہنوں کو متاثر کرے اور اسلام کی ہر دور میں انسانی قیادت کی صلاحیت پر ایمان ان کے دل و دماغ میں راسخ کرے، اس طبقہ کو مطمئن کرنے کی تیاری بھی آپ کے ذمہ ہے حالات اور رجحانات کا برابر محاسبہ کرتے رہنا بھی ندوی فضلاء کی ذمہ داری ہے آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ طبقہ کون سی زبان سمجھتا ہے، کون سے دلائل اس کے سامنے پیش کرنے چاہئیں کس اسلوب میں اس سے گفتگو کرنی چاہئے، اس مجلس میں جن عزیزوں نے اپنے تاثرات مقالے عربی اور اردو میں پیش کئے اور تقریریں کی گئیں وہ ہماری توقع سے بڑھ کر تھیں، امید ہے کہ یہ استعداد نہ صرف قائم رہے گی بلکہ مزید ترقی کرے گی۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

علمائے حق نے وراثت نبوت کا حق کس طرح ادا کیا؟؟

الحمد لله نحمده و نستعينه و نستغفره و نو من به و نتوكل عليه و نعوذ بالله من شرر افسنا و من سيأت اعمالنا من يهده الله فلا مضل له و من يضل الله فلا هادي له و نشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له و نشهد ان سيدنا و مولانا محمد اعبده و رسوله صلى الله تعالى عليه و على آله واصحابه اجمعين اما بعد .

دین خالص

علمائے حق حضرات انبیاء اعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے وارث و جانشین ہیں ”العلماء ورثة الانبياء“ اس کی وراثت اور نیابت اسی وقت صحیح اور مکمل ہوگی جب ان کے زندگی کا مقصد، اور ان کی کوششوں کا مرکز وہی ہوگا جو انبیاء کرام کا تھا۔ وہ مقصد زندگی اور وہ مرکز سعی و عمل کیا ہے دو لفظوں میں ”دین خالص“ یا ایک لفظ میں ”توحید“ یعنی اللہ کی خالص عبادت اور کامل اطاعت جو تنہا اسی کا حق ہے اس کو اپنی ذات سے عمل میں لانا، اور دوسروں میں اس کیلئے جدوجہد کرنا۔

”الا لله الدين الخالص“ و يكون الدين لله“

وما ارسلنا من قبلك من رسول الا نوحي اليه انه لا اله الا فاعبدون

(انبیاء رکوع ۲)

اور ہم نے آپ سے پہلے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا کہ میرے سوا کسی کو بندگی نہیں، پس میری ہی بندگی کرو۔

دین خالص سے نفرت

دین الہی سے انحراف کا ایک عام سبب غفلت ہے اللہ سے بے تعلقی اور اس کے احکام و فرائض سے بے توجہی کا سبب ہمیشہ بغاوت و کفری ہی نہیں ہوتا، بلکہ اکثر اوقات دنیا پرستی اور مادیت ہوتی ہے عزت و جاہ کا سودا، دولت کا عشق اور معاش میں سر تپا انہماک آدمی کا مادہ سے بالکل غافل کر دیتا ہے مادیت کا ایسا غلبہ ہوتا ہے کہ سرے سے نجات کا خیال، رضائے الہی

کے حصول کا شوق اور اس کے عذاب کا خوف دل سے بالکل نکل جاتا ہے، اور کھانے پینے اور رہنے کے سوا دنیا میں کوئی فکر باقی نہیں رہتی، خدا سے غافل لوگوں کی صحبت اور گناہوں اور عیش میں انہماک دل کو ایسا مردہ کر دیتا ہے کہ دینی اور اخلاقی حس باطل ہو جاتی ہے، نیک و بد اور حلال و حرام کی تمیز جاتی رہتی ہے، ایسے غافل اپنے اخلاق و اعمال، سیرت و کردار، معاشرت و آداب، اور وضع صورت میں کافروں اور اللہ کے باغیوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں رہتے۔ شراب کے بے تکلف دور چلتے ہیں، منہیات و محرمات کا آزادی کے ساتھ ارتکاب کیا جاتا ہے۔ جرائم اور فسق و فجور میں نئی نئی ایجادات کی جاتی ہیں اور ان میں ایسی ذہانت اور ہنرمندی کا اظہار کیا جاتا ہے کہ پرانی امتیں ان کے سامنے مات ہو جاتی ہیں۔ شرح و دین کی کوئی حرمت باقی نہیں رہتی، ایسے خدا فراموشی اور خود فراموشی طاری ہو جاتی ہے کہ بھول کر بھی خدا یاد نہیں آتا اور اپنا بھی حقیقی ہوش نہیں رہتا۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنْسَاهُمْ

ان لوگوں کی طرح نہ ہو، جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا، اللہ نے ان کو خود فراموش بنا دیا

(حشر ع-۲)

یہی وہ لوگ ہیں جن کا حال اللہ نے اس آیت میں بیان کیا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَ إِيَّائِي وَرَضُوا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاطْمَأَنَّنُوا بِمَا فِي أَيْدِيهِمْ
هَمٌّ عَنْ آيَاتِنَا غَافِلُونَ

(یونس ع-۱)

بے شک جو لوگ ہم سے ملنے کی امید نہیں رکھتے اور دنیا کی زندگی میں مگن اور مطمئن ہیں جو لوگ ہمارے نشانیوں سے غافل ہیں۔

نتیجہ و عملاً ایسے غفلت شعار اور آخرت فراموش، منکرین آخرت اور اللہ و رسول سے بغاوت کرنے والوں سے ممتاز نہیں ہوتے، پیغمبروں کی دعوت کے لئے بھی ان کا وجود بھی اسی قدر بے سود اور بعض اوقات سنگ راہ ہوتا ہے جس طرح مکذبین و منکرین اور بعض اوقات یہ مدعیان اسلام، اسلام کے خلاف حجت اور تبلیغ اسلام کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ پھر اس سے زیادہ بد قسمتی کی بات یہ ہوتی ہے کہ یہ غافلین، یا منافقین اپنی کثرت یا دنیاوی لیاقت کو یا کوششوں یا محض وراثت سے مسلمانوں کی سند حکومت پر قابض ہو جاتے ہیں، اور مسلمانوں کی امامت ان کے ہاتھ میں آ جاتی ہے یا مسلمانوں کی زندگی میں اتنا اثر و

رسوخ پیدا کر لیتے ہیں کہ ان کے اخلاق و اعمال عوام کیلئے نمونہ بن جاتے ہیں، اور ان کی عظمت اور وقعت دل و دماغ میں جاگزیں ہو جاتی ہے اس وقت ان ”اکابرین مجرمین“ کی وجہ سے غفلت و خدافرا موشی اور غیر اسلامی زندگی کا ایسا دور دورہ ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں کی عملداری میں جاہلیت کی حکومت قائم ہو جاتی ہے اور بعض اوقات اس طرز زندگی کو کچھ زیادہ مدت گزر جاتی ہے، تو اسی کا نام اسلامی تہذیب و تمدن پڑ جاتا ہے، جس کی مخالفت غیر اسلامی تمدن سے زیادہ مشکل ہوتی ہے۔

علماء کی اصل ذمہ داریاں

ان تمام حالات میں پیغمبروں کے جانشینوں کو کام کرنا پڑتا ہے، شاید انسانوں کی کوئی جماعت اتنی مشغول، اور فرائض و ذمہ داریوں سے اتنی گراں بار نہیں، جتنی نایان رسول اور علماء و مصلحین اسلام کی جماعت ہے، جسمانی امراض کی طبیعوں کو بھی آرام اور فرصت کا موقع میسر آ جاتا ہوگا، لیکن ان اطباء روح کے لئے کوئی موسم اعتدال و صحت کا نہیں، بہت سی جماعتیں ایسی ہیں کہ جب ان کی اپنی حکومت قائم ہو جاتی ہیں، تو ان کی جدوجہد ختم ہو جاتی ہے اور ان کا مقصود حاصل ہو جاتا ہے، لیکن علماء حق اور ”قوامین للہ شہداء بالقسط“ (اللہ کی طرف سے منتظم اور انصاف کے گواہ) جماعت کا کام بعض مرتبہ مسلمانوں کی حکومت میں ختم ہونے کے بجائے کچھ بڑھ ہی جاتا ہے، کچھ چیزیں ہیں جو حکومت و طاقت اور دولت و فراغت ہی کے زمانہ میں پیدا ہوتی ہیں، اور علماء اسلام ہی کا فرض ہوتا ہے کہ ان کی نگرانی کریں، وہ اپنے فریضہ احتساب، نگرانی، اخلاق اور دینی رہنما کا منصب سے سبکدوش نہیں ہوتے، اس وقت بھی ان کا جہاد اور ان کی جدوجہد جاری رہتی ہے کہیں مسلمانوں کی مسرفانہ زندگی پر روک ٹوک کر رہے ہیں، کہیں سامان عیش و غفلت پر ان کی طرف سے قدغن ہے کہیں چوری کی شراب کو گرفتار کیا ہے، اور اس کو انڈیل رہے ہیں، کہیں باجوں اور موسیقی کے آلات کو توڑ رہے ہیں، کہیں مردوں کیلئے ریشم کے لباس اور سونے چاندی کے برتنوں کے استعمال پر چسبنجیں ہیں، کہیں حجابی اور مردوں و عورتوں کے آزادانہ اختلاط پر معترض ہیں، کہیں جماموں کی بے قاعدگیوں اور بد اخلاقیوں کے خلاف آواز بلند کر رہے ہیں کہیں غیر مسلموں اور عجمیوں کے عادات اور خصوصیات اختیار کرنے پر ان کی طرف سے مخالفت ہے، کبھی مسجدوں کے صحن اور مدرسوں کے

ایوانوں میں حدیث کا درس دے رہے ہیں، اور ”قال اللہ اور قال الرسول“ کی صدا بلند کر رہے ہیں، کبھی خانقاہوں میں یا اپنے گھروں یا مسجدوں میں بیٹھے ہوئے دلوں کا زنگ دور کر رہے ہیں، اللہ کی محبت و طاعت کا شوق پیدا کر رہے ہیں، امراض قلب، حسد، تکبر، حرص دنیا اور دوسری نفسانی اور روحانی امراض کا علاج کر رہے ہیں، کبھی منبر پر کھڑے ہوئے جہاد کا شوق دلا رہے ہیں، اور اسلامی سرحدوں کی حفاظت یا اسلامی فتوحات کے لئے آمادہ کر رہے ہیں، پوری اسلامی تاریخ میں آپ کو زندہ اور ربانی علماء، جو حکومت وقت کے دامن سے وابستہ نہیں تھے یا حقیر جھگڑوں میں مشغول نہیں تھے، انھیں مشاغل میں منہمک نظر آئیں گے اور مسلمانوں کا کوئی دور حکومت ان علمائے حق اور ان کی جدوجہد سے خالی نہیں رہا۔

ایک لمحہ فکریہ

بنی امیہ کا دور مسلمانوں کا شاہانہ عہد ہے، بظاہر مسلمانوں کو تمام کاموں سے فرصت ہو گئی ہے، مگر علماء کو فرصت نہیں، حضرت حسن بصریؒ کی مجلس وعظ گرم ہے، جس میں اپنے زمانہ کے منکرات و بدعات کے خلاف تقریر ہو رہی ہے، اپنے زمانہ کی معاشرت، نظام اور اہل حکومت کی بے دینی پر تنقید ہے، نفاق کی علامات، اور منافقین کے اوصاف وسیع پیرایہ میں بیان ہو رہے ہیں اور موجودہ زندگی پر ان کو منطبق کیا جا رہا ہے، خشیت الہی اور آخرت کا بیان ہے، جس سے آنسوؤں کی جھڑیاں لگ گئی ہیں اور روتے روتے حاضرین کی ہچکیاں بندھ گئی ہیں، سورۃ فرقان کے آخری رکوع ”وَعِبَادُ الرَّحْمَنِ الَّذِينَ يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا“ کی تفسیر ہو رہی ہے اور صحابہ کرامؓ کے چشم دید حالات اور واقعات اس طرح بیان کئے جا رہے ہیں کہ اس مبارک دور کی تصویر کھینچ گئی ہے اور صحابہؓ چلتے پھرتے نظر آ رہے ہیں، لوگ مجلس سے توبہ کر کے اٹھتے ہیں، اور سینکڑوں آدمیوں کی اصلاح حال ہو رہی ہے۔

نبی عباس کا دور ہے اور امام احمد بن حنبلؒ شاہ وقت کے ذوق ور حجان اور مسلک کے خلاف مذہب اعتزال کی صاف صاف تردید کر رہے ہیں اور بدعات کا رد، اور سنت کا اعلان کرتے ہیں، علم کلام اور فلسفہ کے بڑھتے ہوئے رجحان کے مقابلہ میں، خالص سنت اور عقائد سلف کی تبلیغ فرما رہے ہیں اور یہ سب اس جرأت و اطمینان کے ساتھ کہ گویا مامون و معصوم کی

حکومت نہیں ہے بلکہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ کی خلافت ہے۔

بغداد، اپنے اوج پر، اور بغداد کی تہذیب، دولت اور بے فکری اور آزادی عروج پر ہے، ہر طرف عیش و غفلت کا سمندر رواں ہے، کرخ اور صافہ کے میدانوں اور مسجدوں کے سامنے میلے لگے ہوئے ہیں، بازاروں میں بڑی چہل پہل ہے، لیکن سینکڑوں آدمی، ان تمام دل چسپیوں اور تفریحات سے آنکھ بند کئے ایک طرف چلے آ رہے ہیں، آج جمعہ کا دن ہے، محدث ابن جوزیؒ کا وعظ ہے، وعظ ہو رہا ہے، سینکڑوں آدمی تائب اور بیسیوں غیر مسلم مسلمان ہو رہے ہیں، لوگ خلاف شرع امور سے توبہ کر رہے ہیں۔

ایک طرف اسی پر شور اور ہنگامہ زدہ بغداد میں نہایت سکون و اطمینان کے ساتھ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا درس، وعظ اور روحانی فیض جاری ہے، جس سے عرب و عجم کے لوگ فائدہ اٹھا رہے ہیں، بڑے بڑے امراء، اور شہزادے اپنے عیش و دولت کو خیر باد کہہ کر زہد و فقر کی زندگی اختیار کرتے ہیں، بڑے بڑے سرکش اور نشہ دولت میں مخمور تائب ہوتے ہیں، خلافت عباسی کے عین دار الخلافہ میں، اور خلیفہ بغداد کی حکومت کے بالکل مقابل اس درویش کی روحانی اور دینی حکومت قائم ہے، جس کا سکہ عرب و عجم پر رواں ہے۔

بعد کے تمام عہدوں میں اور حکومت اسلامی کے تمام اطراف و اکناف میں، سلاطین و امراء کے بالمقابل اور تمام دوسری دلچسپیوں و دعوتوں اور تحریکوں اور مشاغل کے ساتھ علمائے حق کی یہ کوششیں اور ان کے مرکز، مساجد، مدارس، خانقاہیں، مجالس وعظ باضابطہ اور بے ضابطہ احتساب جاری رہا۔

علمائے حق کا یہی بد قسمت یا خوش قسمت گروہ ہے، جس کو مسلمان بادشاہوں اور ان کے کارکنان حکومت کے ہاتھوں (جبکہ دوسروں کو سیم و زر کی تھیلیاں اور عہدوں کے پروانے ملتے تھے) دارورسن اور تازیانے کے انعامات ملے، اسی گروہ کے کتنے افراد کو، ایک مسلم، ان حاکم (حجاج) کے ہاتھوں شہادت کا سرخ، خلعت ملا، پھر اسی گروہ کے ایک مقتدر فرد (حضرت امام ابو حنفیہؒ) کو امیر المومنین منصور عباسی کے ہاتھوں زہر کا جام نوش کرنا پڑا، پھر اسی گروہ کے دوسرے امام (حضرت امام احمد بن حنبلؒ) کو سب سے بڑے روشن خیال مسلمان بادشاہ (مامون) کے زمانہ میں، پایہ جولان اور اسیر زندان ہونا پڑا، اور اس کے جانشین (معتمد) کے ہاتھوں

تازیانے کھانے پڑے۔

آخر زمانہ میں بھی کیسے کیسے عادل و دادگر مسلمان فرمانرواؤں کے ہاتھوں کیسے کیسے جلیل القدر علماء پر بیداد ہوئی، جہانگیر کی زنجیر عدل مشہور ہے، مگر حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کے پاؤں میں بھی زنجیر پڑی، اور ان کو اپنے اظہار حق کے صلہ میں گوالیار کے قلعہ میں محبوس ہونا پڑا۔

ان کارناموں اور خدمات کے علاوہ (جو حاملین دین اور محافظین شریعت کے فرائض منصبی ہیں) جن کو ہم اس حیثیت سے دفاعی کہہ سکتے ہیں، کہ وہ شرک و کفر، بدعت اور غفلت کے مقابلہ میں اسلام کی حفاظت کی کوششیں ہیں، اور دین کی مسلسل جدوجہد ہے، جو قیامت تک جاری رہے گی۔

لا يزال طائفة من امتي ظاهرين على الحق لا يضرهم من خذلهم
او كمال قال) الجهاد ماض الى يوم القيامة، میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر اعلانیہ قائم رہے گا، کسی کے مدد نہ کرنے سے اس کو کچھ نقصان نہ پہونچے گا، جہاد قیامت تک جاری رہے گا۔

لیکن ان کے علاوہ دو اور خدمتیں ہیں، جو ہر زمانہ کے علماء کے ذمہ ہیں، اور علماء ربانی ان کو انجام دیتے رہے ہیں۔

۱۔ اسلام فتوحات سے کمتر اور مبلغین، صلحاء و صوفیہ اور بعض مسلمانوں کے خلاف اور محبت کے اثر سے بیشتر مسلمانوں کے مفتوحہ ممالک میں لاکھوں آدمیوں نے اسلام قبول کیا اور پوری پوری برادریاں اور بڑے بڑے خاندان اسلام میں داخل ہو گئے، لیکن ان کی تعلیم و تربیت کا کوئی انتظام نہ کیا جاسکا، اور ان پر اسلام کی تعلیمات کا کوئی اثر نہ پڑ سکا، یا ان پر کوئی اثر پڑا تو ان کے بعد کی نسلوں میں یہ اثر باقی نہ رہ سکا اور رفتہ رفتہ اس کے سوا ان کو کچھ یاد نہ رہا کہ ہمارے باپ دادا مسلمان تھے اور انھوں نے کس زمانہ میں اسلام قبول کیا تھا، اور سوائے اسلامی نام اور کلمہ طیبہ کے الفاظ کے ان کے پاس اسلام کا کوئی نشان باقی نہ رہا، کچھ دنوں کی اور بے توجہی کے بعد اسلامی نام بھی باقی نہ رہا اور کلمہ طیبہ بھی سینکڑوں میں سے چند کے سوا کسی کو یاد نہ رہا، مگر اپنے مسلمانوں ہونے کا اعتراف باقی رہا، پھر وہ بھی مٹنے لگا اور اس وقت باقاعدہ ان کا ارتداد عمل

میں آنے لگا۔

ہندوستان جیسے ملک میں جہاں خاص حلقہ کے باہر اسلام کی بنیادی ہمیشہ کمزور رہی اس کی بکثرت مثالیں ملتی ہیں، تقریباً ہر بڑے شہر سے کچھ فاصلہ پر اور ہندوستان کے تمام اطراف میں لاکھوں کی تعداد میں ایسی مسلمان قومیں اور برادریاں موجود ہیں، جن کو اسلام سے کچھ تعلق باقی نہیں رہا، دیہاتوں کی بڑی مسلمان آبادی ایسی ہے، جو نئے سرے سے تبلیغ اسلام کی محتاج ہے، ان میں سے بکثرت ایسے ”مسلمان“ ہیں، جو ہنوز عہد جاہلیت میں ہیں، اور ان کی بعثت نبویؐ کی خبر بھی نہیں، وہ اسلام سے اتنے بے خبر ہیں، جتنے دیہاتوں کے غیر مسلمان، فرائض و احکام اسلام کا ذکر چھوڑ کر بعض بڑے شہروں کے اطراف و انواح میں ایسے مسلمان ملتے ہیں، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نام نامی سے بھی واقف نہیں۔

بعض علمائے ربانی نے اپنے زمانہ میں، ان علاقوں اور دیہاتی رقبوں کی طرف توجہ کی اور بعض مسلمان قوموں اور برادریوں کو از سر نو مسلمان بنایا، ان میں تبلیغی دورے کئے، وعظ و نصیحت، اختلاط، آمد و رفت اور اپنے اخلاق و تالیف قلب سے ان کے دل مٹھی میں لئے، ان کو مرید کر کے ان کی توحید اور اتباع سنت کے راستہ پر لگایا، شرک و بدعت سے تائب کیا، جاہلانہ رسمیں، غیر مسلموں کی وضع و صورت اور کفر و جاہلیت کے شعار چھڑائے، ان میں اخلاق و انسانیت پیدا کی، پابند فرائض اور خوش اوقات بنایا، علم کا شوق دلایا، اور تعلیم کو رائج کیا اور ان میں سے لائق افراد کو چھانٹ کر اور اپنے پاس رکھ کر ان کی تربیت و تعلیم دی، پھر ان سے اپنی قوم اور دوسری جماعتوں کی تبلیغ و اصلاح کا کام لیا، یہ تبلیغی کام، جو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا طریق کار ہے، سب سے زیادہ ظاہری مشابہت رکھتے ہیں، ان کے دوسرے کارناموں کے مقابلہ میں کسی طرح کم اہم نہیں۔

۲۔ قرآن و حدیث اسلام کی طاقت کا اصلی سرچشمہ ہیں، جن سے ہمیشہ طاقت اور روشنی حاصل کی جاسکتی ہے اور جن کے ذریعہ سے ہر زمانہ میں مسلمانوں کے کمزور سے کمزور ڈھانچے میں روح پھونکی جاسکتی ہے، شرک و کفر بدعت و غفلت کے خلاف سب سے کارگر حربہ، قرآن و حدیث کا علم اور ان کی اشاعت ہے، ان کا صحیح علم اور ان کی روشنی جس قدر پھیلتی جائے گی، کفر و جہالت کی تاریکیاں دور ہوتی جائیں گی، اس لئے ہزار تبلیغوں کی ایک تبلیغ ان کی نشر و اشاعت ہے۔

جانشین انبیاء کی خصوصیات

انبیاء کرام کی بڑی خصوصیت ان کی ہم آہنگی اور یک آہنگی ہے، یعنی وہ سب ایک بات کہتے ہیں، اور ایک ہی بات کہتے رہتے ہیں، وہ کیا؟ یا قوم اعبدوا اللہ مالکم من اللہ غیرہ۔ اے میری قوم اللہ کی بندگی کرو تمہارا معبود، اس کے سوا کوئی نہیں۔

ان کے جانشینوں کی بھی یہی خصوصیت ہوتی ہے کہ ان کی تمام کوششوں اور ان کی زندگی کے متنوع مشاغل کا ہدف بھی ایک ہوتا ہے وہ ”دعوت الی اللہ“ ہے درس و تدریس و وعظ و تقریر تبلیغ و تذکیر، تصنیف و تالیف، سلوک و تصوف، بیعت و ارشاد، سب سے غرض خلق خدا کو اللہ کی طرف بلانا، اللہ سے ملانا، اور اللہ ہی کا بنانا ہوتا ہے، ان کے مشاغل متنوع اور مختلف ہو سکتے ہیں، مگر سب کا مرکز اور مقصد ایک ہوتا ہے، وہ سب کچھ کہتے ہیں مگر درحقیقت ایک ہی بات کہتے ہیں، اور بار بار کہتے ہیں۔

فطرت کا سرود ازیں اس کے شب و روز

آہنگ میں یکتا، صفت سورہ رحمان

حضرت نوح کی طرح وہ بھی ان مشاغل، اور مختلف طریق تبلیغ کی طرف اشارہ کر کے کہتے ہیں

”رب انی دعوت قومى لیلاً ونهاراً“

اے رب میں بلا تار با اپنی قوم کو، رات اور دن

ثم انی دعوتهم جہاراً

پھر میں نے ان کو بلایا برملا۔

ثم انی اعلنت لهم واسررت لهم اسراراً

پھر میں نے ان کو کھوکھو کر اور چھپ کر کہا، چپکے سے۔

یہ وعظ، یہ درس اور انفرادی و اجتماعی کوششیں، یہ ظاہر و مخفی تدبیریں، یہ تذکیر و ترغیب اور یہ

جہالت اور انفاس قدسیہ (سب دین کی دعوت و تبلیغ کے) اعلان و اسرار ہی کی شکلیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے دین سے لگائے رکھے اس پر آپ سے اجازت چاہوں گا!

و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

علمائے دین کا منصب استقامت اور حقیقت پسندی کا جامع

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسینی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ تقریری مجلس علمی (حیدرآباد) کی اس نشست میں فرمائی تھی جو ۱۱ اکتوبر ۱۹۸۲ء کو جمیل الدین صاحب ایڈوکیٹ کے دولت خانہ پر شب میں ہوئی تھی، اور جس میں بڑی تعداد میں حیدرآباد کے علمائے کرام، مفتضائے مدارس اور دینی اداروں اور تنظیموں کے سربراہ تشریف رکھتے تھے۔

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على سيد المرسلين محمد
وعلى اله وصحبه اجمعين اعوذ بالله من الشيطان الرجيم بسم الله
الرحمن الرحيم يا ايها الذين امنور كونوا قوامين لله شهداء بالقسط
(المائدہ-۸)

اے ایمان والو! کھڑے ہو جایا کرو، اللہ کے واسطے گواہی دینے کو انصاف کی۔

حضرات! علمائے کرام کی اس موقر مجلس میں کچھ عرض کرنا بڑی ذمہ داری کی بات ہے، پرانا حکیمانہ مقولہ ہے، ”لکل مقام مقال“ میں کوشش کروں گا کہ اس اہم اور باوقار مجلس اور موقع محل کے مطابق اپنے معروضات و خیالات پیش کروں۔

لوگوں نے چھوٹے چھوٹے واقعات اور روزمرہ کے مشاہدات سے بڑے بڑے نتائج نکالے ہیں اس میں شیخ سعدیؒ خاص طور پر بڑے ممتاز ہیں اسی طریقہ سے مولانا رومؒ مثالوں کے بادشاہ ہیں، دونوں روزہ مرہ کے واقعات سے بڑی حکیمانہ باتیں اور بڑے عمیق نتائج نکالتے ہیں، میں اپنا بھی اسی قسم کا ایک تاثر اور عبرت کا سبق پیش کرتا ہوں، آپ کو معلوم ہے کہ میں ایک طویل سفر کر رہا ہوں دہلی سے چلا اور حیدرآباد پہنچا، خدا جانے گاڑی نے کیا کیا رخ بدلے، کن کن علاقوں سے گزری لیکن قبلہ نما نے ہمیشہ صحیح قبلہ بتایا، اس نے نہ گاڑی کے پھرنے کی پرواہ کی، نہ سمت کے تبدیل ہونے کی، مجھے بڑا رشک آیا کہ ایک ادنیٰ سا جماداتی چیز جو انسان کی صحت ہے، وہ اتنی امین، ایسی ثابت قدم، ایسی خوددار، اور ایسی پابند اصول ہے، کہ اس نے نہ یہ دیکھا کہ گاڑی کس طرح رخ بدل رہی ہے، نہ یہ کہ انسان (جو اشرف المخلوقات ہے)

برابر اپنا رخ بدلتا ہے ہر جگہ اس نے صحیح طور پر قبلہ بتایا اور ہم نے اس پر اعتماد کیا اور نماز پڑھی اس سے مجھے غیرت بھی آئی اور عبرت بھی ہوئی کہ قبلہ نما تو کسی کی پروا نہ کرے، اور ہمیشہ سمت قبلہ بتائے اس نے اپنا مقصد وجود تبدیل نہیں کیا اور نہ اپنے فرض منصبی کی ادائیگی میں فرق آنے دیا اس سے مجھے خیال ہوا کہ علمائے دین کو حقیقت میں ”قبلہ نما“ ہونا چاہئے، ان کے اندر قبلہ نما کی سی استقامت ہونی چاہئے کسی طرف کی ہوا چلے اور کہنے والے کتنا ہی کہیں کہ۔

چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی

اور سمجھانے والے کتنا ہی سمجھائیں۔

زمانہ باتو نہ سازو تو بازمانہ بہ ساز

لیکن ان کا عقیدہ اقبال (جو خود اعلیٰ انگریزی تعلیم یافتہ اور مفکر و فلسفی اور پھر شاعر تھے) کی اس تعلیم پر ہو۔

حدیث کم نظراں تو بازمانہ بساز

زمانہ باتو نہ سازو تو بازمانہ ستیز

بلکہ وہ یہاں تک کہتے ہیں

علماء امت کی شان

گفتند جہان ما آیا بتوی سازو

فتم کی نمی سازو گفتند کی برہم زن

حضرات: علماء کی شان یہی ہونی چاہئے امت مسلمہ، امتوں میں، اور جماعت علماء حاملین علم میں الگ شان رکھتے ہیں، امت مسلمہ کو ایک قبلہ دیا گیا ہے، وہ جہاں کہیں ہو اسی قبلہ کی طرف اپنا رخ کرے، جس امت کو ایک معین قبلہ دیا ہے اس کو یہ اشارہ دیا گیا ہے کہ تمہارے دلوں کا قبلہ تمہارا قبلہ حاجات، تمہاری فکر اور سعی و جہد کا محور ایک ہی ہونا چاہئے، نمازوں میں خانہ کعبہ اور اعمال و مساعی و مقاصد میں اللہ تعالیٰ کی (جو معبود و مقصود حقیقی ہے) رضا، آپ حضرات خدا کے فضل سے نہ صرف اہل علم ہیں، بلکہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے دینی

قیادت کا مقام عطا فرمایا ہے، خاص طور سے یہ مؤقر مجلس علمی جہاں اس وقت ہم جمع ہیں اس موقع سے فائدہ اٹھا کر دواہم حقیقتوں کے بارے میں اجمالی طور پر کچھ عرض کروں گا۔

ایک تو عقائد اور حدود شرعیہ کا مسئلہ ہے، اس میں جماعت علماء کو بالکل قطب نما کی طرح ہونا چاہئے، کوئی بڑے سے بڑا آدمی بھی اس کو سامنے رکھے گا تو وہ اس کی رعایت نہیں کرے گا وہ صحیح سمت بتائے گا، جہاں تک عقائد اور حدود شرعیہ کا تعلق ہے، دین میں کسی قسم کی رعایت کی گنجائش نہیں، حکمت اور چیز ہے، مہذبیت اور چیز، حکمت اور مہذبیت میں بڑا فرق ہے، ہاں آدمی سچی اور صاف بات حکمت کے ساتھ کہہ سکتا ہے، اس کا اسلوب حکیمانہ ہو۔ ”ادغ الی سبیل رب بالحکمة والموعظة الحسنة“ لیکن، منت نہ ہو، قرآن شریف میں آتا ہے ”و دوا لوتدھن فیدھنوں۔“

اللہ کے رسول کو صاف حکم ہے ”فاصدع بما تؤمر و اعرض عن المشرکین“ یہ ”اعرض عن المشرکین“ کا تکرار ”صدع بالامر“ کا محل متعین کر دیتا ہے، جہاں پر توحید اور شرک کی سرحدیں آتی ہوں، وہاں ”فاصدع بما تؤمر پر عمل کا حکم ہے، نرمی اور وسعت، کسی اور چیز میں ہو تو ہو، لیکن توحید و سنت کے بارے میں منصوصات، شریعہ اور قطعیات، دینیہ کے بارے میں ”فاصدع بما تؤمر“ کا حکم ہے، اگر ”فاصدع بما لومر“ مطلق آتا تو اس میں کچھ گنجائش تھی، لیکن ”واعرض عن المشرکین“ نے بالکل تفسیر کر دی کہ اس کا موقع محل کیا ہے، علماء حقائق کا فرض ہے کہ توحید کے بارے میں بالکل بے لوث اور صاف بات کہیں لیکن حکمت کے ساتھ کہیں، بقول غالب ایسا نہ ہو۔

کہتے ہیں وہ بھلے کہ لیکن بری طرح

شروع ہو تو علماء شروع میں اچھی سے اچھی نرم سے نرم زبان استعمال کریں، تدریج و حکمت سے کام لیں لیکن اس طرح کہ تاویل اور غلط فہمی کی گنجائش نہ ہو اسی طرز عمل کا نتیجہ ہے، کہ آج تک یہ دین قائم ہے، اور دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہے، جس کی ہلاکت کا شوق ہے وہ شوق سے ہلاکت میں پڑے، لیکن وہ شریعت اور شریعت کے حاملین الزام نہیں دے سکتا، تاریخ کا اگر عمیق دو سچ نظر سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس امت کی تاریخ میں ایک سال بھی ایسا نہیں گزرا کہ یہ امت عمومی طور پر کسی ضلالت کا شکار ہو گئی ہو جو مقامی طور پر

ضلالتیں رہی ہیں لیکن پوری امت مسلمہ کسی سازش یا کسی عالمگیر ضلالت میں گرفتار نہیں ہوئی اور خود حدیث میں آیا ہے ”لا تجتمع امتی علی ضلالة“ اس کے برعکس یہودیت بالکل شروع میں تحریف کا شکار ہو گئی، اور عیسائیت بالکل عہد طفلی اور آغاز کار میں ایک بالکل نئی پٹری پر پڑ گئی جس پر وہ صدیوں سے چلتی آرہی ہے، اسی لئے قرآن مجید نصاریٰ کو ”ضالین“ کے لفظ سے یاد کرتا ہے کہ وہ جیسے ہی چلے دوسرے راستہ پر پڑ گئے، لیکن الحمد للہ اسلام اس سے بالکل محفوظ ہے، اس وقت تک تو حید و شرک کا فرق سنت و بدعت کا فرق اسلام اور جاہلیت کا فرق، غیر مسلمین کی معاشرت و تمدن اور اسلامی معاشرت و تمدن کا فرق بالکل واضح ہے، کوئی ملک کسی وجہ سے کسی خاص زمانہ میں کسی خارجی یا داخلی سبب کی بناء پر کسی سازش کا شکار نہ ہو جائے یا کسی فتنہ میں مبتلا ہو جائے یہ الگ بات ہے علماء حق اس صورت حال سے بھی نبرد آزما اور اس کے مقابلہ میں صف آراء رہتے ہیں اور اصلاح حال کی کوشش جاری رہی ہے۔

امت مسلمہ کا فرض

پوری امت مسلمہ کو خطاب کر کے فرمایا گیا ہے۔ ”یا ایہا الذین امنوا کونوا قومین للہ شهداء بالقسط“ (یعنی تم اللہ کے لئے حق کے علمبردار بن جاؤ) ہماری زبان اور محاورے میں ”خدائی فوجداری“ ایک طنز کا لفظ ہے کہ آپ خدائی فوجدار ہیں؟ لیکن ”قوامین للہ“ کا مفہوم تقریباً خدائی فوجداری کا ہے، مبالغہ کے اس صیغہ (قوانین) سے ”خدائی فوجدار“ ہی کی شان ظاہر ہوتی ہے اگر قوامین للہ ہوتا تو شاید یہ بات نہ پیدا ہوتی کوئی پوچھے نہ پوچھے، کوئی بلائے نہ بلائے، کوئی کہے نہ کہے آپ اپنا فرض ادا کر رہے ہیں، آپ ہر جگہ پہنچ رہے ہیں، اس آیت میں خطاب اگرچہ پوری امت کو ہے، لیکن علماء کی اس بارے میں امتیازی شان ہونی چاہئے، ان کو ”شهداء بالقسط“ حق و صداقت کا گواہ و علم بردار ہونا چاہئے، اگر امت اسلامیہ کا فرض قوام عالم کا احتساب ہے تو علماء اسلام کا فرض مسلم معاشرہ کا احتساب کرتے رہنا چاہئے، کہ کہاں سے یہ معاشرہ صراط مستقیم کو چھوڑا ہے، اس بارے میں ان کا کام بالکل بیرومیٹر کا سا ہے، وہ ہر جگہ، ہر موسم میں ہوا کا دباؤ بتاتا ہے، وہ صحیح شہادت ادا کرتا ہے۔

حضرات! اسی طرح علماء کا دوسرا فرض یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کو زندگی کے حقائق ملک کے

حالات، ماحول کے تغیرات اور تقاضوں سے باخبر اور روشناس رکھیں، ان کی کوشش دینی چاہئے کہ مسلم معاشرہ کا رابطہ زندگی اور ماحول سے کٹنے نہ پائے، اس لئے کہ اگر دین اور مسلمانوں کا رابطہ زندگی سے کٹ گیا اور وہ خیالی دنیا میں زندگی گزارنے لگے تو پھر دین کی آواز بے اثر ہوگی، اور دعوت و اصلاح ہی نہیں ہوگا، بلکہ اس دین کے حاملین کو اس ملک میں رہنا مشکل ہو جائے گا، تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جہاں علماء نے سب کچھ کیا، لیکن زندگی کے حقائق سے امت کو روشناس نہیں کیا، اس ماحول میں اپنے فرائض کے انجام دینے کی انھوں نے تلقین نہیں کی، ایک اچھا شہری، ایک مفید عنصر بننے اور اس ملک کی قیادت حاصل کرنے کی اہلیت پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی، وہاں اس ملک نے ان کو اس طرح اگل دیا جیسے لقمہ اگلا جاتا ہے اور ان کو اگل کر کے باہر پھینک دیا، اس لئے انھوں نے اپنی جگہ نہیں بنائی تھی، آج ہندوستان کے مسلمان ایک دانشمندانہ اور حقیقت پسندانہ دینی قیادت کے محتاج ہیں، آپ مسلمانوں کو سو فیصدی تہجد گزار بنا دیں، سب کو متقی و پرہیزگار بنادیں لیکن ان کا ماحول سے کوئی تعلق نہ ہو، وہ یہ نہ جانتے ہوں کہ ملک کدھر جا رہا ہے، ملک ڈوب رہا ہے ملک میں بد اخلاقی، طوفان اور وبا کی طرح پھیل رہی ہے، ملک میں مسلمانوں سے نفرت پیدا ہو رہی ہے، تو تاریخ کی شہادت ہے کہ پھر تہجد تو تہجد پانچ وقتوں کی نمازوں کا پڑھنا بھی مشکل ہو جائے گا، اگر آپ نے دین داروں کے لئے اس ماحول میں جگہ نہیں بنائی اور ان کو ملک کا بے لوث مخلص اور شائستہ شہری ثابت نہیں کیا، جو ملک کو بے راہ روی سے بچانے کیلئے ہاتھ پاؤں مارتا ہے، اور ایک بلند کردار پیش کرتا ہے، تو آپ یاد رکھئے کہ عبادات و نوافل اور دین کی علامتیں اور شعائر تو الگ رہے، وہ وقت بھی آسکتا ہے کہ مسجدوں کا باقی رہنا بھی مشکل ہو جائے گا اگر آپ نے مسلمانوں کو اجنبی بنا کر اور ماحول سے کاٹ کر رکھا، زندگی کے حقائق سے انکی آنکھیں بند رہیں اور ملک میں ہونے والے انقلابات، نئے بننے والے قوانین، علوم کے دل و دماغ پر حکومت کرنے والے رجحانات سے وہ بے خبر رہے تو پھر قیادت تو الگ رہی (جو خیر امت کا فرض منصبی ہے) اپنے وجود کی حفاظت بھی مشکل ہو جائے گی، فاتح مصر صحابی رسول حضرت عمرو بن العاصؓ نے جس وقت مصر فتح کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی بصیرت پر منکشف کیا ہوگا کہ انشاء اللہ مصر سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں برس اسلام کا حلقہ بگوش رہے گا، مرکز اسلام زمین مقدس حجاز اس کے بالکل قریب ہے، رومی شہنشاہی

وہاں سے بے دخل ہو چکی ہے، قطبی مسیحی سلطنت دم توڑ چکی، لیکن انھوں نے عربوں اور مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا ”انتم فی رباط دائم“ یاد رکھو تم ہمیشہ محاذ جنگ پر ہو، تم ہمیشہ سرحد پر پہرہ دے رہے ہو، آنکھ جھپکی اور مارے گئے، ناکے پر کھڑے رہنے والے کو ہر وقت چوکنا اور بیدار رہنا چاہئے، اس کے لئے نہ غفلت کی گنجائش ہے نہ تغافل کی، نہ جہل کی نہ تجاہل عارفانہ کی۔

ملک کو تباہی سے بچانا ہماری ذمہ داری ہے!

حضرات: جس ملک میں اس وقت ہم زندگی گزار رہے ہیں، یہ ملک گرد و پیش کے ممالک اور دنیا کی بڑی طاقتوں سے بے نیاز نہیں رہ سکتا، اس ملک میں بہت سے فلسفے، بہت سی سہمی طاقتیں، بہت سی تخریبی تحریکیں کام کر رہی ہیں اور بہت سرگرم اور فعال ہیں، نظام تعلیم برابر بدلتا رہتا ہے اور کبھی وہ شدت سے عقائد و حقائق دینی پر اثر انداز ہوتا ہے، جبری تعلیم نے اور قومی زبان نے بھی نئے نئے مسائل پیدا کر دیئے ہیں، اس حالت میں ہم کو حالات کا برابر جائزہ لیتے رہنا چاہئے، اور اپنے تحفظ کا سامنا کرتا رہنا چاہئے۔

اس کے ساتھ مسلمانوں کو بتانا چاہئے کہ دیکھو اس ملک کو تباہی سے بچانا تمہاری ذمہ داری ہے، تم با ایمان، با اصول اور با کردار بن کر یہاں رہو، اگر تم یہاں حضرت یوسف کا نمونہ پیش کرو گے تو پھر وہ وقت آئے گا کہ اہم سے اہم اور نازک سے نازک تر، اور دشوار سے دشوار تر ذمہ داری تمہارے سپرد کی جاسکے گی، حضرت یوسف نے جن کو اللہ تعالیٰ نے حفیظ و علیم کی صفت عطا فرمائی تھی، دیکھا کہ اس ملک میں اس وقت تک دین کی اشاعت نہ ہو سکے گی اور دین کے لئے مقام پیدا کیا نہ جاسکے گا جب تک وہاں اپنی اہلیت اپنی خیر خواہی انسان دوستی اور عدل کا ثبوت نہ دیں گے، اور اللہ کے بندوں کو اپنا گردیدہ نہ بنالیں گے اس وقت تک اس ملک میں خدائے واحد کا نام لینا بھی مشکل ہوگا، ہم ہندوستانی مسلمانوں کو بھی یہ ثابت کرنا چاہئے کہ ہمارے بغیر یہ ملک چل نہیں سکتا ہم نہ رہے تو یہ ملک تباہ ہو جائے گا۔

میری بھائیوں اور دوستوں! یاد رکھئے، اگر ہم ملک کے حالات سے اپنے کو کاٹ لیں گے اور جو گرم و سرد ہوائیں چل رہی ہیں اس سے بے خبر ہو جائیں گے اور ہم کسی مکلف

(AIRCONDITIONED) مکان میں رہنا شروع کر دیں گے، جہاں نہ گرم جھونکا پہنچ سکے نہ سرد، تو ہم اپنے ساتھ بھی بدخواہی کریں گے، اپنے دین کے ساتھ بھی، کوئی فرقہ ملک کی آبادی کا کوئی عنصر باقی عناصر سے کٹ کر نہیں رہ سکتا، ہاں اس کے شرائط اور حدود ہیں آپ ہرگز تحلیل نہ ہوں، آپ اپنے پیغام اور دعوت کے ساتھ رہیں، آپ اپنی تہذیبی و معاشرتی خصوصیات کے ساتھ رہیں، آپ اپنے ملی تشخص کو پورے طور پر برقرار رکھیں اور اس کے کسی حصہ سے بھی آپ دستبردار ہونے کے لئے تیار نہ ہوں، لیکن زندگی کے دھارے سے الگ نہ ہوں، میں قومی دھارے کو نہیں کہتا (خدا نہ کرے کہ اس زندگی میں کبھی میری زبان سے یہ لفظ نکلے کہ قومی قومی دھارے میں جذب ہو جائے) نہیں زندگی کے دھارے سے آپ الگ نہ ہوں، اس لئے کہ زندگی کے دھارے سے جو الگ ہو وہ الگ ہی ہو گیا، اس کی جگہ زندہ انسانوں میں نہیں رہتی، میں اسلام کو ایسا محدود اور ناقص نہیں سمجھتا کہ اگر حالات اور زندگی کے مسائل کی طرف توجہ کی جائے تو فرائض چھوٹ جائیں گے، عقائد میں خلل آ جائے گا، ہمارے اسلاف نے شہنشاہی کی اور امپائر بنائے ہیں لیکن ان کی تہجد بھی نہیں چھوٹی، معمولی سنت بھی ترک نہیں ہوئی، حضرت سلمان فارسیؓ کا واقعہ یہ عراق کے گورنر تھے، اور مدائن کے دارالحکومت میں رہتے تھے، ایک مرتبہ کھانے کی کوئی چیز زمین پر گر گئی تو اٹھا کر صاف کر کے کھانے لگے، کسی نے کہا کہ ارے آپ والی ہو کر ایسا کام کرتے ہیں، انھوں نے جواب دیا کہ کیا میں اپنے حبیبؐ کی سنت تم جیسے بیوقوف کی خاطر چھوڑ دوں گا؟ یہ نہیں کہ آگ آئے تو پانی نہیں رہے گا، اور پانی آئے تو آگ بجھ جائے گی، یہ غلط تحلیل ہے، آپ پوری عزیمت، شان و تقویٰ اور کثرت عبادت کے ساتھ اچھے اور کامیاب شہری بن سکتے ہیں، بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ وہی اچھا شہری بن سکتا ہے جو خدا کا صحیح پرستار اور اپنے اصولوں کا پابند ہو آج ہندستان ہی نہیں تقریباً تمام خاص مسلم ممالک اور عرب ممالک کی بھی حالت یہ ہے کہ وہاں بھی یورپ، امریکہ کے گرم جھونکے آرہے ہیں، نئے نئے فتنے پیدا ہو رہے ہیں، اسلام اور جاہلیت کی کشمکش برپا ہے، وقت کے نئے نئے تقاضے اور زندگی کے نئے نئے مسائل درپیش ہیں، ان سے آنکھیں بند کر لیں اور یہ کہنا کہ نہیں کچھ نہیں ہو رہا ہے، غلط ہے، اس حقیقت پسندی، وسیع النظری اور جامعیت کا ثبوت دینے کا حیدرآباد میں اور بھی اچھا موقع ہے، یہاں تعلیم بھی ہے اور قوت عمل بھی یہاں نئے نئے

ارارے، نئی نئی تنظیمیں اور تحریکیں پیدا ہو رہی ہیں، لیکن مسلمانوں کو ایک اجتماعی قیادت اور صحیح مشورے کی ضرورت ہے، ایک طرف تو عقائد کے بارے میں، اصول کے بارے میں، شریعت کے منصوصات کے بارے میں پہاڑ کی سی استقامت اور فولاد کی سی صلابت ہو، دوسری طرف پوری دانشمندی، پوری باخبری اور پوری ہمدردی، یہ دونوں چیزیں ہوں گی، تو انشاء اللہ ہم موجودہ حالات سے نہ صرف یہ کہ عہدہ برآ ہو جائیں گے بلکہ مجھے پوری امید ہے کہ قیادت آپ کے پاس خود آئے گی، مسلمانوں میں سیاسی شعور الوعی سیاسی (شہری شعور) الوعی انسانیت دوستی، حقیقت پسندی، ہوش مندی، ملک کے لئے فکر مندی، اس کو بچانے کیلئے خطر پسند اور مہم جوئی کی ضرورت ہے، اس کے لئے آپ خود نمونہ بنیں اور ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ نمونہ پیش کریں۔

وصلی اللہ تبارک و تعالیٰ علی سیدنا و مولانا محمد وآلہ وصحبہ وسلم

بے مثال استاد..... بے مثال شاگرد

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسینی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے شعبہ عربی جامعہ کراچی (پاکستان) کے سیمینار ہال میں اپنے محبوب استاد اور مربی علامہ خلیل عرب بن محمد عرب سے منسوب لائبریری کے قیام کے موقع پر ۹ جولائی ۱۹۷۸ء کو یہ اہم تقریر فرمائی تھی، جس میں انھوں نے اپنے استاد کے احسانات کا تذکرہ بھی کیا تھا، اور ان کے کامیاب طرز تعلیم کا ذکر بھی، اور استاد اور شاگرد کے درمیان کی ساری ربط و تعلق ہونا چاہئے، یہ بھی بتایا، اس لئے یہ تقریر اساتذہ اور طلباء دونوں ہی کے لئے بہت مفید ہے لہذا وہ اس تقریر کا ضرور مطالعہ کریں۔

الحمد لله نحمده و نستعينه و نستغفره و نو من به و نتوكل عليه و نعوذ بالله من شرر انفسنا و من سيأت اعمالنا من يهده الله فلا مضل له و من يضل الله فلا هادي له ونشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له و نشهد ان سيدنا ومولانا محمداً عبده و رسوله صلى الله تعالى عليه و على آله واصحابه اجمعين اما بعد .

اما بعد، صدر محترم جناب وائس چانسلر جامعہ، سید ہاشم رضا صاحب، خواہر عزیز عطیہ خلیل عرب

استاد اور شاگرد کا تعلق

اساتذہ، طلبہ و طالبات حاضرین کرام، مجھے خوشی ہے اور میں اپنی سعادت اور ایک طرح سے شرافت سمجھتا ہوں کہ اگر مجھے اس لفظ کی اجازت دی جائے کہ میں ایک ایسی جگہ پر حاضر ہوا ہو، جس کا انتساب میرے محبوب استاد اور مربی علامہ خلیل عرب سے ہے۔

یہاں میں مہمان کی حیثیت سے نہیں آیا، اگرچہ آپ نے مجھے ازراہ کرام اپنی میزبانی سے نوازا ہے، لیکن میں اپنے کو مہمان نہیں سمجھتا بلکہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اپنے گھر آیا ہوں اور ایسے خاندان کو سلام کر رہا ہوں اور اس کے ان افراد سے مل رہا ہوں جو میرے جانے پہنچانے ہیں۔

حضرات: اس موقع کا تقاضا ہے اور احسان کے جس بوجھ تلے میں منت و امتنان کے

ساتھ دیا ہوا ہوں اس کا تقاضا ہے کہ میں کچھ فصل گل کی داستان سناؤں۔

داستان فصل گل خوش می سراید عند لیب

زاغہا آشفته تر گفتند این افسانہ را

خوش نصیب طالب علم

وہ بہت خوش نصیب انسان یا طالب علم ہے، جسے ایسا استاد مل جائے جو حقیقی معنوں میں استاد ہو، حقیقی استاد کی بڑی تعریف یہ ہے کہ وہ اپنے طالب علم کو اپنے جیسا بنانے کے لئے حریص اور بے چین ہو اور اس کو خوشی ہو کہ اگر اس کا شاگرد اس کی صرف نیک نامی اور سرخروگی کے باعث نہ ہو بلکہ لوگ اس کا تعارف اس شاگرد کے ذریعہ کرائے لگیں، میرا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ میں اس مقام پر فائز ہوں بلکہ میں کہنا چاہتا ہوں کہ جس استاد میں یہ جذبہ نہیں ہے کہ وہ طالب علم کو اپنے جیسا بنادے اور علم کو گھول کر پلا دے، جیسے ہم سنا کرتے تھے اپنی مکتبی زندگی میں کہ بھئی، کیا گھول کر پلا دیا جائے؟ کوئی علم میں گھول کر پلا نہیں سکتا، لیکن میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ سچا استاد، فطری استاد، پیدائشی استاد جسے انگریزی میں BORN TEACHER، یا عربی میں استاد موهوب کہیں گے، وہ ماں کے پیٹ سے استاد ہی پیدا ہوا، اس کا اصل جوہر یہ ہی ہوتا ہے، کہ وہ علم گھول کر پلا دیتا ہے، پھر وہ صرف اپنا علم ہی منتقل نہیں کرتا بلکہ اپنا ذوق بھی منتقل کر دیتا ہے، یہی ایک استاد کی اصل تعریف ہے، ہم علامہ اقبال کے تذکرے میں کبھی اس بات کو نہیں بھول سکتے اور سوانح نگاروں نے کبھی اس کو نظر انداز نہیں کیا کہ اقبال نے جو بھی علمی ترقی کی اور دین سے جوان کی رغبت یا مناسبت پیدا ہوئی اس میں ان کے استاد میر سید حسن سیالکوٹی کا بڑا حصہ ہے، میں بتانا یہ چاہتا ہوں، کہ وہ عرب صاحب کی طرح ان اساتذہ میں تھے جو گھول کر پلا دیا کرتے تھے، اور علم کو لباس مستعار کی طرح نہیں دے دیا کرتے تھے بلکہ علم کا گوشت پوست اور خون میں جاری کر دیا کرتے تھے، ہاں میں یہ ثابت کر سکتا ہوں، افسوس کہ اس وقت یہاں کوئی اس کا گواہ نہیں، ہماری فاضل بہن اپنی عربی دانی میں خواہ کتنی ہی آگے بڑھ جائیں، انھوں نے اپنے والد ماجد کا وہ زمانہ نہیں دیکھا، جب ان کا ذوق تدریس اپنے عروج شباب پر تھا، غالباً یہ اس وقت پیدا نہیں ہوئی ہوں گی، ہاں ان کے عم محترم حسین بن محمد عرب نے دیکھا ہے،

افسوس ہے کہ اپنی بعض معذوریوں کی بناء پر وہ یہاں موجود نہیں ہیں، مجھے خوشی ہوتی ہے کہ اگر حسین عربی بھی یہاں موجود ہوتے، کل ہی میں ان سے مل کر آیا ہوں، تو عرب صاحب کی تعریف یہی ہے، آپ حضرات کو علم ہے، اور مجھے بھی کہنے میں کوئی حرج نہیں کہ میری آزمائش کہیں یا میری خوش قسمتی کہ مجھے ہندوستان سے باہر جانے کا موقع ملا اور ممالک عربیہ تو کف دست کی طرح میرے سامنے رہے، کوئی ادارہ ایسا نہیں جس میں نہ گیا ہوں، مجھے یاد ہے کہ میں نے جب شیخ الازہر مرشد عبد المجید حلیم جن سے بڑا قابل شخص ابھی تک شیخ الازہر کی مسند پر نہیں آیا، میں قاہرہ میں چند دن رہنے کے بعد ان سے ملا، اور میں نے جامعہ ازہر کے بارے میں کچھ طالب علمانہ تاثرات پیش کئے چونکہ میں بھی مدرسے سے تعلق رکھتا ہوں اور اسی دنیا کا آدمی ہوں تو میں نے ان کے سامنے بلا تکلف اپنے کچھ تاثرات رکھے تو انھوں نے کہا یوں کام نہیں چلے گا، بلکہ آپ قلمبند کر کے دیجئے، تاکہ ہماری مجلس شوریٰ ہے اس میں یہ رکھا جائے، شیخ محمود شلتوت جو بعد میں جامعہ ازہر کے نامور شیخ ہوئے ان سے شیخ ان سے شیخ الازہر نے کہا کہ شیخ ابوالحسن آپ کو لکھ کر دیں گے، (میرا نام ممالک عربیہ میں شیخ ابوالحسن ندوی ہے) معاف کیجئے میں ہندوستان میں علی میاں کہلاتا ہوں مگر ممالک عربیہ میں اگر آپ کسی سے بات کریں اور میرا کسی سے ذکر کریں تو کبھی نہیں پہچان سکے گا، انھوں نے کہا کہ استاد ابوالحسن آپ کو یادداشت لکھ کر دیں گے، آپ مجلس میں پیش کر دیجئے گا۔

یہ ۱۹۱۵ء کا تذکرہ ہے میں نے اپنے تاثرات قلمبند کئے، اور ان کے سامنے پیش کر دیئے، چند ہی سطریں پڑھیں تھیں کہ ورق پلٹ دیا، اور کہا خیر یہ تو میں بعد میں پڑھ لوں گا، آپ مجھے پہلے یہ بتائیے کہ آپ نے عربی کہاں پڑھی اور کس سے پڑھی، مجھے بتانا یہ تھا کہ شیخ محمود شلتوت جن کے علم کا شہرہ دنیا بھر میں تھا اور وہ اپنی ذہانت اور وسعت نظر میں ممتاز تھے، میری عربی میں لکھی ہوئی چند سطروں کے بعد وہ سلسلہ جاری نہ رکھ سکے اور ان کے ذہن پر اتنا بوجھ پڑا گویا وہ بالکل موقع نہیں رکھتے تھے کہ کوئی ہندوستانی اس طرح اپنے خیالات کا اظہار عربی میں کر سکتا ہے، جب ہی انھوں نے کہا کہ یہ میں پڑھ لوں گا پہلے یہ بتائیے کہ آپ نے عربی کہاں پڑھی اور کس سے پڑھی تو میں نے استاد اور مربی علامہ خلیل عرب کا ذکر کیا اور ان کے طریقہ تعلیم کے بارے میں بتایا کہ انھوں نے مجھے اس طرح عربی پڑھائی ہے، شیخ شلتوت نے میز پر ہاتھ

مار کرتیں بار کہا، ”یہی صحیح ترین طریقہ ہے“ وہ خود بہت بڑے ماہر تعلیم بھی تھے۔

ہر چیز تقدیر الہی کے مطابق ہوتی ہے

حضرات: میں اتفاقات کی منطق کا قائل نہیں، نہ ہی یہ کوئی اتفاقی واقعہ تھا، میں سمجھتا ہوں کہ قضاء و قدر کا ایک نظام ہے، اور وہ مربوط ہے، علت و معلول کا سلسلہ بالکل مربوط ہے، کوئی چیز اس کائنات میں اتفاقی طور پر پیش نہیں آتی ”وکل شیء خلقناہ بقدر روہا امرنا الا واحداً کلمح بالبصر“ تو ہر چیز تقدیر الہی کے مطابق ہوتی ہے، کسی کو یہ خبر نہ تھی کہ آپ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیں خواہ وہ خود ستائی پر محمول کیا جائے یا اظہار واقعہ پر کسی کو خبر نہ تھی کہ عربی زبان سیکھنے اور پڑھانے کا میرے شفیق بھائی جو والد کے قائم مقام تھے ان کو بھی یہ خبر نہیں تھی کہ اتنا مہتمم بالشان انتظام عربی کے لئے کیوں کیا جا رہا ہے، اور اس کی ضرورت کہاں ہے۔

مجھے ہندوستان میں رہنا ہے ہندوستان میں ہی پڑھنا ہے، اور اردو میں کام کرنا ہے، خدا کا شکر ہے کہ میں لکھنؤ میں ہی رہتا تھا، اور لکھنؤ گویا میرا گھر ہے تو مجھے اردو میں مہارت حاصل کرنا چاہئے تھی یا انگریزی میں کمال پیدا کرنا چاہئے تھا تا کہ میں یورپ اور امریکہ تک اسلام کی دعوت پہنچا سکوں، یا پھر ہندوستان میں کوئی بڑا مقام حاصل کر سکوں، بس یہ تقدیر کی بات تھی اور یہ ایسا نوشتہ تھا جسے آنکھوں سے پڑھنا نہیں جاسکتا، اور ایسے بہت سے نوشتے، نوشتہ تقدیر ہوتے ہیں، جو آنکھوں سے پڑھے نہیں جاتے، میرے بھائی (ڈاکٹر عبدالعلی) کے دل میں اللہ نے یہ بات ڈال دی کہ ہندوستان میں رہ کر عربی کا جو بہتر سے بہتر انتظام ہو سکتا ہو اور اس پر عبور حاصل کرنے کے لئے جو بہترین اسباب ہو سکتے ہوں، وہ مہیا کئے جائیں، قدرت نے گویا پہلے ہی سے اس کا فیصلہ کر لیا تھا۔

شیخ خلیل عرب سے ہمارا تعلق

یہ دولت میرے گھر کی تھی اس معنی میں کہ خلیل عرب صاحب ہمارے محلے میں رہتے تھے، اور ان کے والد (شیخ محمد بن حسین) میرے والد (شیخ عبدالحی) کے ادب عربی میں استاد تھے، جبکہ ان کے دادا (شیخ حسین بن محسن الانصاری) میرے والد کے حدیث میں استاد تھے،

شیخ خلیل کے والد شیخ محمد بن حسین کا تعارف کم ہوا ہے جو عربی کے قادر الکلام شاعر تھے اور فن عروض کے تو وہ امام تھے، عربی نثر بھی بے تکلف لکھتے تھے، ان کی نشوونماط اور ان کی جوانی سب بلا دیمین میں گذری تھی، تو وہ اہل زبان تھے، اور صاحب دیوان شاعر بھی، میرے والد نے عربی زبان اور ادب میں ان سے کسب فیض کیا، استفادہ کیا، اور حدیث میں میرے والد نے ان کے دادا شیخ حسین بن محسن انصاری الیمانی سے جن کو سہیل یمانی کہنا چاہئے جو سارے ہندوستان کے بلند پایہ محدثین کے استاد ہیں، نواب صدیق حسن خان کے استاد ہیں، اور ان کے علاوہ جو علماء بھی فن حدیث کے استاد ہے، اور ان کے علاوہ جو علماء بھی فن حدیث میں چوٹی کے علماء، اور فن حدیث میں اپنی اپنی جگہ ایک ستون سمجھے جاتے تھے، اور انھیں کے شاگرد ہیں، تو میرے والد حدیث میں نہ صرف ان کے شاگرد بلکہ ممتاز و محبوب شاگرد سمجھے جاتے تھے، یہ ہمارے گھر کی دولت تھی میرے بھائی صاحب نے مجھے عرب کے حوالے کر دیا اور عرب صاحب نے ان شرطوں کے ساتھ لیا، جن شرطوں پر استاد اس زمانے میں لیا کرتے تھے، یعنی مجھے اس کے جسم پر اختیار ہوگا، دماغ پر بھی اختیار ہوگا، کوئی حدود نہیں ہوں گی، کہ آج کیوں مارا اور طمانچہ کہاں لگا، چوٹ آئی نہیں آئی، عرب صاحب اس زمانہ کی پیداوار تھے، جب شاگرد کو استاد اپنی محبت سے نوازتے تھے اور تنبیہ و تادیب کا بھی مستحق سمجھتے تھے تو اس طرح سے انھوں نے گویا میرا چارج لیا، میرے بھائی صاحب کا اور ان کا گھر قریب قریب تھا، تو عربی کا الف ب جس کو فعل فعلوا کہتے ہیں، اور جس سے آج کل آپ میں سے بہت سے لوگ گھبراتے ہوں گے، وہ پہلی مرتبہ میری کاپی پر انھوں نے ماضی کے گردان لکھی اور مجھ سے کہا کہ اسے یاد کر لو۔

ایسا تو بہت ہوتا ہے کہ مختلف اساتذہ سے انتساب ہوتا ہے اور فخر بھی ہوتا، استادوں کو اور طالب علموں کو بھی لیکن میں بڑا خوش نصیب ہوں اور میرے ساتھ یہ استثنائی معاملہ پیش آیا کہ وہ استاد میری عربی کی ابجد سے لے کر الف باء کہنا چاہئے یا عربی کی الف ب سے لے کر تائے تمت، تک وہی میرے استاد ہیں، ایسا تو اکثر ہوتا ہے کہ آدمی ایک خاص مرحلے تک کسی ایک کا شاگرد ہوتا ہے پھر آگے بڑھ کر کالج یونیورسٹی میں پڑھتا ہے، یا باہر کسی دانشگاہ میں چلا جاتا ہے، داخلہ لے کر مختلف پروفیسروں سے پڑھتا ہے۔

لیکن میرا معاملہ یہ ہے کہ میں عربی کی الف ب (المطالعة العربیة) (یہ کتاب ہمارے

لے صاحب نے اپنے خاص اسلوب میں تیار کی تھی، جو طالب علم میں عربی بولنے اور لکھنے کی استعداد پیدا کر دیا کرتی تھی (چنانچہ المطالعة العربیة سے لے کر قرآن کریم میں ان کی منتخب سورتیں پھر صحیح بخاری بھی مکمل انھیں سے پڑھی، وہ توحید کا کھرا عقیدہ رکھتے تھے، اور قرآن کریم کے جلال و جمال سے خوب واقف تھے اور اس طرح انھوں نے ہمیں بھی اس کا ذوق و شوق ایسا عطا کیا، تھا کہ قرآن کی تلاوت اور ایمان کی حلاوت کا صحیح لطف ملا اور محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک سے عشق ہو گیا تو میں بتا رہا تھا کہ ابتدائی کتاب المطالعة العربیہ سے جس کا میں بارہا تقریر و تحریر میں ذکر کر چکا ہوں وہ ان کے خود ساختہ نصاب کی مبادیات میں تھی، عربی ادب کی آخری کتابوں، نہج البلاغہ، دلائل الاعجاز، اور حماسہ ابی تمام، الامیۃ العرب اور رسائل ابی بکر، خوارزمی، تک میں انھیں کا شتا گرد ہوں، پھر میری ایک اور خوش نصیبی یہ بھی تھی کہ مجھے ان کی شفقت و توجہ کا کوٹہ پچاس فیصد ملا، میں تو یہ انکسار سے کام لے رہا ہوں، میرا خیال ہے کہ ۸۰ فیصد سے زیادہ ملا، اس لئے کہ میرے شریک درس صرف ایک تھے میں یہ بات بڑی دانش گاہ (جامعہ کراچی) میں عرض کر رہا ہوں، اس لئے کہہ رہا ہوں کہ اس سے منفہ نہیں اور میں کوئی تعلیمی مشورہ نہیں دے رہا ہوں۔

حضرات! جامعات و کالج کی سب سے بڑی کوتاہی

لیکن آج حالت یہ ہے کہ ہر یونیورسٹی اور کالج کی کامیابی سمجھی جاتی ہے کہ کلاس میں کتنے طلباء ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ گروہ طالب علم ہیں تو ان کا استاد کی توجہ کا ایک فیصد حصہ ملتا ہے، ہم صرف دو شاگرد تھے اور ایک استاد، ایک میں اور دوسرے عرب صاحب کے چھوٹے بھائی حسین بن عرب تو ہمارا کوٹہ محبت میں بہت بڑھا ہوا تھا، تو یہ ایک بات تھی، یہاں سے پرھ کر جب میرے قدم ہندوستان سے باہر نکلے تو رباط سے لے کر جامعہ قروین سے مصر اور حجاز تک کوئی بڑی جامعہ تیونس کے سوا جہاں اتفاق سے میں جامعہ زیتونہ کو نہیں دیکھ سکا۔

دنیا کی تین بڑی جامعات

تین جامعات عالمی اسلامی میں بڑی اور قدیم کہی جاتی ہیں، جامع کہی جاتی ہیں، جامعہ قروین، جامعہ زیتونہ اور جامعہ الازہر، جامعہ زیتونہ دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا لیکن جامعہ کے شیخ یا

وائس چانسلر ڈاکٹر الحبیب بن خوجہ کمیٹیوں میں میرے شریک کار رہے، جامعہ زیتونہ میں نے دیکھی نہیں وہاں کے حالات سے واقف ہوں، ڈاکٹر خوجہ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ اور بہت سی کمیٹیوں میں ہم دونوں ساتھ تھے، اور اس کے علاوہ بھی محفلوں میں ملاقات رہتی، اسی طرح مصر کی مختلف انواع درس گاہوں کو دیکھا، دارالعلوم کو دیکھا اور جامعہ فواد الاول جو جامعہ القاہرہ کہلاتی ہے، وہاں گیا اور جامعہ ازہر کو تو بہت خوب دیکھا اس طرح میں یہ کہہ سکتا ہوں، اس لئے کہ اس کی عظمت و افتخار میں شاگرد کی حیثیت سے حصہ مجھے بھی ملتا کہ میں نے عربی ادب کا ایسا صحیح ذوق رکھنے والا استاد بلکہ جامعہ میں ایک علمی شہادت کے طور پر عرض کر رہا ہوں کہ عربی ادب کا ایسا صحیح ذوق رکھنے والا استاد جس کے اندر ادبی ذوق رچ بس گیا ہو، ایک تو یہ ہوتا ہے کہ آدمی بوقت ضرورت اور بقدر ضرورت کام لے لے، ہم لوگ سب ہی یہ کرتے ہیں، میں بھی یہ کرتا ہوں اس لئے کہ استاد رہا ہوں، مثلاً ایک مضمون پڑھانا ہے تو میں نے تیاری کی بلکہ چلتے چلتے بھی ایک نظر دیکھ لیا کہ فلاں چیز ذہن سے نکل تو نہیں جائے گی مجھے یاد ہے کہ جب بخاری ترمذی پڑھانے کے لئے ملی تو میں اس کا مطالعہ کرتا تھا اور پھر چلتے چلتے جب تیار ہو کر جاتا تب بھی ایک نظر ڈال لیا کرتا تھا کہ کہیں راویوں کے نام ذہن سے نہ نکل جائیں، ابواب و تراجم کی باریکیاں نہ بھول جاؤں تو میں طالب علم کو مطمئن کر دیتا تھا، عرب صاحب کو اس کا اندازہ نہیں ہوتا تھا لیکن ایک چیز ہوتی ہے کہ وہ کس طرح انسان کی گھٹی میں پڑی ہو اور اس کے اندر رنج بس جاتی ہے اور خون کے اندر جاری و ساری ہو جاتی ہے تو اس کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے، پھر وہ ابلتی ہے، چشمہ رواں کی طرح روئیں روئیں سے ابلتی ہے، عرب صاحب کا حال یہی تھا، کہ جب وہ پڑھانے بیٹھتے تو ان پر ایک کیفیت طاری ہو جاتی اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ لکھنؤ کا یہ بازار جہاؤ لال جو محمد علی لین کہلاتی ہے وہ گلی، اور امین آباد کا ایک حصہ جہاں ایک معمولی سا مکان تھا کسی کو خبر نہیں تھی کہ یہاں پر کون سا مدرسہ لگا ہے، اور اس مدرسہ سے عربی زبان و ادب کی کون سی خدمت ہونے والی ہے، چٹائی پر صحیح معنی میں میں کوئی استعارہ نہیں بول رہا ہوں، وہ فرش ایسا تھا کہ اس موٹے موٹے بال تھے (نمدہ) کے ہم لوگوں کے نشان پڑ جاتے تھے، اگر نثر کی کوئی کتاب ہے تو عرب صاحب اس کے کسی جملے کا بڑا لطف لیتے، میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ کاش عربی تعلیم کی کلاس ہوتی تو وہاں عرض کرتا کہ اچھا جملہ وہ پڑھتے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انھوں

نے کوئی لذیذ چیز کھائی ہو اور وہ اس کا مزہ لے رہے ہوں اور ان کے منہ میں پانی بھر آیا ہے۔

استاد اور طالب علم کے درمیان ربط

حضرات: یہ ایک حسی کیفیت ہوتی ہے، اسے صرف ذہنی کیفیت نہیں حالانکہ یہ ایک علمی اور ذہنی کیفیت بھی ضروری ہے اور مفید بھی ہے لیکن جب حسی طور پر یہ بات پیدا ہو جائے کہ معلوم ہوا کہ گم ہو گئے اور بس عرب صاحب بار بار فرماتے کہ ارے ظالم نے یہ کیا جملہ کیا کہہ دیا اور اتنی بار دہراتے کو معلوم ہوتا تھا کہ ان کو انتظار ہے کہ ہم اس خوبصورت جملے کو اپنے اندر اخذ کر لیں تاکہ وہ کرنت ہماری طرف منتقل نہیں ہوگا، تو طالب علم استاد کا شنی نہیں بن سکتا، اگر عربی کا شعر ہے تو ان کی حالت ایسی ہوتی تھی اور اس قدر جوش و خروش کے ساتھ پڑھتے کہ پورا کمرہ گونج اٹھتا تھا بعض مرتبہ آدمی اچھل جاتے، مجھے آج تک یاد ہے اور میں یہ بات بتا سکتا ہوں کہ ان کو کون کون سے شعر پسند تھے، اور یہی تعریف ہے، ایک کامیاب استاد کی، آج کتنے طالب علم ہیں جو یہ بات بتا سکتے ہوں، خواہ اردو زبان کا معاملہ ہو یا عربی کا ان سے پوچھئے کہ آپ کے استاد کو کون کون سے شعر پسند ہیں، ہاں میں بتا سکتا ہوں یا لکھوا سکتا ہوں، جو میرے استاد کو پسند تھے، اور وہ مزے لے لے کر پڑھتے تھے اور یہ بھی عجیب بات ہے کہ عرب ہونے کے باوجود انھیں اردو شاعری کا بھی بڑا اچھا ذوق ملا تھا، ان کی زندگی کا برا حصہ لکھنؤ میں گذرا تھا جہاں انھوں نے بڑے بڑے اساتذہ سے پڑھا تھا اور ادب کا بھی ایک حاسد یعنی ایک SCENCE ہوتا ہے، جس طرح آپ جو اس خسمہ سے واقف ہیں، ایک حاسہ اور ہوتا ہے، اسے آپ حاسہ سادسہ (چھٹی حس) کہئے اور وہ ہے حاسہ ادبیہ جس کو حاسہ نہیں ملتا وہ جتنی ہی کوشش کرے کامیاب شاعر یا ادیب نہیں بن سکتا، ہاں ناقد یا مؤرخ ہو سکتا ہے، عروض داں ہو سکتا ہے، خامیاں نکال سکتا ہے، لیکن وہ صحیح معنوں میں ادیب نہیں ہو سکتا، اس لئے وہ حاسہ ادبیہ سے محروم ہوتا ہے اور میرا خیال ہے کہ ابھی کئی حاسے اور ہوں گے جن کا ابھی انکشاف نہیں ہوا، ان میں سے ایک دینی حاسہ بھی ہوتا ہے بعض لوگوں میں دینی حاسہ نہیں ہوتا، ان کو مصیبت یہ ہوتی ہے کہ ہزار دلیلیں دیں مگر وہ دینی حاسہ ان کے اندر موجود نہیں ہوتا، جو وہ اس سے کام لیں، جیسے بعض لوگوں کے اندر موسیقی (SCENCE) نہیں ہوتا ان کا حال یہ ہوتا

ہے کہ اچھے شعر پڑھیے، وہ شس سے مس نہیں ہوتے، میں ایک لطیفہ سناؤں، مجھے دو سال ہوئے میں رباط گیا تھا، وہاں مسلم یونیورسٹیز کا فیڈریشن کا مرکز ہے، وہ ندوۃ العلماء کے ناظم کی حیثیت سے اس کا رکن ہوں وہاں ایک بڑے علامہ اور دارالحدیث کے شیخ عمید (DEAN) تھے ان میں ہماری خوبیاں تھیں لیکن یہ حاسہ کم ملا تھا یا بالکل نہیں ملا تھا، ایک شخص نے ان کی تعریف کی بڑے اچھے آدمی ہیں، لیکن صبح گدا گدا دیئے تو شام کو ہنسی آتی، ہنسی کے اس محرک کو اتنا لمبا سفر کرنا پڑتا ہے، پورا دن گزر جائے، (اد غدغہ صباحا، فیضک مساء) یعنی بڑے اچھے، بڑے سنجیدہ، صاحب علم لیکن ان میں لطف اندوز ہونے یا انجوائے (ENJOY) کرنے کا حاسہ نہیں ہے، تو صبح کو گدا گدا دیئے اور شام کو ہنسی آئے تو شام تک کھڑا رہے گا کہ ہنسی آئی کہ نہیں غرض یہ حاسہ عرب صاحب کو خوب ملا تھا، مثلاً مجھے یاد ہے کہ ایک بار وحشت کلکتوی کا شعر انھوں نے اس طرح سنایا کہ بس تصویر بن گئے شعر یہ تھا۔

نشان منزل جاناں ملے ملے نہ ملے

مزے کی بات ہے یہ شوق جستجو میرا

ایک عرب کو دیکھئے وہ کس طرح اس کا لطف لیتا ہے، اس شعر پر انھوں نے اس طرح پہلو بدل بدل کر داد دی، ایسے ہی ان کو عربی کے شعر بہت یاد تھے، کتری ان کا پسندہ شاعر تھا، کہتے تھے، ان کے ایک شعر پر پورا دیوان قربان کیا جاسکتا ہے۔

و کالسيف ان جنته مستغيثا و کالجراں جنته مستقيا ان لم یکن قصدی

زنا فقد کفی ان لا اراک عقابا

کہ اگر میرا آپ کی خدمت میں حاضر نہ ہونا جرم تھا تو اس سے بڑھ کر کوئی سزا نہیں ہو سکتی کہ میں آپ کے دیدار سے محروم رہا، اس پر انھوں نے کہا تھا کہ دیوان قربان کیا جاسکتا ہے۔

اس وقت کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ انتظام کیوں کیا جا رہا ہے، ایک متوسط درجے کا ایک لڑکا جس کے بھائی بے شک عربی کے عالم تھے، لیکن انھوں نے ڈاکٹری کا کورس (MBBS) بھی کیا تھا، اور مطب کر رہے ہیں، اس کے خاندان کے کئی افراد ہندوستان سے باہر گئے آئی سی ایس میں شریک ہوئے ان میں سے ایک صاحب یہاں بھی ہیں، حافظ محمد اسحاق آئی سی ایس وہ

میرے خاندان کے ہیں، وہ جس وقت وہاں گئے تو ایک دھوم مچی تھی، ہمارا ضلع رابع بریلی ہے، ہم لوگ نصیر آباد کے رہنے والے ہیں، دھوم یہ تھی کہ ولایت گئے ولایت گئے وہ آئے، جب بھی بڑی دھوم ہوئی، میرے حقیقی خالہ زاد بھائی اس سے پہلے پیر مٹری کرنے انگلینڈ گئے تھے اور ایک تیسرے بھائی بھی امریکا گئے تھے، حقیقی ماموں کے بیٹے تھے کہ ایک چھوٹا سا خاندان جس کے تین تین افراد باہر گئے ان کے ایک لڑکے لئے یہی سوچا جاسکتا تھا کہ اس کو انگریزی میں کمال پیدا کر لینا چاہئے یہی منصوبہ بنایا جاسکتا تھا لیکن کیا بات تھی کہ میرے بھائی کے ذہن میں یہ بات آئی کہ مجھے عربی پڑھائی جائے اور عربی پڑھنے کے لئے اس وقت بھی دیوبند تھا، ندوۃ العلماء تھا، مظاہر العلوم سہان پور تھا، لیکن قبل اس کے کہ ندوۃ العلماء سے فیض حاصل کرتا مجھے ایک عرب استاد کے سپرد کر دیا گیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربی زبان سے میرے لئے غیریت نہیں رہی مجھے یاد ہے کہ پندرہ سولہ سال کی عمر میں پہلی مرتبہ لاہور آیا تو حفیظ جالندھری سے میری ملاقات کرائی گئی اور تعارف میں کہا گیا کہ یہ لڑکا لکھنؤ سے آیا ہے، جو آب حیات اور ”گل رعنا“ کا حافظ ہے، گل رعنا میرے والدہ کی تھیں، یعنی اپنے گھر کی دولت اور ”آب حیات“ میں نے اتنی پڑھی تھی کہ آپ ایک مصرعہ پڑھئے میں دوسرا پڑھ دوں گا، حفیظ جالندھری نے مجھ سے کہا کہ میاں ہماری مشکل یہ ہے کہ ہم پنجابی میں سوچتے اور اردو میں شعر کہتے ہیں، اس طرح انھوں نے یہ پوچھا کہ عربی میں سوچتے ہو اور عربی میں بولتے ہو، عرب صاحب کے پڑھانے میں یہی سب سے بڑی خوبی تھی کہ وہ طالب علموں میں یہ احساس پیدا کر دیتے تھے کہ عربی گویاں تمہاری زبان ہے، اور جو اچھی الفاظ، محاورے ہیں، یہ کسی کی ملکیت نہیں تمہارے لئے بھی اسی طرح ہیں جیسے ان کے لئے جنہوں نے لکھے ہیں، البتہ صحیح جگہ استعمال کرنے کا سلیقہ چاہئے تم صحیح جگہ استعمال کرو تمہاری بن جائے گی یہ سمجھو یہ تصرف ہے، ایک بات مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ میں نے ایک جملہ لکھا۔

فلما سل سيف الصبح من سيف الظلام -

ان کو معلوم تھا کہ یہ جملہ میں نے کہاں سے لیا ہے ابھی چند دن ہوئے تھے مجھے ان سے پڑھے ہوئے لیکن اس قدر خوش ہوئے اتنا پلٹایا، اتنا چمٹایا اور اسی وقت مجھے ایک روپیہ انعام دیا، پھر ملائی کی برف بھی جو لکھنؤ میں بہت پسند کی جاتی ہے وہ بھی کھلائی یعنی وہ یہ احساس پیدا کر دیا کرتا تھا کہ یہ جو ورثہ یا ذخیرہ ہے وہ سربہ مہر نہیں ہے اور ایسا نہیں ہے کہ ختم ہو جائے یا بند کر کے

رکھ دیا گیا ہے بلکہ یہ ایک ایسی دولت مشترکہ ہے جس سے سب کو فائدہ چاہئے، البتہ اس شخص کا حق اس پر قائم ہوتا ہے جو اس کو صحیح جگہ پر امتدال کے ساتھ استعمال کرے، اگر بے جا اور بے موقع محاورات استعمال کئے جائیں تو ان میں کوئی نہ کوئی طنز نکلتا ہے، اور ہمارے لکھنوں میں اس کا بہت لحاظ رکھتے ہیں، کہ یہ محاورہ یہاں نہیں بولنا چاہئے، یا ایسا نہ ہو کہ امتدال کی حد تک پہنچ جائے، دوسری صفت ان کے پڑھانے کی یہ تھی کہ وہ احساس پیدا کر دیا کرتے تھے کہ سب کچھ تمہارے لئے ہے تم اس کی عبارتوں میں، تقریروں اور دلیلوں میں استعمال کرو، سچ تو یہ ہے اس سے مجھے بہت فائدہ ہوا، یہی نہیں بلکہ اہل زبان تھے، قرآن مجید کی تلاوت اس قدر خوش الحانی سے کرتے اور ان پر گریہ دزاری کے ساتھ ایسی وقت رقت طاری ہوتی تھی کہ محلہ کی مسجد سے باہر غیر مسلم تک سن کر رک جایا کرتے تھے۔

استاد ایسا ہو جو اپنا ذوق طالب علم میں

منتقل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو

بہر حال وہ ان گنے چنے اساتذہ میں سے تھے جو اپنا ذوق منتقل کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے، اس لئے کہ ان کا یہ ذوق ان میں خود ایک چشمے کی طرح ابلتا اور اس کے لئے ضروری تھا کہ اس چھلکتے ہوئے جام کو ٹپکنے کا موقع ملے ورنہ اگر کوئی جام لبریز ہو اور ٹپکنے کی اجازت نہ دی جائے تو پھر یہ ہوگا:

سقونی وقالو الاتغن وان سقواء

جبال سلیمی ماسقیت ، لغت

شاعر کہتا ہے کہ انہوں نے مجھے شراب پلائی تو بہت، لیکن کہتے ہیں کہ گنگناؤ نہیں، حالانکہ اگر یہی جام سلیمی کے پہاڑوں کو پلا دیئے جائیں تو وہ بھی گنگنا نے لگیں یا نغمہ سرا ہو جائیں اس کے صرف ایک آنچ کی ضرورت ہوتی ہے، عرب صاحب کے اندر ذوق و شاعری کی آگ بھری ہوئی تھی زبان کی بھی ایک آگ ہوتی ہے، اس کی چنگاریوں کو نکلتا عیا ہے، اس موقع پر بغیر کسی ترتیب کے علامہ خلیل عرب اور ان کے کامیاب طریق تعلیم عربی کے بعض پہلو آپ کے سامنے رکھے ہیں اس کے لئے میری کتاب ”پرانے چراغ“ میں ان پر مستقل مضمون ہے

میں عربی میں کئی جگہ ان کا تذکرہ اور ان کی خصوصیات کا ذکر کر چکا ہوں، خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ پہلی مرتبہ یہاں آیا جہاں عرب صاحب کے نام کی لائبریری قائم کی گئی ہے، یہ ۲۲ سال بعد میرا پاکستان کا دورہ ہے۔

اب جب آیا ہوں تو اب یہ لائبریری قائم ہو گئی ہے، انشاء اللہ پھر آیا تو ان کے نام سے کوئی عربی ادارہ بھی قائم کر دیا گیا ہوگا، تاکہ عرب صاحب کے کامیاب طریق تعلیم کے مطابق پاکستان میں عربی کا ذوق پیدا کیا جائے، وما ذلک علی اللہ بعزیز۔

میں جناب احسان رشید وائس چانسلر جامعہ کراچی کو مبارکباد دیتا ہوں اور مبارکباد سے زیادہ داد دیتا ہوں کہ آپ کی جامعہ پہلی جامعہ ہے جس کو یہ اعزاز حاصل ہوا کہ اس میں ایک عربی النسل خاندان کا ایک فرد نہیں بلکہ میری استادزادی میری بہن پروفیسر عطیہ خلیل عرب اس کی سربراہ اور استاذ ہیں، میں ان الفاظ کے ساتھ اجازت چاہتا ہوں، دوسرا پروگرام بھی ہے اگرچہ۔

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
وما علینا الا البلاغ امین۔
والسلام علیکم ورحمۃ اللہ علیہ

قرآنی مطالعہ اور اس کے آداب

یہ تقریر ۲۶ جولائی ۸ء کو قرآن اکیڈمی، ڈال ٹاؤن لاہور کے ایک منتخب جلسے میں کی گئی، اس جلسہ میں حلقہ تدریس قرآن سے تعلق رکھنے والے حضرات و دراز کا سفر کر کے آئے تھے، تقریر خصوصی اور قرآن اکیڈمی کا تعارف اس کے مہم سس و صدر ڈاکٹر امجد احمد صاحب نے فرمایا۔

الحمد لله نحمده ونستعينه ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور انفسنا ومن سيئات اعمالنا من يهده الله فلا مضل له ومن يضلل الله فلا هادي له ونشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له ونشهد ان محمدا عبده ورسوله صلى الله تعالى عليه وعلى آله واصحابه وسلم تسليما كثيرا كثيرا اعوذ بالله من الشيطان الرجيم بسم الله الرحمن الرحيم. الله يجتبي اليه من يشاء ويهدي اليه من ينيب O

قرآن مجید ہر موقع پر مشکل کشائی اور دست گیری کرتا ہے:

برادران عزیز! قرآن مجید کے تجزات میں سے جن کا سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا یہ بھی ہے کہ وہ ہر موقع پر مشکل کشائی اور دست گیری کرتا ہے، مجھے بارہا اس کا تجربہ ہوا کہ میں کسی تقریر کے موقع پر یہ طے نہ کر سکا کہ اپنی بات کہاں سے شروع کروں گا اور مجھے آج کیا کہنا ہے اور قاری نے قرآن مجید کی تلاوت کی اور مجھے معلوم ہوا کہ دوسرے لوگوں کے سننے سے پہلے وہ آیتیں مجھے سنائی جا رہی ہیں اور ان آیتوں کا انتخاب میرے لئے کیا گیا ہے، مجھے اپنے غیر ملکی دوروں میں بھی اس کا تجربہ ہوا کہ دن بھر کی مصروفیتوں اور نقل و حرکت میں اس پر غور کرنے کی نوبت ہی نہ آئی کہ کس موضوع پر تقریر ہوگی، کہیں تو موضوع کا تعین ہو جاتا ہے اور کہیں نہیں ہوتا تو میں نے اس کو خدا پر چھوڑ دیا کہ وہ وقت پر رہنمائی فرمائے گا، چونکہ جو چیز اس کی طرف سے آتی ہے، اس کو عارفین ”وارد“ کہتے ہیں، یعنی ایک عزیز مہمان جس کا ورود ہوا ہے، اس میں اپنے ارادہ اور انتخاب کو کوئی دخل نہیں، اس موقع پر بھی یہی پیش آیا، اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے عزیز قاری کو جو انہوں نے آیتیں پڑھیں اس میں ہماری رہنمائی ہوئی۔ قبل

اس کے کہ میں آیت کی تشریح میں کچھ عرض کروں اور قرآن مجید کے طالب علموں کے سامنے اپنے کچھ تجربے، کچھ مشورے پیش کروں کہ حقیقت میں وہی میرے مخاطب ہیں، کچھ اپنی حقیر ذات اور علمی سفر کے بارے میں عرض کرنا چاہتا ہوں۔

قرآن مجید کی حکمت و دعوت :

ڈاکٹر صاحب نے بڑی خوبی سے میرے تعارف بھی کرایا لیکن میں کس قدر تعارف ضروری سمجھتا ہوں اور سنت یوسفی کے مطابق یہ فرض بھی خود ہی انجام دیتا ہوں۔ جب حضرت یوسفؑ کے پاس تعبیر پوچھنے والے گئے تو انہوں نے فرمایا: ذلکما مما علمنی ربی سب سے پہلے سامعین کو یا جو کوئی استفسار لے کر جائے اس کو اس اطمینان کی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ جس کے پاس گئے ہیں اس سے کچھ مدد بھی مل سکتی ہے یا نہیں، انتخاب میں انہوں نے کچھ غلطی تو نہیں کی تو انہوں نے ضروری سمجھا کہ کہہ دیں ذلکما مما علمنی ربی انی ترکت ملة قومہ لا یؤمنون باللہ وہم بالآخرۃ ہم کفرون O

یہ نبی کا کلام تھا اور اس میں ایک طرح کی خود ستائی کی بو تھی، اس میں اپنی تعریف کی بو نکلتی تھی اور یہ وہم ہو سکتا تھا، اس لئے انہوں نے فوراً فرما دیا کہ "ذلکما مما علمنی ربی" میں تمہاری اس موقع پر مدد تو کر سکتا ہوں، مجھے اللہ نے یہ علم عطا فرمایا ہے، لیکن یہ علم کیوں عطا کیا ہے؟ "انی ترکت ملة قوم لا یؤمنون باللہ" یہ میری ذہانت کا نتیجہ نہیں ہے، میری نجابت کا بھی یہ نتیجہ نہیں حالانکہ یہ دونوں چیزیں موجود تھیں اور بدرجہ کمال و جمال، لیکن انہوں نے فرمایا "انی ترکت ملة قوم لا یؤمنون باللہ وہم بالآخرۃ ہم کفرون" اس علم کا افادہ اس لئے ہوا کہ میں نے اس قوم کی ملت چھوڑ دی جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتی اور آخرت کی منکر تھی۔ "واتبعت ملة ابائی ابراهیم واسحاق و یعقوب" اور اس کے بعد انہوں نے وہیں سے توحید کے وعظ کا مدخل پیدا کر لیا۔ عزیزو! تم جس کو بڑا مسئلہ سمجھ رہے ہو اور جو مشکل تم کو یہاں لے کر آئی ہے، اس سے بڑی مشکل درپیش ہے، وہ ہے عقیدہ، یہ خواب جو تم نے دیکھا، خواب تو خواب ہی ہوتا ہے، لیکن معاملہ بیداری کا ہے، معاملہ زندگی کے مستقبل کا ہے، معاملہ ابدی اور دائمی زندگی کا ہے، مان لو تم کو خواب کی تعبیر دینے والا دنیا میں کوئی بھی نہ ملے تب بھی کوئی بڑا نقصان نہیں، لیکن اس خواب بستی کی تعبیر دینے والا اگر کوئی نہ ملا کہ دنیا میں آنے کا مقصد کیا

ہے؟ کائنات کا فطر و خالق کون ہے؟ اگر اس کی صحیح معرفت نہ ملی تو اصل خطرہ یہ ہے، پھر انہوں نے اتنا ہی Dose یا جتنا Dose دینا چاہئے تھا، وہ جانتے تھے کہ یہ غرض لے کر آئے ہیں، ان کو ایک ذہنی پریشانی ہے، یہ اتنا صبر نہیں کر سکتے کہ ان کو ایک یا دو گھنٹے تبلیغ کروں، اس لئے انہوں نے بالکل صحیح احساس تناسب کے ساتھ جو ایک حاذق طبیب رکھتا ہے اور ایک داعی حکیم رکھتا ہے ایک ملہم رکھتا ہے، اتنا ہی ڈوز دیا جتنے ڈوز کے وہ متحمل تھے۔

دل کا دروازہ کبھی کبھی کھلتا ہے:

آپ اس تناسب کو دیکھئے، اس میں جمال یوسفی پورے طور پر عیاں ہے، اس میں نہ کمی ہے نہ زیادتی، ناپ تول کر جہاں رک جانا چاہئے وہاں رک گئے، یعنی توحید کی پوری بات کہی، لیکن اس کو اتنا دراز نہیں کیا کہ وہ لوگ یہ کہنے لگتے کہ آپ اگر خواب کی تعبیر دے سکتے ہیں تو دیجئے، ورنہ ہم فرصت سے آئیں گے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے دیکھا کہ ان کے دل و دماغ کا دروازہ کھلا ہے اور دل کا دروازہ کبھی کبھی کھلتا ہے۔ قسمت سے کھلتا ہے، کبھی کسی قریش سے کھلتا ہے، کبھی کسی پریشانی سے کھلتا ہے، اس دروازہ سے جو اصل پیغام ہے وہ داخل کر دینا چاہئے، لیکن وہ پیغام اس میں سبک روی کے ساتھ داخل ہو کر وہ دروازے بند نہ ہو جائیں اور احتجاجاً بند نہ ہو جائیں، میں تو حیران رہ جاتا ہوں اور افسوس ہے کہ یہ پورا حصہ بائبل سے حذف ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ بائبل کس کی تصنیف ہے اور قرآن کس کا نازل کیا ہوا ہے، ان کو خوب اندازہ تھا کہ یہ کتنی بات کے متحمل ہو سکتے ہیں، اتنی ہی بات انہوں نے کہی۔ مریض چاہتا ہے کہ اس کو اس کے درد کا مداوا جلد مل جائے تو انہوں نے کہا قبل ان یأتیکما طعام ترزقاندہ تمہارا راشن جو مقرر ہے اس کے آنے سے پہلے تعبیر دے دوں گا۔ مخاطب کو یہی دوا طمینان چاہئیں، اس کی دوا مل سکتی ہے یا نہیں؟ اور جلد ملتی ہے یا نہیں؟ اس درمیان میں توحید کا وعظ کہہ دیا۔

مطالعہ قرآن مجید سے علمی زندگی کا آغاز:

میں اپنا تھوڑا سا تعارف کرانا مناسب سمجھتا ہوں کہ میں قرآن شریف کا ایک حقیر اور ادنیٰ طالب علم ہوں، میری علمی زندگی قرآن مجید ہی مطالعہ سے شروع ہوئی، میں نے کئی جگہ لکھا ہے

کہ مجھے اللہ نے ایک ایسا استاد عطا کیا جس کو ذوق ایمانی اور ذوق قرآنی ملا تھا۔ (۱) وہ قرآن پڑھتے تھے اور روتے تھے، پہلا نقشہ جو مجھ پر پڑا وہ ان کی آواز کا، جو درمیں ڈوبی ہوئی، یہ میری خوش نصیبی تھی، اور قرآن مجید کا اصل مزاج بھی یہی ہے۔

قرآن مجید کا مزاج صدیقی ہے:

قرآن مجید کا مزاج صدیقی ہے۔ جب حضرت ابو بکر صدیقؓ سے کہا گیا کہ نماز پڑھاؤ اور حضور ﷺ کے مصلى پر کھڑے ہو جاؤ تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ ابو بکرؓ کو اس سے معاف رکھا جائے کہ وہ ”رجل یکا“ ہیں جب وہ قرآن شریف پڑھنے لگتے ہیں تو پڑھ نہیں سکتے، ان پر گریہ غالب ہو جاتا ہے اور لوگ سن نہیں سکتے ہیں اور یہی شکایت کی تھی مشرکین قریش نے جب حضرت ابو بکرؓ کو نماز پڑھانے کی اجازت دی گئی اور انہوں نے اپنے گھر کے سامنے ایک مسجد بنائی، جب تک وہ سری نماز پڑھتے رہے تو لوگ وہاں جمع نہیں ہوتے، لیکن جب وہ قرأت کرنے لگے تو مرد و عورتیں اور بچے وہاں جمع ہونے لگے۔ پھر وہ رقت کے ساتھ قرآن مجید پڑھنے لگے تو پتھر بھی موم ہونے لگے اور دلوں پر اثر ہونے لگا کہ قریش کو یہ فکر پر گئی کہ کہیں مکہ معظمہ کی زندگی میں تہلکہ نہ مچ جائے اور زمام کار ان کے ہاتھوں سے نہ نکل جائے۔ اصل میں قرآن کا مزاج ہی یہی ہے کہ درد کے ساتھ ایمانی حلاوت کے ساتھ پڑھا جائے۔ حدیث میں آتا ہے ”الایمان یمان و الفقه یمان و الحکمة یمانیہ“ یہ میری خوش نصیبی کہ پہلا معلم جو مجھے عطا کیا گیا وہ رفیق القلب تھا، دل دردمند رکھتا تھا اور ہم لوگوں کو حسرت رہتی تھی کہ وہ دیر تک قرآن شریف پڑھیں اور ہم سنیں، وہ ہمارے محلہ کی مسجد میں فجر کی نماز پڑھاتے تھے۔ شاذ و نادر کبھی ایسی نوبت آئی تھی کہ وہ پوری سورہ پڑھ سکیں، پرہنا شروع کیا کہ گریہ طاری ہوا، آواز بھرا گئی، ان کا روزانہ کا یہ معمول تھا۔ انہوں نے مجھے قرآن مجید کی کچھ سورتیں پڑھائیں، تو حید کی سورتیں خاص طور پر انہوں نے مجھے پڑھانی شروع کیں۔ سورہ زمر سے شروع کیا، پھر وہ وقت آیا کہ زبان و ادب کی تعلیم غالب آ گئی اور اسی میں مشغول ہو گیا، لیکن قرآن مجید کا جو ذوق تھا وہ وقتاً فوقتاً سامنے آتا تھا اور اثر کرتا تھا۔ اس کے بعد جب میری

(۱) شیخ خلیل بن محمد یمانی (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ”پرانے چراغ“ مستقل مضمون)

تعلیم ختم ہوئی تو قرآن مجید کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا۔ مدارس کے نصاب میں جو کتابیں پڑھی جاتی ہیں، ان سے زیادہ پڑھیں پھر یہاں لاہور آ کر مولانا احمد علی سے قرآن مجید پورا پڑھا، یہاں بھی جس چیز نے متاثر کیا وہ ان کی قرآنی زندگی تھی جس کو قرآن ناطق کہا گیا ہے، اس سے قلب میں جلا محسوس ہوتی تھی، مولانا کی زہدانہ زندگی، درویشانہ معاشرت اور عمل بالسنّت کا مجھ پر وہ اثر پڑا جس کو ”برکت“ کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں، کچھ عرصہ دارالعلوم دیوبند میں بھی رہا۔ میں نے مولانا سید حسین احمد مدنی سے وقت مانگا کہ خاص خاص آیات جن میں مجھے اشکال محسوس ہوتا ہے جو عام تفسیروں سے حل نہیں ہوتیں وہ میں آپ کے سامنے پیش کروں گا۔ مولانا مدنی اپنے زمانہ کے بلند ترین علماء میں تھے اور علوم و فنون اور حدیث کے علاوہ (جس کے وہ مانے ہوئے استاد اور شیخ تھے) ان کو قرآن مجید کا خاص ذوق تھا۔ اس کا رنگ ان کی زندگی اور مزاج پر چھا گیا تھا۔ انہوں نے مجھے جمعہ کا دن دیا، مجھے یاد ہے کہ ان آیات کو منتخب کر لیتا تھا جو ہل نہیں ہوتی تھیں۔ مولانا کثرت سے سفر کرتے تھے اور وہ تحریک کا زمانہ تھا لیکن مجھے پھر بھی استفادہ کا کچھ موقع ملا۔

مولانا سید سلیمان ندوی اور علوم قرآن:

اس کے علاوہ مجھے مولانا سید سلیمان ندوی سے قرآن مجید کی بعض آیات کی تفسیر اور بعض آیتوں پر ان کی تقریر سننے کا موقع ملا اور میرا تاثر یہ ہے کہ میں نے قرآن مجید کے بارے میں کسی کا فہم اتنا عمیق نہیں پایا جتنا کہ مولانا سید سلیمان ندوی کا۔ یہ ایک تاریخی انکشاف ہے، لوگ سید صاحب کو مورخ اور سوانح نگار کی حیثیت سے جانتے ہیں، متکلم کی حیثیت سے جانتے ہیں، لیکن میرے نزدیک فہم قرآن میں ان کا پہلا اتنا بلند تھا کہ مجھے ہندوستان ہی نہیں بلکہ حتیٰ براعظم میں بھی کوئی ایسا شخص نہیں ملا جس کا مطالعہ قرآن اتنا وسیع اور عمیق ہو اور اس غائر مطالعہ کی وجہ یہ ہے کہ عربی زبان و ادب اور بلاغت اور اعجاز قرآنی کا مطالعہ ان کا بہت وسیع و عمیق تھا، پھر مولانا حمید الدین فراہی (جو اس فن کے گویا امام تھے) کی صحبت میں رہ کر انہوں نے ان کی گفتگو، ان کی تحقیقات اور ان کے مطالعہ قرآن سے پورا استفادہ کیا، مجھے یاد ہے کہ ایک بار ہم لوگ دارالمصنفین گئے ہوئے تھے تو انہوں نے سورہ جمعہ پر تقریر کی، میں نے ایسی عالمانہ، ایسی محققانہ اور ایسی نکات سے بھری ہوئی تقریر بھی تک نہیں سنی تھی، کاش کہ وہ محفوظ ہو جاتی۔ تو مجھے

سید صاحب سے مختصر استفادہ کا موقع ملا، پھر جب دارالعلوم ندوۃ العلماء میں بحیثیت استاد میرا انتخاب ہوا تو خاص طور سے قرآن مجید کا درس میرے سپرد ہوا، وہاں قرآن کے درس کی دو صورتیں ہیں، ایک تو متن قرآن پڑھا جاتا ہے اور یہ سلسلہ غالباً دارالعلوم ندوۃ العلماء ہی سے شروع ہوا، پھر اور مدارس میں اس کی تقلید کی جائے گی اور یہی صحیح طریقہ ہے کہ ابتداء میں متن کو سامنے رکھ کر پڑھا جائے بغیر کسی تفسیر کی مداخلت کے استاد تیار ہو کر آئے اور وہ اپنا مطالعہ قرآن پیش کرے، تو مجھے کئی سال تک قرآن مجید کی خدمت کا موقع ملا، تفسیر بھی پڑھائی لیکن زیادہ متن قرآن پڑھایا، جو مضامین میرے سپرد ہوئے تھے ان میں سب سے زیادہ اہم تفسیر والا مضمون تھا، میں نے اپنا تعارف اس لئے کرادیا کہ آپ یہ سمجھیں کہ میں قرآن مجید کا ادنیٰ طالب علم ہوں، اس کے بعد جو کچھ بھی اللہ نے توفیق دی اس میں قرآن مجید کا سب سے بڑا حصہ ہے:

”آنچہ کروم ہمہ از دولت قرآن کروم“

جن لوگوں نے میری ناچیز تحریریں اور تصنیفات دیکھی ہیں ان کو اندازہ ہوگا کہ میری تحریروں کا تانا بانا قرآن مجید ہی سے تیار ہوتا ہے۔ میں نے سب سے زیادہ قرآن سے مدد لی ہے اور پھر تاریخ سے اور میں تاریخ کو قرآن مجید کی ہی تفسیر سمجھتا ہوں۔

اجتباء خاص، ہدایت عام:

اس وقت جو آیت پڑھی گئی، اس آیت میں دو چیزیں بیان ہوئی ہیں، ایک مقام اجتباء اور دوسرے ہدایت، اجتباء کے لئے اللہ تعالیٰ نے صاف صاف کہہ دیا ”اللہ یجتبیٰ من رسلہ من یشاء“ سارا معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے، جس کو چاہے وہ اجتباء سے سرفراز کرے اور اس کو قبولیت و اجتباء کا درجہ عطا کرے، لیکن ہدایت کی سب انسانوں کو ضرورت ہے۔ ”یہدی الیہ من ینیب“ وہ ان کو ہدایت دیتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرتے ہیں، ہدایت کے طالب ہوتے ہیں، اور جن میں انابت کی تواضع کی اور بندگی کی اور اپنے کو کچھ نہ کچھ سمجھنے کی کیفیت پیدا ہو جائے تو اللہ تعالیٰ ان کو راستہ پر لگا دیتا ہے اور آخر تک پہنچا دیتا ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ ان میں انابت کی صفت پائی جائے۔ ”یہدی الیہ من ینیب“ میں اسی ٹکڑے پر عرض کرنا چاہتا ہوں۔

قرآن مجید کے دو پہلو ہیں، ایک اس کا تعلیمی اور تبلیغی پہلو ہے، یعنی وہ عقائد جن پر ہر

شخص کو ایمان لانا چاہئے اور سمجھنا چاہئے اور قرآن سے اخذ کرنا چاہئے، اس کے متعلق تو قرآن مجید کا اعلان ہے کہ ”بلسان عربی مبین“ روشن اور واضح عربی میں ہے۔ اس سے زیادہ واضح الفاظ میں بتا دیا ”ولقد یسرنا القرآن للذکر فہل من مدکر“ ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان کر دیا ہے۔ کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے؟

قرآن مجید پڑھ کر انسان مشرک نہیں ہو سکتا:

کوئی شخص یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ خدا اس سے کیا چاہتا ہے اور اس کی ہدایت کے لئے کیا شرائط ہیں اور توحید و رسالت اور معاد کا قرآنی تصور کیا ہے؟ قرآنی عقیدہ کیا ہے؟ اس کی حقیقت کیا ہے کہ دنیا میں ہدایت اور آخرت میں نجات مل سکے؟ اس کے لئے قرآن مجید آسان ہے اور کسی کو یہ کہنے کا یہ عذر نہیں کہ ہم قرآن مجید سے ان باتوں کو سمجھ نہیں سکے، اور قرآن ہمارے لئے حجت نہیں، توحید کے بارے میں واضح سے واضح، صریح سے صریح، طاقتور سے طاقتور، دونوں بات جو کہی جاسکتی ہے قرآن مجید میں موجود ہے، قرآن مجید پڑھ کر آدمی سب کچھ ہو سکتا ہے لیکن مشرک نہیں ہو سکتا۔ میں یہ علی الاعلان کہتا ہوں کہ وہ ٹھوکریں کھا سکتا ہے، بے عمل ہو سکتا ہے، وہ فسق کی راہ اختیار کر سکتا ہے، لیکن جہاں تک توحید و شرک کا تعلق ہے تو قرآن مجید بالکل سورج کی طرح روشن اور سورج کیا ہے اس میں کسی قسم کے اشتباہ کی گنجائش نہیں، اور جہاں تک رسالت کے عقیدہ کا تعلق ہے کہ نبوت کیا چیز ہے؟ انبیاء کیا ہیں؟ ان کے ذمہ کوئی چیز سپرد کی گئی ہے؟ ان کو کیا حکم ہوتا ہے؟ وہ کیا تعلیم دیتے ہیں؟ ان کی سیرت کیسی ہوتی ہے؟ ان کی زندگی کیسی پاکبازانہ اور بلند ہوتی ہے؟ یہ قرآن مجید میں صاف طور سے بیان کر دیا گیا ہے، وہ اپنا تعارف بھی کراتے ہیں، وہ شہوں کو بھی دور کرتے ہیں۔ آپ سورہ اعراف پڑھئے، سورہ ہود پڑھئے، سورہ شعراء پڑھئے، اس میں ایک ایک نبی کا نام لے کر تعارف کرایا گیا اور ثبوت دیا گیا ہے۔

عقل حج نہیں بلکہ وکیل ہے:

جہاں تک رسالت و انبیاء کا تعلق ہے، اس کے بارے میں بھی قرآن مجید میں کسی غلط فہمی کی گنجائش نہیں، لیکن اگر کوئی آدمی گمراہی کا ارادہ ہی کر لے تو گنجائش تو ہر چیز کی ہے، آپ

ہی میں سے کوئی صاحب جن کو اللہ تعالیٰ نے ذہانت و طاقت کی ہوکھڑے ہو جائیں اور ہمیں کہ میں ثابت کر سکتا ہوں کہ اس وقت دن ہے، سورن روشن ہے اور ہمیں دھوپ کی تمازت محسوس ہو رہی ہے تو یہ ہو سکتا ہے کہ وہ ہم سب کو لا جواب کر دیں۔ اس کا تو زبان اور ذہانت سے تعلق ہے، مقدموں میں عدالتوں میں کیا ہوتا ہے؟ دن کو رات اور رات کو دن ثابت کر دیا جاتا ہے۔ ہمارے استاد مولانا عبدالباری صاحب ندوی فرمایا کرتے تھے کہ عقل جج نہیں بلکہ وکیل ہے۔ اس کو قیس ملنی چاہئے تو پھر یہ ہر مقدمہ کو ثابت کر سکتی ہے۔ جب کوئی فلسفہ آیا، عقل نے اس کی صداقت کو اس طرح ثابت کیا کہ وہ بالکل بدیہی حقیقت معلوم ہونے لگی۔ یہ الگ بات ہے کہ کوئی آدمی طے کر لے کہ قرآن مجید سے کوئی بات نکالنا ہے اور اس کی مثال میں آپ کے سامنے دیتا ہے، میں اسلامک اسٹڈیز کانفرنس کے ایک جلسہ میں شریک تھا، وہاں ایک صاحب نے مقالہ پڑھا، میں ان کا نام اور جگہ کا نام نہیں لوں گا۔ انہوں نے اپنے مقالہ میں یہ ثابت کیا کہ قرآن مجید میں جہاں صلوٰۃ کا لفظ آیا ہے اس سے مراد علاقائی حکومت ہے اور جہاں الصلوٰۃ الوسطیٰ آیا ہے اس سے مراد مرکزی حکومت ہے اور ثابت کیا کہ سارے قرآن میں یہ لفظ اس معنی میں استعمال ہوا ہے۔ مجھے اس وقت بڑی سختی سے اس کی تردید کرنی پڑی۔

ہدایت کے لئے قرآن آسان ہے:

ہدایت کے لئے قرآن مجید آسان ہے، اس میں کہیں کوئی شبہ نہیں، لیکن جہاں تک اس کے علوم کا تعلق ہے، اس کے رفیع و دقیق مضامین کا تعلق ہے، اس میں کسی چیز کے متعلق دعوے کے ساتھ یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ ہم جو کچھ سمجھتے ہیں، اس کے علاوہ سب غلط ہے، قرآن کے بارے میں سب سے الگ، منفرد و شاذ رائے قائم کرنا بڑی خطرہ کی بات ہے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا قول ہے ”ای سماء تظلنی وای ارض تعلنی اذا قلت فی کتاب اللہ مالا اعلم“ اے اللہ! کس آسمان کے نیچے پناہ لوں گا اور کس زمین پر چلوں گا اگر میں کتاب اللہ کی آیت کے متعلق کوئی ایسی بات کہہ دوں جس کی کوئی بنیاد، کوئی تحقیق نہیں۔ اور قرآن کے بارے میں صحابہ کرام کا یہ عام رویہ تھا۔ حضرت عمرؓ خود کسی کے لفظ کے بارے میں فرماتے کہ اس کے کیا معنی؟ اور پھر خود ہی کہہ دیتے کہ شکلتک امک یا عمر عمر تیری ماں تجھ پر روئے، اگر تجھے اس ایک لفظ کے معنی نہیں معلوم تو کیا غضب ہوا۔ صحابہ کرام کا انداز فکر بتاتا ہے کہ

ہے کہ اگر قرآن مجید اپنے کو تیرہ سو برس میں نہیں سمجھا۔ کا تو یہ قرآن مجید پر بہت بڑا الزام ہے۔ وہ تو کہتا ہے ”لسان عربی مبین ان انزلناہ قرانا عربیا لعلکم تعقلون“ اور آپ کہتے ہیں کہ ایک ہزار برس تک، بارہ سو برس تک قرآن مجید کے فلاں لفظ کی حقیقت آج تک کسی نے سمجھی نہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کا افادہ اتنے دنوں تک بند رہا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایک سیمینار میں اس کی اختتامی تقریر میں، میں نے کہا تھا کہ اہل علم اپنی کسی تحقیق کو یہ کہہ کر پیش کرتے ہیں کہ ہمیں مطالعہ کا جتنا موقع ملا، اس کے نتیجہ میں ہمارا خیال یہ ہے۔ میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں۔ لیکن یہ طریقہ کہ کوئی شخص اپنے نتائج فکر کو سو فیصد صحیح ثابت کرنے پر اصرار کرے اور اس کے علاوہ جو کچھ ہے سب کو غلط قرار دے صحیح نہیں۔ قرآن مجید کے سلسلہ میں آتا ہے کہ اس کا نیا پن، تازگی پرانی نہیں ہوگی اور اس کے عجائب کی کوئی انتہاء نہیں، تو اگر آپ کو عمر نوٹ بھی ملے اور وہ قرآن مجید کے تدبر میں صرف ہو تو ہر روز نئے نئے معانی کھلنے لگیں۔ ہماری عمر کا یہ محدود وقت، محدود قوت اور صلاحیت اور اس کے بعد ہمارا یہ دعویٰ کہ قرآن مجید اب تک سمجھا ہی نہیں گیا، یہ بہت بڑی غلطی ہے۔

میری ذاتی کتاب:

آخری بات یہ ہے کہ قرآن مجید سمجھا جائے، یہ کتاب ابدی ہے، کتاب آسمانی ہے، لیکن میری ذاتی کتاب بھی ہے، میری ذاتی ہدایت نامہ بھی ہے، اس میں میری ذاتی کمزوریاں بیان کی گئی ہیں، میرے ذاتی امراض کی نشاندہی کی گئی ہے۔

قرآن مجید میں ہر آدمی اپنے کو تلاش کر سکتا ہے۔ یہ جب ہوگا جبکہ آپ اس کو زندہ کتاب سمجھیں یا اپنی کتاب سمجھیں، اور آپ میں اپنی اصلاح کا جذبہ ہو، لوگوں کی اصلاح تو بعد میں ہوگی، پہلے اپنی اصلاح ہو جائے۔

انبیاء کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے میری ہدایت ہو جائے پھر میں دوسروں سے کچھ کہوں، ہم میں سے بہت سے لوگ قرآن مجید کو اس لئے پڑھتے ہیں کہ یہ حجت بنے، دوسروں کو شرمندہ کیا جائے، دوسروں پر حجت قائم کی جائے۔ حالانکہ صحابہ کرام قرآن مجید پڑھتے تھے اپنی اصلاح کے لئے، ایک آیت پڑھی اس پر عمل کرنا شروع کیا۔ سورۃ بقرہ بعض اوقات مہینوں میں ختم ہوئی۔

یہ چند باتیں ایک طالب علم کی حیثیت سے میرے ذہن میں تھیں، وہ سب میں نے آپ کے سامنے رکھ دی۔ ”یہدی الیہ من ینیب“ کے میدان میں جہاں تک ہم کوشش کر سکتے ہیں کریں، اللہ جس کو چاہے مقام اجنباء تک پہنچائے۔ ہم اس کے مکلف نہیں ہیں، ہم سیکھنا چاہیں، ہم ہدایت حاصل کرنا چاہیں، ہم بننا چاہیں اور اپنی زندگی میں انقلاب لانا چاہیں تو قرآن مجید موجود ہے جو ہماری رہنمائی بھی کرے گا اور منزل مقصود پر بھی پہنچائے گا۔ ہم میں ہدایت کی طلب، اپنی احتیاج کا احساس اور اپنی بے بضاعتی کا اعتراف ہونا چاہئے۔ اسی کے مجموعہ کا نام انابت ہے۔ میں دعا کرتا ہوں، آپ بھی دعا کریں۔

اهدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیہم غیر المغضوب
علیہم ولا الضالین O

عالم اسلام میں اعلیٰ تعلیم کا مقصد و منہج

یہ تقریر ۱۲ جولائی ۷۸ء کو کراچی یونیورسٹی میں ہوئی، جلسہ میں یونیورسٹی کے اسٹاف اور طلبہ کے علاوہ ممتاز دینی، علمی، ادبی شخصیتیں، سیاسی رہنما، دینی اداروں کے ذمہ دار علماء اور اب و صحافت سے تعلق رکھنے والے معروف اصحاب شریک تھے۔ کراچی یونیورسٹی کے آرٹس آڈیٹوریم کی وسعت کو سامعین کی کثرت نے ناکافی ثابت کر دیا تھا۔ بڑی تعداد کو ٹیلرٹی میں کھڑے ہو کر تقریر سننی پڑی۔ استقبالیہ اور تعارفی کلمات ڈاکٹر احسان رشید صاحب و انس چانسلر اور اختتامی کلمات تشکر اسماعیل سعد صاحب رجسٹرار کراچی یونیورسٹی نے ادا کئے۔

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على رسوله الامين

علم ایک صداقت ہے:

جناب و انس چانسلر، اساتذہ جامعہ، طلبہ و طالبات اور برادران عزیز! اگرچہ میں علم میں تقسیم کا قائل نہیں ہوں..... اور میرا عقیدہ ہے کہ علم ایک اکائی ہے جو بٹ نہیں سکتی، اس کو قدیم و جدید، مشرقی و مغربی، نظری اور عملی میں تقسیم کرنا صحیح نہیں اور جیسا کہ علامہ اقبال نے کہا ہے کہ:

حدیث کم نظراں قصہ قدیم و جدید

میں علم کی دینی و دنیوی تقسیم کا بھی قائل نہیں ہوں۔ میں علم کو ایک صداقت مانتا ہوں یا ایک انسانی تجربہ جو کسی ملک و قوم کی ملک نہیں اور نہ ہونی چاہئے، میں زندگی کے دوسرے سرچشموں کی بھی جغرافیائی، نسلی، تاریخی یا سیاسی حد بندیوں کا قائل نہیں، میں علم کو ایک ”وحدت“ مانتا ہوں اور جس کو کثرت کہا جاتا ہے اس کثرت میں بھی مجھے وحدت نظر آتی ہے، علم کی وہ وحدت سچائی ہے، سچ کی تلاش ہے، علمی ذوق ہے اور اس کو پانے کی خوشی ہے، اس کے باوجود میں جناب و انس چانسلر صاحب کا اور اس جامعہ کے ذمہ داروں کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے آج ان عزیز طالب علموں اور چمن اسلام کے ان شگوفوں کو خطاب کرنے کے لئے ایک

ایسے شخص کا انتخاب کیا ہے جس کا (صحیح یا غلط طریقہ پر حقیقتاً شہرت کی بناء پر) انتساب اور تعلق قدیم طرز تعلیم سے ہے، اس لئے میں وائس چانسلر صاحب کی وسیع النظری اور آپ کی جامعہ کی اس فراخ دامانی کا معترف ہوں کہ اس نے اس میں کوئی تفریق نہیں کی۔ میں علم، ادب، شاعری، فلسفہ، حکومت، کسی بھی اس اصول کا قائل نہیں ہوں کہ جو اس کی ”وردی“ پہن آئے وہی ”عالم“ اور ”دانشور“ ہے، اور یہ مان لیا گیا ہے کہ جس کے جسم پر وردی نہ ہو وہ نہ مستحق خطاب ہے نہ لائق سماعت۔ بد قسمتی سے ادب و شاعری میں بھی یہی حال ہے کہ جو ادب کی دکان نہ لگائے اور اس پر ادب کا سائن بورڈ آویزاں نہ کرے اور ادب کی وردی پہن کر کے مشاعرے میں یا کسی ادبی محفل میں نہ آئے وہ ”بے ادبی“ کا مرتکب ہے۔ لوگوں نے ان پیدائشی ادیبوں اور شاعروں کا قصور بھی معاف نہیں کیا ہے جن کے جسم پر وہ وردی دکھائی نہیں دیتی ہو یا جن کو بد قسمتی سے ان وردیوں کے گودام سے کوئی وردی نہ مل سکی ہو، اگرچہ میں علم کی آفاقیت اور علم کی تازگی کا قائل ہوں، جس میں خدا کی رہنمائی ہر دور میں شامل رہی ہے، اگر خلوص ہے اور سچی طلب ہے تو خدا کی طرف سے فیضان میں کمی نہیں، بہر حال یہ ایک جرأت مندانہ قدم ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اس کی تقلید کی جائے۔ ہماری قدیم درس گاہوں میں جدید ماہرین کو دعوت دی جائے اور ہماری ان جامعات اور دانش گاہوں میں ان لوگوں کو یاد کیا جائے جنہوں نے خلوص کے ساتھ پڑھا ہے اور انسانوں کے پیدا کئے ہوئے علمی اور ادبی ذخیرے سے فائدہ اٹھایا ہے۔

تعلیم کا اصل مقصد:

حضرات میں شکر گزار ہوں کہ مجھے اس باوقار دانش گاہ میں ایک ایسے مجمعے کے سامنے اپنے خیالات کے اظہار کا موقع دیا جا رہا ہے جو کل اسی ملک کی نہیں بلکہ شاید دوسرے اسلامی ملکوں میں بھی کوئی اہم کردار ادا کر سکیں یا جن کے ہاتھ میں زمام کار آئے، کم از کم تعلیم و تربیت کی رہنمائی اور سربراہی کا ان کو موقع ملے۔

میں نے تعلیم کی غرض و غایت اور اس کی فائدے و نتیجہ کے بارے میں بہت کچھ پڑھا ہے، لیکن میں یہاں صرف ایک حوالہ دوں گا۔

مشہور برطانوی ماہر تعلیم Sir Percy Neinn نے تعلیم کی بڑی جامع و بلیغ تعریف کی

ہے وہ کہتے ہیں کہ:

”تعلیم کا بنیادی خیال جو پورے نظام تعلیم پر حاوی ہونا چاہئے یہ ہے کہ تعلیم اس کوشش کا نام ہے جو بچوں کے والدین اور سرپرست اور نظر یہ حیات پر (جس پر وہ عقیدہ رکھتے ہیں) اپنی نئی نسل کو تیار کرنے کے لئے کرتے ہیں۔ ”مدرسہ“ کا فریضہ یہ ہے کہ وہ ان روحانی طاقتوں کو جو اس نظر یہ حیات سے وابستہ ہیں طالب علم پر اثر ڈالنے کا موقع دے اور وہ طالب علم کو ایسی تربیت دے جو اس قوم کی زندگی کی تسلسل و ترقی میں طالب علم کی دستگیری کرے اور اس کے ذریعہ وہ مستقبل کی طرف اپنا سفر جاری رکھ سکے۔

میں نے تعلیم کی تعریف کے سلسلہ میں جو کوششیں دیکھی ہیں اور جو عبادتیں میری نظر سے گزری ہیں ان میں میرے نزدیک یہ سب سے زیادہ جامع اور عملی تعریف ہے۔ تعلیم کیوں دی جاتی ہے؟ اور تعلیم پر اعلیٰ صلاحیتیں اور قوم کی توانائیاں فیاضی کے ساتھ اور ایسے منظم طریقے پر کیوں صرف کی جاتی ہیں؟ کیا اس لئے کہ وہ تعلیم ایک خلیج پیدا کر دے اس قوم کے معتقدات، مقاصد اور علمی و تہذیبی سرمایہ اور ان چیزوں کے درمیان جو اس کو عزیز ہیں، جو خیالات اس کو عزیز ہیں، اور عزیز ہونے کے لئے شرط نہیں ہے، جو چیز جس کو عزیز ہو، یہاں یہ بحث نہیں اٹھائی جاسکتی کہ وہ چیزیں عزیز بنانے کے قابل ہیں یا نہیں، لیکن جو چیزیں اس کو عزیز ہیں، جو عقائد ان کو عزیز ہیں، جو خیالات اس کو عزیز ہیں، جو اقدار جو ویلیوز اور جو تصورات و معتقدات اور جو افکار اس کو عزیز ہیں، جو ذخیرہ اس کو اپنے اسلاف سے ملا ہے، تعلیم کا اصل فرض یہ ہے کہ وہ ان دونوں کے درمیان کوئی رشتہ پیدا کرے اور قوم کی نئی نسل کی طرف اس ذخیرہ کو منتقل کرے جو اس قوم کو عزیز ہے اور جس پر اس کے اسلاف کی بہترین طاقتیں اور طویل ترین مدت صرف ہوئی ہے اور جن کے لئے بعض اوقات وہ قوم نبرد آزما ہوئی اور اس نے اپنی جان کی، اپنی عزت کی، آبرو کی بازی لگا دی ہے، یہاں یہ بحث بڑی بے موقع اور بڑی غیر ہمدردانہ بحث ہے کہ ان قوموں نے ان اقدار کے لئے کیوں جنگ کی، تعلیم یہ سرمایہ نہ صرف منتقل کرے اور طوطے کی طرح اس کو رٹا دے بلکہ اس کو اس کے قلب و دماغ میں جاگزیں کر دے، اس کا ذہن، اس کا ذوق اس کو قبول کر لے اور جذب کر لے، وہ اس کے لئے خارجی اور اجنبی چیز نہ ہو بلکہ وہ اس کے لئے ایک داخلی چیز بن جائے اور یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس کا مزاج بن جائے۔

خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی:

میں سمجھتا ہوں کہ یہ تعریف بہت جامع ہے۔ لیکن جب ایسی ملت کا معاملہ ہو کہ وہ عقائد اور وہ اقدار اس کے اپنے بنائے ہوئے اور پیدا کئے ہوئے نہ ہوں، بلکہ ان کا سرچشمہ وحی الہی ہو، ان کا سرچشمہ کلام الہی ہو، ان کا سرچشمہ نبوت ہو، ان کا سرچشمہ وہ علم غیب ہو اور وہ علم اذنی ہو جس میں کوئی تغیر نہیں ہوتا، تب ذمہ داری بڑھ جاتی ہے۔ اب اگر کوئی نظام تعلیم یہ خدمت انجام دیتا ہے، شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر، ارادی طریقے پر یا غیر ارادی طریقے پر، غفلت کی بناء پر یا کسی بڑی سازش کے ماتحت، وہ سازش اس ملک کے اندر ہوئی ہو یا اس ملک کے باہر ہوئی ہو کہ اس نظام تعلیم کے ساختہ پرداختہ حضرات کا عقیدہ ان تمام عقائد اور اقدار سے اٹھ جائے یا متزلزل ہو جائے، اس کی چولیس بل جائیں اور وہ دائمی شک میں، تردد میں مبتلا ہو جائیں، وہ ایک ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو جائیں اور انفرادی زندگی کی حد تک نہیں بلکہ یہ کشمکش افراد کی حدود سے تجاوز کر کے اسی ملت کے میدان زندگی میں کارفرما ہو، وہ اس کو متاثر کر رہی ہو اور ایک بڑی خونریز کشمکش، ایک بڑی خونریز جنگ برپا ہو جائے۔ اس تعلیم یافتہ نسل کے درمیان اور ان اقدار کے درمیان، ان مفاہیم کے درمیان اور ان عقائد کے اور خیالات کے درمیان، میں اسلام کو ایک تر کے (LEGACY) حیثیت سے نہیں مانتا اور اس کو اسلام کی بڑی تعریف نہیں سمجھتا۔ اس لئے Hertiage of Isam اور Legacy of Islam پر جو کتابیں پڑھی گئی ہیں ان کا زیادہ قائل نہیں ہوں، میں اسلام کو ایک پیغام حیات سمجھتا ہوں، میں اسلام کو زمانہ کے ساتھ چلنے والا نہیں بلکہ زمانہ سے آگے چلنے والا، زمانہ کا رہبر، زمانہ کا رفیق اور شریک کارواں ہی نہیں بلکہ اس کا محتسب اور اتالیق (GAURDIAN) سمجھتا ہوں، اس لئے جب غیر ارادی طریقے پر یا اتفاقاً کسی سازش کے ماتحت کوئی اعلیٰ تعلیم یافتہ یہ نتیجہ پیدا کرے کہ اس کی نسل ان تمام اقدار کے بارے میں، ان تمام عقائد و خیالات کے بارے میں شک میں مبتلا ہو جائے، اس کا یقین اس سے اٹھ جائے اور وہ اس کو ایک طفل تسلی یا ڈھکوسلا سمجھنے لگے یا کم سے کم اس کو ان اقدار پر اس طرح یقین نہ ہو کہ وہ ان کی حمایت کرے، سینہ سپر ہو، ان کے لئے کبھی نبرد آزما ہو جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ تعلیم صرف انتشار کا باعث ہے۔

اسلامی ملک کا معاملہ زیادہ اہم ہے:

جب میں یہاں آپ کے سامنے خطاب کر رہا ہوں تو میرے سامنے تمام اسلامی ممالک ہیں، میرے سامنے ترکی ہے، میرے سامنے مصر و شام و عراق ہیں اور میرے سامنے مملکت سعودیہ عربیہ بھی ہے جہاں ابھی چند ماہ پہلے ایک آل ورلڈ اسلامک ایجوکیشن کانفرنس (ALLWORLD ISLAMIC EDUCATION CONFERENCE) ہوئی تھی۔

جس میں یہاں سے احسان رشید صاحب اور اے کے بروہی صاحب بھی گئے تھے۔ میں ہندوستان کی طرف سے آیا تھا۔ وہاں میں نے جو پیپر (PAPER) پڑھا تھا، اس میں، میں نے اس چیز کا اظہار کیا تھا کہ معاملہ کہیں زیادہ سنگین اور نازک ہو جاتا ہے جب کسی اسلامی ملک کا معاملہ ہو۔ اسلامی ملک میں وہ مسلمان آبادی ہے جو اپنی ایک شخصیت رکھتی ہے، ایک (Personality) رکھتی ہے، اس کی ایک ملی شخصیت ہوتی ہے، اس کے پاس ایک پیغام ہے، اس کو دنیا میں ایک فرض انجام دینا ہے، اگر تعلیم وہاں اس نسل میں انتشار پیدا کر دیتی ہے اور صرف یہ خدمت انجام دیتی ہے کہ وہ نسل جب کسی جدید دانشگاہ سے پڑھ کر نکلتی ہے تو وہ اپنے معتقدات سے بیگانہ بن جاتی ہے، وہ ایک نئی قوم بن جاتی ہے جو کسی طریقے سے اس ملک میں فٹ نہیں ہو سکتی اور وہاں کے لئے وہ ایک اجنبی عنصر بن جاتی ہے۔ اس سے ایک نئی پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے، وہاں کی زندگی میں ایک نیا مسئلہ وجود میں آ جاتا ہے، ایک نئی گرہ وہاں کے رشتہ حیات میں پڑ جاتی ہے، وہ ملک یا وہ ملت جس کے معتقدات اور جس کے اقدار حیات اور نقطہ فکر کی بنیاد وحی الہی پر ہے، اگر وہاں کی تعلیم کا ثمرہ اور نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ ایک ذہنی انتشار، ایک خونریز جنگ اور ایک زبردست کشمکش اس نئی نسل کے درمیان اور اس کے خاندانوں کے درمیان، اس معاشرہ کے درمیان جس کا اس سے تعلق ہے، ان نونہالوں اور نوجوانوں کے درمیان، اس کی پوری تاریخ اور پورے کارنامہ، اس کے منصب و مقام کے درمیان جو خدا نے اس کو عطا کیا ہے اور مسلمان کا پیغام اور اس کے انجام دینے کا جو کام ہے، اس کے درمیان ایک کشمکش پیدا ہو جاتی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ کوئی خدمت نہیں ہے، Service نہیں ہے بلکہ بد خدمتی (Disservice) ہے۔

کسی اسلامی ملک کی جامعہ کا اولین فریضہ:

آپ مجھے معاف کریں۔ میرا اشارہ کسی خاص جامعہ کی طرف اور کسی خاص جامعہ کے ذمہ داروں کی طرف نہیں ہے۔ میں بالکل اصولی حیثیت سے گفتگو کر رہا ہوں کہ ایک جامعہ جو کسی اسلامی ملک میں قائم ہو، اس کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ ان اقدار اور عقائد و خیالات پر، اس تہذیب پر، اس پیغام پر، ان امتیازات و شخصیات پر یقین پیدا کرے جس کی وہ قوم حامل ہے اور وہ یقین محض عامیانہ یقین نہ ہو، ایک ایسے لے مین (LAYMAN) یقین نہ ہو، ایک راستہ چلنے والے آدمی کا یقین نہ ہو، بلکہ ایک پڑھے لکھے انسان کا، ایک اسکالر کا یقین ہو، جس کا دل جتنا مطمئن ہو، اسی درجہ اس کا دماغ بھی مطمئن ہو، یہ نہیں کہ: ”ع قلب او مومن دماغش کافر است“

جیسا کہ اقبال نے ایک مغربی فلسفی کے متعلق کہا، جس طرح فرد اور جماعت کے درمیان کشمکش جائز نہیں، اسی طرح فرد کی زندگی میں فرد کے قلب و دماغ کے درمیان بھی کشمکش درست نہیں، اور نہ اس کی اجازت دی جاسکتی ہے۔ یہ کشمکش اگر کوئی جامعہ یا جامعہ کا نصاب یا جامعہ کا کوئی طریقہ کار اور نظام پیدا کرتا ہے تو یہ کشمکش اس ملک کے لئے خوش قسمتی نہیں بلکہ بد قسمتی ہے۔

قلب اور دماغ دونوں کا اطمینان ضروری ہے:

آپ نے مجھے موضوع دیا ہے کہ اسلامی جامعات کا مقصد و منہاج کیا ہونا چاہئے؟ میں سمجھتا ہوں کہ ان کا سب سے بڑا مقصد و منہاج یہ ہے کہ وہ ان چیزوں پر یقین پیدا کرے، وہ یقین جو علم اور مطالعہ کے راستہ سے ہوتا ہے، وجدان کے راستہ سے ہوتا ہے، دماغ کے سکون کے راستہ سے ہوتا ہے، تقابلی مطالعہ کے راستہ سے ہوتا ہے۔ اگر یہ یقین کسی شخص کو قلبی طور پر حاصل ہو جاتا ہے، لیکن اس کا دماغ اس سے مطمئن نہیں ہوتا، وہ اپنے دماغ کو بہلاتا رہتا ہے، پھسلاتا رہتا ہے، وہ اپنے دماغ کو بیدار نہیں ہونے دیتا، جس طرح بعض غیر مسلم ملتوں کا حال ہے کہ وہ اپنے مذہب کی بقاء اور اپنے مذہب کی ترقی اس میں سمجھتی ہیں کہ علم کا شعور جاگنے نہ پائے، اس مذہب کے حاملین یا اس مذہب کے حلقہ بگوشوں کا شعور جاگنے نہ پائے، وہ اپنے

شعور کی زندگی و بیداری میں اپنے مذہب کی موت سمجھتے ہیں، اس لئے کلیسا اور علم میں وہ کشمکش پیش آئی جس کی خونریز کہانی اور دلدوز کہانی ڈریپر کی مشہور کتاب میں آپ پڑھتے ہیں۔ یہ کشمکش اس لئے پیدا ہوئی کہ کلیسا کی بنیاد اس پر تھی کہ انسانی شعور جتنا سوتا رہے اچھا ہے۔ اسے لوریاں دے کر اور سلانا چاہئے، اور انسان کا علم جتنا محدود ہے اچھا ہے بلکہ بہتر یہ ہے کہ وہ علم سے بالکل عاری اور محروم ہو۔ اس وقت تک مسیحیت کی زندگی ہے، اسی وقت تک بائبل پر ایمان راسخ ہوگا۔ عہد عتیق کی کتابیں بعض ایسی باتیں پیش کرتی ہیں کہ جن کی علم جدید تصدیق نہیں کرتا بلکہ اس کی نفی کرتا ہے، اس لئے کلیسا اپنی خیریت اسی میں سمجھتا تھا کہ مسیحی کا شعور بیدار نہ ہونے پائے اور علوم ترقی نہ کریں، اس لئے وہ علم کی راہ روک کر کھڑا ہو گیا، علم کے لئے وہ سنگ راہ ثابت ہوا بلکہ اہل کلیسا نے علم کو اپنے مد مقابل اور حریف سمجھ لیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ علم تو انسان کی فطرت کا ایک تقاضا تھا، علم تو انسان کے اندر ایک جذبہ تھا، علم تو خدا کی ایک نعمت تھی، علم تو دنیا کی ایک ضرورت تھی، علم تو خدا نے پھلنے پھولنے اور بڑھنے کے لئے پیدا کیا تھا۔ مٹنے اور مرجھانے کے لئے نہیں پیدا کیا تھا۔ صد اقسمتیں مٹ نہیں سکتیں، نتیجہ یہ ہوا کہ کلیسا کو علوم کے مقابلہ میں اور لوگوں کے طلب علم اور شوق جستجو کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ یہ وہ منحوس واقعہ تھا جو اگرچہ مسیحی یورپ میں پیش آیا لیکن اس کا اثر تقریباً تمام دنیا اور تمام مذاہب پر پڑا اور بہت سے لوگوں نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ علم و عقل اور علم و مذہب کی ترقی ساتھ نہیں چل سکتی، تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے مجھے افسوس کے ساتھ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ تھوڑے وقفے کے لئے بعض اسلامی ملکوں میں بھی یہ غلط خیال پیدا ہوا، لیکن اسلام چونکہ اس سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا، اسلام کی روح اس سی منکر اور اس سے باغی ہے، اس لئے یہ چیز زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہ سکی۔ اور یہ مصنوعی کشمکش عالم اسلام میں قائم نہ رہ سکی۔ مسیحی یورپ کے اثر سے پیدا تو ہوئی لیکن بہت جلد مغربی ممالک کا یہ سایہ دور ہو گیا۔

علم کی قسمت قلم سے وابستہ :

میں یہ سمجھتا ہوں کہ اسلامی یونیورسٹیوں اور ان اسلامی جامعات کا ایک فرض تو یہ ہے کہ علم و دین میں یہ خلیج پیدا نہ ہونے پائے جو مسیحی یورپ میں یا ان مذاہب میں جن کا علم و عقل کے

ساتھ کوئی رشتہ نہیں تھا بلکہ وہ علم و عقل سے بچ کر اور کترا کر اور بلکہ اس کی آنکھوں میں دھول ڈال کر پیدا ہوئے اور اسی حالت میں وہ پھلے پھولے، وہاں تو اس بات کی گنجائش ہو سکتی ہے، لیکن جس نے سب سے پہلے اپنے دین کا اور اپنی دعوت کا اور اپنے علم کا اعلان اس طرح کیا:

اقرا باسم ربك الذی خلق خلق الانسان من علق اقرا وربك

الاكرم الذی علم بالقلم علم الانسان ما لم يعلم

(اے محمد) اپنے پروردگار کا نام لے کر پڑھو جس نے پیدا کیا جس نے انسان کو خون کی پھٹکی سے بنایا، پڑھو اور تمہارا پروردگار بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا اور انسان کو وہ باتیں سکھائیں جن کا اس کو علم نہ تھا۔

جس نے اپنی وحی کی پہلی قسط میں اور اس بارانِ رحمت کے پہلے چھینٹے میں بھی اس قلم کو، اس حقیر قلم کو فراموش نہیں کیا جس نے اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا کہ علم کی قسمت قلم سے وابستہ ہے۔ غارِ حرا کی اس تنہائی میں جہاں ایک نبی امی اللہ کی طرف سے دنیا کی ہدایت کے لئے پیغام لینے گیا تھا اور جس کا یہ حال تھا کہ اس نے قلم کو حرکت دینا خود نہیں سیکھا، جو قلم کے فن سے واقف نہیں تھا، آپ خیال کیجئے کہ دنیا میں، دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر کہیں مل سکتی ہے اور اس بلندی کا تصور ہو سکتا ہے کہ نبی امی پر، ایک امت امی کے درمیان ایک ایسے ملک کے درمیان کہ جہاں علم کا ہر عام نہیں تھا، جامعات اور دانش گاہیں در سگاہیں تو بڑی چیز ہیں، جہاں حرف شناسی بھی نہیں تھی، وہاں اس نبی پر وحی نازل ہوتی ہے اور پہلی بار وحی نازل ہوتی ہے اور آسمان و زمین کا رابطہ صدیوں کے بعد قائم ہوتا ہے، اس کی ابتدا ”اعید“ سے نہیں، اس کی ابتدا ”صل“ سے نہیں بلکہ اس کی ابتدا ہوتی ہے ”اقرا“ سے جو خود پڑھا ہوا نہ تھا اس پر جو وحی نازل ہوتی ہے اس میں اس کو خطاب کیا جاتا ہے کہ ”اقراء“ اس لئے کہ تمہیں جو امت دی جانے والی ہے وہ امت صرف علم کی سچی طالب نہ ہوگی بلکہ وہ علم آموز ہوگی، وہ علم کی اس دنیا میں اشاعت کرنے والی ہوگی، جو دور تمہیں دیا جاتا ہے اصلاح اور ہدایت کا، جو دور تمہارے حصے میں آیا ہے وہ دور امت کا دور نہیں ہوگا، وہ دور وحشت کا دور نہیں ہوگا، وہ دور جہالت کا دور نہیں ہوگا، وہ دور علم دشمنی کا دور نہیں ہوگا، وہ دور تخریب کا دور نہیں ہوگا، وہ دور علم کا دور ہوگا، عقل کا دور ہوگا، حکمت کا دور ہوگا، تعمیر کا دور ہوگا، انسان دوستی کا دور ہوگا، وہ دور ترقی کا دور ہوگا، اس لئے پہلی بار

دنیا میں، مذاہب کی تاریخ میں پہلا تجربہ تھا (اگر اس کو تجربہ کہنا صحیح ہو) کہ اس نبی امی پر ایک امی قوم کے درمیان جو وحی نازل ہو رہی ہے اس کی ابتداء ہوتی ہے ”اقراء“ (پڑھو) سے بسم ربک الذی خلق۔ بڑی غلطی یہ تھی کہ علم کا رشتہ رب سے ٹوٹ گیا تھا، اس لئے علم سیدھے راستے سے ہٹ گیا تھا، اس لئے اس ٹوٹے ہوئے رشتہ کو جہاں جوڑا گیا، جب علم کو یاد کیا گیا، علم کو یہ عزت بخشی گئی تو اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی متنبہ کیا گیا کہ اس علم کی ابتداء اسم رب سے ہونی چاہئے، اس لئے کہ یہ علم اس کا دیا ہوا ہے، اس کا پیدا کیا ہوا ہے اور اس کی رہنمائی میں یہ متوازن ترقی کر سکتا ہے۔ یہ جو جملے میں سنار باہوں یہ دنیا کی سب سے بڑی انقلاب آفریں، انقلاب انلیئر اور صاعقہ آسا آواز ہے، جو ہماری دنیا کے کانوں نے سنی تھی جس کا کوئی تصور نہیں کر سکتا تھا۔ اگر دنیا کے ادیبوں اور دانشوروں کو یہ دعوت دی جاتی کہ آپ لوگ قیاس کیجئے اور یہ بتائیے کہ جو وحی نازل ہونے والی ہے، اس کی ابتدا کس چیز سے ہوگی؟ اس میں کس چیز کو اولیت دی جائے گی؟ تو میں سمجھتا ہوں کہ اس میں ایک، آدمی بھی جو اس امی قوم اور اس کے مزاج اور دماغ سے واقف تھا وہ سب کچھ کر سکتا تھا، لیکن یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ جو پہلی وحی نازل ہوگی وہ ”اقراء“ کے لفظ سے شروع ہوگی۔ پڑھو ”اقراء“ قرأت کا لفظ ہے، یہاں خالص علم کا بھی لفظ نہیں ہے، یعنی اس کا تعلق کاغذ سے بھی ہے، اس کا تعلق نقوش سے بھی ہے اور اس کا تعلق قلم سے بھی ہے، وہ علم نہیں جو لدنی طریقہ پر آتا ہے بلکہ وہ علم جو قلم کے ساتھ ہے، کاغذ کے ساتھ ہے، صحیفوں کے ساتھ ہے، کتب خانوں کے ساتھ ہے، تجربوں کے ساتھ ہے، ذہانتوں کے ساتھ ہے۔ ”اقراء بسم ربک الذی خلق“

یہ دین علم سے الگ نہیں ہو سکتا:

پہلی بات تو یہ ہے کہ اس دین کا مزاج بتا دیا گیا کہ یہ دین بھی علم سے الگ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ سب سے پہلے جو پیغام دیا گیا اس میں ”اقراء“ تھا کہ ”عزیز مسلمان! پڑھو“ کیسے رہ سکتا ہے۔ مسلمان حقیقی مسلمان نہیں جو اس سے بے نیاز ہو جائے۔ ”اقراء“ کا یہ فرمان دے گا کہ ”پڑھو“ پہلی بات تو یہ ہے کہ ”اقراء“ کا یہ فرمان دے گا کہ ”پڑھو“ پہلی بات تو یہ ہے کہ ”اقراء“ کا یہ فرمان دے گا کہ ”پڑھو“ پہلی بات تو یہ ہے کہ ”اقراء“ کا یہ فرمان دے گا کہ ”پڑھو“

بہت طویل ہے، بہت پر پیچ ہے، پر خطر ہے، قدم قدم پر قافلے لوٹنے والے ہیں، قدم قدم پر بڑی بڑی کھائیاں ہیں۔ قدم قدم پر گہرے دریا ہیں، قدم قدم پر سمندر ہیں، قدم قدم پر سانپ اور بچھو ہیں، اس لئے اس میں ایک رہبر کامل کی رفاقت ہونی چاہئے اور وہ رہبر کامل حقیقتاً خدا کی ذات ہے، اس لئے اقراء بسم ربک الذی خلق پڑھو، لیکن وہ مجرد علم نہیں، وہ علم نہیں جو نیل بوتے بنانے کا نام ہے، وہ علم نہیں جو محض کھلونوں کا نام ہے، وہ علم نہیں جو محض دل بہلانے کا نام ہے، وہ علم نہیں جو ایک کو دوسرے سے لڑانے کا نام ہے، وہ علم نہیں جو قوموں کو قوموں سے ٹکرانے کا نام ہے، وہ علم نہیں جو اپنے معدہ کے رقبہ کو بھرنے کا ذریعہ سکھانے کا نام ہے، وہ علم نہیں جو زبان کو صرف استعمال کرنا سکھاتا ہے بلکہ اقراء بسم ربک الذی خلق، خلق الانسان من علق، اقراء وربک الاکرم الذی علم بالقلم علم الانسان ما لم يعلم پڑھو، تمہارا رب بڑا کریم ہے، وہ تمہاری ضرورتوں سے، تمہاری کمزوریوں سے کیسے نا آشنا ہو سکتا ہے؟ اقراء وربک الاکرم الذی علم بالقلم، آپ خیال کیجئے کہ قلم کا رتبہ اس سے زیادہ کس نے بڑھایا ہوگا کہ اس غار حرا کی پہلی وحی نے بھی وہ قلم جو شاید ڈھونڈنے سے بھی مکہ میں کسی گھر میں نہ ملتا، مجھے اس میں شک ہے کہ وہ قلم اگر آپ اسے تلاش کرنے کے لئے نکلتے تو معلوم نہیں کسی ورقہ بن نوفل کے گھر میں ملتا یا فلاں کاتب کے یہاں جو عجم سے کوئی چیز سیکھ کر آیا ہو، اس کے گھر میں ملتا اور وہ قلم جس کا استعمال عربی شاعری میں بھی بہت کم ہے، آپ اگر عرب شعراء کے دیوان پڑھیں، پڑھتے ہی چلے جائیں تو اس میں قلم کا نام آپ بہت کم پائیں گے۔

سب کا خلاصہ، علم الانسان ما لم يعلم:

اور پھر ایک بہت بڑی انقلاب انگیز اور لافانی حقیقت بیان کی کہ علم کی کوئی انتہاء نہیں۔ ”علم الانسان ما لم يعلم“ سائنس کیا ہے؟ ”علم الانسان ما لم يعلم“ ٹیکنالوجی کیا ہے؟ ”علم الانسان ما لم يعلم“ انسان چاند پر جا رہا ہے یہ کیوں ہے؟ ”علم الانسان ما لم يعلم“ یہ خلا کو ہم نے طے کر لیا ہے اور ہم نے دنیا کی وسعتیں سمیٹ لی ہیں اور دنیا کی طنائیں کھینچ لی ہیں اور سورج کی شعاعوں کو بقول اقبال گرفتار کر لیا ہے اور ستاروں کے درمیان

اپنی رہگذر پیدا کی ہے، یہ کیا ہے؟ ”علم الانسان مالہ يعلم“ علم اشیاء کی جہانگیری۔ تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ جس امت کی اور جس پیغام کی بنیاد قرأت سے پڑی، فن قرأت سے پڑی اور قلم کے ذکر سے پڑی، اس ملت کا، اس قوم کا، اس امت کا ساتھ کبھی قلم سے نہیں چھوٹ سکتا، اس کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اب اس امت کے لئے جو دانش گاہ تعمیر کی جائے، جو نظام تعلیم مرتب کیا جائے اس میں جو بنیادی چیز ہو، جو اصل کار فرما اور رہنما اصول ہے، وہ یہ ہے کہ یہ علم، یہ نظام تعلیم ان اقدار پر، ان حقائق پر اور ان عقائد پر ایمان کو راسخ کرے اور یہ پختگی صرف دل کی راہ سے نہیں بلکہ دماغ کی راہ سے بھی ہو، یعنی دل و دماغ دونوں مطمئن ہونے چاہئیں، اگر دل و دماغ دونوں مطمئن نہیں ہیں تو فرد کی زندگی میں کشمکش پیدا ہوگی اور یہ کشمکش پھر وسیع ہوتی جائے گی۔ پہلے وہ اپنے اندر ایک دوسرے سے دست بگریباں پھر جماعت سے دست بگریباں ہوگا، نئی نسل اپنے معاشرہ سے دست بگریباں ہوگی، اپنے دین سے دست بگریباں ہوگی اور بہترین توانائیاں اس نسل کو اس ملے کو مٹانے میں، اس کھنڈر کو دور کرنے میں صرف ہوں گی، پہلے اس ملے کو ہٹاؤ پھر اس کے بعد تعمیر کرو اور تمام توانائیاں اس پر صرف ہو جائیں گی۔ ہماری بعض مسلم قوموں کے رہنماؤں نے اس طریقہ پر کام کرنا شروع کیا کہ پہلے ماضی کا ملبہ ہٹائیں، پہلے حقائق و عقائد کا ملبہ ہٹائیں پھر اپنی دعوت پیش کریں، اس میں ان کی عمر بیت گئی اور ان کو جو وقت دیا گیا تھا کام کرنے کا وہ ختم ہو گیا اور وہ اس میں کامیاب نہیں ہوئے، تو جامعات کا اصل مقصد یہ ہے کہ ان عقائد اور حقائق پر یقین کو استوار کریں اور صرف قلب کی راہ سے نہیں بلکہ دماغ کی راہ سے بھی کہ ایک طرف دل ان کا حلقہ بگوش ہو اور ان کو اپنی تہہ میں، اپنی گہرائی میں جگہ دے تو دوسری طرف دماغ کا کام یہ ہو کہ وہ ان کے لئے دلائل فراہم کرے اور وہ بھی اس طرح سے مطمئن ہو جس طرح سے دل مطمئن ہو، اس لئے اس نظام تعلیم کی سب سے بڑی کامیابی یہ سمجھتا ہوں، خاص طور سے مسلمانوں کے سلسلہ میں کہ وہ ان حقائق پر، ان اقدار پر، اس نسل کا، اس تعلیم یافتہ نسل کا، ان اسکالرز کا، ان یونیورسٹی گریجویٹس کا، فلاسفرس کا، مفکرین کا یقین مضبوط کر دے اور ان کو اس قابل بنادے کہ وہ دماغ سے ان کے لئے دلائل فراہم کریں، دنیا میں جو علمی ذخیرہ پرانا یا نیا پھیلا ہوا ہے، وہ اس کو اپنے اس دعوے کے ثبوت

میں یا اپنے اس مقصد کی تکمیل میں استعمال کر سکے اور استعمال کرنے کا سلیقہ رکھتے، میرے نزدیک ایک جامعہ کی بہترین تعریف یہ ہے۔

سیرت سازی:

جامعات کا دوسرا کام سیرت سازی ہے، یونیورسٹی ایک کیریئر بنانے جو اپنے ضمیر و بقول اقبال ایک گف جو گے بدلے میں بیچنے کے لئے تیار نہ ہو، آج کل کے خلاف اسلام فلسفے اور نظام یہ سمجھتے ہیں کہ اس بازار میں سب کی قیمت مقرر ہے، وہ اگر کم قیمت پر نہیں خریدا جاسکتا تو زیادہ قیمت پر خرید لیا جائے گا، ایک جامعہ کی حقیقی کامیابی یہ ہے کہ وہ سیرت سازی کا کام کرے، وہ کیریئر بنائے، وہ ایسے طالب علم افراد پیدا کرے جو اپنے ضمیر کا سودا نہ کر سکیں، جس کو دنیا کی کوئی طاقت، کوئی تخریبی فلسفہ، کوئی غلط دعوت، کوئی حکومت ان کو کسی دام کرید نہ سکے اور جو یہ کہہ سکیں کہ

برو ایں دام بر مرغ و گرنہ

کہ عنقارا بلند است آشیانہ

اور اقبال نے کہا ہے:

دل کی آزادی شہنشاہی، شکم سامان موت

فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی

جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

دوسرا فرض یہ ہے کہ ہمارے جامعات نے ایسے نوجوان نکلیں جو اپنی زندگی بھر وقف

کردیں حق پرستی کے لئے، جن کو کبر سے بچنے میں وہ لذت ہے جو یہ کہ

کھائے، پئے، سوائے اللہ کے اور کسی اور کوئی شے نہ ہو، ان کو

عقل و دماغ پر قابو رکھیں، جو ان کو دنیا کی ہر شے سے بالاتر رکھے

میں مقرب ہو جائیں، جو ان کو دنیا کی ہر شے سے بالاتر رکھے

لے جو وہ دنیا کی ہر شے سے بالاتر رکھے

ملک، باعزت ملت، صاحب پیغام ملت بنانے میں صرف کرے، یہ دو چیزیں ہیں، ایک تو یہ کہ دل و دماغ کو وہ غذا دی جائے، وہ روشنی دی جائے کہ جس سے دل و دماغ دونوں مل کر باہمی تعاون کے ساتھ، ایک دوسرے کی رفاقت کے ساتھ ان حقائق اور عقائد پر ایمان کو پختہ کریں اور دوسروں کو سمجھنے، قائل ہونے کا موقع دیں اور انہیں مطمئن کریں۔

آپ یہ دیکھیں کہ آپ اعلیٰ صلاحیت کے لوگ کتنی تعداد میں پیدا کر رہے ہیں، میں صفائی سے کہتا ہوں کہ اب کسی ملک کی یہ تعریف نہیں کہ وہاں کتنی یونیورسٹیاں ہیں، یہ کوتاہ نظری اب بہت پرانی ہو گئی ہے بلکہ قابل قدر بات یہ ہے کہ علم کے شوق میں، ریسرچ کی راہ میں اور علم کو پھیلانے کے جذبہ سے کتنے آدمی اپنی زندگیاں وقف کرتے ہیں۔ اپنی قوم کو صاحب شعور، مہذب اور باضمیر قوم بنانے کے لئے کتنی تعداد میں وہ نوجوان موجود ہیں جو اپنی ذاتی سر بلندی اور ترقی سے آنکھیں بند کر کے اس مقصد کے لئے اپنے کو وقف کرتے ہیں، اصل معیار یہ ہے اور یہی معیار ہونا چاہئے، کتنے نوجوان ایسے ہیں کہ جو دنیا کی تمام آسائشوں اور ترقیوں سے آنکھیں بند کر کے کسی گوشہ میں ٹھوس علمی کام کر رہے ہیں، ملت کی سر بلندی کے لئے یا کسی نظریہ کی دریافت کے لئے یا کسی علمی تحقیق کے لئے اور اپنے ملک کو طاقتور بنانے کے لئے۔

یہی دو حقیقی مقصد ہیں، باقی صرف پڑھا لکھا دینا اور ملازمت کے قابل بنادینا میں سمجھتا ہوں اب کسی جامعہ کے لئے قابل تعریف نہیں اور مجھ پورے یقین اور وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے وائس چانسلر اور جو اس جامعہ کی رہنمائی کرنے والے ہیں وہ اس پوزیشن کو قبول کرنے پر کبھی تیار نہ ہوں گے کہ ہماری جامعہ کا مقصد صرف یہ رہ جائے کہ پڑھے لکھے نوجوان ہزاروں کی تعداد میں پیدا ہو جائیں اور محکموں، کارخانوں اور دکانوں میں فٹ ہو جائیں اور پتہ نہ چلے کہ وہ کہاں گئے۔

مقصود ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے:

اس جامعہ کا مقصد جو ایک ایسے نازک ملک میں، ایسے نازک دور میں قائم ہوا ہے یہی ہونا چاہئے کہ وہ اس انتشار کو رفع کرے جو تمام ممالک اسلامیہ میں تقریباً سو برس سے نمایاں

ہے، جب مغربی تہذیب اور مغرب کی سیاسی یلغار شروع ہوئی تو اس وقت ہمارے عقائد اور حقائق کی بنیادیں ہل گئیں اور ایک ایسی ذہنی کشمکش پیدا ہوئی کہ اس پر بہترین توانائیاں واعیان مذہب کی صرف ہو رہی ہیں اور یہ ایک ایسی غیر فطری صورت حال ہے کہ جس کو جلد ختم ہونا چاہئے۔ اب توانائیاں خالص تعمیری مقاصد اور ملک کی حفاظت و ترقی پر صرف ہونی چاہئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ادب، شاعری، فنون لطیفہ، حکمت، فلسفہ، تصنیف و تالیف سب کا مقصد یہ ہے کہ آپ میں زندگی، نیا یقین پیدا ہو اور آپ کے ذریعہ سے ملت میں ایک نئی زندگی پیدا ہو۔

میں اس وقت شاعر اسلام ڈاکٹر محمد اقبال کے شعر پڑھوں گا جو انہوں نے اگرچہ کسی ادیب یا شاعر سے مخاطب ہو کر کہے، لیکن یہ ہم پر پوری طرح صادق آتے ہیں۔

اے اہل نظر ذوق نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ سمجھے وہ نظر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ معنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا
مقصود ہنر سوز حیاتِ ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا

آج ملت اسلامیہ پاکستان کو ایک ضرب کی ضرورت ہے اس لئے کہ قوموں کی کشتی اس کے بغیر ساحل تک نہیں پہنچ سکتی، جن حالات سے ہم گزر رہے ہیں وہ ایک معجزہ کے طالب ہیں، یہ معجزہ اسلام کے ابدی پیغام میں مضمر ہے:

بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں تو میں
جو ضربِ کلیسی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا؟

اس وقت پاکستان کو ایک ضربِ کلیسی کی ضرورت ہے بلکہ تمام عرب اور اسلامی ملکوں میں بھی زندگی کی نئی روح پیدا کرنے کی ذمہ داری پاکستان پر ہے۔ اسلام کے عقائد و حقائق پر ایک نیا یقین، ایک نیا اعتماد، ایک نیا سرور، ایک نیا نشہ، ایک نیا ولولہ عمل، نئی جرأت اندیشہ، ایک نئی لذت، کردار، ایک نیا جذب دروں پیدا کرے، جس سے ان او نگھتی سوتی قوموں، آمادہ زوال

قوموں، ان مرتعش قوموں کو جن کے قدم بھی ڈگمگا رہے ہیں، دل بھی ڈگمگا رہے ہیں، ان کو نئی زندگی، نئے جوش سے آشنا کریں۔ آپ کی قومہ داری صرف آپ تک محدود نہیں ہے، برصغیر کے مسلمان تعداد کے لحاظ سے تمام عالم اسلام پر فائق ہیں، آپ فکری طور پر عالم اسلام کی رہنمائی کے لئے آگے بڑھیں اور اسلام پر اعتماد پیدا کریں اور یہ ثابت کریں کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے دور میں اسلام چل سکتا ہے، پاکستان ایک معمول ایک تجربہ گاہ ہے جو یہ ثابت کرے گا کہ اسلامی نظریات اس دور میں چل سکتے ہیں اور کامیاب ہو سکتے ہیں۔

آخر میں، میں وائس چانسلر صاحب اور آپ سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے پوری سنجیدگی اور توجہ کے ساتھ میری باتیں سنیں۔



زر خیز زمین مردم خیز خطہ

۲۳ جولائی ۱۹۷۸ء کو زرعی یونیورسٹی فیصل آباد میں یہ تقریر کی گئی۔ جلسہ میں یونیورسٹی کے اعلیٰ عہدہ دار، اساتذہ اور طلبہ کے علاوہ معززین شہر، علماء اور دانشوروں کی خاصی تعداد شریک تھی۔ اس یونیورسٹی میں زیر تعلیم عرب ممالک کے طلبہ کی فرمائش پر مقرر نے اسی موضوع پر عربی میں بھی خطاب فرمایا۔

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم اما بعد

ملک کی عظمت کا حقیقی معیار:

اساتذہ جامعہ، بزرگان محترم اور طلبائے محترم!

مجھے بڑی مسرت اور خوشی حاصل ہو رہی ہے کہ میں آپ کی اس یونیورسٹی میں جو اپنا ایک خاص کام اور مقام رکھتی ہے، اپنے رفقاء کے ساتھ حاضر ہوا ہوں، میں اس عزت افزائی کے لئے یونیورسٹی کے ذمہ داروں کا شکریہ گزار ہوں۔

کسی ملک کی ترقی اور اس کی بڑائی کا معیار صرف یہ نہیں ہے کہ اس میں یونیورسٹیوں کی کتنی تعداد ہے، اس کی زمین میں زراعتی صلاحیت کتنی ہے، اس کے محاصل کتنے ہیں، اس میں کتنے سرمایہ دار پائے جاتے ہیں، اس کا معیار زندگی کتنا بلند ہے؟ بلکہ ملک کی عظمت کا حقیقی معیار یہ ہے کہ اس کے اہل علم میں بحث و تحقیق کرنے کا کتنا ذوق پایا جاتا ہے اور خالص فنی اور تحقیقی دانش گاہیں اور جامعات کتنی ہیں؟ اگر کوئی ملک سب کچھ رکھتا ہے، اس کے اندر قدرتی دولتوں کے بڑے بڑے ذخائر ہیں، فطری اور قدرتی وسائل بھی ہیں، لیکن اس میں ذوق بحس نہیں ہے، تحقیق کا خالص علمی اور سنجیدہ ذوق نہیں پایا جاتا، ایسے لوگ کافی تعداد میں نہیں ہیں، جو اپنی زندگیوں وقف کر چکے ہوں، تعریف و تحسین سے بے نیاز ہو کر تحقیقی کام کرنے کے لئے اللہ تبارک و تعالیٰ کی رضا کے لئے جو اصل مقصود ہے اور اس کی ترقی اور بہبودی کے لئے وہ دن

رات کام میں لگے رہتے ہیں۔ ان کو حکومت یا کسی ادارے سے انعام کا کوئی لالچ نہیں ہے، وہ تھکتے ہوں اور تھکنے ہی سے ان کو راحت ملتی ہو، قطل اور بیکاری اور آرام ان کے لئے سزا ہو، ان کے لئے اس سے بڑھ کر سزا نہ ہو کہ ان کو تحقیقی کام کرنے سے روک دیا جائے، کام ہی ان کی غذا ہو، دوا ہو، ان کا انعام ہو۔

یہاں آ کر خوشی حاصل ہوئی:

یہاں یہ دیکھ کر اس ملک میں ایک ترقی یافتہ زرعی یونیورسٹی پائی جاتی ہے اور یہاں بیرونی ممالک خاص طور سے عرب ممالک کے نوجوان اپنے ملکوں سے پڑھنے اور تحقیقات کرنے کے لئے آتے ہیں، بڑی مسرت ہوئی۔ اس سے ایک مسلمان اور ایک طالب علم کا دل ضرور خوش ہونا چاہئے۔ خدا کا شکر ہے کہ مسلمان بھی ہوں، طالب علم بھی ہوں، اس لئے مجھے یہاں آنے سے قدرتا خوشی حاصل ہوئی۔

اگر میں کوئی بڑا میوزیم دیکھتا یا کسی بڑے سے بڑے ایوان میں میری ضیافت و عزت افزائی کی جاتی تو مجھے وہ خوشی نہ ہوتی جو آپ کے اس دانش گاہ میں آ کر ہوئی۔

اپنی بہترین صلاحیت اس ملک پر صرف کریں:

مجھے امید ہے کہ جو نوجوان یہاں تعلیم پا رہے ہیں وہ اپنی بہترین صلاحیتیں اس ملک کے مفاد پر صرف کریں گے، بجائے اس کے کہ وہ اونچی تنخواہوں کی خواہش میں امریکہ اور یورپ جائیں، جن کا عام طور پر رواج ہو گیا ہے۔ میں پورے امریکہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آیا ہوں کہ ہمارے مشرقی ممالک کے بہترین نوجوان، بڑے باصلاحیت افراد جو اپنے ملکوں کو بہت کچھ دے سکتے ہیں، اور یہ ملک ان کی ذرا سی کوشش سے اپنی زمین سے خزانے اگل سکتے تھے، انہوں نے اپنے اپنے ملکوں سے باہر میدان کا انتخاب کیا۔ اس سے ان افراد کا خواہ کتنا ہی بڑا فائدہ ہو، لیکن ان ملکوں کا بڑا نقصان ہوا کہ پڑھ لکھ کر جب کام کے آدمی بنے تو اغیار کی سرزمین میں پہنچ گئے، تاکہ اپنی جھولی بھریں، کیا ہی اچھا ہوتا کہ اپنے ملکوں کی جھولی اپنی محنتوں سے، ان کے نتائج سے بھرتے، لیکن افسوس ہے کہ ہماری دولت اغیار کے کام آ رہی ہے، اس

لئے میں اس ملک کے نوجوانوں سے اور عرب نوجوانوں سے بھی (مجھے امید ہے کہ وہ یہاں رہ کر اتنی اردو سمجھنے لگے ہوں گے کہ میری بات سمجھ لیں) یہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنی ذہانتیں، اپنی صلاحیتیں، اپنے مطالعے، اپنی تحقیقات کا اصل مستحق اپنے ملکوں کو سمجھیں، یہ بڑے افسوس کی بات ہے اور حب الوطنی اور غیرت اسلامی کے خلاف ہے کہ ہم اپنی صلاحیتوں سے ان ملکوں کو فائدہ پہنچائیں جنہوں نے تمام اسلامی ملکوں کو غلام بنا رکھا ہے، آج بالواسطہ یا بلاواسطہ سیاسی طور پر، اقتصادی طور پر، علمی اور فنی طور پر سب امریکہ اور روس کے دست نگر ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک کے دست نگر ہیں، اگر ہمارے نوجوان اپنی صلاحیتیں اپنی سرزمین پر صرف کریں تو وہ بہت کچھ عطا کر سکتے ہیں اور اس راستہ سے خدا سے، اپنے خالق سے بھی بہت کچھ لے سکتے ہیں۔

نظریات، فلسفوں اور علمی تحقیقات و مسلمات کا غلبہ جاری ہے:

مجھے امید ہے کہ نوجوان ان ملکوں کا مقابلہ کریں گے جو علمی تحقیقات کے ذریعہ اسلام کے قلب و دماغ پر حملہ آور ہیں، وہ زمانہ گیا کہ کوئی ملک کسی ملک کو غلام بنائے اور اگر اب بھی کہیں کسی کو اس کا شوق ہے تو وہ ایک قصہ پارینہ کی تقلید ہے، لیکن علمی نظریات، علمی تحقیقات اور علمی مسلمات کے نام پر جو باتیں پیش کی جاتی ہیں ان کا حملہ اسلام پر ہمیشہ جاری رہا ہے اور جاری رہے گا۔ ایک زمانہ میں فلسفہ یونان کا حملہ تھا، اس زمانہ میں اسلام نے غزالی، باقلانی، شیخ الاسلام تیمیہ اور امام رازی پیدا کئے۔ اس کے بعد پھر مغربی استعمار نے تاریخ کی راہ سے مسلمانوں پر حملے شروع کئے۔ مثلاً یہ کہا جانے لگا کہ کتب خانہ اسکندریہ مسلمانوں نے جلایا ہے اور اس کو یورپ نے ایسی مسلمہ حقیقت کے طور پر پیش کیا کہ ہر پڑھا لکھا آدمی سن کر گردن جھکا لیتا تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ اگر میں نے اس کو ماننے سے ذرا بھی پس و پیش کیا یا انکار کیا تو میں ناخواندہ اور غیر تعلیم یافتہ سمجھا جاؤں گا۔ پورے عالم اسلام پر اس کا جادو چل گیا تھا کہ مسلمان علم کی کیا سرپرستی کریں گے، علم کے سلسلے کو آگے بڑھائیں گے، وہ تو ایسے غیر روا دار، ایسے علم دشمن ہیں کہ اپنے خلیفہ عمر فاروقؓ کے حکم سے کتب خانہ اسکندریہ کو آگ لگا دی اور کہا کہ اگر یہ قرآن و حدیث کے مطابق ہے تو اس کی ضرورت نہیں ہے اور اگر مطابق نہیں ہے تو اس کا جل جانا ہی بہتر ہے۔ یورپ کے عیسائی مصنفین نے یہ بات کہی اور ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں نے تسلیم

کر لیا اور یہ سمجھا جانے لگا کہ یہ تاریخی حقیقت ہے۔ برصغیر میں مولانا شبلی نعمانی پہلے مورخ و ناقد تھے جنہوں نے اس مسئلہ پر قلم اٹھایا اور مستقل رسالہ لکھا اور ثابت کر دیا کہ یہ محض افسانہ اور مسیحی تعجب و جہالت کا کرشمہ ہے جس طرح ریاضی کی حقیقت ہوتی ہے۔ دو دو چار، اسی طرح انہوں نے تاریخی دلائل سے ثابت کر دیا کہ کتب خانہ اسکندر یہ حضرت عمر فاروقؓ کی خلافت اور مسلمانوں کے داخلہ مصر سے پہلے جل چکا تھا اور یہ متعصب عیسائیوں کا کارنامہ تھا۔ اسی طریقہ سے تاریخ کے راستے سے جو خیالات پیدا ہوئے اور جنہوں نے مسلمانوں کے ایمان و عقیدہ کو متزلزل کرنا شروع کر دیا جیسے اورنگزیب عالمگیرؒ کے متعلق مشہور کیا گیا کہ وہ ستم گر تھا، ہندو کش تھا، ظالم تھا، جزیہ ظالمانہ ٹیکس ہے۔ اس کا جواب بھی مولانا شبلیؒ نے دیا اور معتبر ضمیمہ کا منہ بند کر دیا۔

علم کسی منزل پر رکتا نہیں:

جب اسلام پر حملے سیاسیات کی راہ سے، اقتصادیات کی راہ سے شروع ہوئے تو اسی تحتی براعظم کے مسلمان فضلاء کے قلم چلے اور انہوں نے ان فلسفوں کا، ان نظریات کا علمی محاسبہ کیا، علم کی تعریف یہ ہے کہ وہ کبھی کسی منزل پر جا کر رکتا نہیں اور اس میں برابر ارتقاء کا عمل جاری رہتا ہے، اس لئے یہ کہنا کہ یہ حرف آخر ہے، یہ علم کی حیثیت و منصب سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ اب آپ حضرات کا فرض ہے کہ علم نباتات کے ذریعہ جو غلط نظریات آرہے ہیں اور جو اسلام کے اور قرآن مجید کے عقائد، ان کی تعلیمات سے متصادم ہیں، آپ ان کا بطلان ثابت کریں یا قرآن شریف نے جن چیزوں کی نقاب کشائی کی ہے، مثلاً قرآن کہتا ہے کہ ”وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ“ اور کہتا ہے کہ نباتات میں بھی ازدواج ہے، اس میں بھی جوڑا ہے، نہ اور مادہ نباتات میں بھی ہوتے ہیں، مجھے معلوم نہیں کہ قرآن سے پہلے بھی کسی نے اس کا دعویٰ کیا ہو اور یہ بات پیش کی ہو، اب آپ اس کی صداقت ثابت کریں اور بتائیں کہ اس کتاب کا، اور اس نبی امیؐ کا بڑا معجزہ ہے کہ فن نباتات سے پہلے کسی نے یہ بات نہیں کہی کہ ہر چیز میں نر و مادہ ہوتے ہیں اور خاص طور سے نباتات کے متعلق تو سورہ رعد کی ابتداء میں ایسی حقیقتوں کو بیان کیا گیا ہے، یہ حقیقتیں تو ایسی ہیں کہ ان پر مستقل ریسرچ کی جائے اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ کی یہ جامعہ اس بات کی پورے طور پر مستحق ہے کہ اس پر کام کرے اور وہ کام لوگوں

کے سامنے اور پوری دنیا کے سامنے آئے۔

کاش یہ کام اسلامی ملکوں میں ہوتا:

ڈارون کے نظریہ ارتقاء نے جس طرح سے لوگوں کے دماغوں کو ماؤف کیا، نہ صرف یہ کہ علمی دنیا میں ہلچل پیدا کی بلکہ مذہبی دنیا کو بھی ہلا کر رکھ دیا۔ جن حضرات کا یہ موضوع ہے وہ بہتر جانتے ہیں۔ اس کی ضرورت تھی کہ عالم اسلام میں اس کے محاسبہ کا کام کیا جائے۔ اتفاق سے یورپ میں خود اس سلسلہ میں بڑا کام ہوا اور اس نظریہ کا انیسویں صدی کے آخر یا بیسویں صدی کے شروع میں جو بد یہ قائم تھا، جو طمطراق تھا اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ ڈارون کے نظریہ کی تنقید میں زبان کھولنا اپنی جہالت کا ثبوت دینا ہے، بہت سے لوگوں نے اس کے سامنے سپر ڈال دی تھی، اور کہنا شروع کر دیا کہ قرآن کے بیان اور اس نظریہ میں کوئی منافات نہیں۔ لوگوں نے دونوں میں تطبیق دینی شروع کر دی تھی، بلکہ نظریہ ارتقاء کو اصل مان کر منصوصات قرآنی کی تاویل کرنے لگے تھے، لیکن اب علمی طور پر اس نظریہ کی وہ حیثیت نہیں رہی جو انیسویں صدی کے اوائل میں تھی لیکن یہ کام یورپ میں ہوا۔ کاش کہ یہ کام اسلامی ملکوں میں ہوتا، مصر میں ہوتا، عراق میں ہوتا، ہندوستان میں ہوتا۔ مگر افسوس ہمارے ممالک عربیہ کے فضلاء کی کوشش کا میدان ادب تھا یا تاریخ، انہوں نے تطبیقی علوم یعنی سائنس، کیمسٹری، فزکس یا اس طرح کے میدان کی طرف کم توجہ دی، اسلامی ممالک کا ایک آدمی بھی ایسا پیدا نہیں ہوا جو کسی نظریہ کا اضافہ کرتا، یا علمی دنیا سے اپنی تحقیق کا لوہا منوالیتا، اور بین الاقوامی اعزاز کا مستحق قرار پاتا۔

آپ نوبل پرائز حاصل کریں:

عزیز طلبہ اور مسلم نوجوانو! آپ ایگریکلچر ہی کی فیلڈ میں کوئی ایسا نظریہ پیش کریں کہ آپ نوبل پرائز کے مستحق قرار پائیں۔ آپ کو اندازہ نہیں کہ جب کسی مسلمان کو کسی تحقیقی یا علمی کام میں نوبل پرائز ملے گا تو مسلمان نوجوانوں کا حوصلہ کتنا بلند ہوگا، وہ کتنا افتخار محسوس کریں گے، میں طبقہ علماء سے تعلق رکھنے کے باوجود اس روز سعید کا منتظر ہوں جب میں سنوں کہ کسی اسلامی ملک میں سے کسی نے نباتات یا زراعت کے میدان میں ایسا کام کیا ہے کہ وہ نوبل پرائز کا

مستحق ٹھہرا، آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ اس سے مسلمان نو جوان کتنا خوش ہوں گے اور یہ وہ خوشی ہے جس پر کسی کو ملامت نہیں کی جاسکتی اور جس کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں، کوئی حکومت اس پر تنقید نہیں کر سکتی۔ میں نو جوانوں کو اور عرب ممالک کے نو جوانوں کو توجہ دلاتا ہوں کہ وہ ایسا اور بچل تحقیقاتی بلکہ انقلابی کام کریں جس کی طرف ساری دنیا کی نگاہیں اٹھ جائیں اور وہ مان جائے کہ ہاں مسلمانوں میں بھی ایسی غیر معمولی دماغی صلاحیت اور عبقری پائی جاتی ہے اور ان میں ایسے جینیئس (GENIUS) پائے جاتے ہیں۔

مسلم اقوام کے دل کی زرخیز زمین :

آپ مسلم قوم کے نو نہال ہیں، آپ اس زمین کی تحقیق کرتے ہیں کہ اس میں کیا کیا صلاحیتیں ہیں، اس میں کیا چیزیں پیدا کی جاسکتی ہیں اور اس کی پیداوار کس طرح بڑھائی جاسکتی ہے، میں آپ کو ایک اور زمین کی طرف توجہ دلاتا ہوں، جس کی طرف ہمارے مسلم ممالک کی بہت تھوڑی توجہ ہوئی ہے، وہ ہے ہمارے مسلم اقوام کے دل کی زمین، ہمارے مسلم اقوام کے دل میں کیسے کیسے خزانے دفن ہیں، دل کی یہ زمین کن دولتوں، کن خزانوں اور کن طاقتوں سے مالا مال ہے، ان کو ابھارنا، ان کو پہچاننا، ان سے کام لینا چاہئے، ہمارے سیاسی قائدین اور قومی رہنماؤں نے ابھی تک اس کی طرف توجہ نہیں کی ہے کہ جو قومیں ہمارے حصہ میں آئی ہیں وہ قومیں کیسی ایمانی طاقت، کیسی قربانی کی طاقت، کیسا جذبہ، کیسی گرم جوشی، کیسی سادگی، کیسی محبت اپنے اندر رکھتی ہیں۔ کیا اس کے لئے ضرورت نہیں کہ ایک یونیورسٹی قائم کی جائے جو دلوں کی اس سرزمین، ان مسلم اقوام کی ان صلاحیتوں کے متعلق تحقیقات کرے، اور ان کے ابھارنے کے ذرائع معلوم کرے اور پھر ان کو کلٹی ویٹ (CULTIVATE) کرے، ان کی پرورش کرے، ان کی نشوونما کرے، اگر یہ کام ہو گیا تو دنیا میں انقلاب عظیم برپا ہو جائے گا، آپ کسی تحقیق کے ذریعہ دنیا کے حالات و اخلاق میں انقلاب عظیم برپا نہیں کر سکتے، دنیا کو حقیقی فائدہ نہیں پہنچا سکتے، لیکن اس کام سے دنیا کے حالات و اخلاق میں انقلاب عظیم برپا کر سکتے ہیں، میں اقبال ہی کے الفاظ میں شکوہ سنج ہوں، نہ صرف ایران سے بلکہ اس تختی براعظم بلکہ عالم اسلام سے کہتے

نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب و گل ایراں وہی تبریز ہے ساقی
اور پھر اپنے دل کو تسلی دوں گا اور آپ کو مژدہ سناؤں گا کہ
نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشت ویراں سے
ذرا تم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

زرخیز زمین میں مردم خیز خطہ:

خدا نے آپ کو پاکستان کی سرزمین دی، اس کی مٹی بھی زرخیز، اس کی قوم بھی زرخیز، اس کا دماغ بھی زرخیز، اس کا دل بھی زرخیز۔

اسی طرح ایشیاء کے سارے ممالک جہاں سے یہ طالب علم آئے ہیں، زرخیز ہیں، یہی عراق کا حال ہے جو دجلہ و فرات کی وادی ہے، یہی سوڈان کا حال ہے جو نیل کا منبع ہے، وہاں کی زمین کیسی زرخیز ہے، لیکن مردم خیز بھی ہے۔ آپ نے یہ تو سمجھا کہ زرخیز ہے، لیکن آپ نے یہ نہیں سمجھا کہ مردم خیز بھی ہے، زرخیزی کا کام تو ہو رہا ہے لیکن افسوس ہے کہ مردم خیزی کا کام ابھی شروع نہیں ہوا، ممکن ہے کہ کل ہم سنیں کہ آپ وزیر زراعت بن گئے، یہ عرب نوجوان ہیں، ہو سکتا ہے کہ ان میں کوئی وزیر زراعت ہو جائے، یہ زمانہ انقلاب کا زمانہ ہے، جمہوریت کا دور ہے، اس لئے اس کا پورا امکان ہے کہ آج آپ یہاں فیصل آباد یونیورسٹی کے طالب علم ہیں، لیکن کل آپ اپنے یہاں منسٹر ہوں یا لیڈر ہوں، کسی سیاسی پارٹی کے رہنما بن جائیں یا صدر جمہوریہ ہو جائیں تو میں آپ کو یہ پیغام دیتا ہوں کہ آپ زمینوں کی زرخیزی اور مردم خیزی دونوں کی طرف توجہ دیں اور اپنے ہم وطنوں کو بتائیں کہ اللہ نے ان مسلم و عرب اقوام کو جو باطنی صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں، یورپ و امریکہ کی قومیں ان سے محروم ہیں، مسلمانوں کے اندر جو سادگی ہے، جو اخلاص ہے، اس کا ہزارواں حصہ بھی ان امریکن، یورپین اور ان غیر مسلم قوموں کو حاصل نہیں۔ آپ اس خلوص کا فائدہ اٹھائیں، مسلمان مسلمان سے کس خلوص سے ملتا ہے، ایمان کی کتنی بڑی طاقت اس کی اندر ہے اور اللہ اور اس کے رسول کے نام پر وہ کیا کر سکتا ہے، اس طاقت کو بھی سُنو و نما دیں، اس کو بھی بڑھائیں، آپ کا ملک لالہ زار نہیں، بلکہ ایسا مردم خیز،

زرخیز، انقلاب خیز اور ایسی بہاروں کا پیغام دینے والا بن جائے گا کہ دنیا محو حیرت رہ جائے گی۔
 ان الفاظ کے ساتھ اپنے ان داعیوں کا شکر یہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے مجھے یہ مسرت و
 عزت حاصل کرنے کا موقع فراہم کیا اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ اس جامعہ کو نیک نام بلکہ نامور اور
 باعث عزت و افتخار بنائے۔ نہ صرف اس ملک کے لئے بلکہ عالم اسلام کے لئے۔

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

یہ تقریر مورخہ ۲۵ جولائی ۱۹۷۸ء کو پنجاب یونیورسٹی لاہور میں اسلامی جمیۃ الطلبة کے کیمپ میں کی گئی۔ اس تربیتی کیمپ میں صوبہ پنجاب کے مختلف مقامات کے طلبہ اور طلبہ کی اس تنظیم کے عہدہ دار، ذمہ دار اور نمائندے موجود تھے۔

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے:

میرے عزیز بھائیو! مجھے آپ کی اس مجلس میں آکر وہ مسرت ہوئی جس کو کسی ایسی دعوت کے خادم سے یا مدرسہ کے ایسے استاد سے پوچھنا چاہئے جس کو نو جوانوں پر اور ملت کے نو بہاروں پر اپنا خون جگر صرف کرنے کی سعادت حاصل ہوئی ہو، اور جو ایسے نو جوانوں کو دیکھنے کی تمنا کرتا ہو جس کے متعلق اقبال نے کہا ہے:

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

خدا کے گھر میں ایک جگہ پر اتنے نو جوان، جنہوں نے اپنے مالک کے ساتھ عہد کیا ہو اور جنہوں نے ارادہ کیا ہو کہ وہ اسلام کی سربلندی کے لئے کام کریں گے اور صراطِ مستقیم پر چلتے رہیں گے۔

صراطِ مستقیم پلِ صراط ہے:

صراطِ مستقیم اصلاً تو صراطِ مستقیم ہے، لیکن کبھی پلِ صراط کی شکل اختیار کر لیتی ہے کہ بال سے زیادہ باریک، تلوار سے زیادہ تیز، خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ خدا نے ہم کو اس پلِ صراط کے لئے انتخاب کیا ہے اور اس راستہ سے وہ ہم کو انعام دینا چاہتا ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ جب مصائب پر انعامات ملنے لگیں گے قیامت میں تو وہ جنہوں نے اسلام کی راہ میں مصیبتیں اٹھائی

ہیں، اور بڑی بڑی مشکلات سے گزر رہے ہیں وہ تمنا کریں گے کہ کاش ان کی کھالیں قینچیوں سے کتری گئی ہوتیں۔ اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ اس نے ہمیں اس قابل سمجھا۔ اگر کوئی طالب علم مہنتی ہے، اس نے واقعی پورے سال مہنت کی ہے اور اپنا پورا کام کیا ہے، اگر امتحان میں پرچہ آسان آجائے تو اپنا سر پیٹ لیتا ہے کہ میں نے کس دن گے لئے مہنت کی تھی، اور راتوں کی نیند حرام کی تھی۔ اگر یہی پرچہ آنا تھا تو پہلے سے بتا دیا گیا ہوتا، اور اگر پرچہ مشکل آتا ہے تو مہنتی طالب علم سمجھتا ہے کہ اس کی مہنت ٹھکانے لگی۔

اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے:

یہ شکوہ کرنا کہ ہمیں بہت نازک زمانہ ملا ہے اور ہماری راہ کانٹوں سے بھری ہوئی ہے، کم ہمتی کی بات ہے، بلند ہمتی کی بات یہ ہے کہ اگر راستہ آسان ہو تو آدمی کو شبہ ہونے لگے اپنے بارے میں کہ مجھے اس قابل نہیں سمجھا گیا کہ میں کسی مشکل پر چلوں، اگر زندگی ساری کی ساری سہولتوں سے لبریز ہوتی تو زندگی میں لطف نہ رہتا۔ شاعر نے خوب کہا ہے:

چلا جاتا ہے ہنستا گھیلتا موج حوادث سے

اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

میں نے آپ کے سامنے سورہ کہف کی آیت پڑھی ہے جو مجھے بے اختیار یاد آئی۔

آپ کا رب آپ سے مخاطب ہے:

”انہم فتیۃ آمنوا برہم“ وہ ایسے نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے، یہاں فتیۃ کا لفظ آیا ہے۔ فتیۃ عربی میں فتی کی جمع ہے (جمع قلت) اور فتی نوجوان کو کہتے ہیں، یہاں بہت سے الفاظ ہو سکتے تھے لیکن فتیۃ کا لفظ اختیار کیا گیا۔ انہم فتیۃ آمنوا برہم۔ وہ چند جو اپنے رب پر ایمان لائے، اپنے رب پر ان کا عقیدہ مستحکم ہوا، زدناہم ہدی، اور جب انہوں نے پہلی منزل طے کر لی تو دوسری منزل ہم نے طے کی کہ زدناہم ہدی آپ کے کرنے کا اور ہمارے کرنے کا جو کام ہے وہ کریں۔ پھر اللہ تعالیٰ کی مدد آتی ہے، آپ قرآن شریف میں دیکھتے ہیں ”ویزدکم قوۃ الی قوتکم“ وہ تمہاری قوت میں اپنی قوت کا اضافہ کرے گا،

تمہارے پاس جو ہے لا کر رکھ دو، ہم اس میں اضافہ کریں گے ”ان تَنْصُرُوا اللَّهَ يَنْصُرْكُمْ“ تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا۔ چنانچہ بنی اسرائیل سے خطاب کیا گیا ”یا بنی اسرائیل اذکروا نعمتی الی انعمت علیکم وافرأ بعہدی اوف بعہدکم“ اے یعقوب کی اولاد میری نعمت کو یاد کرو، اور میرے عہد کو تم وفا کرو، تمہارے عہد کو میں وفا کروں گا۔ آنحضرت ﷺ سے ایک مرتبہ شکایت کی گئی کہ پانی نہیں ہے، آپ اللہ سے دعا کر سکتے تھے اور پانی آسمان سے برس سکتا تھا، لیکن آپ فرماتے ہیں کہ جو پانی باقی ہے لے آؤ۔ پانی جب آتا ہے تو اس میں انگشت مبارک ڈال دیتے ہیں تو وہ ابلنے لگتا ہے، آپ سے عرض کیا گیا کہ کھانے کو کچھ نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا کہ جو کچھ ہے لے آؤ، سوکھی کھجوریں، خشک روٹیاں اور جو وغیرہ لوگ لائے، تھوڑا سا ذخیرہ تھا۔ آپ (ﷺ) نے دعا کی، ہاتھ لگایا اور وہ بڑھ گیا اور سارے لشکر کے لئے کافی ہو گیا۔ اللہ کا رسول حضرت عیسیٰ کی طرح یہ دعا بھی کر سکتا تھا کہ ”ربنا انزل علینا مائدة من السماء“ مگر چونکہ آنحضرت ﷺ کی اس امت کو مختلف ادوار سے گزرنا تھا، اس امت کو اندرونی طاقت اور عزم و ارادہ سے کام لینا تھا، اس لئے اس کی تعلیم دی گئی۔ یہ عہد ہاتھ میں ہاتھ رکھنے کا نہیں ہے، یہ عہد عمل کا ہے، جدوجہد اور کوشش کا ہے، اس لئے امت سے کہا گیا کہ تمہارے پاس جو ہے اس کو پیش کرو، پھر ہم اس میں اضافہ کریں گے۔ آنحضرت ﷺ کے معجزات کو بھی اسی طرح پیش کیا گیا ہے، آپ نے تین سو تیرہ آدمیوں کو لے کر میدان بدر میں کھڑا کر دیا، آپ یہ بھی کر سکتے تھے کہ پھونک مار دیتے، کنکر پھینک دیتے، لیکن آپ ﷺ مدینہ سے چل کر آئے، مدینہ سے بدر کا فاصلہ ستر اسی میل کے قریب ہے، اس کو طے فرمایا، اس زمانہ کے طریقہ جنگ کے مطابق صفوں کی ترتیب کی، جیسے ایک فوجی قائد کرتا ہے، یہ ہے صحیح طریقہ سنت نبوی ﷺ۔

مسئلہ ربوبیت کا تھا:

میں نے آپ کے سامنے آیت پڑھی کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”انھم فہیہ“ وہ گنتی کے چند نوجوان تھے، حکومت وقت نے غذائی سامان اور معاشی وسائل پر قبضہ کر رکھا تھا، وہ غلہ دے تو لوگوں کو غلہ ملے، وہ لوگوں کو ملازمتیں دے تو لوگوں کو ملازمتیں ملیں، تو وہ حکومت گویا ایک طرح

سے ”مسنوعی رب“ بن گئی تھی۔ ”امنوا برہم“ لیکن وہ اپنے حقیقی رب پر ایمان لائے کہ ہمارا پالنے والا، ہمیں غذا دینے والا، ہماری زندگی کی ضروریات پوری کرنے والا، ہمیں عزت دینے والا وہ کوئی اور ہے، وہ مالک الملک ہے، وہ رب حقیقی ہے۔ جب انہوں نے یہ منزل طے کر لی تو ”زدناہم ہدیٰ“۔ ہم نے ان کی ہدایت میں اضافہ کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہدایت کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور اس کی معرفت ہے، ہدایت وہاں سے ملتی ہے۔ اپنی دماغی صلاحیت، اپنی ذہانت سے، تحریروں سے، محض مطالعہ سے، کتب خانہ کے علمی ذخیرہ سے نہیں ملا کرتی، ہدایت کی نسبت اپنی طرف کی ہے، اور بادشاہوں کے انداز خطاب کی طرح جمع کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ ”زدناہم ہدیٰ“ ہم نے ان کی ہدایت میں اضافہ کیا تو وہ کہیں سے کہیں پہنچ گئے، اللہ کے سامنے سر جھکایا، اس سے مانگنا شروع کیا، اس کی معرفت پر محنت کی، اس کی صفات عالیہ اور اسمائے حسنیٰ کی معرفت و فہم حاصل کرنے میں انہوں نے غور و فکر سے کام لیا تھا تو ہم نے ان کی ہدایت کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔

نوجوانوں کا جذبہ عمل:

اب مشکلات کا سامنا پڑا، یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب عیسائیت نئی نئی جزیرہ نمائے سینا اور اپنے اصل مرز بوم سے نکل کر روم اپنی تو وہاں کٹر قسم کی بت پرست حکومت تھی، جب یہ داعی وہاں پہنچے تو ان کی تبلیغ سے نوجوان بھی متاثر ہوئے، تاریخ کے بہت سے ادوار میں ایسا نظر آتا ہے کہ نوجوان پہلے متاثر ہوئے ہیں، اس لئے کہ زیادہ عمر رکھنے والے معمر لوگوں کے ساتھ بہت سے وزن بندھے ہوتے ہیں، جیسے تیرنے کے لئے آپ دریا میں جاتے ہیں، جتنے ہلکے ہوں گے، اتنی ہی آسانی سے تیر سکیں گے، لیکن اگر کسی کے ساتھ بو جھل پتھر بندھے ہوں، کچھ سامان بھی اس کے ساتھ ہو تو اس کے لئے دریا کو پار کرنا مشکل ہوگا، جو جتنا ہلاک ہوتا ہے وہ اتنی ہی جلدی منزل طے کرتا ہے:

سبک سار مردم سبک تر روند

خاندان، روایات، بادشاہ اور حکمرانوں سے تعلقات اور رسم و رواج کے پتھر معمر لوگوں کی راہ میں جیسے حائل ہوتے ہیں، نوجوانوں کے راستے میں حائل نہیں ہوتے، رکاوٹ نہیں بنتے،

نیا خون، نئی عمر، نیا جوش، نئی انگلیں، نئے حوصلے تھے، ایک آواز ان کے کان میں پڑی، ”اے قرآن مجید میں سورہ آل عمران میں آیا ہے ”ربنا اننا سمعنا منادان ینادی للابنات ان امنوا ببرکم فامنا“۔ پروردگار! ہمارے قبول حق کی تاریخ بس اتنی سے کہ ہم نے کان میں ایک آواز پڑی، ایک منادی حق نے کہا اپنے رب پر ایمان لاؤ ہم ایمان لے آئے، تو یہ یوں ہون جو تھے، ان کے پاؤں میں وہ بیڑیاں نہیں پڑی تھیں، جو اللہ پرانی اسل کے لوگوں کے پاؤں میں پڑی رہتی ہیں، اس لئے فخر کے ساتھ کہا گیا ”فامنا“ کہ ان کو کوئی دوسری ایمان لانے میں۔

ہم نے ان کے دلوں کو تھام لیا:

”وربطنا علی قلوبہم“ ہم نے ان کے دلوں کو مضبوط کر دیا۔ ہم نے ان کے دلوں کو تھام لیا، باندھ لیا، اس لئے کہ جب کوئی چیز کھلی ہوتی ہے تو ہوا کے جھونکے سے اڑ جاتی ہے، کسی چیز سے بندھی ہو تو پھر وہ قائم رہتی ہے، تو ہم نے ان کے دلوں کو باندھ رکھا، وہ ادھر ادھر چلنے جلنے نہ پائیں۔ ”اذا قاموا فقالوا ربنا رب السموت والارض“ وہ لھٹے ہوئے اور انہوں نے کہا کہ ہمارا رب وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے۔ کھڑے ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ بیٹھے تھے، رکھ رہے ہو کہے میدان کے اندر ایک عزم پیدا ہو گیا، انہوں نے اعلان کیا کہ ہمارا پروردگار وہ ہے جو آسمان زمین کا پروردگار ہے۔

”لن ندعو من دونه الہا لہذا قلنا اذا سططا“ ہم اس کے سوا کسی الہ، کسی معبودی پرستش نہیں کریں گے، اور ہم نے ان زمان سے یہ بات نکالی تو بڑی بے جا بات ہو گئی، بڑی خلاف واقعہ بات ہو گئی ”ہذلاء قومنا استعدوا من دونه الہة“ یہ ہماری قوم کے لوگ بڑے اچھے، بنیاد، لوگ معلوم ہوتے ہیں۔ بڑے باوقار لوگ ہیں، تجربہ کار ہیں، اس کے باوجود انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر دوسرے معبود بنائے ہیں۔ لولا باتوں علیہم بسطنا مس اس پر کوئی دلیل کیوں نہیں لائے اور یوں ہے اس شخص سے بڑا ظالم کہ جس نے اللہ کو جھوٹ کر ڈھکا۔

وادی گلزار، وادی پر خارا:

اب وہ وادیاں آئیں جو دعوت کے میدان میں آتی ہیں اور وہ دو طرح کی ہوتی ہیں۔

ایک وادی پر خار اور ایک وادی گلزار۔ وادی پر خار تو یہ ہے کہ راستے میں کانٹے بکچھے ہوں، مگر انکارے بکچھے ہوں اور وادی گلزار یہ ہے کہ تعلیمات، ترقی، ترقی کے مواقع، انعامات، بڑی بڑی آسامیاں، بڑے بڑے عہدے، یہ وادی گلزار ہے۔ مگر وادی پر خار مشکل ہوتی ہے اور وادی گلزار، لیکن بہت سے تجربہ کاروں کا کہنا ہے کہ وادی گلزار وادی پر خار سے زیادہ دشوار گزار ہے، تربیبات، تربیبات اور تعزیرات کے مقابلہ میں زیادہ موثر ہوتی ہے۔ آپ کو شاید معلوم ہو گا کہ امام احمد بن حنبل کو ایک منزل وہ پیش آئی کہ معتصم نے ان کو ڈرایا، اڑھم کرایا، وہ نہیں مانے تو ان کو دربار میں بلایا اور یہاں احمد فرما میری بات مان دو گے تو میرے ولی عہد کی طرف منسوب و تہرب میں جاوے اور اس جہان میں بیٹھو گے۔ انہوں نے کہا، امیر المومنین! کتاب و سنت سے ولی عہد لائے تو میں اس کو مان لوں۔ وہ جھنجھکیا اور اس نے جلاو کو حکم دیا اور اس نے ایک بوڑھا پوری طاقت سے ساتھ مارا۔ جلاو کہتا ہے واللہ وہ کوزا آبر با بھی پر پڑتا تو وہ چنگھاڑ مار کر بھاگ جاتا، لیکن وہ برابر لوڑے کھاتے رہے۔

اس کے بعد ایک دوسرا آیا جب معتصم کا انتقال ہو گیا اور اس کا بیٹا متوکل تخت پر بیٹھا، اس نے امام احمد و سرمن راہی میں طلب کیا اور بڑی نا طر مدارات کی۔ یہ اپنے ساتھ کچھ زاد راہ لے گئے تھے، ستویا اسی طرح کی کوئی اور چیز۔ دس دن بھانے کا وقت آتا وہی کھاتے تھے اور شاہی کھانوں کو ماتھ نہیں دیتے تھے، بعد میں متوکل نے ان شریفیوں کے لئے نئے شروع کئے، تو ان کے ساتھ ان کے بیان کرنے میں کہ والد صاحب نے اپنے لئے معتصم سے وروں سے زیادہ متوکل کے لئے توڑے گئے امتحان کا سبب ہیں۔

یہ سب سے رجحان میں کبھی یہ کرتی ہیں، کبھی وہ کرتی ہیں، کبھی یہ کرتی ہیں کہ لوہے سے اپنے لئے تیرے دھاتی ہیں اور جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ لوہے سے نہیں دے گا، تو اسے بہت سے پیش برنی ہیں، یہ منزل بڑی سخت ہوتی ہے۔ مگر سربراہی اس طرح نہیں سمجھتی، بلکہ باپ لے اصرار پر جھک جاتا ہے۔ ان کے والدین سے جو دراز سے متعلق تھے، مختلف عہدوں پر فائز تھے کہا گیا کہ اپنے لڑے و سمجھاؤ، وہ سب چکر میں آگئے ہیں۔ ان کو سمجھاؤ، ہماری بات مانیں، اپنا مستقبل بنائیں، تمہارے بعد آخر کون ہوگا؟ تمہارے بیٹے مٹے ہوں گے۔ بیان حسب اس سے کام نہیں چلا تو ان کو دھمکانا شروع کیا، ان کو پتہ چلا کہ ان کا پیچھا یہ تو اس

وقت اللہ کی مدد کی ضرورت تھی۔

تین باتیں:

میرے عزیز بھائیو! یہ میں نے آپ کے سامنے سورہ کہف کی آیتیں پڑھی ہیں، اس کی تشریح کی ہے، اس میں ہم کو یہ سبق ملتا ہے کہ پہلے ایمان مستحکم ہونا چاہیے، بہت بصیرت کے ساتھ، قوت کے ساتھ ہمارا ایمان اللہ پر، اس کی صفات پر مستحکم ہونا چاہئے، اگر ہم طالب علم ہیں تو علمی انداز کے ساتھ، اور اگر ہم عوامی مسلمان ہیں تو بھی پوری صداقت کے ساتھ ہمارا ایمان خدا پر قائم ہونا چاہئے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ”زدناہم ہدیٰ“ اس سرچشمہ ہدایت سے ہمارا تعلق ہونا چاہئے جہاں سے ہدایت کا فیضان ہوتا ہے۔ کتاب و سنت کے مطالعہ، اسوہ رسول اور صحابہ اور مجاہدین اسلام کے حالات سے ہمیں طاقت حاصل کرنا چاہئے، جس طرح کہ بیڑی چارج کی جاتی ہے۔ سیل جب ختم ہو جاتے ہیں تو بدلے جاتے ہیں، ہم اور آپ اس مادی دنیا میں چلتے پھرتے ہیں، ایسے اساتذہ سے بھی پڑھتے ہیں جن کو خود بھی پورے طور پر ان دینی و نبوی حقائق پر یقین حاصل نہیں ہوتا، ہمارا دور ایسی چیزوں سے بھرا ہوا ہے کہ قدم قدم پر ہم کو خدا سے غافل کرنے والی چیزیں ملتی ہیں اور ہمیں ان کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ہر چیز خود فراموشی اور خدا فراموشی پیدا کرنے والی ہے، ٹیلی ویژن کو دیکھئے، ریڈیو سنئے، اخبارات پڑھئے، حتیٰ کہ خالص ادب، جس کو پاک، معصوم اور غیر جانبدار ہونا چاہئے، وہ بھی غیر جانبدار نہیں رہا، وہ فسق کا ایجنٹ بنا ہوا ہے اور بہت ہی سستا ایجنٹ باطل اقدار کا، ہمارا ادب اس وقت مشاطہ بنا ہوا ہے معصیت اور سفلی جذبات اور فحش اخلاق کا، یہ ساری چیزیں جو ہمارے چاروں طرف دریا کی طرح موجزن ہیں اور دریا میں ہم کو ڈال دیا گیا ہے، ہمارے حالات نے، ہمارے نظام تعلیم نے، ہم کو اس دریا کے حوالے کر دیا ہے، پھر اس کا کہنا یہ ہے کہ:

”دامن تر مکن ہشیار باش“

خبردار بیٹا، دامن تر نہ ہونے پائے، تو دامن بچانے کے لئے ضرورت ہے کہ ”زدناہم ہدیٰ“ پر غور کریں، ایمان کا چراغ روشن کریں اور جرات و محبت پیدا کریں۔ جس کے بغیر ہم ان

نفسانی خواہشات کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ہم ان چیزوں کا مقابلہ خالی نظام جماعت اور ضابطہ اخلاق سے نہیں کر سکتے، تجربہ کی بات بتاتا ہوں کہ زمانہ اتنا جا بروجع ہوا ہے، اس کے تقاضے اتنے قابہر ہیں کہ اگر ان کے مقابلہ میں ایمان کی طاقت نہ ہو اور وہ نمونے آپ کے سامنے نہ ہوں جو سیرت کے اندر ہم کو ملتے ہیں تو ہم زمانہ کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

مسلمح مادیت کا مقابلہ:

ہماری نمازیں درست ہوں، یہ طاقت نمازوں سے پیدا ہوتی ہے، دعا سے پیدا ہوتی ہے، تلاوت سے پیدا ہوتی ہے، سجدوں سے مانوس ہونے سے پیدا ہوتی ہے، بندگان خدا کے پاؤں پیچنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ اس مسلمح مادیت کا مقابلہ کریں جس کو یورپ اور امریکہ نے اپنے بہترین اسلحہ سے مسلح کر رکھا ہے، اس کی ہر چیز اتنی بھانے والی ہے کہ بڑے بڑے شیروں کے پاؤں اکھڑ جائیں تو اس کا مقابلہ ہم محض تنظیم سے، محض اپنے ضابطہ اخلاق سے نہیں کر سکتے، اس کے لئے ہمارے اندر ایمانی طاقت ہونی چاہئے، تعلق مع اللہ ہونا چاہئے، اللہ کے ساتھ ایسا تعلق ہونا چاہئے، ہم کو ایک سجدہ نصیب ہو جائے جس کی زمین بھی تاب نہ لاسکتی:

وہ سجدہ روح زمیں جس سے کانپ جاتی تھی
اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب

روح زمیں کانپنے نہ کانپے، اپنا کلیجہ تو کانپ جائے، اپنا دل تو کانپ جائے، آنکھیں تو اشکبار ہو جائیں، یہ سجدہ جب آپ کو نصیب ہوگا تو آپ کو مادیت پر قابو ہوگا، اب جو دور ہے، اس کا مقابلہ کرنے کے لئے آپ کے اندر کی طاقت کی ضرورت ہے، آپ کے اندر وہ طاقت ہو، خدا کے نام سے محبت ہو، اس کے رسول ﷺ سے محبت ہو، سنتوں کا اہتمام اور اس کی عظمت آپ کے دل میں بیٹھی ہوئی ہو، سب کوتاہیاں ہوتی ہیں، لیکن اپنی کوتاہیوں کو آپ سمجھیں، ان پر اصرار کریں، ان کے لئے دلیلیں نہ دیں، بلکہ یہ آئیڈیل تو وہی ہے، اسوہ تو وہی ہے، کرنا تو ہم کو وہی ہے، خدا آپ کو توفیق دے گا اور یہ کوتاہیاں بھی معاف کر دے گا، بہت سی پیچیدہ اور نازک دور ہمارے اور آپ کے حصہ میں آیا ہے، اس میں اگر دین کے تقاضے پورے کئے اور

اسلام کے جھنڈے کو ہم نے سرنگوں ہونے نہیں دیا تو آپ کو جو بھی دنیا میں ملے گا وہ تو خیر ملے گا، لیکن آخرت میں جو کچھ ملے گا، اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

اسلام کے ہاتھ میں رہنمائی:

یہ بڑی قابل قدر بات ہے کہ نو جوانوں میں ایک نئی تحریک پیدا ہو رہی ہے، اور یہ بات محض اتفاق نہیں ہے، اس وقت لاہور میں آپ کو دیکھیں گراچی میں، میں نے دیکھا، مصر و شام میں دیکھا کہ نو جوانوں میں خاص طور سے دیورسی کے طلبہ اور انجینئرز تک اور میڈیکل کالج و غیرہ کے طلبہ میں جو اسلامی جذبہ موجزن ہے، وہ انیسویں کی بات ہے کہ بہت سی خالص دینی ورگہا ہوں کے طلبہ میں نہیں ہے، شام میں بالخصوص وہاں کی لڑکیوں میں جو یونیورسٹی اور کالجوں میں پڑھتی ہیں، خدا جانے کہاں سے یہ بات آئی ہے کہ کھل کر اسلام کی حمایت اور اس کے لئے ہر طرح کی قربانی برداشت کرتی ہیں۔ انہوں نے اصرار کیا کہ ہم شرعی پردے کے ساتھ پڑھیں گے، اگر آپ کو منظور ہو تو ہم داخلہ لیں گے، ورنہ داخلہ نہیں لیں گے۔ یہ اتفاقی بات نہیں ہے، پاکستان کے مخصوص حالات نے نو جوانوں میں ایک نیا رد عمل پیدا کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کو بھی منظور ہے اور اس پردے کے پیچھے کوئی اور طاقت کام کر رہی ہے، ورنہ یونیورسٹی کے نو جوانوں میں ایک نئی تحریک، ایک نیا جذبہ، ایک نیا جوش کہاں سے آتا، اب اللہ تعالیٰ کو یہ منظور ہے کہ مسلمان نو جوان سامنے آئیں اور زمام کار ان کے ہاتھ میں رہے جو انہم فتیہ امنوا برہم کے مصداق ہیں۔

اپنے محدود تجربہ کی روشنی میں چند اور باتیں بھی عرض کرنا چاہتا ہوں، ایک بات تو یہ ہے کہ آپ سیرت سازی کی کوشش کریں، اس کے بغیر کام نہیں چلتا، ہماری دینی دعوتوں میں سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ سیرت کی تعمیر نہیں ہوتی اور نو جوان اگلے مرحلہ پر جا کر پست ہو جاتے ہیں، سیرت کی تعمیر کتاب و سنت، اسوۂ رسول ﷺ کے ماتحت ہو تو پھر پائے ثبات میں لغزش نہیں آتی۔

اپنی فکر کیجئے:

دوسری بات یہ ہے کہ اپنی فکر کیجئے، اس زمانہ کا ایک عیب یہ بھی ہے کہ دوسروں کی فکر زیادہ

اپنی فکر کم ہوتی ہے، ہمارے اجتماعی فلسفہ اور سیاسیات نے یہ ذہن پیدا کیا ہے کہ آدمی کی نظر دوسروں کے عیوب پر پڑتی ہے، اس کا محاسبہ زیادہ تر دوسروں سے ہوتا ہے، فلاں پارٹی یہ کر رہی ہے، فلاں طبقہ یہ کر رہا ہے، فلاں شخص اپنی ذمہ داری پوری نہیں کر رہا ہے اور اس کو فرصت ہی نہیں ملتی کہ آدمی اپنا جائزہ لے اور دیکھے کہ ہم میں کیا نقص ہے؟

منفی حصہ مثبت حصہ سے بڑھنے نہ پائے:

تیسری بات یہ کہ منفی حصہ مثبت حصہ سے بڑھنے نہ پائے، تناسب سے دونوں چیزیں ہوں، آپ کا مزاج یہ نہ بن جائے کہ ہر چیز کو آپ ہمیشہ ناقدانہ دیکھیں، ہر طبقہ سے جہاں آپ دین پائیں، ان کے پاس بیٹھنے سے آپ کو محسوس ہو کہ ایمان بڑھتا ہے، ان کے پاس بیٹھ کر نمازوں کی طرف توجہ ہوتی ہے، نماز پڑھنے کا طریقہ آتا ہے، اس کو بھی بہت قیمت سمجھئے بلکہ نعمت سمجھئے اور یہ نہ سمجھئے کہ پورے دین و انسانوں نے سمجھا ہی نہیں، پورا دین تو یہ لے کر کھڑے نہیں ہوئے تو پھر ان کے پاس بیٹھنے سے کیا فائدہ ہے۔ نماز بھی بہت بڑی چیز ہے، آپ کو اگر نماز پڑھنی آجائے، روزہ رکھنا آجائے تو یہ کوئی معمولی بات نہیں، اسی سے پوری زندگی ڈھلتی ہے۔

اپنا مطالعہ وسیع کیجئے:

چوتھی بات یہ ہے کہ مطالعہ آپ وسیع بھی کیجئے اور عمیق بھی۔ آپ کے مطالعہ میں وسعت بھی ہونی چاہئے اور عمق بھی ہونا چاہئے۔ یعنی آپ اسلام کے اصل سرچشمہ سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کیجئے۔ آپ کو عربی زبان سے واقفیت کے بغیر ہم وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ یہ بات کس درجہ کی ہے، اس کے ساتھ ساتھ ہر قسم کا لٹریچر پڑھیں جس میں کوئی گمراہی کی بات نہ ہو، کوئی کجی نہ ہو، کسی ایک لٹریچر پر انحصار رکھنا صحیح نہیں ہے، ایک ماڈل جو مکمل ہے وہ صرف رسول اللہ ﷺ کا ماڈل ہے، کسی انسان کا ماڈل ایسا نہیں ہے جو سب سے مستغنی ہو، کسی کے متعلق یہ خیال نہیں ہونا چاہئے کہ یہ آخری ماڈل ہے، اس کے بعد کسی کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے، کسی لٹریچر پڑھنے کی ضرورت نہیں، تنگ نظری سے کم سے کم آپ کو کام نہیں لینا چاہئے۔

میرا ہمیشہ یہ ذوق رہا اور میں کہتا بھی رہتا ہوں کہ کتابوں کا تنوع ہونا چاہیے اور جو چیزیں آپتی ہوں ان کو دیکھنا چاہئے، البتہ اپنے ذہن میں یہ صلاحیت پیدا ہو کہ درجہ و پیمانہ میں اور اس کے اثرات و نتائج محسوس کر سکیں۔

میرے دل میں آپ کے لئے جگہ ہے

یہ بات پورے خلوص سے سمجھیں گے آپ سے کہ میں یہاں حاضر ہونا نہایت ہی
میل ہے کہ میرے دل میں آپ کے لیے لیا جلد سے؟ اور میں آپ کی قدر کرتا ہوں، حضرت
مرضی اللہ عنہ کا یہ کہنا مجھے اکثر یاد آتا ہے کہ ایک مرتبہ کئی جلیل القدر صحابی ایک جمعہ جمع تھے تو
حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ آج ہر شخص اپنی مادیات مانگ لے، خدا سے دعا کرے، جس جانی نے
کہا میرے پاس اتنا سونا ہو کہ میں خدائی راہ میں صرف کروں، کسی نے کہا مجھے بہت سی خوشی
ہو۔ وغیرہ۔ حضرت عمرؓ کی باری آئی تو کہا بھائی میرا تو یہ ہی چاہتا ہے کہ میرا احمد خالد اور ابو عبیدہ
اور فلان فلاں سے بھر رہا ہو اور میں ایک ایک وایک ایک محاذ پر بھیجوں اور ساری دنیا میں اسلام
پھیلاؤں، تو اس کی کس سے امید لی جا سکتی ہے؟ آپ ہی جیسے نوجوانوں سے۔

میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں، آپ کا شکریہ کہ مجھے آپ کے پاس آنے، خطاب کرنے اور ایک جگہ دیکھنے کی مسرت حاصل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو نظر بد سے بچائے۔ نظر بدہ خطائیں وسیع معنوں میں استعمال کر رہا ہوں۔ نظر بد کا بہت ہی وسیع مفہوم ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی نظر بد سے بھی بچائے اور دوسروں کی نظر بد سے بھی اللہ تعالیٰ آپ کی حفاظت فرمائے اور آپ دینی سلامتیوں کو بہترین مصرف پر صرف کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اخلاص، جذبہ قربانی اور جوہر ذاتی

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں حسب روایت طالبین الوداعی تقریب ۲۵ دسمبر ۱۹۶۳ء کو ہمایہ بال میں منعقد ہوئی۔ اس میں حضرت مولانا نے طلباء کے سامنے الوداعی تقریب اور وہ نعمات اور ثناء کا بیان کرتے ہوئے بعض باتوں پر تفصیلی تھیل فرمائی۔ اور مولانا نے ان کے سامنے بعض باتوں پر تفصیلی تھیل فرمائی۔ اور مولانا نے ان کے سامنے بعض باتوں پر تفصیلی تھیل فرمائی۔

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ اَدَارِعَد

میرے عزیز طلباء، ایسے موقعہ پر اگر آپ رنجیدہ ہیں تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں، یہ موقع ایسا ہے جو رنج و مسرت دونوں کا جامع ہے۔ لیکن وہ ماں قابل مبارکباد نہیں جو ہمیشہ اپنے بچے کو سینے سے لگائے رہے، اور آنکھوں سے اوجھل کرتے کے لئے تیار نہ ہو، بلکہ اس کا ایک وقت مقرر ہے، اس وقت تک وہ بچے کی پرورش کرتی ہے، پھر وہ اپنی ماں اس بچے کو اپنی آنکھوں سے اوجھل کر دیتی ہے، تاکہ وہ اس کی پیروی کے لئے سہارا بن سکے، اسی طرح آپ نے ایک مدت یہاں گزاری، اس میں آپ کا ہم سے مانوس ہونا یا ہمیں آپ سے انس ہونا بالکل قدرتی چیز ہے، اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات کے اندر انس پیدا کیا ہے، لیکن انسانوں کے اندر یہ جوہر بہت زیادہ نمایاں ہے، صرف لسانیت ہی نہیں نفسیات کے بھی بعض بڑے بڑے ماہروں کا یہ کہنا ہے کہ انسان کا لفظ اسی انس سے مشتق ہے، اس موقع پر یقیناً ہمیں اس حیثیت سے توجہ ہے کہ آپ ہم سے جدا ہو رہے ہیں، ہمارا آپ کا جو ایک ساتھ تھا، وہ چھوٹ رہا ہے، لیکن دوسری حیثیت سے ہمیں یہ مسرت ہے کہ آپ نے تعلیمی مدت حسن و خوبی کے ساتھ پوری کر لی، آپ نے اس زمانے میں جبکہ بالکل ہی مخالف ہیں، اور زمانے سے سکون و اطمینان رخصت ہو چکا ہے، دین کی تعلیم حاصل کی، اس حیثیت سے آپ قابل مبارکباد ہیں اور ہمیں اس پر دلی مسرت ہے۔

فراغت کا غلط تخیل:

لیکن ایسے موقع پر جب "فارغ" کا لفظ آتا ہے تو سوچتے ہیں کہ اس کا مفہوم سمجھنے میں لوٹ غلطی کریں، دارالعلوم کو ایک ایسی تعلیمی مدت تو کہتی ہی چاہئے تھی جس مدت وہ آپ ملے۔ اور اس مرحلے سے فارغ ہوتے، لیکن اس موقع پر جو اہم بات آپ سے منی ہے وہ یہ ہے کہ اگر آپ نے اس کا مفہوم یہ سمجھ لیا کہ ہم تعلیم سے فارغ ہو گئے، اب ہمیں تعلیم و تربیت کی کوئی ضرورت نہیں، تو بلا کسی حجاب کے اور تردد کے میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ آپ نے کچھ بھی نہیں سیکھا اور آپ کا ادارہ اپنے مقصد میں بالکل ناکام رہے اور ہم لوگ بالکل ناکام ہیں، لیکن جیسا کہ مجھے یقین ہے کہ آپ نے فارغ ہونے کا یہ مفہوم نہیں سمجھا۔ بعد فارغ ہونے کا مفہوم آپ کے نزدیک بھی یہ ہے کہ آپ اس قابل ہو گئے کہ کتابوں و ہاتھ کا سہیں اور سب ضرورت اس سے استفادہ کر سکیں، بلکہ یوں کہا جائے کہ آپ کو اب علم کے حاصل کرنے کی کتنی دے دی گئی تو زیادہ صحیح ہوگا، آپ اس کتنی کے ذریعہ ہر قفل کھول سکتے ہیں اور علم کے خزانے اپنے پاس جمع کر سکتے ہیں، آپ اس کتنی کو جتنا ہی استعمال کریں اسی قدر وہ کام دیتی چلی جائے گی۔

ہر نصاب کی ایک خصوصیت ہوتی ہے، اگر وہ نصاب اپنے فارغ شدہ طلباء کے اندر اس احساس کو پیدا کر دے یعنی جہل کا اعتراف، شاید یہ لفظ بعض کانوں کو نامانوس معلوم ہو، لیکن مجھے اس لفظ پر اصرار ہے، جسے لوگ ذوق علمی سے تعبیر کرتے ہیں، اگر آپ کے اندر یہ احساس پیدا ہو گیا ہے تو آپ کامیاب اور قابل مبارکباد ہیں اور میں آپ کے ادارے کو مبارکباد پیش کرتا ہوں، اس کے بعد اس مختصر وقت میں اپنے جانے والے بھائیوں کو میں صرف تین باتوں کی طرف متوجہ کرتا ہوں۔

اخلاص:

پہلی چیز اخلاص ہے، آپ کسی بڑے سے بڑے بزرگ یا جس کا نام آپ دنیا میں روشن کرتے ہیں، اگر آپ اس کی زندگی کا مطالعہ کریں گے تو اس کی زندگی کی تعمیر میں اخلاص کو ایک اہم عامل پائیں گے، آپ دیکھیں گے کہ اس کی ہر چیز و اخلاص نے دوام بخشا ہے، آپ ملا نظام الدین کو دیکھ لیجئے، جس کے درس نظامی کا سکھ صرف ہندو پاک ہی نہیں، اقصادی عالم میں

چل رہا ہے، اور حس کو باوجود کوششوں کے اپنی جگہ سے بلایا ہی نہیں جا۔ کا، محض ان کی علمیت کی بناء پر ایسا نہیں ہوا بلکہ ان کے ساتھیوں اور ان کے معاصرین میں بہت سے ایسے اشخاص تھے جو علم و فضل اور ذہانت و ذکاوت میں آکر بڑھے ہوئے نہیں تو ان کے ہم پندہ سرور رہے ہوں گے، لیکن کیا بات ہے کہ آج ملا نظام الدین تو زندہ جاوید ہیں، لیکن ان کے معاصرین کا تذکرہ اگر آتا ہے تو ان کے سلسلے ہی میں آتا ہے، اگر آپ غور کریں اور ان کی زندگی کا مطالعہ کریں تو اس کی پشت پر اخلاص کی وہ زبردست قوت کا فرمایا نہیں گے، جس نے ملا نظام الدین کو قیامت تک کے لئے زندہ جاوید بنادیا، بات صرف اتنی تھی کہ انہوں نے پڑھنے کے بعد یہ محسوس کر لیا کہ انہوں نے کچھ بھی نہیں سیکھا ہے، اور انہوں نے اپنے زمانے کے ایک ایسے امی شخص سے جو گوشہ کننامی میں اودھ کے ایک چھوٹے سے گمنام گاؤں ”بانسہ“ میں اخلاص کا سرمایہ لے کر پڑھا ہوا تھا، اپنے آپ کو متعلق کر لیا، اگر ملا نظام الدین چاہتے تو بہت سے ایسے بھی خدا کے بندے ان کو مل سکتے تھے جو اپنے وقت کے امام تصور کئے جاتے تھے، لیکن ملا نظام الدین نے اپنے آپ کو ایک ایسے شخص کے سپرد کیا جس کی شہرت اگر ہوئی تو ملا نظام الدین کے ذریعے سے ہوئی، بہر صورت اس کی اگر مثالیں دی جائیں تو سینکڑوں مثالیں ملیں گی۔

جذبہ قربانی:

دوسری بات جو ہمیں آپ سے کہنی ہے، وہ ایثار و قربانی ہے، ایثار و قربانی اور عزم یہ وہ طاقت ہے کہ اگر افراد میں ہوتی ہے تو انہیں شریا تک پہنچا دیتی ہے اور اگر کسی ادارہ یا قوم کے اندر پیدا ہو جاتی ہے تو دنیا اس کے سامنے جھک جاتی ہے اور اس کی بالا دستی کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔

جوہر ذاتی:

اس کے بعد جو تیسری بات ہے وہ جوہر ذاتی ہے، انسان کا ذاتی جوہر اور اس کی قابلیت ہی وہ چیز ہے، جو ہر وقت اور ہر زمانے میں اس کی ترقی کا واحد ذریعہ ہے، اگر آپ نے ان تینوں چیزوں یعنی اخلاص، جذبہ قربانی اور جوہر ذاتی کو حاصل کر لیا ہے، تو آپ کے لئے زمانہ بالکل نہیں بدلا ہے، اور ہر وقت آپ کے لئے چشم براہ ہے، لیکن ان صفات سے اگر کوئی خالی

ہے تو وہ جہاں بھی جائے گا اور جس جگہ کی بھی سند یا ڈگری اس کے پاس ہوگی، حالات کو بدلا ہوا اور اپنے مخالف پائے گا، پھر میں کہتا ہوں کہ اگر آپ نے یہ صفات اپنے اندر پیدا کر لیں تو آپ کے لئے عالمگیری کا زمانہ، نظام الملک طوسی کا زمانہ اور امام غزالی، امام رازی، امام ابن قیم اور امام ابن تیمیہ کا زمانہ آج بھی منتظر ہے، اور وہ آپ کے لئے واپس ہو سکتا ہے۔ یہ غلط ہے کہ زمانے میں کوئی جگہ خالی رہتی ہے، ابھی زمانے میں ایسا نہیں ہوا کہ کوئی جگہ پہلے سے خالی ہو اور کسی کی منتظر ہو کہ جب وہ شخص فارغ ہوگا تو اس کو وہ جگہ مل جائے گی۔ زمانہ بقائے اس صلیہ کا قائل ہے، وہ بہت ہی حساس اور نقاد ہے، وہ صالح کے بجائے اصلح اور نافع کے بجائے انفع کو ترجیح دیتا ہے۔ لہذا اگر آپ کے اندر یہ چیزیں ہیں تو ہر زمانہ آپ کا ہے، اور آپ کا منتظر ہے۔ زمانے کا شکوہ دراصل اپنی کمزوری چھپانے کی کوشش اور احساس کمتری کی علامت ہے، دنیا نہیں بدلی ہے ہم بدل گئے ہیں، زمانہ آج بھی وہی ہے، جو پہلے تھا، تبدیلی صرف ہمارے اندر پیدا ہوئی ہے۔

آخری بات:

اگر ہمارے سامنے یہ تصور اور یہ خیال نہ ہوتا تو یقیناً ہمارے لئے اس زمانے میں قطعاً یہ جائز نہ تھا کہ ہم کسی ایک مسلمان بچے کو اس کے ماں باپ سے الگ کر کے ایسی تعلیم دلاتے جس کی دنیا میں بظاہر کوئی قیمت نہیں، لیکن یہی تین باتیں ہیں، اخلاص، جذبہ قربانی اور جوہر ذاتی، جس کی وجہ سے ہم کو اس کا پورا پورا حق حاصل ہے، اور اس کا پورا پورا جواز بلکہ ضرورت ہے کہ صرف ایک دارالعلوم ندوۃ العلماء ہی نہیں ہندوستان میں دارالعلوم دیوبند، مظاہر العلوم سہارنپور، اور اس طرح کے جتنے بھی ادارے قائم ہیں، وہ قائم رہیں، اور ترقی کریں۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارے وہ طلباء جو ہم سے رخصت ہو رہے ہیں، وہ اپنی آنے والی زندگی میں ان اصولوں کو اپنائیں گے، اور وہ طلباء جنہیں ابھی موقع حاصل ہے اور وہ کچھ سال یہاں گذاریں گے، زیادہ سے زیادہ ان اصولوں سے فائدہ اٹھائیں گے، اس کے ساتھ ہمیں اپنے رخصت ہونے والے بھائیوں سے یہ امید ہے کہ وہ اپنے دارالعلوم سے ہر حال میں تعلق رکھیں گے، اور اس کو اپنا نصب العین بنائیں گے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

علماء اور تعلیم یافتہ طبقہ کی ذمہ داریاں

یہ تقریر جامع مسجد فیصل آباد میں ۲۲ جولائی ۱۹۷۸ء کو علماء و جدیدہ تعلیمی اداروں سے اساتذہ معززین شہر اور مختلف دینی، سیاسی، سماجی، علمی، ادبی اور صحافتی حلقوں سے ذمہ دار حضرات کے ایک مخصوص منتخب جلسہ میں کی گئی۔ مولانا مفتی سیاح الدین کاہنیل (رہنما اسلامی نوریاتی کونسل) نے غیر مقدمی تقریر فرمائی۔

الحمد لله وكفى وسلام على عباده الذين اصطفى. اما بعد:

حضرات علماء کرام اور اساتذہ مدارس و جامعات!

قبل اس کے کہ آپ حضرات سے کوئی تفصیلی اور معین بات کہوں، ایک اصولی اور اجمالی بات کرنا چاہتا ہوں۔

علماء اور تعلیم یافتہ طبقہ کی ذمہ داریاں:

اس وقت علماء اور تعلیم یافتہ طبقہ کی ذمہ داری بہت بڑھ گئی ہے، جب کسی دعوت یا کوشش کے ساتھ اعلیٰ طبقہ کے وہ لوگ جو ذہین اور صاحب فکر سمجھے جاتے ہیں اور جو دین کا گہرا علم رکھتے ہیں تو اس میں سنجیدگی، گہرائی اور پختگی ہوتی ہے اور اس کے بارے میں یہ امید ہوتی ہے کہ وہ کسی غلط راستے پر نہیں پڑے گی۔ اس تحریک میں جذباتیت نہیں ہوگی، اس میں عامیانہ اور تبذل انداز نہیں ہوگا۔ اس وقت عالم اسلام میں علماء کی اور دینی جماعتوں اور قائدین کی ذمہ داری بہت بڑھ گئی ہے۔ یہ ذمہ داری ہر زمانے میں زیادہ رہی ہے۔ لیکن اس زمانے میں وہ خاص طور پر بہت عظیم بن گئی ہے کہ وہ صحیح رہنمائی کریں گے اور تحریک دعوت اور جدوجہد کو سطحیت سے بچائیں گے، اس کے متعلق یہ تصور اور یہ تاثر قائم ہونے نہ دیں گے کہ دریا کا حباب ہے، بلکہ اس کے متعلق یہ تاثر دیں گے کہ اس کی جڑیں گہری اور علم و دین کی زمین میں پیوست ہیں۔

مسلم حکومتوں میں علماء کا کارنامہ:

خلافت نبی امیہ، خلافت نبی عباسی، پشت پر اسلام، مجتہدین نہ ہوتے تو اسلام یہ حیثیت نظام حیات کے ایک مرتبہ و مدون قانون کی شکل میں موجود نہ ہوتا۔

تاریخ میں ان لوگوں کی خدمات و سرابا جاتا ہے جو ملک فتح کرتے ہیں۔ ہمارے بڑے بڑے قائدین طارق بن زیاد، محمد بن قاسم، عقبہ بن نافع، موسیٰ بن نصیر وغیرہ حضرات کی خدمات روز روشن کی طرح تابناک ہیں، لیکن جو لوگ مفتوحہ ممالک میں اللہ کے قانون کو رائج کرتے تھے اور وہاں کی مشکلات و مسائل کو حل کرتے تھے وہاں کی پیش آمدہ ضروریات کی تکمیل کرتے تھے، نئے نئے حالات جو پیدا ہوتے تھے ان میں رہنمائی کرتے تھے، ان کی خدمات کو بہت کم لوگ جانتے ہیں، حالانکہ اگر ائمہ مجتہدین، محدثین، عظام، اس زمانہ میں نہ محنت کرتے اور ان کا دماغ اس تلوار کے پیچھے نہ ہوتا جو ملک کو فتح کرتی تھی اور اس حکومت کے پیچھے نہ ہوتا جو ملک میں نظم و نسق قائم کرتی تھی تو یہ سب کوششیں فتوحات اور سلطنتیں بالکل کھو چکی تھیں۔

مسلمانوں کے فاتح اسلام کے مفتوح:

مثال کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ تاتاریوں نے عالم اسلام کو زیر و زبر کر دیا، عالم اسلام کی چولیس بلادیں، اس وقت مسلمانوں سے زیادہ کوئی ذلیل کوئی نہیں تھا۔ آپ اس زمانہ کی تصاویر دیکھیں جو آثار قدیمہ میں ملتی ہیں تو اس سے اندازہ ہوگا کہ کسی مسلمان کی واڑھی کسی گھوڑے کی دم سے بندھی ہے اور ایک تاتاری اسے کھینچنے لگے جا رہا ہے، دنیا کی ہر قوم ان کی نگاہ میں عزت رکھتی ہے لیکن مسلمانوں سے زیادہ کوئی ذلیل نہ تھا اور خاص طور پر اس خطہ زمین کے مسلمان جو مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت کا مرکز رہ چکا تھا۔ یعنی ایران اور ماوراء النہر کا علاقہ جو آخر میں فقہ کا (خاص طور پر فقہ حنفی) کا مرکز رہا ہے، لیکن آپ حضرات اس سے واقف ہیں کہ وہی تاتاری جو مسلمانوں کے فاتح تھے، اسلام کے مفتوح بن گئے اور جن کو مسلمانوں کی تلوار شکست نہ دے سکی، ان کو مسلمانوں کی تہذیب نے، مسلمانوں کی ثقافت نے، مسلمان کے علم نے تسخیر کر لیا اور ان کو اپنے بے دام غلام بنالیا۔ بات یہ تھی کہ تاتاریوں کے پاس کوئی علمی ذخیرہ، کوئی شائستہ تہذیب اور کوئی مرتب و وسیع قانون نہ تھا، ان کا ایک سیدھا سادہ روایتی قانون تھا جو قبائلی

زندگی میں رائج تھا اور کوہ قراقرم اور اس کے اطراف میں اس کا مثل دخل تھا۔ نیم وحشی اقوام میں جیسے ”عرف“ ہوتے ہیں، وہ ویسے تھے، ان کے پاس کوئی آئین، کوئی تہذیب، کوئی لٹریچر نہیں تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو مسلمان علماء اور دانشوروں کی ضرورت پڑی۔ مسلمان علماء اور دانشور جب ان کے دربار میں پہنچے تو ان کی علمیت کا، ان کی ذہانت کا سکہ ان کے دلوں پر بیٹھ گیا۔ اسلامی تہذیب نے ان کو اپنا گرویدہ بنا لیا، نتیجہ یہ ہوا کہ تاریخی من حیث القوم مسلمان ہو گئے۔ مسلمان چونکہ صاحب دماغ تھے، ان کے پاس ذہانت کے سرچشمے تھے، ترقی یافتہ تہذیب تھی، ایک وسیع ثقافت اور علمی ذخیرہ تھا، وہ آئین سازی کا تجربہ رکھتے تھے، تمدنی مشاہدات و مسائل کو حل کر سکتے تھے، تاتاریوں کو ان کی ضرورت پیش آئی، فلسفہ تاریخ کا یہ ایک اہم اصول ہے کہ جنگی طاقت اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک اس کے پیچھے دماغ نہ ہو، آئین سازی کی طاقت نہ ہو اور کوئی منظم ادارہ نہ ہو۔

یہ دین جہالت سے نہیں بلکہ علم سے پیدا ہوا ہے:

عصر جدید میں عالم اسلام کے علماء جامعات کے اساتذہ اور پروفیسر صاحبان اور ہمارے قانون دان اور ہمارے ادیب و دانشور طبقہ کی ایک ذمہ داری تو یہ ہے کہ وہ یہ ثابت کریں کہ یہ دین جہالت کے لطن سے اور فوجی طاقت سے نہیں پیدا ہوا ہے، معرفت سے پیدا ہوا ہے، اللہ کی رہنمائی سے پیدا ہوا ہے، وحی سے پیدا ہوا ہے، یہ زمانے کا ساتھ دے سکتا ہے، یہ تمدن کی رہنمائی کر سکتا ہے، اس کی نگرانی کر سکتا ہے کہ یہ تمدنی بے راہ نہ ہونے پائے، فاسد نہ ہونے پائے، تخریبی راستہ اختیار نہ کرنے پائے، یہ تاثیر علماء دین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ ہی دے سکتا ہے اور یہ بڑی ذمہ داری ہے، اگر کسی دین یا کسی قوم کے متعلق یہ خیال قائم ہو جائے کہ اس کا علم کے ساتھ کوئی جوڑ نہیں ہے بلکہ علم سے اس کو نقصان پہنچتا ہے اور جہالت سے اس کو فائدہ تو خواہ تھوڑے عرصے کے لئے اپنے زور و شمشیر، اپنے بازو سے وہ دعوت یا جماعت یا قوم دنیا کے کسی حصے پر قبضہ کر لے، لیکن دماغوں پر اس کا قبضہ نہیں ہو سکتا، سب یہی خیال کریں گے کہ اس کو زندہ رہنے کے لئے جہالت کی تاریکی چاہئے، جب تک وہ تاریکی رہے گی، وہ زندہ رہے گا اور جب علم آئے گا وہ غائب ہو جائے گا، اس کا پردہ چاک ہو جائے گا اور جس طرح

بدنی آفتاب کی روشنی سے چھٹ جاتی ہے۔ اسی طرح وہ چھٹ جائے گا، عیسائیت کا معاملہ یہی ہوا، عیسائیت نے علم کا ساتھ نہیں دیا، عیسائیت ایک خاص روحانی تحریک اور ایک معاشرتی انقلاب کے طور پر قیام پائی۔ حضرت مسیح علیہ السلام کا یہ تک زمانہ، وہاں کی مقبولیت، ان کا تقدس، ان کی روحانی طاقت، رہنمائی مرقی رہی۔ لیکن اس سے بعد پھر اس کو ایک زمانہ تک ذہین اور صاحب نظر لوگوں کا تعاون حاصل نہ ہوا، پھر جب مسیحیت یورپ میں پہنچی تو سمجھا گیا کہ یہ زندگی کا ساتھ نہیں دے سکتی، اس لئے زندگی سے اس کو علیحدہ کر لینا چاہئے۔

عیسائیت مستقل شریعت نہیں رکھتی تھی:

یورپ اس وقت ترقی کر رہا تھا، یورپ کے اندر ترقی کی طاقتیں اور ولولے جوش مار رہے تھے، یورپ میں تنازع لابقاء کے لئے سخت کشمکش تھی، ان کی پلک ذرا جھپک جاتی تو یہ قوم کی قوم بالکل مغلوب ہو جاتی، عیسائیت جو ابھی بالکل اپنے دور طفولیت میں تھی، جس کی ابھی نہ تدوین تھی نہ تشریح، نہ ان کے پاس آئین تھا، آئین میں وہ سارا انحصار یہودیت پر کرتی تھی۔ مسیحیت اپنے ساتھ کوئی مستقل شریعت نہیں رکھتی تھی، شریعت موسوی تھی، جس میں جزوی تبدیلی کی گئی تھی، ولا حل لکم بعض الذی حرم علیکم کہا گیا ہے، یہ نہیں کہا گیا ہے کہ میں تمہارے لئے مستقل شریعت لے کر آیا تو جو چیزیں یہودیت میں غلط طور پر داخل ہو گئی تھیں، مسیحیت ان کی اصلاح کرتی تھی، ان کے پاس مستقل کوئی آئین نہیں تھا اور ان کا زیادہ تر زور رحم پر، محبت پر، انسان دوستی پر، مظلوموں پر شفقت پر، اجارہ داری اور اس کے غرور کو ختم کرنے پر تھا، جب یورپ جیسے بے چین ملک اور وہاں کی بے چین قوموں میں جو زندگی کے لئے دوڑ رہی تھیں مچل رہی تھیں، عیسائیت پہنچی تو یہ حقیقت بہت جلد منکشف ہو گئی کہ عیسائیت بدلتے ہوئے زمانہ، دوڑتے ہوئے معاشرے اور ابلتے ہوئے علم کا ساتھ نہیں دے سکتی، اس وقت مسیحی علماء کی بہت بڑی ذمہ داری تھی کہ وہ مسیحیت کی افادیت کو ثابت کرتے اور رہنما اصول دیتے، زمانہ کے جائز تقاضوں اور فطرت انسانی کی جائز خواہشات کو قبول کرتے اور کہتے کہ یہ ٹھیک ہے، لیکن اس کے ساتھ مذہب کی ہدایت اور نگہبانی چاہئے، یہ انہوں نے نہیں کیا، وہ دوڑ رہے تھے، حاکمانہ گروہ نے مسیحیت کو بس عقیدہ کے طور پر تسلیم کیا اور باقی

زندگی کو، آئین کو، آئین سازی کو کھلی چھوٹ دے دی، دوسرا طبقہ علماء کا تھا۔ انہوں نے مخالفت شروع کر دی اور کہا ترقی ضروری نہیں ہے، بلکہ ترقی زندگی سے فرار میں ہے، کلیساؤں میں جانے میں، جنگلوں میں چھپ جانے میں، شادی نہ کرنے میں، ازدواجی زندگی سے منہ موڑ لینے میں، عورت کے سایہ سے بھاگنے میں ہے، اور اس میں روحانیت کا بچاؤ ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں طبقوں نے عیسائیت کو فائدہ پہنچانے کے بجائے نقصان پہنچایا، جو حاکم طبقہ تھا، اس نے آزادی کے ساتھ اپنے تمدن کا ڈھانچہ بنانا شروع کیا، لوگوں کو غلام بنانا شروع کیا جو مسیحیت کی تعلیم کے خلاف تھا، اس نے مسیحیت کو بدنام کیا، سینٹ پال کے زمانہ سے یہ سلسلہ شروع ہوا اور یہ تقریباً چوتھی صدی عیسوی سے آج تک جاری ہے، یورپ اسی راستے پر گامزن ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے کلیسا سے رشتہ توڑ لیا، کلیسا اور ریاست میں ہمیشہ کے لئے جدائی ہو گئی اور عیسائیت سمٹتے سمٹتے ایک نقطہ ہو گئی۔

اسلام اور علم کا چولی دامن کا ساتھ ہے:

یہ غلطی عالم اسلام میں الحمد للہ نہیں ہونے پائی، اس لئے کہ شروع سے اسلام اور علم کا چولی دامن کا ساتھ تھا۔ میں نے کراچی یونیورسٹی میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ جس کی پہلی وحی ”اقراء“ کے لفظ سے شروع ہوئی ہو اور جس کی پہلی وحی میں قلم کو فراموش نہ کیا گیا ہو وہ علم اور قلم کا ساتھ کیسے چھوڑ سکتا ہے؟ اسلام میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا ہے کہ دین و علم میں کبھی بھی دوری ہوگی، اس لئے کہ اسلام اور علم کا شروع سے ساتھ رہا ہے، جب بدر کے قریشی قیدی مدینہ پہنچے تو ان میں کئی ایسے تھے کہ وہ قیدیہ ادا کر کے رہائی نہیں حاصل کر سکتے تھے، ان کا قیدیہ یہ مقرر کیا گیا کہ ہر شخص انصار یوں اور مہاجرین کے دس دس بچوں کو پڑھنا لکھنا سکھا دے۔

اسلام زمانہ کا رفیق ہی نہیں بلکہ راہنما ہے:

اس وقت عالم اسلام میں اہل عرب کی سب سے بڑی ذمہ داری یہ تھی کہ یہ تاثر نو جوان طبقہ میں نہ آنے پائے کہ اسلام محض طاقت اور حکومت کے بل پر قائم رہ سکتا ہے، وہ زمانہ کی تبدیلیوں اور علم و فن کی ترقیوں کا ساتھ نہیں دے سکتا، وہ اس زمانہ میں چلنے والی چیز نہیں، وہ ابتدائی، سادہ اور محدود زمانہ کا ساتھ دے سکتا تھا، جب انسانیت عہد طفولیت میں تھی، لیکن اس

پرتیق، ترقی یافتہ اور وسیع تمدن کے دور میں اسلام زندگی کا ساتھ نہیں دے سکتا، سب سے بڑی خدمت علما کی یہ تھی کہ اسلامی ملکوں میں اس پیلیج کو قبول کرتے اور اپنی ذہانت سے، کھرے مٹا دے، اصول فقہ سے کام لیتے کی صلاحیت سے، کتاب و سنت کے ان ازلی اور افغانی اصولوں کی مدد سے جو زمانہ میں اس اسلامی رہنمائی پرستے ہیں، اس تمدن و اسلام سے اس وقت کے مطابق رکھنے کی کوشش کرتے، ان میں اگر کسی ملک میں وہ رائج بھی چھٹی ہوئی ہو، نتیجہ میں جو ہو سکتا ہے وہ بعملی اور شریعت کے خلاف زندگی ہے، اور بڑے سے بڑا نقصان جو ہو سکتا ہے وہ الحاد اور دین سے نفرت ہے۔ کسی اسلامی ملک میں آپ دیکھیں کہ دو سالہ نتیجہ ظاہر ہوا اور کسی اسلامی ملک میں دیکھیں کہ پہلا نتیجہ ظاہر ہوا، حالانکہ دونوں نتیجہ اسلام کے حق میں عمیقاً قائل ہیں، سب سے بڑا کام اس وقت یہ ہے کہ ہم یہ ثابت کریں کہ اسلام اپنی اپنی روح اور مقصد کے ساتھ یہ نہیں اصولوں کے ساتھ زندگی کا نہ صرف ساتھ دے سکتا ہے بلکہ رہنمائی کر سکتا ہے، ساتھ دین تو میں نے علی السبیل التزلزل کہا، وہ تو جہت ہی صحیح رہا ہے، یہ اسلام کی کوئی تعریف نہیں ہے کہ وہ زندگی کا ساتھ دے سکتا ہے، نہیں بلکہ وہ غنی زندگی کی رہنمائی کر سکتا ہے، اس کو خطوں سے صرف وہی بچا سکتا ہے اور وہ تمدن صحیح انسانی تمدن نہیں اور وہ ریاست معتدل اور محفوظ ریاست نہیں جو اسلام کے اصولوں سے ہٹ جائے، یہ ثابت کرتا ہے کہ اس بڑا فرقہ بندی ہے۔

اسلام کو ہر مفاد پر ترجیح دیتے ہیں:

علما، اور دانشوروں کا دوسرا فریضہ یہ ہے کہ اسلام کے مفاد کو ہر جماعت، ہر ادارہ، ہر مدرسہ اور ہر گروہ کے مفاد پر ترجیح دیں، میں آپ سے صاف کہتا ہوں کہ اگر ہمیں معلوم ہو کہ سب جماعتوں کو منادینا پڑے گا، سارے نشانوں کو نکال دینا پڑے گا، سارے ناموں کو ختم کر دینا پڑے گا، سارے بورڈوں کو ہٹا دینا پڑے گا اور اسلام اس ملک میں غالب رہے گا تو ہمیں ایک منہ بھی اس میں پس و پیش نہیں ہونا چاہئے۔ ہمیں دین و ملت کا مفاد ہر جماعت سے عزیز ہونا چاہئے، سہرا کسی کے سر بندھے، سہرا ہونا چاہئے، حضور ﷺ کا معجزہ یہ تھا کہ صحابہ کرام کے دل سے یہ شوق نکل گیا تھا کہ ان کا کارنامہ سمجھا جائے۔

بخاری کی روایت ہے کہ حضرت ابو موسیٰ اشعرنی نے ایک مجلس میں واقعہ کے طور پر ذکر کیا

کہ ہم لوگ ایک غزوہ میں گئے تھے، وہاں ہمارے پاؤں میں چھالے پڑ گئے تھے، ہم نے چیتھرے لپیٹ لئے، اسی وجہ سے وہ غزوہ ذات الرقاع کہلاتا ہے، یہ کہنے کے بعد ان کو ایک دم یہ احساس ہوا کہ میں نے یہ کیوں کہا، کہیں میرا یہ عمل باطل نہ ہو گیا ہو، کہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ نہ کہہ دیا جائے کہ لوگوں نے سن لیا اور بڑا مجاہد سمجھا، یہ کافی ہے، اب ہم سے یہ لینے آئے ہو؟ تو بخاری شریف میں خاص طور سے ہے کہ انہوں نے کہا کاش میں یہ نہ بتا، ان کو اس کا افسوس رہا، آج اس پر زیادہ زور ہے کہ یہ کارنامہ کس طرف منسوب ہوگا، ایک صاحب تھے غازی محمود دھرم پال، آپ ہی کے پنجاب کے، مجھے ان کا ایک لطیفہ یاد آ گیا، ایک تقریر میں کہنے لگے اخباروں میں چھپتا ہے کہ فلاں آدمی فلاں صاحب کے دست حق پرست پر اسلام لایا، کہ اس کے اسلام قبول کرنے کے ساتھ ان کے دست حق پرست کی بھی شہرت ہو جائے، حالانکہ دست حق پرست کی شہرت زیادہ منظور ہے۔ قبول اسلام کی شہرت ہو یا نہ ہو، یہاں تک کہ انش و کو میں نے دیکھا ہے کہ کسی بڑے آدمی کا جنازہ ہوتا ہے، لپک کر پہنچ جاتے ہیں جنازہ کی نماز پڑھانے کے لئے، اس لئے کہ اخبار میں کل یہ خبر چھپ جائے گی، یہ جذبہ بڑا نقصان پہنچاتا ہے، دیکھئے جب کسی کا عزیز جان بلب ہوتا ہے تو اس کے عزیزوں میں کسی کو یہ خیال نہیں ہوتا کہ تعریف کس کی ہو، سب کی یہ تمنا ہوتی ہے کہ ہمارا مریض بچ جائے، حکیم کے سرمہ را بندھے یا ڈاکٹر کے، تو اس وقت عالم اسلام بیمار ہے، آپ کا ملک بیمار ہے، آپ اس وقت بھول جائیے کہ کس کے حساب میں لکھا جائے گا اور تاریخ میں لکھنے والے کیا لکھیں گے کہ اس ملک کو سب سے زیادہ نفع فلاں ادارہ، فلاں جماعت سے پہنچا اور اس میں سب سے بڑا حصہ ان کا تھا۔ تاتاریوں کے بارے میں آج تک یہ ثابت نہ ہو سکا کہ ان کو مسلمان کرنے میں سب سے بڑا حصہ کس کا تھا، اس لئے کہ ان مخلصین نے جنہوں نے یہ خدمت انجام دی تھی اپنے کو اتنا چھپایا کہ تاریخ کی باریک بین نگاہ بھی ان کو نہیں دیکھ سکی۔

اس وقت جو لڑائی لڑی جا رہی ہے، اس ملک کو اسلامی آئین دینے کی، اسلامی معاشرت و تمدن میں ڈھالنے کی اور یہاں سے ان خرابیوں کو دور کرنے کی جو مغربی تمدن نے اور ہمارے سیاستدانوں نے داخل کر دی ہیں، اس لڑائی میں فوج کے ادنیٰ سپاہی بن جائیں، خالص اللہ کی رضا کے لئے کام کیجئے، اللہ کے یہاں آپ کا نام اس کے نورانی دفتر میں لکھا جائے گا، یہاں ہوا

تو کیا اور نہ ہوا تو کیا، اس وقت لڑائی کسی مکتب خیال کی نہیں ہے، اس وقت لڑائی اسلام اور غیر اسلام کی ہے، اس طرح سمجھئے کہ ایک مسجد تعمیر ہو رہی ہے اس میں جو بھی شریک ہو جائے سب اجر میں شریک ہوں گے، اس میں یہ کس کا کتنا حصہ ہے اور کس کا نام پہلے ہے اور کس کا نام بعد میں ہے، یہ نہیں ہونا چاہئے، اس جذبہ کو جہاں تک ہو سکے مغلوب کرنا چاہئے، اپنے اپنے مسلک پر پورے طور پر قائم رہنا چاہئے، جسے ہم حق سمجھتے ہیں، اس کو حق سمجھنا چاہئے، اس سے بٹنے کی ضرورت نہیں، سودا کرنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن سب دعوت اسلامی کا محاذ اور اسلامی زندگی پیدا کرنے کا محاذ بنائیں، اس ملک میں اسلامی زندگی پیدا ہو اور وہ آنکھوں سے دیکھی جاسکے اور یہ ملک دوسروں کے لئے نمونہ بنے۔

ایثار و قربانی:

تیسری بات یہ ہے کہ ہم جتنا بھی ہو سکے ایثار سے کام لیں اور باہمی نزاع سے پرہیز کریں، ہماری زندگی جتنی سادہ ہوگی، ہماری زندگی میں جتنی قربانی ہوگی، اتنا ہی اثر پڑے گا، اتنا ہی بہتر نتیجہ نکلے گا، سب سے خطرناک بات آپس کی نزاع ہے، ہماری آپس کی دینی مباحث کا میدان اور ہے، اس کے کہنے کا موقع اور ہے، حضرت مجدد الف ثانیؒ نے مکتوبات میں لکھا ہے کہ اکبر اس لئے دین سے متنفر ہوا کہ اس نے علماء کو مرغیوں کی طرح لڑتے دیکھا، اگر کوئی مسئلہ چھیڑتا تو ان میں آپس میں اتنی تیز بحث ہوتی اور ہر ایک دوسرے پر اپنا تفوق اس طرح ظاہر کرنے کی کوشش کرتا جیسا کہ پکے دنیا والے اور جاہ طلب کرتے ہیں، اکبر نے سوچا کہ یہ کیسے لوگ ہیں، یہ ہمارے وزراء، ارکان سلطنت اور خالص دنیا دار لوگ بھی اس سطح پر نہیں آتے، جب حضرت مجدد صاحبؒ کو یہ معلوم ہوا کہ جہانگیر کا ارادہ ہے کہ وہ چند علماء کو اپنے دربار میں مشورہ کرنے کے لئے رکھے تو انہوں نے نواب سید فرید کو خط لکھا کہ خبردار خبردار! بادشاہ کو رائے دو کہ مخلص اور حقانی عالم صرف ایک آدمی کو رکھے، یہ مجدد صاحب کی فراست ایمانی تھی جو انہوں نے اس بات کو سمجھا، میں نہیں کہتا کہ ہر موقع اور مجلس میں صرف ایک ہی عالم رہے، لیکن میں کہتا ہوں کہ علماء کے آپس کے نزاعات اور بحث اور نفی کرنے سے اور ایک دوسرے کی تذلیل کرنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے۔

خطرے کے اظہار کرنے کا بہر حال ہر شخص کو حق ہے، ایک بچہ بھی خطرہ کا اظہار کر سکتا

ہے کہ یہ دروازہ کھلا رہ گیا ہے، چور نہ آ جائے، اس طرح میں یہ دو تین چیزیں آپ سے کہتا ہوں کہ ایک تو آپ جدید تعلیم یافتہ طبقے کو یہ تاثر لینے دیں کہ کتاب و سنت اور اس کی تشریحات میں فقہ کا اصول اور فقہ کا جو ذخیرہ ہے وہ موجودہ تمدن کا ساتھ نہیں دے سکتا، موجودہ مسائل حل نہیں کر سکتا، یہ خیال بڑا خطرناک ہے، یہ الحاد تک پہنچا سکتا ہے، دوسری بات یہ ہے کہ آپ عمل سے عوام پر اور خواص پر جو حکومت میں ہیں یہ تاثر دیں کہ آپ کی سطح بلند ہے عوام کی سطح سے، آپ کی زندگی میں سادگی نظر آئے، وہ دیکھیں کہ آپ تھوڑی چیز پر قناعت کر رہے ہیں یہ نہیں کہ آپ چاہیں کہ آپ کی بڑی بڑی تنخواہیں ہوں اور گریڈ ہوں اور جو تنخواہیں وزراء، کونسلر ہیں اور ان کو جو فوائد اور مواقع حاصل ہیں وہ ہم کو بھی حاصل ہوں، ہماری کیڈلک کار ہو، ہمارے پاس بھی کوئی ہو اور وہ کسی وزیر کی کوٹھی سے کم نہ ہو، بلکہ صاف صاف میں یہ کہوں گا کوئی بوریہ نشین ہو تو زیادہ کام کر سکتا ہے، اس لئے کہ یہ طبقہ اسی کے سامنے جھکتا ہے، میں یہ نہیں کہتا کہ کوئی بہ تکلف بوریہ نشین بنے، میں اس کی تعلیم نہیں دیتا، لیکن یہ واقعہ ہے، یہ طبقہ اسی کے سامنے آ کر جھکتا ہے اور مانتا ہے جس کو سب سے زیادہ بے نیاز دیکھتا ہے۔ حضرت مجدد کے سامنے وقت کے شہنشاہ کیوں جھکے؟ اس لئے کہ یہ اللہ کا بندہ نہ کبھی کسی کی سفارش کرتا ہے اور نہ کبھی دربار میں آتا ہے، بیٹھا اللہ اللہ کرتا ہے۔ بیٹھے بیٹھے مشورہ دیتا ہے، ہمارے تمام مشائخ نے یہی کیا، کبھی بادشاہوں کے قریب نہیں گئے مگر دور سے نگرانی کرتے رہے، حکومت کو اچھے آدمی دیتے رہے، دعا کرتے رہے، ان کے حق میں، مشورہ دیتے رہے، لیکن وہ کہتے تھے کہ آگ کو دور سے تاپو تب تو ٹھیک ہے، اگر ہاتھ ڈال دو گے تو جل جاؤ گے۔

یہ چند باتیں ہیں جو میں نے مختلف موقعوں پر عرض کی ہیں، سب کا ماحصل یہی ہے کہ اس وقت بڑا امتحان ہے ہمارا، پھر عالم اسلام کا امتحان ہے، ہمیں اپنی صلاحیت کا ثبوت دینا چاہئے، کہیں ہماری صلاحیت کی کمی سے اسلام کو نقصان نہ پہنچ جائے، کوئی یہ نہ کہے اور لکھے کہ علماء کی عدم صلاحیت سے یہ ہوا۔ میں اتنی باتیں بہت معذرت کے ساتھ آپ کی خدمت میں عرض کرتا ہوں..... اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو اس کی توفیق و طافرمائے۔

اسلام اور علم کا دائمی رشتہ

۲۵ نومبر ۱۹۸۳ء کو مدرسہ مطبع العلوم البین (ہندوستان) کی جدید مارت کے سنگ بنیادی کے
مقتضیٰ نئی تقریر

بحمدہ وتصلی علی رسولہ الکریم اما بعد واما کان المومنین
لینفرواکافہ ، فلول انفرمن کل فرقة منهم طائفة لیفقہوا فی الدین
ولیندروا قومہم اذ ارجعوا الیہم لعلہم یحذرون۔

اور یہ تو نہیں سکتا کہ مومن سب کے سب نکل آ میں تو یوں کیوں نہ کیا کہ ہر ایک
جماعت میں سے چند اشخاص نکل جاتے تاکہ دین (کامم سمیختے اور اس) میں سمجھ پیدا کرتے،
اور جب اپنی قوم کی طرف واپس آتے تو ان کو درس دیتے تاکہ وہ حذر کرتے۔

میرے عزیزو، بھائیو! اور دوستو ابھی آپ نے مولانا برہان الدین صاحب استاد انیسویں
دارالعلوم ندوۃ العلماء کی بڑی جامع مانع تقریر سننے میں بھی اس سے استفادہ کر رہا تھا۔ علما کا اصل
منصب کیا ہے؟ وہ نائبین نبی ہیں،، اور نبوت کے فرائض یا اس کے منصبی کام اور اس کے شعبے کیا
کیا ہیں؟ وہ انہوں نے شرح و بسط کے ساتھ بیان کئے تلاوت کتاب، پھر تعلیم کتاب، تعلیم
حکمت بعض حضرات نے اس کو الگ الگ شمار کیا اور پھر ترکیب، اس پر انہوں نے بڑے مناسب
طریقہ سے روشنی ڈالی۔

اسلام اور علم کا رابطہ

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کا اور مہم کا چوٹی دامن کا ساتھ ہے، اسلام علم کے بغیر نہیں رہ
سکتا، واقعہ تو یہ ہے کہ علم بھی اسلام کے بغیر نہیں رہ سکتا لیکن یہ کسی اور مجلس میں شرح و بسط کے
ساتھ کہنے کی بات ہے وہ علم علم ہی نہیں جو وحی کی سرپرستی اور وحی کی رہنمائی بلکہ وحی اور علوم نبوت
کی انگلی پکڑ کر کے نہ چلے اور جن پر وحی کی مہر تصدیق ثبت نہ ہو، اور جو وحی اللہ تبارک و تعالیٰ کے
بھیجے ہوئے و اس کی نازل کی ہوئی کتابوں کی سرپرستی میں، اتالیقی میں، نگرانی میں، رہنمائی
میں نہ ہو، وہ علم علم نہیں۔

ع علم کے رشتہ کی نمائندگی جہالت است

اس وقت ہمارا آپ کا موضوع ہے کہ اسلام بغیر علم کے نہیں رہ سکتا، اس کی مثال ہا اکل ایسی ہے جسے آپ مچھلی کو پانی سے نکال دیجئے تو اس کا دم گھٹنے لگتا ہے اور وہ مر جاتی ہے، تو اسی طریقہ سے اسلام کے لئے علم ضروری ہے، خدا کی صحیح معرفت ہو اس کی ذات و صفات کی صحیح معرفت ہو، اس کا بندوں کے ساتھ کیا تعلق ہے، بندوں کا اس کے ساتھ کیا تعلق ہونا چاہئے، زندگی کا مقصد کیا ہے؟ آغاز کیا ہے انجام کیا ہے؟ ابتداء کیا ہے انتہا کیا ہے؟ انسان کہاں سے آیا کیوں آیا، کہاں اس کو جانا ہے اور کچھ کیا ہونا ہے اس سب کا علم ہونا ضروری ہے، اسی لئے اسلام علم کو چاہتا ہے وہ علم کو ضروری قرار دیتا ہے۔

پہلی وحی میں علم و قلم کا تذکرہ

پہلی وحی جو رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر غار حرا میں نازل ہوئی اور سینکڑوں برس کے بعد آسمان و زمین کا پہلی مرتبہ جو رشتہ قائم ہوتا ہے، زمین کیلئے کچھ لینے کیلئے اور آسمان کیلئے کچھ دینے کیلئے برسوں کے بعد دو چھڑے ہوئے ملتے ہیں وہ ایک دوسرے کو کیا کیا فغاں و فریاد، شکایتیں اور حکایتیں سناتے ہیں لیکن اس وقت جو یہ دو چھڑے ہوئے ملے تو آسمان سے اس نبی کو جس کو زمین والوں کا رشتہ اللہ سے جوڑنا تھا، سب سے پہلا پیغام ”اقراء“ کی شکل میں ملا، اس سے آپ علم و قلم کی اہمیت و عظمت سمجھئے جن کو اس پہلی وحی اور پیغام آسمانی میں عزت کا مقام دیا گیا۔

شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں کہا تھا

کتب خانہ چند ملت بشت

لیکن آپ نے کتب خانے اتنے دھوئے نہیں جتنے کتب خانے بنا دیئے وہی کتب خانے دھوئے جن کو دھونا چاہئے تھا لیکن دھو کر کے پھر کیا دیا؟ نور دیا، یقین دیا، اللہ کی صحیح معرفت عطا فرمائی، انسان کو انسان بنادیا اور جاہل انسان بلکہ حیوان صفت انسان کو دنیا کا معلم بنادیا بقول اکبر۔

جو نہ تھے خود راہ پر، غیروں کے ہادی بن گئے
کیا نظر تھی، جس نے مردوں کو مسیحا کر دیا

تعلیم و تعلم کی ضرورت اور اس کا انتظام

دنیا کی کوئی قوم علم سے مستغنی ہو سکتی ہے کہہ سکتی ہے کہ نہیں، ہمارا کوئی نقصان نہیں، ہم پر کوئی واجب نہیں، ضروری نہیں کہ ہم پڑھیں اور پڑھائیں، بچوں کی تعلیم کا انتظام کریں، لیکن روئے زمین پر قیامت تک مسلمان کہیں بھی آباد ہوں، وہ چاہے مقامات مقدسہ ہوں، چاہے جزیرۃ العرب ہو، چاہے یورپ و امریکہ ہو، چاہے ہندوستان کی سرزمین ہو، شہر ہو، قصبہ ہو، دیہات ہو جہاں مسلمانوں کے چار گھر بھی ہیں بلکہ جہاں چار مسلمان بھی پائے جاتے ہیں۔ وہاں ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ ”اقراء“ کا سامان کریں۔ وہ اسکی تعمیل کریں کہ پڑھو یہ کام شفاخانوں کے قیام سے زیادہ ضروری ہے، اور آپ کی دکانوں سے زیادہ ضروری ہے، یہ کارخانوں سے زیادہ ضروری ہے، اس میں سے کسی چیز کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو مامور نہیں فرمایا، یہ نہیں فرمایا کہ تجارت کرو، کماؤ کہ یہ بھی بہت بڑی طاقت ہے، دین حق کو غالب کرنے کیلئے خوب پیسہ پیدا کرو، خوب دولت جمع کرو، اپنی امت کو یہ سبق سکھاؤ یہ کہیں نہیں فرمایا، فرمایا تو یہ فرمایا ”اقراء“ (پڑھو) اب بتائیے کہ علم کا کیا مقام ہے؟

اچھا پھر وہ علم جو منجانب اللہ حاصل ہوتا ہے، ایک علم لدنی ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کسی کسی کا سینہ کھول دیتا اور اسے علوم کا گنجینہ بنا دیتا ہے، ان کی زبان سے حکمت اہلتی ہے، یہ سر آنکھوں پر ہم ان کو اپنے سے ہزار درجہ افضل مانتے ہیں ان کا سایہ پڑ جائے تو ہم سمجھیں کہ ہم آدمی بن جائیں گے لیکن ”اقراء“ اپنی جگہ پر رہے گا، ان حضرات کو بھی ضرورت ہے کہ وہ مسئلہ پوچھیں عالموں سے بڑے بڑے صاحب ادراک صاحب کشف بھی نماز کا مسئلہ پوچھتے ہیں۔

یہ ”اقراء“ کا سلسلہ ایسا ہے کہ نبی امی سے شروع ہو کر آخری امتی امی تک (یعنی جو لفظ بے پڑھا ہے) جاری رہے گا، کتنے ہی دنیا میں انقلابات آئیں، سلطنتیں بدلیں، تہذیبیں بدلیں، اور انقلاب عظیم برپا ہوئے، زبان بدل جائے، تعلیم و تعلم کا سلسلہ جاری رہے گا۔

حفاظت قرآن کا مفہوم

اللہ تعالیٰ نے کسی زبان اور کسی کتاب کی حفاظت کی گارنٹی نہیں لی، قرآن کی حفاظت کا اللہ تعالیٰ نے ذمہ لیا ہے، تو حفاظت کا مطلب یہ تو نہیں ہوتا کہ بس کتاب رہے نہ کوئی اسے سمجھے نہ سمجھائے، اس کے لئے سمجھنے سمجھانے والے بھی ہونے چاہئے، اور وہ کتاب الفاظ میں ہے تو

زبان بھی ہونی چاہئے، الفاظ بغیر زبان کے نہیں رہتے اس لئے عربی زبان بھی رہے گی کتنی زبانیں مٹ گئیں لیکن شریعت الہی کی زبان عربی اپنی جگہ پر ہے، اور اس کا علم اپنی جگہ پر ہے، تو ہر جگہ کے مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے یہاں مقدر بھردینی تعلیم کا انتظام کریں۔ ہر جگہ مسائل کے بتانے والے نہ صرف یہ کہ موجود ہوں بلکہ ان کا سلسلہ جاری رہے، یہ بھی مسلمانوں کے ذمہ فرض ہے، مدارس کا سلسلہ ضروری ہے، یہ کوئی شوقیہ تفریحی کام نہیں ہے، یہ خالص دینی ضرورت ہے میں پوری ذمہ داری کے ساتھ کہتا ہوں کہ مساجد کے بعد نمبر دو کی چیز یہی ہے اور سچ پوچھئے تو مساجد کے پشت پناہ بھی یہی مدارس ہیں، اگر مدارس نہ ہوئے تو آپ کو امام کہاں سے ملیں گے، اگر ایسے امام مل گئے جو بس نماز پڑھا دیں تو جمعہ پڑھانے کیسے اس سے زیادہ پتہ شرائط ہیں اس کے پتہ اور احکام ہیں پھر اس کے بعد مسائل کیسے آپ کہاں جائیں گے مسجدوں ہی میں تو جائیں گے امام صاحب سے پوچھئے، امام صاحب کو کوئی علم نہیں ہے جس تھوڑی سی صورتیں یاد کر لیں، اور نماز پڑھانا آگیا، تو یہ مدارس درحقیقت مساجد کے بھی محافظ ہیں اور مساجد کو بھی غذا پہنچاتے ہیں۔

فضلائے مدارس کا فرض

میں نے آپ کے سامنے شروع میں یہ آیت پڑھی تھی ”وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنفِرُوا كَافَّةً“ یہ تو نہیں ہو سکتا، یعنی ایک غیر ممکن سی چیز ہے غیر طبعی چیز ہے کہ سب مسلمان کام چھوڑ چھاڑ کر دین سیکھنے کیلئے نکل جائیں، نہ دکان پر کوئی بیٹھنے والا ہو، نہ کوئی خرید و فروخت کرنے والا ہو، نہ کوئی ضرورت پوری کرنے والا، معلوم ہوا سارا شہر چلا گیا، مدرسہ کا طالب علم بن کر یہ ہونے والی بات نہیں ہے، اللہ تعالیٰ ایسی بات نہیں کہتا، نہ اس کا مکلف قرار دیتا ہے، نہ اس کا مطالبہ کرتا ہے، فرماتا ہے کہ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ تمام مومنین سب کے سب گھر چھوڑ کر باہر چلے جائیں، ”فَلَوْلَا نَفَرَ مِن كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ“ پھر ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ ہر جماعت میں سے کچھ لوگ اس کیلئے تیار ہو جائیں کہ وہ دین سیکھیں ”لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ“ دین کی سمجھ حاصل کر لیں یعنی وہ دین کے حکام و مسائل کا علم حاصل کریں ”وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ“ اور اتنا ہی نہیں کہ خود اپنی ہی ذات کیلئے سیکھ کر بیٹھ گئے، اپنا کام نکال لیا ”وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ“ جا کر اپنی اپنی بستیوں میں ہدایت کا کام کریں واعظ

وارشاد کا کام کریں، اور ان کو خطرات سے مہلکات سے بچائیں، شرک کے مہلکات سے، کفر کے مہلکات سے، ان عقائد سے، ان رسوم سے، ان اعمال سے جن سے آدمی بالکل اسلام سے خارج ہو جاتا ہے، اور بعض اوقات وہ اسلام کی سرحد پار کر جاتا ہے، اور مسلمانوں میں اس کا شمار نہیں رہتا، بعض چیزوں سے ایمان چلا جاتا ہے، بالکل آدمی نے کوئی ارتداد اختیار کر لیا۔“

ولینذروا قومہم اذارجعوا الیہم“ عالم ہی بتا سکتا ہے، مسلمانوں کا کوئی بڑا شہر ہو، تجارتی مرکز بھی ہو، کھاتے پیتے مسلمان رہتے ہوں ایک مدرسہ بھی وہاں نہ ہو، دین کے مولے مولے احکام سکھانے کیلئے قرآن مجید پڑھا۔ نہ کیلئے۔ تو پورا شہر گنہگار ہوگا، بس یہی فرض کفایہ کے معنی ہوتے ہیں پورا شہر خطرے میں ہے، اور خدا کے یہاں سوال ہو سکتا ہے کہ تمہیں تو فقیہ نہیں ہوئی کہ اتنے بڑے شہر میں مدرسہ قائم کرو، یہ بات ایسی نہیں جیسی تہجد پڑھنا، بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تہجد فرض تو ہے نہیں اللہ توفیق دے، کوئی پڑھے تو بڑی اچھی بات ہے، ایسے ہی ان لوگوں نے مدرسہ قائم کر دیا گویا تہجد پڑھ لی یا کوئی خیرات کر دی، یہ بنیادی کام ہے، یہ آپ کیلئے شہ رگ کی حیثیت رکھتا ہے کہ اپنے یہاں بقدر ضرورت کم سے کم دینی تعلیم کا انتظام کریں، آپ کے شہر میں ایسے لوگ ہوں جو وقت پر مسئلہ بتا سکیں اور مسلمانوں کیلئے کوئی خطرہ پیش آ جائے، حلال و حرام، کفر و ایمان کا کوئی مسئلہ آ جائے تو اس میں وہ رہنمائی کر سکیں، بتا سکیں کہ یہاں سے یہاں تک تو اسلام ہے اس کے بعد کفر ہے اور اگر تم سمجھنا چاہتے ہو تو ہم تمہیں بتاتے ہیں ”قد تبین الرشید من الغی“، فمن یکفر بالطاغوت ویومن باللہ فقد استمسک بالعروة الوثقی“ (البقرہ ۲۵۶) اور یہ غی ہے یہ اسلام ہے اور یہ جاہلت ہے یہ بتا سکیں اس کے بعد کرنا نہ کرنا آپ کا کام ہے۔

عوام کی ذمہ داری

بنیاد رکھنے کا مطلب یہ نہیں کہ ہم نے بنیاد رکھ دی ہماری ایک ذمہ داری ہو گئی آپ کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے یہ بنیاد تو ہم آپ کی طرف سے رکھیں گے، گویا آپ کے ہاتھوں سے، آپ سب تو ہاتھ نہیں لگا سکتے، تو ہم آپ کی طرف سے آپ کی نیابت کریں گے، خدمت ہم کریں گے کہ وہ پتھر رکھ دیں، لیکن آپ کا کام ختم نہیں ہوتا بلکہ سچ پوچھئے تو اس سے شروع ہوتا ہے، اب آپ کی ذمہ داری ہے کہ اس مدرسہ کو ترقی دیں، باقی مشورہ کا معاملہ ہے استادوں کا مسئلہ

ہے، کتابوں کا مسئلہ ہے، نصاب کا مسئلہ ہے، کبھی جلسوں میں آنے جانے کا مسئلہ ہے، اس کے لئے ہم حاضر ہیں، آپ کو شکر گزار ہونا چاہئے کہ ایک بہت بڑی اجتماعی معصیت سے ایک قومی اور ملی کوتاہی سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو بال بال بچا لیا، اگر یہ مدرسہ نہ ہوتا تو خدا کے یہاں پریش ہو تی۔

مدارس دینیہ کے قیام و بقاء کے شرائط

[26 نومبر 1983ء بروز جمعہ ریاض العلوم کھجراتہ (اندرا) کے دارالافتاء کے سنگ بنیاد کے موقع پر]

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونعوذ بالله من شرور انفسنا ومن
سيئات اعمالنا من يهده الله فلا مضل له ومن يضلل الله فلا هادي له ،
واشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له ، واشهد ان سيدنا محمد ا
عبده ورسوله . اما بعد .

انسانی سعی و کوشش کے آثار و مظاہر

حضرات! میں یہاں آ رہا تھا اور میری زبان پر ایک شعر خنود بخود جاری ہو گیا کسی صاحب
بصیرت شاعر کا ہے۔

عزم راسخ ہے نشان قیام و شان کوہ کن
عشق نے آباد کر ڈالے ہیں دہشت و کوہسار

یہ شاعر کی بات نہیں یہ اصل میں تو قرآن کی ترجمانی ہے۔

وان ليس للانسان الا ماسعى ، وان سعيه سوف يرى ، ثم يجزاه الجزاء
الاولیٰ (النجم : ۴۱ ، ۴۰ ، ۳۹)

اور یہ کہ انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے اور یہ کہ اس کی کوشش دیکھی جائے
گی ، پھر اس کو اس کا پورا بدلہ دیا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ انسان کے لئے اتنا ہی ہے جس کی وہ کوشش کرے اور پھر اللہ تعالیٰ
فرماتا ہے اور خاص طریقہ اداۓ قرآنی کے ساتھ فرمایا گیا ”وان سعيه سوف يرى“ (اور
اس کی کوشش ایک مرتبہ نظر آ کر رہے گی) یہ بھی قرآن مجید کا اعجاز ہے کہ یہاں ”سوف“ کا لفظ
استعمال ہوا ہے جو عام طور پر مستقبل بعید کیلئے استعمال ہوتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر
تمہیں جلدی نتائج نظر نہ آئیں تو مایوس نہ ہونا ”سوف يرى“ وہ نظر آئے گا جو کچھ دنیا میں

دیکھ رہے ہیں سلطنتوں کا قیام، تہذیبوں کا عروج، علوم و فنون کی اشاعت، باکمال لوگوں کا پیدا ہونا، سب انسانی سعی و جہد و جہد کے ظہور کے نتائج ہیں اور قرآن مجید اس آیت کی تفسیر ہے۔

مردم خیز شہر اور قصبے

کسی سرزمین میں کچھ لوگ پیدا ہو جاتے ہیں اور ان کو دھن لگ جاتی ہیں کسی کام کی، کسی علم و فن میں امتیاز پیدا کرنے کی اور لوگوں تک اس دولت کے عام کرنے کی، پھر مم پانی کی طرح برستا ہے ہندوستان کی تاریخ اور یہاں کے خاندانوں کی تاریخ پڑھنیے جس خطہ کا تذکرہ پڑھے گا تو معلوم ہوگا کہ اولیاء اللہ اور باکمال لوگ زمین سے اگتے تھے یا آسمان سے برستے تھے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں یا وہی اللہ پیدا ہوتے تھے یا امامین پیدا ہوتے تھے اس پر اس وقت کے لوگوں کا تعجب کرنے کا حق ہے جب کسی چیز کا چلن ہو جاتا ہے تو ایسا ہی ہوتا ہے یہ تہذیب بھی جب اپنی عمر پوری کرے گی اور کوئی مومن نہ رہے گا کہ اس زمانہ میں اس ملک میں بزاروں لاکھوں کی تعداد میں گریجوئیٹ تھے، ڈاکٹر تھے، انجینئر تھے، ایل ایل بی تھے، پی ایچ ڈی تھے اور خدا جانے کیا کیا تھے لوگ کہیں گے کہ کتنا مباحثہ ہے بھلا ایک ملک میں کتنا ہی بڑا ملک ہو، ایک زمانہ میں ایک سو برس دو سو برس کے اندر اتنے باکمال و فاضل لوگ پیدا ہو گئے تھے معلوم ہوتا ہے کہ اس ملک میں کوئی آدمی رہتا ہی نہیں تھا سب ڈاکٹر، انجینئر اور اسکالر ہی رہتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس چیز کی ہوا چل جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا ہے (اصل تو ارادہ الہی ہے اور اس کی طرف سے ہر طرح کی آسانی دی جاتی ہے) پھر لوگوں کی طبعیتوں میں ایسی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ تھوڑی کوشش سے بڑے بڑے نتائج نکلنے لگتے ہیں بڑے بڑے کمالات حاصل ہونے لگتے ہیں۔

مالوہ کی قدیم تاریخ

مالوہ کی تاریخ آپ پڑھیں صرف شیخ محمد حسن مندوی کی ”گلزار ابرار“ ہی پڑھ لیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ اولیاء اللہ، مشائخ طریقت، اور اصحاب سلسلہ اور اہل روحانیت بارش کے قطروں کی طرح ماند و کی سرزمین پر نازل ہوئے تھے۔ آدمی کو حیرت ہوتی ہے کہ کیا اس وقت اور کوئی کام نہیں رہ گیا تھا۔ لیکن یہ حضرات اتنے نمایاں تھے کہ مورخ ان کو نظر انداز نہیں کر سکا کوئی بھی تاریخ ایسی نہیں ہے، جس کو یہ کہا جائے کہ یہ ایک طرح کی ڈائریکٹری ہے جس کا چاہئے

نام نکال لیجئے۔ یا ڈکٹری ہے جس کا چاہئے نام تلاش کر لیجئے، یہ بات نہیں ہے اگر انہوں نے سو کا ذکر کیا ہے تو ڈیرہ سودو سو آدمی چھوٹ بھی گئے یہ زمین سب کو اگانے کیلئے تیار ہے، آپ چاہیں تو یہ بڑی پیدا کرے، درخت پیدا کرے، اور آپ چاہیں تو اللہ کے حکم سے اولیا، اللہ پیدا کرے، اور کامین فن پیدا کرے، زمین ہی کی طرف نسبت کرتے ہیں کہ اس سر زمین سے کتنے آدمی اٹھے۔

رضا کار و ایثار پیشہ خادم دین، علماء اور نگران حکومت و معاشرہ صوفی

بس ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ پہلے کوئی بندہ دیوانہ بن جائے، تو اس کے بعد پھر تو دریا بہہ جاتے ہیں ایسے ہی یہ جنگل پڑا ہوا ہے ہم نے بہت کچھ بنا ہوا دیکھا۔ اور جن کی زندگی بے وہ دس برس بعد آئیں گے اور بہت کچھ بنا ہوا دیکھیں گے۔ یہاں تک کہ ہو سکتا ہے کہ بارامیدان آپ کو گھروں کا اور اداروں کا ایک شہر نظر آئے، بہر حال یہ ایک مبارک بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چند عزیزوں کو اس کی توفیق عطا فرمائی، اور انہوں نے یہاں پر ایک ویشش شریعت کی ہے، بغیر کسی سلطنت کی سرپرستی کے، میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ پہلے بھی جو کوششیں ہوئی ہیں وہ ان سلطنتوں کی سرپرستی سے نہیں ہوئی ہیں، سلطنتیں اپنا کام کر رہی تھیں ان کا مذاق اور تھا، ان کی ضرورتیں اور تھیں، ان کے مصالح اور تھے یہ سب وہ لوگ کر رہے تھے جو پیٹ پر پتھر باندھے ہوئے تھے اور بہت سے دوسرے ملکوں سے آئے ہوئے تھے۔ یہاں آ کر انہوں نے علم و روحانیت کا دریا بہا دیا، اور سلطنتوں سے تو وہ دور ہی دور رہے، سلسلہ چشتیہ نے خاص طور پر اس کا لحاظ رکھا کہ سلطنت سے دور رہے، ایک بزرگ کا قول ہے کہ سلطنت وقت، اور بادشاہ وقت آگ کی طرح ہے کہ دور بیٹھ کر تاپے، آدمی پاس نہ جائے، ورنہ جل جائے گا، ان لوگوں نے یہی طرز عمل رکھا، بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ تاریک الدنیا تھے، ان کو خبر نہیں تھی کہ حکومتوں میں کیا ہو رہا ہے، اچھا برا سب ہو رہا تھا، یہ بیٹھے بیٹھے اللہ اللہ کر رہے تھے، اور وظیفہ پڑھ رہے تھے، اور ضریں لگا رہے تھے، یہ غلط ہے، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کی ایک مثال دیتا ہوں، کہ وہ غیاث پورہ کی خانقاہ میں بیٹھے ہوئے پورے ہندوستان کی نگرانی کر رہے تھے، کیسے لوگ آ رہے ہیں، کیسے آدمیوں کی ضرورت ہے اور جب ضرورت پڑتی تھی تو بادشاہ کو ایسے آدمی دے دیا کرتے تھے کہ نگینہ کی طرح حکومت میں اس طرح جڑ جاتے تھے، جیسے انگوٹھی میں

گمینہ جڑ دیا جائے، علاء الدین خلجی نے ایک مرتبہ کہلوایا کہ میں تو مل کر رہوں گا، چاہے جو کچھ ہو، فرمایا کہ میری خانقاہ کے دو دروازے ہیں، بادشاہ ایک دروازہ سے آئے گا، میں دوسرے دروازہ سے نکل جاؤں گا، چنانچہ جب بادشاہ آیا تو حضرت اجودھن چلے گئے، فرمایا، ملنے ملانے کی کوئی ضرورت نہیں، ملنے کا بالکل خیال نہ کریں، ہم دعا کر رہے ہیں ہمارا کام ہے دعا کرنا عام انسانوں کے لئے پھر مسلمانوں اور والئی سلطنت کے لئے کیوں نہیں، جس کی خوبی پر جس کی بہتری پر بہت کچھ موقوف ہے، اور یہی ان کا طرز عمل ساری عمر رہا۔

بات زبان پر آگئی تو کہہ دوں کہ ایک وقت ایسا آیا کہ محمد تغلق کا ٹھٹھہ (سندھ) میں انتقال ہوا، وہاں دریائے سندھ کے اس پار مغل پڑے ہوئے تھے، وہ مغل جو وحشی مغل تھے، وہ نہیں جو بعد میں آئے، کئی لاکھ کا لشکر پڑا تھا، مسلمان لاوارث ہو گئے، اور کسی کے کچھ بنائے نہیں بنتی تھی، اور لوگ اس انتظار میں تھے کہ مغل دریا پار کر کے آئیں گے، اور جیسے کہ بکریوں کا شکار بھیڑیے کھیتے ہیں، ایسے ہی مغل اس لاوارث فوج کی بوٹی بوٹی کر دیں گے، اس وقت کسی کے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے، بادشاہ کا کوئی بیٹا اس قابل نہیں تھا، اس وقت حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلی موجود تھے، ان کو بادشاہ نے ایک بہانہ سے بلا لیا تھا، لیکن اصل میں اللہ نے ان کو پہنچایا تھا، انھوں نے فیروز تغلق سے کہا (جو محمد تغلق کا چچا زاد بھائی تھا) کہ دیکھو اگر تم سلطنت سنبھالتے ہو تو سنبھالو، ورنہ ہم کسی اور کے حوالہ کریں گے، اور اگر تم عدل اور حکومت کے خیال سے، رزم اور بزم کے خیال سے حکومت لیتے ہو تو میں اللہ سے تمہارے لئے تیس سال مانگ لوں گا، چنانچہ پورے تیس سال نہایت کامیابی کے ساتھ اس نے سلطنت کی، حضرت نصیر الدین چراغ دہلی کا بٹھایا ہوا فیروز تغلق بادشاہ تھا، جس کے متعلق بعض تاریخ دانوں کا خیال ہے کہ دہلی کے تخت سلطنت پر فیروز تغلق سے بہتر اور مکمل اور جامع آدمی کوئی نہیں آیا، بعض حیثیتوں سے عالمگیر مرحوم سے بھی وہ فائق تھا، اور بعض حیثیتوں سے وہ فائق تھے، لیکن مجموعی طور پر فیروز تغلق جیسا بادشاہ نہیں آیا، پورے ملک میں امن و امان ہو گیا، جرائم ختم ہو گئے، ظلم کرنا لوگوں نے چھوڑ دیا، بے ایمانی کا رواج کم ہو گیا یا ختم ہو گیا، اور یہ کیا تھا، یہ ایک فقیر درویش کی دعا اور سر پرستی۔

تو اللہ تعالیٰ کو جب منظور ہوتا ہے، اور کسی کے دل سے لگ جاتی ہے تو جنگل میں منگل

ہو جاتا ہے، دل کے لگنے کی بات ہے، اور کچھ بھی نہیں، دل سے لگ گئی اللہ کے ایک بندہ کے تو دارالعلوم دیوبند کھڑا ہو گیا، یہ کیا ہے؟ حضرت حاجی عابد حسین صاحب اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے دل میں خیال پیدا ہوا، ایک نے اس کی ابتدا کر دی، دوسرے اس کی نگرانی کرتے رہے، اور ایسے ہی (جس کی طرف ان بھائیوں اور عزیزوں کا انتساب ہے) ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ کے دل سے لگ گئی، اور دیکھئے کتنے ساتھی تیار کر لئے، اور آج ندوۃ العلماء کی کیا حیثیت ہے، اور ایسے ہی مدرسہ مظاہر علوم اپنے بانیوں کے عزم و اخلاق کا کرشمہ ہے، اور جو بھی بڑے بڑے جامعات ہیں، از ہر ہویا اور کوئی جامعہ، سب کے پیچھے آپ کو کوئی شخصیت نظر آئے گی پھر وہ شخصیت اپنے ساتھی بنالیتی ہے۔

اجتماعی کام کی شرطیں

اللہ کو جب کوئی کام منظور ہوتا ہے، تو اس کے بانی اور ذمہ دار شخصیت کی طبیعت میں صلاحیت پیدا کر دیتا ہے کہ وہ ہر ایک سے کام لے لے، سب کو ملا کر رکھے، اپنے کو جھکا کر رکھے، دوسرے کو بڑھا کر رکھے، یہ علامت ہوتی ہے کہ اللہ کو کچھ کام لینا ہے، اور جب اللہ کو کام لینا نہیں ہوتا شخصیت تو ہوتی ہے، لیکن روز جھکڑا، کوئی اس کے ساتھ کام نہیں کر سکتا، سمجھ لیجئے کہ کام ہونا منظور نہیں ہے، تو اللہ تعالیٰ شخصیت بھی پیدا کرتا ہے، اور اس کے ساتھی بھی پیدا کرتا ہے، اور اس شخصیت کے دل میں ان کی قدر، اور ان کے دل میں اس کی عزت اور اس کا اعتراف، اسی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کچھ اہل استطاعت و اہل توفیق کو بھی کھڑا کر دیتا ہے، وہ اپنی سعادت سمجھتے ہیں، کہ آپ تو ایثار سے کام لے رہے ہیں، اور لیتے رہیں، لیکن ہمیں موقعہ دیجئے کہ ہم خدمت کریں، ہمارا بھی حصہ ہو جائے۔

عمارت کے تین پتھر

اس طرح کم سے کم تین پتھر ہوتے ہیں، ایک اصل کام شروع کرنے والا، ایک اس کے ساتھی، اور ایک کے ساتھ اس کے معاونین یہ تینوں جب پیدا ہو جاتے ہیں، تو چوتھی چیز مدرسہ کی شکل میں، جامعہ کی شکل میں نکل آتی ہے، اور دنیا دیکھتی ہے کہ کتنا بڑا دارالعلوم قائم ہو گیا،

پس ہم اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ توفیق دے، اور عمر میں برکت دے ان لوگوں کی جنہوں نے یہ کام شروع کیا، اور اسی طریقہ سے اللہ تعالیٰ تعاون کا جذبہ، اور لوگوں میں مل کر کام کرنے کی صلاحیت پیدا فرمادے، جو آج عمومی پیمانہ پر دنیا سے رخصت ہوتی جا رہی ہے، اور جس طرح مسلمانوں کے اندر سے رخصت ہوتی جا رہی ہے۔

مسلمانوں میں تعاون کی کمی

مسلمان سے سب کچھ کھینچتے، مسلمان سے کہتے تو وہ سر کے بل کھڑا رہے گا، سر نیچے اور پاؤں اوپر رات بھر کھڑا رہے گا، اور اسے تو پیٹ پر پتھر باندھتے کے لئے تیار ہے، اور کہتے تو کسی وقت خندق میں کودنے کے لئے بھی تیار ہے، مگر یہ کہتے کہ دو دن کسی آدمی کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہیے تو مسلمان سے اسے یہ مشغل ہے، حالانکہ یہی سب سے بڑا کام ہے، جو کامیابی انبیاء علیہم السلام سے لے کر ان کے جانشینوں تک ہوئی ہے، وہ اسی کا کرشمہ ہے، وہ وہی لوگ ہیں، کسی طریقہ سے اللہ نے جن کے دل جوڑ دیئے۔

پہلے دل جوڑنا پھر اینٹیں

پہلے دل جوڑنا پڑتا ہے، پھر اینٹیں جوڑنا، لوگ سمجھتے ہیں اینٹیں جوڑنا اصل کام ہے، نہیں دل جوڑنا اصل کام ہے، دل جوڑے تو اینٹیں سب جڑ جائیں گی، بڑی سے بڑی عمارت کھڑی ہو جائے گی، ہم پڑھتے ہیں بڑے بڑے مدرسوں کے بانیوں کے حالات، میں نے دیکھا کہ کیسے کیسے نازک موقع آئے، خود ندوہ کے بانیوں نے اور اس کے شروع کے ناظموں نے کیسے کیسے کڑوے گھونٹ پئے ہیں، اور کیسے کیسے لوگوں کو برداشت کیا، اس وقت ہمارے اس کام کا تقاضا یہ ہے کہ ہم سب سن لیں، اور سب سے فائدہ اٹھائیں، اور سب کو ہم سینہ سے لگائیں، تب جا کر اللہ تعالیٰ نے یہ دن دکھایا کہ ندوہ کے پڑھے ہوئے فرزند یہاں موجود ہیں، اللہ ان سے کام لے رہا ہے، کسر و انکساری ضروری ہے، تھوڑا سا ٹوڑنا، تھوڑا سا توڑنا، جب ہی کام چلتا ہے، اور توڑنا ہی توڑنا ہو، دوسرے کو توڑے اور خود نہ ٹوٹے تو اس طرح کام نہیں چلتا۔

جہاں بھی آپ دیکھ رہے ہیں کوئی انتشار ہے اس کا سبب یہ ہے کہ کارکن جھکنا نہیں جانتے، ماننا نہیں جانتے، کسی کی بات قبول کرنا نہیں جانتے، ایک ہی سبق پڑھا ہے کہ ہماری مانو، اس کی وجہ سے آج آپ دیکھ رہے ہیں کہ بڑی بڑی جگہوں میں انتشار اور جھگڑا ہے، اللہ

تعالیٰ ہماری اپنے نفس کے آفات و شرور سے حفاظت فرمائے اور اس جنگل میں اپنے فضل سے، محض اپنی قدرت کاملہ سے صحیح علوم دینیہ کا ایک مرکز قائم کرے، جہاں سے علوم نبوت کے آفتاب کی شعاعیں پھیلیں، اور واقعی اس سرزمین کو مالا مال کر دے، اور صحیح معنی میں مالوہ بنادے اور پھر یہاں سے دور دور فیض پہونچے۔

ربنا تقبل منا انک انت السميع العليم

فتح و غلبہ کے دوالہی نظام

یہ تقریر ۱۶ شعبان ۱۳۸۸ھ (۸ نومبر ۱۹۶۸ء) کو ”مدرسے ثانویہ طیبہ“ مدینہ منورہ کے وسیع ہال میں کی گئی۔ اس جلسے میں جامعہ اسلامیہ، مدارس اور کالجوں کے اساتذہ، اور طلباء اور سربراہان و وہ حضرات کی کثیر تعداد شریک تھی۔

الحمد لله و کفی و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ اما بعد

دوالہی نظام

اس کائنات میں دو نظام کارفرما ہیں، پہلا طبعی نظام جسے اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کے لئے منتخب کیا ہے اور اسے پوری کائنات کے لئے دستور بنایا ہے۔ اس نظام کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کثرت قلت پر امارت افلاس پر، اسباب و سائل کی فراوانی، قتل اسباب پر اور قوت ضعف پر غالب رہتی ہے۔ تنظیم، اتحاد، عزم، قوت ارادی، مستقل مزاجی، مستعدی یہ وہ صفات اور خصوصیات ہیں جو ہمیشہ اپنے اضعاف پر غالب رہتے ہیں ہم سب اپنی روزمرہ زندگی میں اس نظام کے تجربات سے گزرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تمام اشیاء میں کچھ خاصیتیں رکھی ہیں۔ جو ماہ و سال کی گردش زمانے کے الٹ پھیر اور صدیوں کی مدت دراز پر بھی ان سے جدا نہیں ہوتیں آگ میں جلانے کی خاصیت رکھی گئی، لہذا آگ ہمیں جلاتی ہے۔ پانی میں اپنی خاصیت ہے مٹی کے کچھ خواص ہیں غرض تمام اشیاء میں مخصوص خواص ہیں جو ان سے کبھی جدا نہیں ہوتے۔

منصفانہ قانون، میزان عدل

طبعی نظام کا قانون ایک ایسا منصفانہ قانون ہے کہ جو کسی کی رعایت نہیں کرتا یہ طبعی قانون ایک انسان دوسرے انسان یا ایک گروہ پر دوسرے گروہ کو افضل نہیں ٹھہراتا۔ حتیٰ کہ یہ قانون مومن و کافر، متقی اور فاجر نیک و بد، مصلح و مفسد تک میں امتیاز نہیں برتتا، آگ ہر اس شخص کو جلاتی ہے جو اس کی طرف بڑھتا ہے، وہ نہ کسی مصلحت کی رعایت کرتی ہے اور نہ انجام سے

خائف ہوتی ہے یہ وہ میزان عدل ہے جو اشیاء کا صحیح صحیح ناپ تول کرتی ہے، نہ مددہست برقی ہے نہ رعایت اور فرق و امتیاز سے ہمیشہ بالاتر رہتی ہے۔ یہ وہ قانون ہے جس کا تجربہ انسان نے اپنے وجود سے آج تک ہزاروں سال کی طویل مدت میں کیا ہے اس کے تجربات، واقعات اور مشاہدات کے تسلسل سے انسانیت کی تاریخ کے مختلف گوشے پر ہیں اور ان میں آپ کوئی استثناء نہیں پائیں گے۔

ایک حکومت دوسری حکومت پر غالب آتی ہے۔ طاقتور اپنے حریف کو زیر کرتا ہے، ایک توانائی دوسری توانائی کو ختم کرتی ہے۔ ایک تعداد اپنے مقابل تعداد کو مغلوب کرتی ہے۔ اور یہ سب اس قانون طبعی کے مطابق ہوتا ہے جس کی تخلیق اللہ تعالیٰ نے کی ہے۔

دلائل سے بے نیاز

قانون طبعی اپنے اثبات کے لئے نہ بحث و دلائل کا محتاج ہے نہ فکر و فلسفہ کا حاجت مند، یہ ایک بدیہی حقیقت تسلیم شدہ قانون، فطری امر، آزمودہ علم اور ہر ایک کا روزمرہ کا مشاہدہ ہے۔ چنانچہ آسمانی کتابوں اور انبیائے کرام کا یہ کبھی موضوع بحث نہیں رہا یہ قانون فطرت پوری قوت سے نافذ اور ہر طرح آزاد ہے اگر اسے اس کے فطری حال پر چھوڑ دیا جائے اور اسے مطلق فرماں روائی حاصل ہو تو اس کے عمل اور کار فرمائی میں کوئی چیز حائل نہیں ہو سکتی۔

دوسرا نظام

یہ وہ نظام ہے جو انبیاء کرام کا موضوع رہا ہے آسمانی صحیفوں نے اپنا موضوع بنایا ہے اس کی تشریح اور توضیح کی ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے چند مقاصد کو فصل اور ممتاز اور (خواص اشیاء کے حقیر مقاصد نتائج سے زیادہ) احترام اور اہتمام کا مستحق قرار دیا ہے۔

حقیر اس مفہوم میں کہ آگ جلاتی ہے، پانی ڈبوتا ہے، زہر ہلاک کرتا ہے، تریاق زہر کے اثر کو زائل کرتا ہے، طبیب علاج کرتا ہے، مرض لاغر اور کمزور کرتا ہے، دوا صحت اور آرام بخشی ہے۔ یہ تمام نتائج اور مقاصد قابل قدر اور عقل کیلئے قابل تسلیم ہیں، مگر ان کے علاوہ چند اور اعلیٰ مقاصد ہیں، جو ان سے توجہ و اہتمام کے مستحق ہیں اور وہ ہیں اللہ تعالیٰ کی معرفت، انسان کی ہدایت، مقصد تخلیق، انسانیت کی سعادت، عدل و انصاف، انصاف پر ور حقوق آشنا اور صالح

زندگی اور ایک ایسے مثالی معاشرے کے قیام جس میں خوف خدا ہو، انسانیت کا احتیاج ہو، حقوق کی ادائیگی اور امانت کی حفاظت ہو، جس میں لوگوں کو اللہ کی معرفت کی اہل ترارہ میسر ہو اور ان کے قوی اور صلاحیتوں کا نشوونما ایسے ماحول میں ہو سکے کہ ان کی رسائی اس مطلوب کمال اور اعلیٰ مقصد تک آسانی ہو جائے جس کی خاطر اس کائنات کی تخلیق عمل میں آئی۔

طبعی نظام کی شکست

یہی وہ نظام ہے جس کی خاطر اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام کو مبعوث فرمایا۔ آسمانی کتابیں نازل فرمائیں، اسی نظام کے آگے طبعی قوانین سرنگوں ہوئے اور انہیں اپنی خاصیتوں کو بدل دینا پڑا۔ جب دو مقاصد کا تصادم ہوتا ہے فطری نظام اور اس شرعی نظام کا جو عقل دین اور اخلاق کا تابع ہوتا ہے۔ اور یہی کائنات کا مقصد وجود اور انسان کا مقصد تخلیق بھی ہے۔ تو پلڑا شرعی نظام کا بھاری ہو جاتا ہے۔ جب سیدنا حضرت ابراہیم کو آگ میں ڈالا گیا تو اللہ تعالیٰ کی سنت آگ میں جاری تھی طبعی عوامل کا فرما تھے، آگ ہزاروں سال سے جلا رہی تھی انسانی تاریک نے اپنی دیانت، دقت نظر، تحقیق و جستجو کے باوجود ایک واقعہ بھی ایسا محفوظ نہیں کیا کہ آگ نے اپنے فطری عمل سے کسی بادشاہ یا عالم کے احترام میں پس و پیش کیا ہو۔ کیونکہ اس کا کام تو جلانا ہی ہے لیکن طبعی تصادم یعنی آگ کا ٹکراؤ، اس شرعی نظام سے ہوا جس کی خاطر اللہ تعالیٰ نے اس وسیع کائنات کی تخلیق کی ہے جس میں آگ، پانی، اجرام فلکی، ہزاروں زمینی اشیاء اور مختلف غذا میں ہیں اس سے جب آگ کی فطرت ہدایت کی فطرت سے متصادم ہوئی تو آگ کو حکم دیا گیا کہ وہ نہ جلانے، آگ سے جلانے کی وہ صلاحیت سلب کر لی گئی جو ابتدائے آفرینش سے اس میں موجود تھی، آگ نے شاید وہ غیبی آواز سنی ہو جسے نہ نمرود سن سکا اور نہ کوئی اور انسان کہ خبردار ابراہیم کو نہ جلانا میں وہ ہستی ہوں جس نے تجھے جلانے کی خاصیت عطا کی ہے لیکن ابراہیم کی جس مقصد کی خاطر تخلیق ہوئی ہے اور انہیں نبوت سے سرفراز کر کے تبلیغ و ہدایت کے لئے مخلوق کے پاس بھیجا گیا ہے۔ یہ وہ اعلیٰ و ارفع مقاصد ہیں کہ جن کے آگے تجھے اپنی خاصیتوں کے ساتھ ہزاروں بار سرنگوں ہو جانا چاہئے۔ ابراہیم کے کپڑوں تک کو نہ چھونا چہ جائیکہ ان کا پاک و مقدس جسم اور مومنانہ قلب سلیم جو دعوت نبوت کا مسکن اور امین ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کے متعلق فرمایا۔

و لقد اتینا ابرہیم رشدہ من قبل و کنا بہ عالمین
اس سے بھی پہلے ہم نے ابراہیم کو اس کی ہوشمندی بخشی تھی اور ہم اس کو خوب جانتے
تھے۔

اس امر الہی کے آگے آگ نے سپردال دی، دین فطرت کے مقابل آگ کی فطرت
اور خاصیت کو سرنگوں ہونا پڑا۔ کیونکہ یہ دین فطرت ہی وہ اعلیٰ مقصد ہے جس کے بغیر اس
کائنات کا وجود مبث اور بے معنی ہے اللہ تعالیٰ کا حکم آگ کو تسلیم کرنا پڑا۔ حضرت ابراہیم کو
جلانے سے اس نے گریز کیا اور ایک جان فزاحی میں تبدیل ہو گئی۔

قلنا ینار کونی بردا و سلما علی ابرہیم، و ارادوا بہ کیدا فجعلناہم
الاحسرین

ہم نے کہا اے آگ ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی بن جا ابراہیم پر، وہ چاہتے تھے کہ ابراہیم
سے ساتھ برائی کریں مگر ہم نے ان کو بری طرح ناکام بنا دیا۔

انبیاء کی بے سروسامانی اور بے اسبابی

آپ حضرات یہ بخوبی جانتے ہیں کہ انبیائے کرام کی بعثت جن قوموں میں ہوئی وہ
قومی اپنے ساز و سامان کی کثرت اور مادی ترقی کو کامیابی کا معیار سمجھتی تھیں۔ نبی پر ایمان
لانے والے غرباء ان کیلئے حجاب بن جاتے۔ اس معاملے میں ہر نبی اور اس کی قوم میں عظیم
تفاوت تھا۔ یہ بدیہی حقیقت دلیل کی محتاج نہیں، قرآن اس قسم کے واقعات، دلائل اور شواہد
سے پر ہے، جب توخ اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوئے تو ان کی قوم نے کہا۔

قالوا انو من لک و اتبعک الارذلون۔

انہوں نے جواب دیا ”کہ ہم تجھے مان لیں حالانکہ تیری پیروی رذیل ترین لوگوں نے
اختیار کی ہے“
اور یہ بھی کہا کہ۔

وما نراک اتبعک الا الذین ہم ارذلنا بادی الراۃ و مانری لکم علینا
من فضل بل نظنکم کذبین۔

اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہماری قوم سے بس ان لوگوں نے جو ہمارے ہاں ارازل تھے

بے سوچے سمجھے تمہاری پیروی اختیار کر لی ہے، اور ہم کوئی چیز بھی ایسی نہیں پاتے جس میں تم لوگ ہم سے کچھ بڑھے ہوئے ہوں بلکہ ہم تو تمہیں جھوٹا سمجھتے ہیں۔

حضرت شعیب علیہ السلام اپنی قوم میں مبعوث ہوئے تو انہیں کہا گیا۔

قالو یٰشعیب ما نفقہ کثیرا مما تقول وانا لنراک فینا ضیعفاً ولولا

رہطک لرحمنک وما انت علینا بعزیز۔

انہوں نے جواب دیا کہ اے شعیب تیری بہت سے باتیں تو ہماری سمجھ میں ہی نہیں

آتیں۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے درمیان بے زور آدمی ہے تیری برادری نہ ہوتی تو ہم کبھی کا تجھے سنگسار کر چکے ہوتے۔ تیرا بل بوتہ تو اتنا نہیں ہے کہ ہم پر بھاری ہو۔

حضرت موسیٰ اور ان کے کمزور رفقاء اور ان کے حریف فرعون اور ان کے لشکر کی کیا نسبت

تھی۔

قرآن کہتا ہے:

ونادی فرعون فی قومہ قال یا قوم الیس لی ملک مصر وھذہ الانھر

تجری من تحتی افلا تبصرون، ام انا خیر من ھذا الذی ھو مہین ولا یکاد یبین

فلولا لقی علیہ اسورۃ من ذھب اوجاء معہ الملئکۃ مقتربین، فاستخف قومہ

فاطاعوہ انھم کانوا قوماً فاسقین۔

ایک روز فرعون نے اپنی قوم کے درمیان پکار کر کہا لوگو! کیا مصر کی بادشاہی میری نہیں

ہے اور یہ نہریں میرے نیچے نہیں بہہ رہیں کیا تم لوگوں کو نظر نہیں آتا؟ میں بہتر ہوں یا یہ شخص جو

ذلیل و حقیر ہے اور اپنی بات بھی کھول کر بیان نہیں کر سکتا، کیوں نہ اس پر سونے کے کنگن

اتارے گئے؟ یا فرشتوں کا ایک دستہ اس کی اردلی میں نہ آیا؟ اس نے اپنی قوم کو ہلکا سمجھا اور

انہوں نے اس کی اطاعت کی درحقیقت تھے وہ بڑے فاسق لوگ۔

اور حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق تو ہر شخص جانتا ہے کہ آپ اپنی قوم میں کس قدر

بے سہارا اور آپ کے چند رفقاء کتنے بیکس اور مظلوم تھے، اللہ تعالیٰ اس دور کو یاد دلاتے ہیں

ارشاد فرماتا ہے:

واذ کروا اذ انتم قلیل مستضعفون فی الارض تخافون ان یتخطفکم

الناس .

یاد کرو وہ وقت جب تم تھوڑے تھے زمین میں تم کو بے زور سمجھا جاتا تھا تم ڈرتے تھے کہ کہیں لوگ تمہیں اچک نہ لے جائیں۔
حتیٰ کہ ان کی قوم نے ان چند نفوس کو اپنے وطن مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت پر مجبور کیا، جہاں آج ہم سب جمع ہیں۔

غیبی تائید اور اسباب

لیکن اللہ تعالیٰ نے تمام طبعی قوانین کو اس اعلیٰ اور افضل مقصد کے تابع کیا ہے، جس پر انسان کی سعادت کا انحصار اور نجات کا دار و مدار ہے، اُس اسباب اور وسائل کو ہر موقع پر اپنی کارکردگی کی پوری آزادی ہوتی، فطرت اپنی مقررہ اور طے کردہ رفتار سے ہر لمحہ سفر کرتی تو انبیاء کرام کی دعوت کی کامیابی مشکوک تھی، طبعی حالات کا غلام ماحول اور یہ مادی معاشرہ دعوت نبوت کو خدا نخواستہ نکل جاتے۔

لیکن اللہ تعالیٰ نے اخلاق و صفات میں بھی چند خاصیتیں رکھی ہیں، اسی طرح قوی، توانا اور مؤثر جس طرح مادی اشیاء میں رکھی گئیں۔

سچ کی خصوصیت ہے، اور اس کا اپنا ایک قانون ہے، امانت، خوف خدا غرض ان سب کا اپنا ایک نظام ہے، اعلیٰ صفات، احترام انسانیت، عدل و مساوات، رواداری، مروت، احسان، ایثار قربانی، دنیا پر آخرت کو ترجیح یہ وہ امتیازات عادات اور اعمال ہیں، جنہیں اللہ تعالیٰ نے بڑی توانائی، پراسرار طاقت، قوت تسخیر، روحانیت، نصرت اور کامرانی عطا کی ہے، کیونکہ وہ بڑا قادر اور علیم ہے۔

کامیابی کا رمز

جب اللہ تعالیٰ نے رسولوں کو مبعوث فرمایا انھیں رسالت سے سرفراز کیا اور اپنی کتابوں کو نازل فرمایا تو ان انبیاء نے عقائد اور ایمان کی دعوت دی، اچھے اخلاق سے مزین اچھی صفات سے آراستہ ہونے کا پیام دیا، اللہ نے انسانوں سے یہ وعدہ کیا کہ عقائد و اعمال اور اخلاق و صفات میں اصلاح کے ذریعہ دنیا میں کامیابی غلبہ اور فتح کی میں ضمانت دیتا ہوں

تمہاری کامیابی اور قوت کا رمز یہی دعوت ہے جو انبیاء لے کر آئے اور یہی تمہاری سپاہ ہے۔
اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

انهم لهم المنصورون ، وان جندنا لهم الغلبون .
یقیناً ان کی مدد کی جائے گی اور ہمارا لشکر ہی غالب ہو کر رہے گا۔
انا لننصر رسلنا والذين امنوا في الحياة الدنيا ويوم يقوم الاشهاد .
یقین جانو کہ ہم اپنے رسولوں اور ایمان لانے والوں کی مدد اس دنیا کی زندگی میں بھی
لازم کرتے ہیں اور اس روز بھی کریں گے جب گواہ کھڑے ہوں گے۔
كتب الله لاغلبن اناورسلى .
خدا کا حکم ناطق ہے کہ میں اور میرے پیغمبر ضرور غالب رہیں گے۔

انبیاء کرام عقل سلیم کا اعلیٰ نمونہ

انبیاء کرام ماؤف الدماغ، فاتر العقل نہیں تھے، وہ عقل سلیم کا اعلیٰ نمونہ، انتہائی ذکی، اشیاء
کی طبعی خصوصیات اور ان کی توانائی سے بخوبی آشنا تھے، نہ وہ فریب خوردہ تھے، نہ لاعلم، انھیں
بخوبی علم تھا کہ جب قوت قوت سے، فوج فوج سے، لوہالوہے سے، تعداد تعداد سے متصادم ہوتی
ہے تو ان میں کمزور کو شکست ہوتی ہے، اور قوی غالب آ جاتا ہے۔
جب کسی معرکہ میں صرف مادی قوت پر اعتماد کیا جاتا ہے تو اس میں کمزوری کو ناکامی اور
شکست کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

مگر انبیاء کرام اس عرفان کے حامل تھے جو مخفی امور پالیتا ہے، اس ہلکی سی کرن کو ان کی
دور بین نگاہ دیکھ لیتی ہے جو ان کے اور ان کے دشمنوں کے درمیان حائل رہتی ہے، جسے نصرت
الہی سے تعبیر کیا جاتا ہے، یہ وہ صاحب بصیرت انسان ہوتے ہیں کہ جن کی کائنات پر گہری نظر
ہوتی ہے، اور اللہ کی نصرت پر یہ کلی اعتماد رکھتے ہیں۔

فرعون اور حضرت موسیٰ کی کشمکش

آپ کو فرعون اور حضرت موسیٰ کا وہ واقعہ یاد ہوگا، جب موسیٰ نے اپنی قوم کو حکم دیا کہ وہ
رات کی تاریکی میں جزیرہ نمائے سینا کی طرف روانہ ہوں (وہی جزیرہ نمائے سینا جس کی یاد

ہمارے سوز غم کو بڑھا دیتی ہے، اور ہمیں خون کے آنسو رلاتی ہے، ہم نے اپنے ایمان و یقین کو کھونے کی وجہ سے اسے بھی کھو دیا۔ جب حضرت موسیٰ اپنی قوم کے ساتھ ساحل سمندر پر پہنچے تو آپ کو قوم بنی اسرائیل کے خوف اور ہراسانی کی کوئی انتہا نہیں رہی، چونکہ سامنے سمندر کی غضبناک موجیں تھیں، اور پیچھے تعاقب کرتا ہوا فرعون اور اس کا لشکر، وہ چیخ اٹھے، ”اے موسیٰ کیا اسی لئے تو ہمیں یہاں لایا، ہم تو پکڑے گئے۔“

قال اصحاب موسیٰ انا لمدبر کون۔

موسیٰ کے ساتھی چیخ اٹھے، کہ ”ہم تو پکڑے گئے۔“

ان کا یہ خوف واقعات اور تجربات کی روشنی میں صحیح تھا، اگر فرعون سے بچنے کے لئے وہ سمندر میں کود پڑتے تو ان کا انجام ظاہر تھا، سمندر بغیر کشتی اور جہاز کے پر عافیت گذر گا نہیں بنتا، غرق کرنے میں ظالم و مظلوم، حاکم و محکوم کے درمیان امتیاز نہیں برتا ہے۔

لیکن موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی جانب سے مامور تھے، انھیں اللہ تعالیٰ کے وعدے پر پختہ یقین تھا، اور نور نبوت کے ذریعہ انھیں اس کا علم تھا کہ وہ جس اعلیٰ مقصد کے لئے مبعوث ہوئے ہیں، جس رسالت کا انھیں اعزاز بخشا گیا، وہ اللہ کے نزدیک سمندر کے عمل اور مقصد سے زیادہ اہم اور لائق احترام ہے، آپ نے پورے اعتماد و یقین سے فرمایا۔

کلا ان معی ربی سیہدین۔

ہرگز نہیں میرے ساتھ میرا رب ہے وہ ضرور میری رہنمائی فرمائے گا۔

کیا یہ اعتماد اور یقین اس انسان میں پیدا ہو سکتا ہے جو صرف نیچر پر یقین رکھتا ہو؟ فطرت کے ان آہنی اصولوں پر ہی اس کی نظر ہو جو مظالم و مظلوم میں کوئی فرق نہیں کرتے؟ کیا کسی عام انسان سے یہ ایمانی جملہ ممکن تھا، وہ جملہ جس کی آواز آج تک کانوں میں گونج رہی اور تاریخ میں جس کی بازگشت آج تک سنائی دیتی ہے، سنئے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فاوحینا الی موسیٰ ان اضرب بعصاک البحر، فانفلق فکان کل فرق کا
لطود العظیم، وازلنا ثم الاخرین، وانجینا موسیٰ ومن معه اجمعین، ثم اغرقنا
الآخرین۔

ہم نے موسیٰ کو وحی کے ذریعہ سے حکم دیا کہ ”مار اپنا عصا سمندر پر“ یکا یک سمندر پھٹ گیا

اور اس کا ہر ٹکڑا ایک عظیم الشان پہاڑ کی طرح ہو گیا، اسی جگہ ہم دوسرے گروہ کو بھی قریب لے آئے، موسیٰ اور ان سب لوگوں کو جو اس کے ساتھ تھے ہم نے بچا لیا اور دوسروں کو غرق کر دیا۔

مشعل راہ

تمام انبیاء کرام اگرچہ اشرف ترین خاندان اور افضل ترین نسب رکھتے ہیں، مگر یہ جانتے ہیں کہ دشمن کے مقابلے میں اعلیٰ نسب سے سودمند نہیں، انبیاء تنہا عقل و تجربہ، حواس ظاہری کی کار فرمائی، اپنی طاقت، تنظیم اور تعداد پر اعتماد نہیں کرتے چونکہ ان میں ان کا حریف ان سے بدرجہا فائق ہوتا ہے، بلکہ دونوں کی مادی طاقت میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے، ان حالات میں انھوں نے اللہ تعالیٰ پر اعتماد کیا، ایمان کو مشعل راہ بنایا، اپنے پیام، اعلیٰ اخلاق و صفات کی وجہ سے وہ اپنے دشمنوں سے نمایاں اور ممتاز تھے، ان ہی صفات نے ان کے ساتھیوں کو حیرت انگیز درخشانی و تابانی بخشی تھی۔

وہ معرکہ کارزار میں اللہ پر اعتماد کے سہارے قدم رکھتے تھے، ان کی زبانوں پر اللہ تعالیٰ سے مدد و نصرت، حق کی فتح، باطل کی ناکامی کی دعائیں جاری رہیں۔

تاریخ ساز واقعہ

معرکہ بدر کو ذہن میں تازہ کیجئے، میدان بدر آپ سے زیادہ فاصلے پر نہیں، یوم بدر آپ کی تاریخ میں گننام اور غیر معروف نہیں، غور کیجئے، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۳۱۳ مہاجرین و انصار کی مختصر جماعت کے ساتھ اس دشمن کے مقابلے کے لئے نکلے تھے، جو تعداد، آلات حرب، اسباب و وسائل، شجاعت و بہادری میں کئی گنا زیادہ اور جوش غضب سے مغلوب تھا۔

آپ نے جب اپنے بے سرو سامان ساتھیوں اور دشمنوں کے عظیم لشکر کو دیکھا تو ان دونوں میں کوئی نسبت اور تناسب نہ تھا، اس نازک موقع پر آپ کی سلامت فکر فراست ثبوت اور تجربہ نے یہ محسوس کر لیا کہ ان لمحات میں مسلمانوں کو طبعی قوانین کے حوالے کرنے کے نتیجے میں ان کی کامیابی تو دور کنارہ مدینہ صحیح سلامت لوٹنے کی توقع تک نہیں کی جاسکتی۔

آپ اپنے رب کی طرف انابت اور دعا کے لئے متوجہ ہوئے آپ کو بخوبی علم تھا کہ فتح عطیہ الہی ہے، طبعی نظام اسی نے بنایا ہے، وہ اسے موقوف بھی کر سکتا ہے، آپ یہ جانتے تھے کہ

فیصلہ آسمان سے نازل ہوتا ہے، زمین سے پیدا نہیں ہوتا، حکم، قوت اور فتح کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، آپ نے اپنی جبین مبارک خاک پر رکھی، الحاح و زاری، عاجزی و در ماندگی سے اس طرح دعائیں مانگیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ سے آپ کی یہ حالت نہ دیکھی گئی اور بے چین ہو کر انھوں نے فرمایا۔

حسبک یا رسول اللہ
بس بس اے اللہ کے رسول

دعاء کا پاسنگ

معرکہ بدر تاریخ کا مشہور فیصلہ کن معرکہ ہے، جس کے سایہ میں ہم زندہ ہیں، ہماری حکومتیں، ہم میں مختلف رنگ و نسل کی مسلمان قومیں، یہ سب بدر کی پروردہ ہیں، اور بدر اس دعوت و پیام کارہین منت ہے، جسے آنحضرت صلعم لائے تھے، بدر میں دو مقابل لشکر نہیں تھے، بلکہ دونوں عدد، اسباب و وسائل میں عدم تناسب کے اعتبار سے گویا دو مختلف پلڑے تھے، ایک پلڑا اپنے بوجھ سے زمین کو چھو رہا تھا یہ کٹارہ، مشکریں کا پلڑا تھا، دوسرا بے وزنی کی وجہ سے فضا میں معلق تھا، یہ اہل ایمان کا پلڑا تھا۔ آنحضرت صلعم نے اپنی دعاؤں میں نصرت الہی کا پاسنگ مسلمانوں کے پلڑے میں ڈال دیا۔

آپ نے زمین پر اپنی پیشانی رکھی اور وہ جملہ فرمایا جو بلاشبہ مسلمانوں کی اس قلیل تعداد کی بقا بلکہ امت کی بقا کا حقیقی سبب تھا، آپ نے فرمایا:

اللهم ان تہلک هذه العصابة لن تعبد.

اے اللہ اگر یہ مختصر جماعت ہلاک ہو گئی تو تیری عبادت نہیں کی جائے گی۔

اللہ تعالیٰ نے اس جماعت کی نصرت فرما کر اس کی تصدیق کی۔

تاریخ میں آج بھی یہ واقعہ زندہ اور اس کے آثار اس دنیا میں تابندہ ہیں، انسانوں کی فلاح و بہبودی اسی جماعت سے منسلک ہے، جن کی بقا کی دعا میدان بدر میں ایک آزمائش کے موقع پر اتنے بلیغ انداز میں پیغمبر اسلامؐ نے کی تھی، دین اخلاق فاضلہ، انصاف، احترام انسانیت کا وجود بدر کی اسی مختصر جماعت کا مرہون منت ہے۔

”فیصلہ تیرا تیرے ہاتھوں میں ہے، دل یا شکم؟“

اگر آپ چاہیں تو ان تمام حقائق کو ضائع کر دیں، اس تمام دولت و ثروت کو تلف کر دیں تمام انبیاء و آباء، اور مصلحین کی کوششوں کو مٹا دیں تو انسان باقی رہے گا، مگر انسانیت فنا ہو جائے گی، جسم متحرک ہوگا، مگر روح پر موت طاری ہو جائے گی، اب یہ فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے، اللہ تعالیٰ نے جنگ بدر میں مسلمانوں کو دیا جو فتح و سیانی دی، دشمن اپنی قوت و کثرت کے باوجود ناکام رہا، اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا:

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ بِبَدْرٍ وَأَنْتُمْ أَذِلَّةٌ فَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُشْكُرُونَ.

آخر اس سے پہلے جنگ بدر میں اللہ تمہاری مدد کر چکا تھا حالانکہ اس وقت تم بہت کمزور تھے لہذا تم کو چاہئے کہ اللہ کی ناشکری سے بچو، امید ہے کہ اب تم شکر گزار بنو گے۔

بحر و بر پر حکمرانی

اس آپ کے سامنے ایک دوسرا واقعہ بیان کرتا ہوں حالانکہ میں داستان گوئی کا شائق نہیں ہوں۔ جو واقعہ میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں، اس میں ایک پیام ہے، اور نئے معانی پنہاں ہیں۔ اب سعد بن ابی وقاص مدائن کی فتح کے ارادہ سے روانہ ہوئے، تو دریائے دجلہ میں طغیانی تھی، موجیں اٹھ رہی تھیں، ایرانیوں نے تمام پل اور آبی گذرگا ہوں کو توڑ دیا تھا، اور کشتیوں اور جہازوں کو دور کر دیا تھا، سعد بن ابی وقاص اپنے ساتھیوں کے ساتھ دریا کے ساحل پر چند لمحے رکے غور کیا اور فرمایا ساتھیو! کیا خیال ہے، لوٹ جائیں یا جہلہ میں کود پڑیں اور پار ہو جائیں؟

مسلمان اس دور میں اس بات پر پختہ یقین رکھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں ایک عظیم مقصد کے لئے پیدا کیا ہے، انسانیت کی نجات انھیں کے ذریعہ ممکن ہے، اللہ تعالیٰ انسانیت پر مہربان ہے، اور اس نے انسان کو بیکار نہیں پیدا کیا۔

افحسبتم انما خلقناکم عبداً و انکم الینا لاترجعون.

کیا تم نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ ہم نے تمہیں فضول ہی پیدا کیا اور تمہیں ہماری طرف کبھی پلٹنا

ہی نہیں ہے۔

مسلمان یہ جانتے تھے کہ وہ اسلام کے نمائندے، اس کی روشنی کے مینار اور اسلامی دعوت کے مشعل بردار ہیں، وہ دنیا کی تمام قوموں میں واحد جماعت تھی، جو اس مقصد کی خاطر تیار کی گئی تھی، رہا و جلد تو اس طرح کے ہزاروں دریا ہیں، لہذا و جلد کو یہ کیسے اجازت دی جاسکتی تھی کہ وہ اس لشکر کو غرق کرے جس کو کوئی مادی غرض نہیں، جو جزیرہ عرب سے اس لئے نکلا کہ ایک تخت کے بجائے دوسرا تخت بچھائے، ایک حکومت کے بجائے دوسری حکومت کرے، ایک بادشاہت کو دوسری بادشاہت میں تبدیل کرے، ایرانیوں سے قیادت و سیادت چھین کر عربوں کو پیش کرے اور کسریٰ کا تاج لے کر اسے عمر (رضی اللہ عنہ) کے سر پر رکھے، یہ باتیں مسلمانوں کے لئے جائز نہیں۔

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی

(اقبال)

ان کی مہم کی غرض یہ رہتی تھی جیسا کہ ان میں سے ایک نے کہا ہے ”اللہ نے ہمیں بھیجا ہے تاکہ ہم انسانوں کو بندوں کی غلامی سے نکال کر عبادت کی طرف رجوع کریں، دنیا کی تنگی سے آخرت کی وسعت کی طرف لائیں، مذاہب کے ظلم و جبر سے اسلام کے عدل و انصاف کی طرف بلا لائیں۔“

یہ جان کر کہ اب سوائے اللہ پر اعتماد کے کوئی چارہ نہیں اگر اللہ تعالیٰ کو یہ منظور ہوگا، کہ یہ لشکر باقی رہے اپنے پیام کو پہنچائے اور اپنے دین کو پھیلانے اور لوگوں کو کفر کی تاریکیوں سے نکال کر ایمان کی روشنی کی طرف لے جائے اور ان پر پڑی ہوئی ظلم و ستم کی زنجیروں کو دور کر دے تو اللہ تعالیٰ یقیناً دریائے و جلد کو اس پہ مامور کرے گا کہ وہ اسلامی لشکر کے لئے راستہ دے دے۔

مومنانہ فراست

حضرت سعدؓ نے اس موقع پر حضرت سلمان فارسیؓ سے مشور کیا، انھوں نے جواب دیا، ”بیشک اسلام ایک تازہ پیام ہے“ یہ جملہ میرے قلب و ذہن کو بہت متاثر کرتا ہے، کیونکہ اس میں بڑے گہرے معانی مضمر ہیں، اس جواب میں مومن کی ذہانت کا نور جھلکتا ہے، میری مراد عقل عام نہیں بلکہ فراست مومن ہے، جس کا یہ جملہ بہترین نمونہ ہے۔

حضرت سلمانؓ نے فرمایا ”بجدا تری ان کے لئے ایسے ہی زیر کردی جائے گی، جیسے نشئی مسخر کی گئی تھی، اس میں سے فوج در فوج لوگ نکلیں گے، جیسے فوج در فوج داخل ہوئے“۔ سلمان کے قول کے معنی یہ ہیں کہ اللہ اس پر قادر ہے کہ اس دنیا کو تمام ادیان پر غالب کرے چونکہ اسلام نے ابھی تک اپنی مہم پوری نہیں کی، اس کے سامنے وسیع میدان ہے، بہت سی قومیں اور قبائل ہیں متمدن ممالک ہیں اور یہ پوری دنیا اس دعوت کی منتظر ہے، جس کے وہ حامل ہیں، ان اخلاق و صفات کی منتظر ہے، جن سے یہ آراستہ ہیں، دنیا اس نجات دہندہ سپاہ کی منتظر ہے۔ حضرت سلمانؓ نے سچ کہا کہ میری مومنانہ عقل اسے قبول نہیں کرتی کہ ہم غرق ہوں گے اور دجلہ ہمیں نکل لے گا، اللہ تعالیٰ اسے ضرور حکم دے گا اور مامور کرے گا کہ وہ ہمارے لئے راہ دے اور تاریخ اس سے گواہ ہے کہ ہوا بھی یہی۔

ایمان و عقیدہ کا نظام

یہ دو خدائی نظام ہیں، جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، ایک طبعی نظام اقلیت پر اکثریت کا غلبہ، ضعف پر طاقت کا غلبہ، انتشار پر اتحاد کا غلبہ، بد نظمی پر انتظام کا غلبہ، کمزور ارادے پر قوی ارادے کا غلبہ اور کابلی و جہالت پر علم و مستعدی کا غلبہ، یہ ایک قدیم نظام ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا ہے، اور اس کا حکم اور قانون اس وسیع و عریض دنیا اور انسانیت کے بڑے حصے میں جاری و ساری ہے۔

لیکن جیسا کہ عرض کر چکا ہوں ایک دوسرا نظام بھی ہے، وہ ایمان و عقیدے کا نظام، اخلاق و صفات اور دعوت و پیام کا نظام ہے، اور یہی وہ سلاح ہے، جس کے ذریعہ مومن جنگ کرتا ہے، اور کامیابی سے ہمکنار ہوتا ہے، یہی وہ ہتھیار ہے، جس کو لے کر عرب، جزیرہ عرب سے نکلے تھے، پھٹے کپڑے، ٹوٹے جوتے، خالی پیٹ اور بغیر زین کے گھوڑوں کے ساتھ، لوگ انھیں حقارت سے دیکھتے اور مذاق اڑاتے اور کہتے ”انھیں ان کے جزیرہ سے بھوک اور برہنگی نے نکالا ہے، انھیں خوب کھلاؤ اور پلاؤ یہ اپنے وطن لوٹ جائیں گے۔“

موجودہ عربوں کی دونوں نظاموں سے بغاوت

یہ دو خدائی نظام ہیں لیکن جب کوئی فرد یا جماعت ان دونوں نظاموں کو چھوڑ دیتی ہے اور

ان دونوں سے بغاوت کرتی ہے، یعنی نہ نظام طبعی کے تقاضے پورا کرتی ہے اور نہ، عین و احد حق ہی کے نظام ہی کو اپناتی ہے تو اس کا کیا انجام ہو سکتا ہے؟

آج کے عربوں میں خواہشات کی پیروی، باہمی رزم آرائی، اپنی قومیت پر فخر اور سرفرازی، حوصلے و عزت اور بلند پائے فخر ہے، بے معنی شور و غوغا ہے، بد نظمی و بے تدبیری ہے، کیا ایسا ملک اور ایسی نوجوان قوت مستحق ہو سکتی ہے؟

نسب و نسب

اللہ تعالیٰ: انسان کے درمیان نسب کا وہی رشتہ نہیں، اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو متنبہ فرمایا تھا۔

وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصَارَىٰ نَحْنُ أَبْنَاءُ اللَّهِ وَأَحِبَّائُهُ، قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوبِكُمْ، بَلْ أَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ۔

یہود و نصاریٰ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے ہیں اور اس کے چہیتے ہیں ان سے پوچھو پوچھو تمہارے گناہوں پر کیوں سزا دیتا ہے، اور حقیقت تم بھی ویسے ہی انسان ہو جیسے اور انسان خدا نے پیدا کئے۔

خدا کسی انسان کو دوسرے انسان پر، کسی فرد کو دوسرے فرد پر، ایک قوم کو دوسری قوم پر، نسب، قومیت، ذات و برادری کی بنیاد پر فضیلت نہیں دیتا، وہ انسانوں کو ان کی دیانت و تقویٰ والی زندگی پر افضل قرار دیتا ہے۔

اِنْ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ اتَّقَىٰكُمْ۔

اور خدا کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔

وہ جس کے غلام بالالہ کو قریش کے معزز زہد دار ابو جہل سے افضل قرار دیتا ہے۔

۱۵/ جون کی جنگ

جب ہم اس جنگ میں کودے تو گویا ہم تہی دامن تھے، نہ ہمارے پاس طبعی نظام تھا، جو ہم میں بیداری، احتیاط، اتحاد باہمی، جہت، ایثار، قربانی، سرفروشی اور شجاعت پیدا کرتا، ہمیں محنت و مشقت کا عادی بناتا اور دنیاوی چمک و دمک کی حقارت، ہمارے دلوں میں پیدا کرتا، ہم اس طبعی قانون کے بھی پوری طرح پابند نہیں تھے، نہ ہمارے پاس وہ مقدس نظام ہی تھا، جس کی

کامیابی کی ضمانت اللہ تعالیٰ نے کی ہے، اور فرمایا ہے:

و ان جندنا لهم الغلبون۔

اور بیشک ہمارا لشکر ہی غالب ہو کر رہے گا۔

اگر اللہ تعالیٰ یہ فرماتا کہ ”ان جندنا الغالبون“ تو کافی تھا، یہ فرماتا کہ ”ان جندنا للغالبون“ تب بھی کافی تھا، لیکن بات میں زور، یقین اور وزن پیدا کرنے کے لئے فرمایا گیا:

انهم لهم المنصورون، و ان جندنا لهم الغلبون۔

یقیناً ان کی مدد کی جائے گی اور بیشک ہمارا لشکر ہی غالب ہو کر رہے گا۔

اذا لننصررسلنا والذين امنوا فى الحياة الدنيا ويوم يقوم الاشهاد

یقین جانو کہ ہم اپنے رسولوں اور ایمان لانے والوں کی مدد اس دنیا کی زندگی میں بھی

اذا مآ کرتے ہیں اور اس روز بھی کریں گے جب گواہ کھڑے ہوں گے۔

جنگ کے زمانہ میں مصر کی اخلاقی و دینی حالت

ہم جب میدان جنگ میں پہنچے تو ہم نے ہوائی باتوں، بے سرو پا دعویٰوں پر اعتماد کیا، ہم دشمن سے عالم خیال میں معرکہ آرائی کرتے رہے، لہذا اندو خواہشات کے غلام بنے رہے، ان قوموں کی طرح جن کی مثالیں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بکثرت بیان فرمائی ہیں، نہ جاتے ہم کس انجام کے منتظر تھے؟

میں آپ کے معاملہ میں صاف گوئی اور حق گوئی پر مجبور ہوں کیوں کہ میں جب دنیا کے کسی خطہ میں بھی جھوٹ سے پناہ مانگتا ہوں تو رسول اللہ کے جوار اور ان کی مسجد کے زیر سایہ غلط بیان سے کیوں کام لوں؟ ہماری زبردگی کا جو رخ تھا اور ہے اس کا اندازہ تو ہمارے ریڈیو اور ہماری صحافت سے بخوبی ہو جاتا ہے۔

صرف زمانہ جنگ اور اس سے چند دن قبل کے اخبارات و رسائل پڑھئے کیا یہ اخلاق اور یہ طریقہ زندگی اللہ اور اس کے رسول کی رضا کا موجب ہو سکتا ہے؟ کیا ام کشوم (۱) کے گیت اللہ تعالیٰ و رسول کی رضا اور فتح و کامرانی کے نزول کا ذریعہ بن سکتے ہیں؟ کیا نائٹ کلب، عریائی و بے حیائی کے اڈے، جسے ہمارے بھائیوں نے اس ملک میں نئی زندگی بخشی جس پر مقدس اسلامی مقامات کے دفاع کی سب سے بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، ہمیں رسولانی

وہزیمت سے بچا سکتے ہیں؟

ایک غیر عرب بادشاہ کا عمل

مسلمانوں پر تو یہ لازم تھا کہ وہ ہنگامی حالات میں رہتے، اور ہمیشہ مستعد اور تیار رہتے، اپنے آپ پر اللہ کی مباح کی ہوئی لذتیں تک حرام کر لیتے، اور ان پہ بے چینی اور ہمہ وقت بے کلی طاری رہتی، زندگی ان کے لئے تلخ ہو جاتی، یہ سانحہ اس کا متقاضی تھا، تاریخ میں ایک غیر عرب بادشاہ نے یہی کر کے دکھایا ہے، جب شہنشاہ بابر (اس سلطنت مغلیہ کا بانی جو سواڑھے تین سو سال تک ہندوستان میں رہی) کا مقابلہ اس کے دشمن رانا سانگا کے لشکر سے ہوا تو یہ دونوں لشکر تعداد و اسباب کے اعتبار سے بین فرق رکھتے تھے، بابر کے ساتھ صرف بیس ہزار سپاہی تھے، اور رانا کا لشکر ایک لاکھ سپاہیوں پر مشتمل تھا۔

بابر شراب کا رسیا تھا، تاریخ میں یہ مشہور بات ہے کہ وہ ہمہ وقت شراب میں مست رہتا مگر اس نازک اور آزمائشی موقع پر اس نے کامیابی کے لئے دعا کی اور شراب اور تمام شرعی محرمات اور منکرات سے توبہ کی اور میدان جنگ میں کود پڑا، دشمن سے زبردست جنگ کے بعد عظیم الشان فتح حاصل کی، اور اس وسیع مسلم حکومت کی بنیاد رکھنے میں کامیاب ہوا، جس کے لازوال اجتماعی و تمدنی آثار اب بھی باقی ہیں۔

حقیقت پسند فوجوں کا یہ طرز ہوتا ہے، اور حقیقت دوست لوگ ایسے ہوتے ہیں، رہا شکست خوروں کا حال تو ان کی داستانیں مشہور ہیں۔ انھیں مجھ سے زیادہ آپ جانتے ہیں۔ کیا یہ رزم و جنگ الف لیلہ کے ڈراموں میں سے کوئی ڈرامہ ہے کہ کوئی طاغفہ کوئی تمثیل مزاحا اور تفریح پیش کرے، یہ بادشاہ، وہ وزیر یہ فوجی وغیرہ جب کوئی حقیقی مسلح لشکر آ جاتا ہے تو مسخروں کی فوج بھاگ کھڑی ہوتی ہے اور ڈرامہ دھڑارہ جاتا ہے۔

نمائشوں، ڈراموں کا خاص موقع ہوتا ہے، یہ امن آسائش کا زمانہ اور اطمینان و فراغت کے ماحول میں کئے جاتے ہیں۔

شکست تعجب خیز نہیں

اب ایسی صورت میں ہم کیوں نہ اس نکتہ و ذلت اور رسوائی کے مستحق ہوتے جو ۵ جون

کے سانچے میں ہمارے حصہ میں آئے۔

اللہ تعالیٰ کی بے شمار صفات میں سے ایک صفت عدل بھی ہے ہم سب کا اس پر ایمان ہے، میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہم واقعی اس شکست کے مستحق تھے، شکست کا ہونا تعجب خیز اور حیرت انگیز اور بعید از قیاس نہیں اس کے برعکس ہوتا تو حیرت اور تعجب کی بات تھی۔

کیا اللہ تعالیٰ ان نام نہاد مسلمانوں کی مدد کرتا جو اپنے بھائیوں کے دشمن اور اپنے دشمن کے بھائی ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

محمدا رسول اللہ والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینہم۔

محمد خدا کے پیغمبر ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں کے حق میں تو سخت ہیں اور

آپس میں رحم دل۔

یمن کی داستان غم^(۱)

مگر ہم دشمنوں کے بارے میں رحم دل اور آپس میں انتہائی سنگدل ہیں، اس غریب یمن کا کیا قصور تھا؟ اسے اپنی بہادری، جنگ آزمائی اور انتقام کا مرکز و میدان کیوں بنایا گیا؟ یہ شجاعت اپنے حقیقی دشمن کے خلاف کیوں استعمال نہیں کی گئی؟ مگر مصریوں کا حال تو اس شعر کے مصداق ہے۔

نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغ

سر دوستان سلامت کہ تو خنجر آزمائی

ظلم و ستم کے شکار یمنی مسلمانوں کے خون ناحق کی پریش جب اللہ تعالیٰ فرمائے گا، تو ان کے پاس کیا جواب ہوگا؟ وہ منصف حقیقی تو قرآن مجید میں فرماتا ہے:-

وَإِذَا الْمَوْدَةُ سَنَلَتْ، بَايَ ذَنْبٍ قَتَلَتْ.

(۱) مصرین کا اندازہ ہے کہ اس بے مقصد اور بلا وجہ جنگ کے نتیجے میں جو مصر کی طرف سے یمن کے خلاف لڑی گئی دو لاکھ مسلمان شہید ہوئے، مصریوں نے اس جنگ میں وحشت و بربریت کے تمام ریکارڈ توڑ دیئے، جنگ کے زمانے میں غاروں میں پناہ لینے والے غریب یمنی عرب مسلمانوں پر زہریلی گیس چھوڑی جاتی تھی، جس کا استعمال بین الاقوامی قانون جنگ کے خلاف اور اقوام متحدہ کے اصول حقوق انسانی کے منافی ہے، شدید سردی میں مصری جہاز یمن میں گرم سیونر گراتے غریب یمنی اسے ایک نعمت سمجھ کر پہنتے مگر اس میں موت پوشیدہ ہوتی تھی، ان اونٹنی سوئٹروں میں ایسے بم پوشیدہ ہوتے جو پہننے والے کے جسم کے چیتھڑے اڑا دیتے۔

جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ پر قتل کی گئی۔
ایک نوزائیدہ بچی کے قتل ناحق پر جو مہم جاہلیت میں زندہ دفن کی جاتی تھی، اللہ تعالیٰ
کے یہاں اس کے قاتل سے پریش ہوگی تو قوم کی اتنی بڑی تعداد کے قاتل قیامت میں اپنا
دامن کیسے چھڑا سکیں گے۔

قریب یارو ہے روزِ محشر، چھپے گشتوں کا خوں کیونکر
جو چپ رہے گی زبانِ خنجر، لہو پکارے گا آستیں کا
وہ اہل یمن جن کے متعلق حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا:
اتاکم اهل اليمن، ارق افئدة و الین قلوباً، الایمان یمان، والفتہ یمان،
والحکمتہ یمانیہ (صحیح بخاری)

تمہارے پاس یمن کے لوگ آئے ہیں، جن کے دل سب سے زیادہ نرم اور رقیق ہیں،
ایمان یمن کا حصہ یہ، دین کی سمجھ یمن کی سوغات ہے اور حکمت یمن کا مال ہے۔
اس قوم کا کیا تصور تھا؟ کیوں یہ اس تباہی کا مستحق قرار دی گئی؟

”نغمہ ہندی ہے تو کیا، لے تو حجازی ہے مری“

یہ میری قسمت میں نہیں تھا کہ میری پیدائش اس مقدس مقام پر ہو، اللہ تعالیٰ کی حکمت
اور مشیت کہ میں بہت دور پیدا ہوا، میری نشوونما ایسے ملک میں ہوئی جہاں عربی زبان بولی نہیں
جاتی، یہاں ہمارے استاد علامہ تقی الدین ہلالی^(۱) مراکشی تشریف فرما ہیں، ان سے ہمارے
ملک کے متعلق دریافت کیجئے، یہ عرصہ تک وہاں مقیم رہے، ایک ایسا ملک جو مرکز اسلام سے
طویل فاصلے پر ہے، وہاں کے لوگ عربی زبان سے بہت کم واقف ہیں، مگر الحمد للہ اپنے
اسلامی عقیدے پر نازاں ہیں، ہمارا اس پر پختہ عقیدہ اور ایمان ہے کہ ہماری سعادت، کامیابی
اور بقا کار از حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع ہی میں مضمر ہے، ہمارے شاعر نے کہا ہے نہ

(۱) علامہ ڈاکٹر تقی الدین ہلالی مراکشی عرصہ تک دارالعلوم ندوۃ العلماء میں مدرس رہے، موصوف کے شاگردوں میں اس
کتاب کے مصنف کے علاوہ مولانا مسعود عالم صاحب ندوی مرحوم، مولانا محمد ناظم صاحب ندوی، مولانا ابواللیث
صاحب ندوی، مولانا حافظ محمد عمران خان صاحب، ندوی اور کئی حضرات ہیں، جنھوں نے علمی، دینی، سماجی اور تعلیمی
میدان میں ممتاز مقام حاصل کیا۔

محمد عربی کا بروئے سرہ دوسرا ست

کے کہ خاک درش نیست خاک بر سراو

حضرت محمد صلعم کی قیادت کو تسلیم کئے بغیر ہم کبھی فوز و فلاح نہیں پاسکتے، اگر آپ نے اس

سے انکار کیا جیسا کہ عرب قومیت کے رہنماؤں نے یا بے قواس کے نتیجہ میں تائیدِ شیعہ فتح

و نصرت اور عزت و سر بلندی سے ہم محروم ہو چائیں گے، اللہ تعالیٰ نے عربوں کی ترقی

و سر بلندی اور مستقبل کو حضرت محمد صلعم کے دامن سے وابستہ رکھا ہے، کسی اثباتِ اک نیدر اور

قومیت کے رہنما سے نہیں۔

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں

یہ جہاں چیز ہے کیا، اوج و قلم تیرے ہیں

نہ صرف عربوں کی بقاء ترقی، عزت و سر بلندی اور فتح و کامرانی کا انحصار محمد رسول اللہ کی

غلامی اور پیروی میں ہے، بلکہ آپ کی بعثت کے لمحے سے قیامت تک تمام دنیا کے انسانوں کی

فلاح و بہبود، سعادت و نجات آپ ہی کے نقش قدم کے اتباع اور دامن سے وابستگی میں ہے۔

عرب قومیت کے علم برداروں نے کیا دیا؟

حیوانات کی بڑی تعداد، واقعات اور تجربات سے فائدہ اٹھاتی ہے، سبق حاصل کرتی

ہے، ہم کیوں نتیجہ نہیں نکالتے؟ نفع اور نقصان کا گوشوارہ نہیں تیار کرتے؟ ہمیں ان عرب

قومیت کے زعماء اور انتہا پسند ملحد لیڈروں نے کیا دیا؟ کس برے انجام کے رخ کو انھوں نے

موڑا؟ کون سی آفت ٹالنے میں یہ کامیاب رہے؟ کون سا کھویا ہوا اعتماد انھوں نے دوبارہ

حاصل کیا؟ اقتصادی اور معاشی خوشحالی لانے میں یہ کب کامیاب رہے؟ صنعت و حرفت ایجاد و

اختراع میں عرب ممالک کی پسماندگی اور محتاجی کہاں ختم ہوئی؟ انھوں نے تو ہماری تابناک

تاریخ پر سیاہی پھیر دی، ہمارے رعب و اثر کا بڑا حصہ لوگوں کے دلوں سے زائل کر دیا، ہمیشہ

اپنی اسلامی عربی تاریخ پر فخر کیا کرتے تھے،..... مگر آج..... عام مجلسوں میں اس کا حوالہ

دینا دشوار ہو گیا ہے، جو عظمت رفتہ ہمیشہ حال و مستقبل میں حوصلہ دیتی رہی وہ ان لیڈروں کی

بے دانشی کی نذر ہو گئی۔

عرب قومیت میں غیر عربوں کے لئے کوئی کشش نہیں

یہ کوئی دانش مندی کی بات اور عقل مندی کا تقاضا نہیں کہ ہندوستان، پاکستان، انڈونیشیا، ترکی، ملیشیا کا انسان تمہاری عرب قومیت کی وجہ سے تمہارا احترام کرے، وہ تو اسلام، ایمان اور انسانیت کی ہدایت کے لئے تمہاری تاریخی کوششوں کی بنا پر تمہارا احترام کرتا ہے، کمزوروں کی دستگیری، ظالموں کی سرکوبی یہ تمہارا شعار رہا، تمہارے اعلیٰ اخلاق و صفات اور اسلامی دعوت سے تمہاری وابستگی نے مشرق و مغرب کے مسلمان کے دل میں تمہاری محبت جاگزیں کی اور ان ہی خصوصیات کی وجہ سے اسلامی دنیا نے تمہیں ہمیشہ اپنے سینے سے لگایا، اور محبوب رکھا، صدیوں پہلے جزیرۃ العرب سے نکل کر تم نے اسلام کی روشنی و سربلندی تک پہنچائی، افغانستان، ایران، سمرقند، بخارا یہ سب تمہارے زیر نگیں ہو گئے، یہ وہ ممالک ہیں، جن کی تاریخ شکست سے ہمیشہ نا آشنا رہی، انہوں نے کبھی تلوار کی دھار کے آگے گردن نہیں ڈالی، انہیں اسلام نے شکست دی، اسلام کے اعجاز، اس کے پیام و دعوت کے آگے یہ جھک گئے، عربوں نے انہیں اپنا غلام نہیں بنایا بلکہ اسلام نے انہیں اپنا حلقہ بگوش کیا، یہ انصاف، مساوات اور انسانیت کی خیر خواہی کے ان مظاہر کے آگے سپر انداز ہوئے جنہیں تم لے کر پہونچے تھے جس دعوت سے دنیا کی مختلف رنگ و نسل کی قومیں متاثر ہوئیں، جسے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے اور جس میں پوری انسانیت کی فلاح و نجات کا سامان تھا۔

قومیت عربیہ اور عالم انسانیت

مجھے بتائیے کہ عالم انسانیت کے لئے قومیت عربیہ کے پاس کیا پیام اور کون سا فلاحی پروگرام ہے؟ تمام بنی نوع انسان کی کون سی بہتری کسی بھی قومیت کی دعوت میں ہے؟ قوم، جنس، رنگ و نسل کے حریف تو ہر جگہ ہیں، اگر تمہیں اپنی عرب قومیت پر فخر ہے تو دنیا میں سینکڑوں قومیں ہیں جنہیں اپنی اپنی قومیت پر فخر ہے، کسی قومیت کو دوسری قومیت یا کسی قدیم تہذیب و کلچر پر اپنی دوسری قدیم تہذیب کو کوئی افضلیت نہیں، افضلیت تو اس پیام کے لئے ہے، جسے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش فرما گئے۔

دنیا تمہاری منتظر ہے

اے عربو! اسلامی دنیا تمہارا احترام کرتی ہے، اس کی قدر کرو، اسلامی غیرت اور انسانی ہمدردی کے باقی ماندہ اثاثے کو لے کر اٹھو، دنیا تمہاری منتظر ہے کہ تم اسے اس بیسویں صدی کی جہالت سے نکالو، جس نے اسے پامال اور مشرق و مغرب کو مسموم کر دیا ہے، قیادت اور ہدایت کے اپنے دیرینہ منصب و مقام کی طرف لوٹو، آفاق کی وسعتوں میں دعوت اسلامی کا فریضہ انجام دو، کامیاب اور کامرانی ہر معرکہ میں تمہارے ہم رکاب ہوگی۔

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی
تو اگر میرا نہیں بننا نہ بن اپنا تو بن

”ان تنصروا اللہ ینصرکم ویثبت اقدامکم“

اجتہاد اور فقہی مذاہب کا ارتقاء

الحمد لله وكفى وسلام على عباده الذين اصطفى . اما بعد

اسلام کی دائمی حیثیت:

حضرات! یہ بنیادی حقیقت ہے کہ زندگی متحرک اور ترقی پذیر ہے، ہمیشہ جوان رہتی ہے، اس میں نشوونما کا عمل مسلسل جاری رہتا ہے، ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ نیز ایک رنگ سے دوسرے رنگ میں دھلتی رہتی ہے۔ اسے جمود یا گھبراہٹ نہیں ہوتا، نہ ہی یہ بڑھاپے اور تعطل کا شکار ہوتی ہے۔ اس کے طویل اور مسلسل سفر میں وہی حرکی دین اس کے ہم رکاب ہو سکتا ہے جو نہ زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہے، نہ ہی اس سفر سے عاجز آئے، بلکہ اس کے قدم سے قدم ملا کر چلے۔ اور اس کا جو ہر حیات اور ارتقاء ختم نہ ہو۔ اسلام ہی ایسا دین ہے۔ اگرچہ اس کا خمیر پختہ عقائد اور ابدی حقائق سے اٹھایا گیا، تاہم وہ زندگی سے لبریز اور ارتقاء سے پر ہے۔ اس کے بال ایسا جو ہر حیات موجود ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا اور ایسا مواد ملتا ہے جو کم نہیں ہوتا۔ یہ دین ہر زبان و مکان کے لئے عمل ہے۔ اس کے پاس ایسی روشنی ہے جو زندگی کے ہر نئے انداز کے لئے نسل انسانی کے لئے تاریخ کے ہر دور میں، یکساں مفید ہے۔ اکثر مسلمانوں کے عقیدے کے برعکس اور بہت سے مستشرقین اور مغربی مورخین کی پیش کردہ تصویر کے برخلاف، اسلام کی ایک دور کی تہذیب نہیں، نہ ہی کسی خاص تاریخی دور کی صنعت و حرفت سے عبارت ہے کہ وہ اسی دور کے آثار و قواعد کی نمائندگی کرے۔ پتھروں، رسومات اور تصاویر میں زندہ رہے جبکہ حقیقی زندگی سے اسے کوئی تعلق نہ ہو، اور مسائل زیست کو اپنے پیغام کی روشنی میں حل کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو جیسا کہ یونانی اور رومی تہذیبوں نیز ترکی اور مغلیہ صنعت و حرفت کے۔۔۔ میں کہا جاتا ہے۔

بلکہ وہ ایک زندہ ایسا ہے۔ یہ پیغام ابدی ہے، وہ زندگی کی طرح زندہ اور فطری حقائق

اور زندگی کے قوانین کی مانند ابدی اور دائمی ہے۔ کیونکہ اسے عطا کرنے والا طاقت والا، غالب اور جاننے والا ہے۔

صنع الله الذي اتقن كل شيء (سورۃ النمل آیت ۸۸)

(ترجمہ) اللہ کی کارگیری ہے جس نے ہر چیز کو خوب پختہ طور پر بنایا ہے۔

اليوم اكملت لكم دينكم واتممت عليكم نعمتي ورضيت لكم

الاسلام دینا

(ترجمہ) اب ہم تمہارے دین کو تمہارے لئے کامل کر چکے اور ہم نے تم پر اپنا احسان پورا

کر دیا اور ہم نے تمہارے لئے (اسی) دین اسلام کو پسند کیا۔

اس دین کو کاملیت حاصل ہے، اس کے بعد کسی اور دین کا انتظار نہیں ہوگا، اس کی موجودگی میں کسی نئے پیغام کی ضرورت نہیں۔ اس میں ایسا جو ہر حیات موجود ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا اور اس میں نمو کی وہ کیفیت ہے، جس کی کوئی انتہا نہیں۔ اسی وجہ سے وہ ایک طرف زندگی کے دوش بدوش اور اس کے قدم سے قدم ملائے رہاں دواں ہے، تو دوسری جانب اس کی اصلاح اور درستگی کے لئے اس کی نگرانی اور رہنمائی کرتا ہے، اور اس کی کجی اور گمراہی کو درست کر دیتا ہے۔ وہ بہت سے تحریف شدہ ادیان کی طرح ترقی کی راہ میں حائل نہیں، نہ ہی وہ بہت سے نظری فلسفوں کی طرح جامد نگران ہے یہ زندہ انسانوں کے لئے زندہ اور کامل دین ہے جو انسانی شعور کا ادراک رکھتا اور اس کی ضروریات کا انتظام کرتا ہے، مشکلات میں اس کی رہنمائی کرتا اور برائی کی جانب جانے سے اسے روکتا ہے۔

امت مسلمہ، شریعت اسلامیہ، اور انسانی زندگی:

امت مسلمہ اس امر کی صلاحیت رکھتی ہے کہ وہ لاتعداد تغیرات، غیر محدود اور قیاس کی حد سے فزوں تر مسائل کا حل پیش کرے۔ چنانچہ وہ زمان و مکان کے خلاف اور لباس و ماحول کی بوجہ قلمونی کا دو قوتوں سے مقابلہ کر سکتی ہے۔

دوسری اور تیسری صدی ہجری میں اجہاوا اور مجتہدین:

اسلام جزیرۃ العرب میں طلوع ہوا یہاں زندگی سادہ اور تہذیب اپنے ابتدائی دور میں

تھی۔ وہاں سے اسلام ایسے وسیع اور زرخیز علاقوں میں پھیلا جو قدیم تہذیبوں کے مراکز اور وسیع علاقوں پر مشتمل تھے جیسے شام، عراق، مصر اور ایران۔ یہاں سماجی زندگی وسیع ہو چکی تھی۔ تجارت، حکومت، زراعت، آبپاشی اور ٹیکسوں کے نظام رائج تھے۔ سب سے اہم جو مسئلہ درپیش تھا وہ یہ تھا کہ اسلامی اصولوں کو ان امور اور مسائل سے ہم آہنگ کیا جائے اور معاشرے کو اسلامی اصولوں کو ان امور اور مسائل سے ہم آہنگ کیا جائے اور معاشرے کو اسلامی روح اور سیاسیات کا تابع بنایا جائے۔ یہ کام بلند پایہ ذہانت، باریک بینی اور ہم عصر معاشرے سے مسلمانوں کی گہری واقفیت کا متقاضی ہے اس کے ساتھ نفسیات اور انسانی فطرت سے کامل آگہی نیز قوم کے مختلف گروہوں اور زندگی کے زاویوں کے بارے میں وسیع تجربہ چاہتا ہے۔ مزید برآں وہ یہ بھی مطالبہ کرتا ہے کہ کتاب و سنت میں موجود دین کے فقہی سرمایہ کی وسیع معلومات حاصل ہوں، علم کے بنیادی آخذ اور اسلامی قانون سازی کے اساسی قواعد میں مہارت نیز عربی زبان میں مہارت اور کمال حاصل ہو۔ کیونکہ یہی وہ زبان ہے جس میں قرآن حکیم نازل ہوا اور جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادات فرمائے۔

اس امت پر اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ اس نے اس اہم منصب کی سہولت کے لئے امت کو ایسے رجال کا روعطا فرمائے جن کا شمار تابعہ روزگار میں ہوتا ہے اور ان کی نظیر نہیں ملتی۔ ان حضرات نے فقہ، امانت اور خلوص میں منفرد مقام حاصل کیا ہے۔ انہیں حضرات میں سے یہ چار آئمہ بھی ہیں۔

الف۔ امام ابو حنیفہ متوفی ۱۵۰ھ

ب۔ امام مالک متوفی ۱۷۹ھ

ج۔ امام شافعی متوفی ۲۰۴ھ

د۔ امام احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ

فقہاء کا فقہی سرمایہ زندہ جاوید ہے اور عالم اسلام میں سے اکثریت اس پر عمل پیرا ہے۔ یہ چاروں فقہاء وسیع اور دقیق نکتہ بینی میں ممتاز تھے۔ انہوں نے فقہی اور قانونی متاع کو تشکیل دینے کے لئے اپنی زندگی وقف کی اور اپنی خداداد صلاحیتیں صرف کیں۔

اس فقہی متاع کا دنیا میں کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ یہ فقہ آج کے دور میں بھی قانون سازی

کے لئے بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان آئمہ نے اپنے کو اس گراں قدر خدمت کے لئے وقف کیا اور آج امت مسلمہ ان کی پیروی کر رہی ہے۔ انہوں نے زندگی میں ہر آرام، راحت اور منصب و مرتبہ قربان کر دیا اور ان میں سے ہر ایک نے علمی متاع اور فقہی میراث یادگار چھوڑی جو آج کے علمی اداروں اور بڑی بڑی تنظیموں کے پاس موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان فقہاء کو سعادت مند شاگرد عطا فرمائے تھے، جو نہ صرف ان کی علمی میراث کے وارث ہوئے بلکہ انہوں نے اس میں اضافے کئے۔ وہ اس کی چھان پھٹک کر بنے اور اس کی نوک بالک سنوارنے میں مصروف رہے۔ یہاں تک کہ فقہاء میں یہ صلاحیت پیدا ہو گئی کہ وہ ان کے بعد کے زمانوں اور ان کے ملکوں سے باہر نکل کر دوسرے علاقوں میں رائج ہو سکے۔

امت اسلامیہ کی زندگی میں اجتہاد کی فضیلت:

ان آئمہ مجتہدین اور فقہائے کرام کا وجود اسلام کی ابتدائی صدیوں میں روشنی کا مینار تھا۔ ان کی کوششوں اور داناتی کے سبب امت کے سماجی امور، باہمی معاملات اور مالی پالیسیوں میں وحدت عمل پیدا ہوئی۔ اور یہی وحدت عبادات، خاندانی نظام اور شخصی قانون میں بھی نظر آنے لگی۔ اسی اتحاد نے دینی اور فکری ہم آہنگی کے لئے اہم کردار ادا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ امت اس سماجی اور قانونی انتشار سے محفوظ رہی ہے جس انتشار کا دوسری قومیں اور ادیان اپنے ابتدائی ادوار میں شکار ہوئے اور یہی انتشار آہستہ آہستہ انہیں غیر دینی زندگی کی طرف لے گیا اور اس طرح ایسا دینی نظام وجود میں آیا کہ اقوام اپنے دین کی مبادیات کے خلاف دیگر اقوام کی خوشہ چینی کرنے لگیں یا مسیحیت کی طرح دین سیاست سے جدا ہے کے مفروضے کے مطابق عمل کر دیا۔ اگر ابتدائی دور کے علمائے کرام اجتہاد اور مسائل کے استنباط میں سستی سے کام لیتے اور محنت و مشقت پر آرام و راحت کو ترجیح دیتے تو ان کے علمی نتائج اور کارنامے کمزور ہو جاتے اور ان کے اذہان پر جمود طاری ہو جاتا چنانچہ زندگی کی عملی مشکلات اور تقاضوں کے پیش نظر حکومتیں مجبور ہو جاتیں کہ وہ روسی اور ایرانی نظاموں کی خوشہ چینی کریں، اسلامی ریاست میں رومی اور ایرانی قانون نافذ کریں کیونکہ انتظامی ہڈیاں بچنے کو چلنے سے کوئی نہیں روک سکتا اور قانون سازی کے انتظار میں زندگی کی حرکت کو کوئی معطل نہیں کر سکتا، اسی طرح تجارتی معاملات کی تکمیل اور

دینی فرائض کی ادائیگی میں تاخیر نہیں کی جاسکتی کہ علمائے کرام غور و خوض کر کے کسی حتمی نتیجہ تک پہنچ جائیں اور ان امور کی بجآوری ممکن ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو امت کی بہت بڑی بدبختی ہوتی کیونکہ وہ اسلامی قانون کی برکتوں، اسلامی معاشرے کی نعمتوں، اسلامی شریعت اور سنت نبویؐ کی رہنمائی سے محروم ہو جاتی۔ یہ امر اس کا مقدر ہوتا کہ وہ دیندار امت کی حیثیت سے نہ صرف مسجدوں میں وقتی طور پر زندہ رہے، ان سے گھر، بازاروں اور عدالتوں میں کبھی سے جاہلیت یا لادینییت کا دور دورہ ہوتا جیسا کہ ان ممالک اور ریاستوں میں ہے، جن کا سرکاری مذہب عیسائیت ہے لیکن وہ عیسائی قانون سے محروم ہیں۔ افسوس اور ندامت کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے، کہ جیسا ان ممالک اور ریاستوں میں ہے جو عقیدہ اور عبادات میں تو اسلام پر یقین رکھتی ہیں، لیکن اسلامی قانون اور شریعت ان سے بالکل الگ ہے۔ عیسائیت کو ایسا اس آسکتا ہے، کیونکہ وہ آئین کی دولت سے محروم ہے۔ ان سے وہ چرنی زندگی میں دین کے نفاذ پر اصرار نہیں کرتی، لیکن اسلام میں یہ تصور اور آسان کام نہیں کیونکہ وہ دین اور ریاست، عقیدہ اور سیاست، نیز عبادت اور سماج سے عبارت ہے اور امت اپنی زندگی سے خطرناک اور مشکل دور سے کامیابی کے ساتھ گزر رہا ہے۔ بدلتی اور صدرات پر کھڑی تھی ایک بڑی غلطی ہو یا اس چھوٹی غلطیاں اسلام کی سماجی زندگی یا سیاسی نظام سے تعلق توڑنے کے لئے کافی ہوتی ہیں۔ جس کے نتیجے میں آئندہ نسلوں کے لئے دین سے ساتھ اپنا تعلق قائم رکھنا ہر اے نامرہ جاتا ہے۔

یہی حال تفصیلی احکام کا ہے۔ دین امور کا تعلق عبادات سے ہے ان میں جو مسائل اور مشکلات درپیش ہوتی ہیں اور بقائے انسانی بشری جو غلطیاں اور کمزوریاں سرزد ہوتی ہیں۔ بسا اوقات سہو، بھول، نسیان، غفلت وغیرہ کی بنیاد پر ہوتی ہیں جو التماس لاحق ہو جاتا ہے وہ کبھی جان بوجھ کر ہوتا ہے اور کبھی شریعت سے عدم واقفیت کی وجہ سے۔ ان میں جو کمی بیشی پائی جاتی ہے اس کے اسباب علم، دینی ثقافت اور اسلامی تربیت میں فرق ہے یا قبولیت اسلام میں تقدیم و تاخیر ہے، مکمل اسلامی ماحول، اسلام اور جدید معاشرتیں یا مخلوط ماحول بھی ان وجوہات کا حصہ ہیں۔ یہ تمام معاملات فیصلہ کن جواب اور فوری حل کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ایک شخص جواب نہ ملنے کی وجہ سے نماز سے منہ موڑ گیا حالانکہ وہ اس کا احترام کرتا ہے اور یہ روزہ دار ہے جس نے اپنے کو کھانے سے روک لیا، اور یہ امر بھی فتویٰ چاہتا ہے کہ مسلمان پر کن مال میں زکوٰۃ فرض

ہوتی ہے؟ زکوٰۃ کی مقدار کیا ہے؟ اس کے مصارف کون سے ہیں؟ یہ ہی حال حج کا ہے۔ جو ایک وسیع فریضہ ہے؟ جو لمبی مدت، طویل مسافت، ایک رکن سے دوسرے رکن نیز ایک جگہ سے دوسری جگہ نہایت احتیاط اور پیچیدگی سے منتقل ہونے پر مشتمل ہے۔ ان امور کی بجا آوری کے لئے رہنمائی، شرعی حکم، سنت نبوی اور اسوۃ رسول اللہ علیہ وسلم سے واقفیت کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ ان میں سے کوئی مسئلہ بھی ایسا نہیں ہے جس میں مہلت دینے کا امکان ہو۔ جس شخص کو یہ مسائل درپیش ہوتے ہیں اس کے لئے ممکن نہیں ہوتا کہ وہ انہیں علاقہ شریعتوں کے ماخذ سے تلاش کر لے یا غلطی کا شکار رہے۔ اس لئے لازمی ہے کہ ضروری احکام، ان کی جزئیات اور فقہی معلومات بآسانی میسر ہوں اور ایسے علما نے کرام بھی موجود ہوں، جو شرعی علوم میں مہارت رکھتے اور رہنمائی کے لئے مستعد ہوں۔ اسلامی معاشرے کی سلامتی اس امر میں پنہاں ہے کہ وہ دوسرے مذاہب کی طرح عبادات میں تحریف و تصرف نہ کرے۔ اسلام کے سوا دیگر مذاہب میں ماہوار یا سالانہ تقریبات میں شریک ہونے والوں میں ولی، اللہ قائم نہیں ہوتا حالانکہ وہ سب ایک ہی مذہب کے پیرو اور ایک ہی نسل میں مشغول ہوتے ہیں۔ وہاں ظہاریت، قرب یا صغیرۃ اللہ جیسی کسی چیز کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس مسلمانوں کی مسجدیں، حج اور وئی مراسم وحدت اسلامی کے رشتے میں پروئے ہوئے ہوتے ہیں، ان میں یگانگت اور اتحاد ہے، عقیدہ اور عبادت کی وحدت نمایاں ہے اور وہ ایک ہی شریعت کے پیرو ہیں۔ اس وحدت کا سہرا یعنی ہدایات کی صحت اور ان کی یگانگت کے سر ہے۔ پھر محدثین اور فقہاء بھی لائق تحسین ہیں جو اس امت کے قانونی نمائندے کی حفاظت کرتے رہے اور اس کا تعلق اپنے حقیقی سرچشمہ اور متحدہ دینی نظام سے جوڑے رکھا۔

یہ اجتہاد فقہ کی تدوین اور شرعی احکام کا استنباط اپنے اپنے زمانے اور اپنے اپنے وقت پر ظہور میں آیا اس میں نہ کچھ پہلے ہوا اور نہ بعد میں۔ اس فقہ کا یہ نمونہ طابع الاشیاء اور امور کائنات کی نہج کے عین مطابق ہے کیونکہ اس دین کی عالمگیریت اسی امر کی متقاضی ہے۔ یہ ویسا ہی طبعی اور منطقی تقاضا تھا جیسا کہ علم الصرف، نحو، عربی زبان کے قواعد، بلاغت اور بیان کے علوم کی نشوونما کا حال ہے۔ ان میں سے ہر ایک کی بنیاد سابقہ عربوں کے کلام، عربی زبان میں نازل شدہ قرآن حکیم اور شعر عرب پر استوار ہے۔ جب کہ عرب اور عجم کے اختلاط اور اسلام پر عمل کرنے

والوں کے لئے تمام عربی علوم کی تدوین کی نسبت فقہ کی تدوین زیادہ ضروری تھی۔ کیونکہ فقہ پر مسلمان کی زندگی کا احاطہ کرتی ہے، عبادت اور عقیدہ سے اس کا مضبوط رشتہ ہے اخروی زندگی اور اس پر مرتب ہونے والے ثواب و عذاب، سعادت اور بد بختی نیز بخشش اور ہلاکت پر فقہ کے گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

چوتھی صدی ہجری سے پہلے لوگوں کی حالت :

ہماری گفتگو سے یہ نہ سمجھا جائے کہ جو لوگ ان بلند پایہ مذاہب اور عالی مرتبہ علمی طریقوں کی نشوونما کے وقت، ان فقہی مذاہب میں سے کسی ایک لڑی میں پروئے گئے تھے اور انہوں نے ایک ہی مذہب سے اپنا تعلق مضبوطی سے جوڑ لیا تھا اور اس سے بال برابر بھی انحراف نہیں کرتے تھے۔ مزید برآں اس وقت کا مسلم معاشرہ ان مذاہب میں تقسیم ہو گیا تھا۔ اور وہ سب ان مذاہب میں سے کسی ایک کے جھنڈے تلے جمع ہو گیا تھا۔ فقہ اور علم کی تاریخ سے ایسی کوئی گواہی نہیں ملتی نیز ایسا ہونا انسانی فطرت اور اس دور کے مسلمانوں کی حقیقی زندگی کے بھی منافی تھا۔ البتہ ایسا بعد کے ادوار میں ضرور ہوا۔ جب ہم اسلامی کلینڈر کی رو سے اس امر کی تجدید کرنا چاہیں تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایسا چوتھی صدی ہجری میں وقوع پذیر ہوا۔ جب یہ مذاہب پختہ اور مکمل ہو کر اپنے اپنے علاقوں میں پھیل چکے تھے۔ نیز سیاسی، حکومتی اور تربیتی عوامل بھی اس بارے میں معاون ثابت ہوئے، اور ان علاقوں کے مسلمانوں کی حقیقی زندگی بھی یہی تقاضا کرتی تھی۔

ہم موجودہ صدیوں میں آنے والے اسلام کے بطل جلیل کا ذکر کرتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے انصاف، متوازن فکر، وسعت قلب و نظر نیز حدیث نبوی اور فقہ میں وقت نظر سے نوازا تھا۔ وہ حکیم الاسلام امام احمد بن عبد الرحیم دہلوی (متوفی ۱۱۷۶ھ) ہیں جو شیخ ولی اللہ دہلوی کے نام سے معروف اور شہرہ آفاق کتاب ”حجتہ اللہ البالغہ“ کے مصنف ہیں، وہ چوتھی صدی ہجری سے پہلے کے مسلمانوں کی فقہی حالت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ انہیں اس دور میں اپنی دینی زندگی میں جو مسائل اور مشکلات درپیش ہوتی تھیں تو اس کا وہ کیا حل تلاش کرتے تھے؟ وہ ”حجتہ اللہ البالغہ کے باب“ چوتھی صدی ہجری سے پہلے اور بعد کے لوگوں کا حال میں لکھتے ہیں۔

جان لیجئے کہ چوتھی صدی ہجری سے پہلے لوگ ایک ہی مذہب کی تقلید نہیں کیا کرتے تھے، ابوطالب مکی نے اپنی کتاب ”قوت القلوب“ میں لکھا ہے کہ بے شک کتابیں اور مسائل کے مجموعے وجود میں آتے رہتے تھے، علماء کے اقوال، ایک مذہب کے فتاویٰ ہر چیز کے بارے میں ایک شخص کا قول یا حکایت یا اس کے فقہی مذہب کو اپنانا، پہلی اور دوسری صدی ہجری تک کے لوگ اس کے پابند نہیں تھے۔

میں کہتا ہوں۔ دو صدیوں کے بعد ان میں تخریج مسائل کا عنصر پیدا ہوا حالانکہ چوتھی صدی ہجری کے باشندے ایک مذہب ایک فقہ اور کسی ایک شخص کے قول یا حکایت کی تقلید محض نہیں کیا کرتے تھے۔ جیسا کہ بعد میں ہوا۔ اس عمل میں عامۃ الناس اور علماء بھی شامل تھے۔

عوام الناس کا یہ حال تھا کہ اپنے اجتماعی مسائل، جن میں مسلمانوں یا جمہور مجتہدین کے مابین کوئی اختلاف نہیں ہوتا تھا۔ ان میں صرف صاحب شریعت کی تقلید کرتے، وضو، غسل، نماز اور زکوٰۃ وغیرہ کی تعلیم اپنے والدین یا اپنے شہر کے علماء سے حاصل کرتے اور اسی کے مطابق عمل کرتے تھے۔ جب انہیں کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تو کسی مذہب کا فرق کئے بغیر، انہیں جو بھی مفتی میسر آتا اس سے مسئلہ کا حل دریافت کرتے۔

خواص کا یہ عالم تھا کہ وہ اہل حدیث تھے۔ اس لئے حدیث پر عمل کرتے تھے۔ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے آثار تک اپنے کو محدود رکھتے کسی مسئلہ کے بارے میں جب انہیں صحیح یا مستفیض حدیث مل جاتی تو اس کی موجودگی میں انہیں کسی اور چیز کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ بعض فقہاء بھی اسی پر عمل پیرا تھے۔ حدیث نبوی، جمہور صحابہ کے آثار اور تابعین کے اقوال پر عمل نہ کرنے والے کے پاس کوئی عذر نہیں ہوتا تھا اور نہ ہی وہ اس کی مخالفت کو پسند کرتے تھے۔ جب کسی حدیث میں تعارض ہوتا اور اس میں ترجیح کا پہلو معلوم نہ ہوتا نیز درپیش مسئلہ کا تسلی بخش حل میسر نہ آتا تو وہ لوگ ماضی کے بعض فقہاء کرام کی طرف رجوع کرتے۔ اگر انہیں ہم پلہ دو اقوال ملتے تو وہ کسی ایک یا ان میں سے ثقہ قول کو اپنا لیتے۔ وہ اہل مدینہ یا اہل کوفہ کے قول میں کوئی فرق نہیں کرتے تھے۔ ان میں کچھ اصحاب ایسے بھی ہوتے تھے کہ جب وہ کسی مسئلہ میں واضح احکام نہ پاتے تو وہ خود مسائل کا استنباط کیا کرتے تھے اور فقہی مذاہب میں اجتہاد کیا کرتے تھے۔ ایسے لوگ مروجہ فقہی مذاہب

کے بانیوں کی طرف منسوب ہوتے تھے۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ فلاں شافعی ہے، فلاں حنفی ہے، اہل حدیث بھی ان مذاہب میں سے جس مذہب سے زیادہ متفق ہوتے اسی کی طرف منسوب ہوتے تھے، مجتہد کے علاوہ کوئی دوسرا شخص قاضی یا مفتی نہیں ہوتا تھا اور فقیہ کو مجتہد کے نام سے ہی موسوم کیا جاتا تھا۔ ان صدیوں کے بعد لوگ اپنی اپنی پسند کا مذہب اپنانے لگے۔

تابع رسول ﷺ کی اجتہادی فکر:

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ایسے مقلد کے بارے میں کیا انصاف کی بات کہتے ہیں۔ جو درحقیقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کا ارادہ رکھتا ہو لیکن وہ کتاب و سنت سے ثابت شدہ شرعی حکم تک براہ راست رسائی حاصل نہیں کر سکتا کیونکہ وہ ایک عام شخص ہے یا وہ دوسرے امور میں مشغول ہے یا (قرآنی) نصوص تک رہنمائی کرنے والے وسائل اسے میسر نہیں یا وہ ان نصوص سے مسائل کا استنباط نہیں کر سکتا۔ حضرت شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ ابن حزم کا یہ قول عقل فرماتے ہیں تقلید حرام ہے۔ کسی کے لئے بھی یہ جائز نہیں ہے کہ دلیل کے بغیر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی اور شخص کا قول اختیار کرے۔

اس کے بعد آپ فرماتے ہیں کہ ابن حزم کے اس قول میں کوئی شبہ نہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کے علاوہ کسی اور کا قول دین نہیں ہوتا، اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حلال کردہ امور کو ہی حلال، اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حرام کردہ امور کو ہی حرام جانو، لیکن جب کوئی شخص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال سے ناواقف ہو، احادیث کے اختلافات میں مطابقت پیدا نہ کر پائے اور نہ ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے مسائل کا استنباط کر سکے تو وہ ہدایت یافتہ عالم کی پیروی کرے۔ کیونکہ وہ عالم جو کچھ کہتا اور جو فتویٰ دیتا ہے اسے معلوم ہے کہ وہ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا پیرو ہے۔ اگر اس کے خیال سے اختلاف ہو تو اس سے جھگڑا کئے بغیر اور اپنی رائے پر اصرار کئے بغیر بات ختم کر دے کیونکہ اس حقیقت کا کوئی کیسے انکار کر سکتا ہے کہ فتویٰ پوچھنا اور فتویٰ دینا مسلمانوں کے ہاں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور سے رائج رہا ہے۔ اس امر میں کوئی فرق نہیں کہ ہمیشہ ایک ہی فتویٰ پوچھا جائے یا کبھی کبھی فتویٰ دریافت کیا جائے۔ جبکہ ہم نے جو کچھ بیان کیا اس

پراجماع امت ہے، ایسا کیوں نہ ہو؟ کیا ہم بنی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی فقہ پر ایمان نہیں رکھتے؟ جو اللہ تعالیٰ نے انہیں وحی کے ذریعے عطا کیا اور ان کی اتباع ہم پر فرض کی کیونکہ وہ معصوم ہیں اگر ہم مجتہدین میں سے کسی ایک کی تقلید کرتے ہیں تو یہ اس یقین کے ساتھ ہے کہ ہمیں معلوم ہے کہ ایسا شخص اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا عالم ہے۔ اس کا قول یا تو کتاب و سنت کی صریح نص سے ثابت ہوگا یا ان سے مروجہ طریقے سے استنباط کیا گیا ہوگا، یا قرآن سے جانا گیا کہ ہماری مطلوبہ مشکل کا حل اس طرح سے ہے اس علم سے ایسے مجتہد کا دل مطمئن ہو گیا اور اس نے ان امور کو جن کے بارے میں کوئی نص نہیں، ایسے امور پر قیاس کیا جن کے بارے میں کوئی نص موجود ہے گویا وہ کہتا ہے میں نے گمان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب کبھی یہ علت موجود ہو تو اس کا حکم یوں ہوگا۔ قیاس کرنے والا اس عموم میں اضافہ کر سکتا ہے اور یہ بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہوگا لیکن مجتہد کا طریق کار ظنی ہوگا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو مسلمان کسی مجتہد کی تقلید کیوں کرتے اگر ہمیں معصوم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن کی اتباع ہم پر فرض کی گئی کی صحیح سند والی حدیث مل جائے جو کسی فقہی مذہب کے خلاف ہو اور پھر ہم نے حدیث کو چھوڑ دیا اور اس ظنی بات کی پیروی کی تو ہم سے بڑا کوئی ظالم نہیں ہوگا اور قیامت کے دن رب العلمین کے حضور ہمارے پاس کوئی عذر نہیں ہوگا۔

مذاہب اربعہ کی خصوصیات:

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے بلند پایہ رسالہ عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید میں چاروں مذاہب کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں۔

جان لیجئے۔ ان چاروں مذاہب کو اپنانے میں بہت بڑی مصلحت ہے ان سب کو چھوڑنے میں بڑا فساد ہے۔ ہم اس کے اسباب بیان کرتے ہیں۔ پہلا سبب یہ ہے کہ امت کا اس امر پر اجماع ہے کہ وہ شریعت کو جاننے کے لئے اپنے اسلاف پر اعتماد کرتی ہے۔ تابعین نے ان امور میں صحابہ کرام پر اعتماد کیا اور یہ عمل ہر طبقہ میں جاری رہا۔ علمائے کرام اپنے سے پہلوں پر بھروسہ کرتے ہیں۔ عقل بھی اس کی اچھائی کی طرف رہنمائی کرتی ہے کیونکہ شریعت، روایت اور استنباط سے ہی جانی جاتی ہے اور روایت اس وقت تک درست نہیں ہوتی جب تک

پہلے گروہ سے مل کر روایت نہ کی جائے۔ اسی طرح استنباط کے لئے متقدمین کے مذاہب کا علم ہونا بھی ضروری ہے تاکہ ان کے اقوال سے الگ نہ ہو جائیں اور اس امر پر استوار اجماع ختم نہ ہو جائے اور پہلے افراد اس بارے میں معاون ثابت ہوتے ہیں کیونکہ تمام صنعتیں جیسے صرف، نحو، طب، شعر لوہے کا کام، تجارت اور کپڑے رنگنا اسی وقت حاصل ہوتی ہیں جب ان کے ماہرین سے تعلق استوار کیا جائے۔ ماہرین سے تعلق قائم کئے بغیر ان صنعتوں کا سیکھنا شاذ و نادر ہی ممکن ہوتا ہے اگرچہ عقلی طور پر ایسا ہونا ممکن ہے جب اسلاف کے اقوال پر اعتماد قائم ہو گیا وہ صحیح اسناد کے ساتھ مردی ہوں یا مشہور کتابوں میں جمع ہوں اور وہ کتب تفصیلی ہوں تاکہ مختلف ممکنہ اقوال میں سے قابل ترجیح قول کی وضاحت کی جاسکے۔ بعض مقامات پر ہم عام کی تخصیص کریں، بعض دوسرے مقامات پر مطلق کو مقید بنائیں، اختلافات کو جمع کریں اور احکام کی علتیں بیان کریں۔ بصورت دیگر ان پر اعتماد درست نہیں ہوگا۔ ان آخری ادوار میں مذکورہ بالا چاروں مذاہب کے علاوہ کوئی اور ایسا مذہب موجود نہیں ہے۔

اجتہاد کی ضرورت، جدید نسل کی کوتاہی:

اجتہاد کی ضرورت کے بارے میں آج کل بہت سی باتیں ہو رہی ہیں۔ یہاں تک کہ یہ ترقی اور جدت کے لئے نعرہ علامت بن گیا ہے۔ بلاشبہ یہ وقت کی اہم ضرورت ہے اور اس دین کی ضروریات میں سے ہے جو زندگی کو آگے بڑھاتا اور اس کی قیادت کرتا ہے۔ یقیناً تہذیب، صنعت اور تجارت اس حد تک ترقی کر چکی ہیں کہ اندازہ کرنا مشکل ہے، نئے اسلوب پیدا ہو چکے ہیں، معاہدات اور تجارتی امور ایسے فقہی حکم کا مطالبہ کر رہے ہیں جن کی بنیاد اسلامی شریعت کی روشنی میں اسلامی اصولوں اور اصول فقہ پر قائم ہو۔

لیکن جو لوگ شرعی مسائل اور آج کی ایجادات کے بارے میں صدائے اجتہاد بلند کر رہے ہیں۔ یعنی عالم اسلام کے فکری قائدین، سیاسی اور انتظامی رہنما، عرب ممالک میں بیرونی یونیورسٹیوں کے فارغ التحصیل نوجوان اور اپنے ممالک کی یونیورسٹیوں کے فارغ التحصیل نوجوان۔ ان کی عربی تہذیب کے لئے ایسی صلاحیت، ذہانت اور قوت ارادہ پایہ ثبوت کو نہیں پہنچی جس میں بہادری، دانائی شامل ہوتا کہ وہ عربی تہذیب کے طریقوں اس کی خامیوں اور

خوبیوں اور معاملات میں خام مال کی طرح اپنے راستے الگ کریں جن سے ایسی ثقافت وجود میں آئے جو دینی تعلیمات عصری ضرورتوں اور مشرقی مسلم اقوام کی طبیعت کے مطابق ہو جس سے وہ ایسا نظام ترتیب دیں جو اس امت کی بعثت کے مقاصد کی تکمیل کرے اور ان اقوام کو راہ دکھائے جو مادیت کے چنگل میں پھنسی ہوئی ہیں۔ جب مغرب سے کوئی چیز لیں تو پہلے اس گرد و غبار و صاف کر لیں جو تاریخ یورپ کے دور تاریک میں اس پر لگ چکی ہو۔ حالت یہ ہے کہ آج ہم یورپ سے جو کچھ لے رہے ہیں وہ ایک اعصابی کشمکش اور نفسیاتی الجھن کی کیفیت میں لے رہے ہیں، جبکہ واقعہ یہ ہے کہ یورپ کے ان علوم کی آج ہمیں سرے سے ضرورت ہی نہیں ہے۔ انہوں نے اپنے اختصاصی میدانوں میں ایسا کردار ادا نہیں کیا جو دونوں نظاموں کو مربوط کرتا اور تربیتی نظام میں آزاد اسلامی رنگ بھر دیتا، یہی عمل اجتہاد کے مشابہ ہے جو ان کے فکری اور قائدانہ کردار کی تکمیل کرتا۔ لیکن یہ قدیم سے انسانی طبیعت کا خاصہ ہے کہ وہ اپنے قول سے جلد ہی دست بردار ہو جاتی ہے اور دوسروں سے مطالبہ شروع کر دیتی ہے کہ وہ اس کا فریضہ ادا کریں۔

اس رائے کے علی الرغم جو قابل مواخذہ نہ سمجھی جائے۔ درحقیقت شرعی مسائل اور عصری ایجادات کی موجودگی میں اجتہاد کی ضرورت روز روشن کی طرح عیاں ہے اس میں اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہ شرعی علوم کے ماہرین کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس میدان میں اپنا قائدانہ اور اساسی کردار ادا کریں اور اس قیمتی سرمایہ سے استفادہ کریں جو اصول فقہ کے نام سے موسوم ہے جس کی نظیر احکام و مسائل کے استنباط کے میدان میں دوسری کوئی قوم پیش نہیں کر سکتی۔ یہ واضح حقیقت ہے کہ زمانہ کی دوڑ کو نہ روکا جاسکتا ہے، نہ وہ معطل کیا جاسکتا اور نہ ہی ماضی کی طرف لوٹایا جاسکتا ہے۔ جبکہ اسلام آج اقوام اور معاشروں کا دین ہے جنہیں یہ مسائل درپیش ہیں اور جنہیں ان کا ہر روز سامنا ہوتا ہے۔

بعض علاقوں اور ادوار میں اجتہاد کے معطل ہونے کے اسباب:

مختلف ادوار اور مختلف علاقوں میں امت اجتہاد پر قائم رہی اور علمائے کرام بھی اس پر عمل پیرا رہے۔ جس کی مثالوں اور نمونوں سے چاروں مذاہب کی فقہی کتب پر ہیں۔ تاتاری حملوں

کے بعد یہ ادارہ (اپنے جدید معنوں میں) پڑمردگی اور کمزوری کا شکار ہو گیا۔ تاتاری یلغار کی وجہ سے ذہانت اور ثقافت کے سوتے خشک ہو گئے اور جو اقوام تاتاری اور مغول حکومت کے زیر اثر آئیں وہ مسلح اور غیر مسلح فوج کشی کے سامنے ماند پڑ گئیں۔ چنانچہ مسلمان علماء خاص طور سے عالم اسلام کے شرقی حصہ کے علماء نے اس دور میں اجتہاد کے ارتقاء میں رکاوٹ محسوس کی جس کے اسباب حکام کی سختی کا خوف، سیاسی اور انفرادی مصلحتیں نفع سے زیادہ نقصان۔ بعض اوقات اجتہاد دین میں تحریف اور اس امت کے جماعتی انحراف کا باعث بنا۔ یہ سب کچھ وقتی تھا اور ابتداء ہی سے اس اصول پر قائم تھا کہ فائدہ کے حصول کی بجائے نقصان کو دور کیا جائے۔

اب اس دروازے کا کھولنا لازم ہو چکا لیکن انہیں شرائط کے ساتھ یہ دروازہ کھل سکتا ہے جو اصول فقہ کی کتب میں مذکور ہیں اور مستحسن امر یہ ہے کہ (کسی خاص ضرورت کے علاوہ) اجتہاد انفرادی نہ ہو اور یہ جماعتی اور علمی اداروں کا کام ہوتا کہ ماہرین کے ساتھ تبادلہ افکار گہرا غور و خوض کتاب و سنت کی روشنی میں مسئلہ کی چھان پھٹک ہوتا کہ فقہ اور اصول فقہ کے گراں قدر سرمایہ سے مکمل استفادہ کیا جاسکے اور اس میں سازشیں اور دسیسے کا ریاں داخل نہ ہوں اور کسی سیاسی طاقت یا خود مختار حکومت کو رسوائی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

اجتہاد کی حدود:

بعض مبلغین کی باتوں سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ جدید تہذیب یافتہ طبقے، یونیورسٹی کے پر جوش طلبہ اور اسلامی ممالک کے بعض حکمرانوں کو اجتہاد کی ضرورت ہے۔ ہر مسئلہ میں مطلق اجتہاد کی دعوت اور بوسیدگی کے باوجود مغربی اقتدار اور عصری طریقے اپنانا گویا ایسا ہے کہ زمانہ اس طرح چل رہا ہے جیسے پہلے دن اسلام آیا تھا، انسانی معاشرہ پیچھے کی طرف الٹی چال پڑا ہے اور فقہاء اور مجتہدین نے ماضی میں جو کچھ کیا تھا وہ سب کچھ ضائع ہو گیا، ان کی آراء اور حاصل مطالعہ کی کوئی قدر و قیمت نہیں رہی کیونکہ اس دور کی طبیعت اور حقیقی زندگی سے اسے کوئی موافقت نہیں رہی۔ یہ ایسا نکتہ نظر ہے جو سطحیت لا پرواہی اور اس پروپیگنڈے کے سامنے ہتھیار ڈالنے کا نتیجہ ہے۔ وقت حاضر کا ادب جس پروپیگنڈے کے ذریعے اسکی ترقی اور زمانے کے حالات کی ایسی تصویر پیش کرتا ہے جو نو جوانوں کو حیرت میں ڈال دیتی ہے وہ سوچتے ہیں کہ گویا

وہ آج ہی پیدا ہوئے ہیں اور دنیا میں کوئی بھی چیز ایسی موجود نہیں جو کل کی اشیاء سے مشابہت رکھتی ہو۔ یہ حقیقت سے زیادہ تخلیکی تصویر ہے اور صورت حال کو منطقی اور حقیقی انداز سے بیان کرنے کی بجائے جذباتی انداز میں مبالغہ کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔

دین ہی زندگی کا محافظ ہے:

دین کا مطیع اور پیرو ہوتے ہوئے میرے لئے یہ کبھی ممکن نہیں کہ میں کسی بھی ایسی تبدیلی شدہ حالت کو تسلیم کر لوں جس کا دین حل پیش نہ کرتا ہو، آپ بھی ایسی کسی بات پر متفق نہیں ہو سکتے، کیونکہ دین آلہ حرارت کا نام نہیں جو ایک حد کے بعد گرمی ریکارڈ کرنے سے قاصر رہے اور نہ ہی وہ قطب نما ہے کہ ہواؤں کا رخ متعین کر لے۔ ان الفاظ سے دین کی تعریف نہیں ہو سکتی اور یہ بھی ممکن نہیں کہ وہ مغربی اوزاروں کی طرح ہو، ہم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جو چاہتا ہو کہ دین وقتی تبدیلیوں کے ریکارڈ کے طور پر کام کر لے۔ کسی خود ساختہ دین کے لئے بھی ممکن نہیں کہ وہ یہ صورت حال برداشت کر لے چہ جائیکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ دین ایسا ہو؟ بے شک دین واقعی حقیقت کی طرح تبدیلی کا اعتراف کرتا ہے اور درست تبدیلی کے تحت معاملات کو چلنے کے کامل مواقع مہیا کرتا ہے۔

دین زندگی کے دوش بدوش ترقی کرتا ہے اور ایک تابع کی حیثیت سے اس کا ساتھ نہیں دیتا۔ اور یہ امر دین کے فرائض میں سے ہے کہ وہ مفید اور غیر مفید کو تعمیری اور تخریبی تبدیلی کے مابین امتیاز کرے اور دین کے لئے ضروری ہے کہ وہ نشان دہی کرے کہ کون سی تبدیلی انسانیت یا کم از کم اس کے پیروکاروں کیلئے مفید یا مضر ہے۔

ایک طرف تو دین فعال زندگی کے دوش بدوش چلتا ہے تو دوسری طرف وہ محافظ اور نگران کا کام سرانجام دیتا ہے کیونکہ نگرانی اور حفاظت کی ذمہ داری بھی اسے ہی سونپی گئی ہے۔

وحی کی یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ اپنے زیر وصیت کمزور اور ناتواں کے ہر کام میں مدد کرے اور اسکی ہر نئی اچھی یا بری خواہش کی تائید کرے، یا ہر اس چیز پر مہر تصدیق ثبت کر دے جو اس کے سامنے پیش کر دی جائے۔ دین دراصل مہر ہے، اس کی حیثیت ایک روشنائی کی ہے، وہ ایک طرز تحریر ہے۔ اس کی یہ شان نہیں کہ وہ ہر وثیقہ اور ہر معاہدے سے اتفاق کر لیا کرے بلکہ ضروری ہے کہ وہ ان چیزوں میں تمیز کرے اور ان میں سے (مفید چیز کو) منتخب کرے۔

پہلے وہ (وشیقہ) کی چھان پھٹک کرے۔ پھر اس کے بارے میں کوئی حکم جاری کرے۔ اگر اس میں کوئی چیز غلط یا نقصان دہ ہو تو دین کی یہ کوشش ہوگی کہ اسے نرمی سے ترک کر دے اور اگر ممکن ہو تو حالات کے مطابق طاقت سے اسے مسترد کر دے۔ جب اس کے سامنے کوئی ایسا وشیقہ پیش کیا جائے جو اس کی رائے میں انسانیت کے لئے ضرر رساں ہو تو وہ نہ صرف خود اس پر مہر تصدیق ثبت کرنے سے باز رہے گا۔ بلکہ اس کا پوری قوت سے مقابلہ کرے گا اور اسی مقام پر دین اور اخلاق کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔ دین اپنا فرض اور ذمہ داری سمجھتا ہے کہ غلط رجحان کی نشاندہی کرے اور اس کا رد کرے۔ جبکہ اخلاق اس کی طرف اشارہ کرنے اور اس کے اظہار کو ہی کافی سمجھتا ہے۔

اس وقت نظر اور گہرائی، امانت اور ذمہ داری کے احساس، اس دین کی طبیعت اور پیغام سے آگہی، اپنے زمانے کے تقاضے اور ان کا پیچیدہ تانا بانا، اختلاف اور تبدیلی نیز ترقی اور ترقی پذیری کے مابین مطابقت، حرکت اور ثبات نیز مفید قدیم ورثہ کی حفاظت کے پیش نظر ہمارے لئے ممکن نہیں کہ ہم وسیع تر مفہوم میں فقہ اسلامی کی ضرورت کی نفی کریں، اسے ترقی اور وسعت میں جو بلند مقام حاصل ہے وہ انتشار پھیلانے یا ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے لئے نہیں۔ نیز اسلامی معاشرے کی یہ اہم ضرورت ہے کہ وہ اسلامی تعلیمات اور احکام پر اس دور میں عمل پیرا ہو، جو موجودہ دور کی طرح وسیع پیمانے پر تہذیب یافتہ ہے۔ جس میں موجودہ زندگی قدرتی طور پر تیزی سے ترقی کر رہی ہے اور آگے بڑھ رہی ہے۔

و علی اللہ قصد السبیل و منها جائز

اور دین کے دور استے ہیں ایک سیدھا راستہ جو خدا تک پہنچتا ہے۔ اور بعض ٹیڑھے راستے پر ہیں۔

مغربی تعلیم اور اس کے تباہ کن اثرات

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونعوذ بالله من شرور
انفسنا ومن سيئات اعمالنا من يهده الله فلا مضل له ومن يضلل الله فلا
هادي له ونشهد ان الا اله الا الله وحده لا شريك له ، ونشهد ان
سيدنا محمدا عبده ورسوله . اما بعد .

ایک اہم مسئلہ:

حضرات! آپ کی اجازت سے میں اس موضوع پر کسی قدر تفصیل اور وضاحت و
صراحت کے ساتھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ موضوع کی نزاکت اور اہمیت اس بات کی متقاضی
ہے کہ کہانی بہت دور سے شروع کی جائے، اس لئے کہ یہ مسئلہ آج کا یا چند مہینوں اور سالوں کا
نہیں ہے، یہ ایک بہت قدیم مسئلہ اور پرانی مشکل ہے جس کی جڑیں ملت کی زندگی اور تاریخ
میں اندر تک پیوست اور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔

اس مسئلے میں پہلی نفسیاتی حقیقت جس سے صرف نظر کرنا ناممکن ہے، وہ اسلامی
معاشرے میں ایسے اشخاص کا وجود ہے، جنکو اس عقیدے پر (جس پر اس معاشرے کی اساس
ہے) قلبی طور پر انشراح نہیں ہوتا اور وہ ان حقائق و مبادی اور مقاصد و اقدار پر یقین نہیں رکھتے
جن کے لئے یہ معاشرہ زندہ اور کوشاں ہے۔

انسانی معاشرے کا مزاج:

یہ دراصل ہر اس انسانی معاشرے کا مزاج اور خاصا ہے جو کسی مخصوص عقیدہ اور متعین حدود
و قیود کا پابند ہے اور جب اس معاشرہ اور جماعت کا کوئی فرد ان حدود کی خلاف ورزی کرتا ہے تو
وہ اس کے دائرے سے خارج یا اس کا باغی قرار دیا جاتا ہے اور ان حقوق و امتیازات سے ہاتھ
دھو بیٹھتا ہے جو اس کو اب تک حاصل تھے، برخلاف قومیتوں کے جن کا دروازہ ہر عقیدہ و مسلک
اور ہر قسم کے صحیح اور غلط طرز زندگی اور کردار کے لئے کھلا رہتا ہے اور ان کی صرف ایک شرط ہوتی

ہے اور وہ یہ کہ یہ فرد اپنی قومیت تبدیل نہ کرے، حکومت یا ملک کے خلاف کوئی سازش نہ کرے اور کسی قومی غداری کے جرم کا مرتکب نہ ہو۔

یہ مشکل اس وقت اور بڑھ جاتی ہے اور جن لوگوں پر اس معاشرے کے اچھے برے کی ذمہ داری ہے، ان کے لئے سب سے سنگین مسئلہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب یہ منصر (جس نے اس عقیدہ کو کبھی اخلاص کے ساتھ قبول نہیں کیا تھا یا کسی وجہ سے اس کو ہضم نہیں کر سکا تھا یا کسی خاص سبب سے ہضم کرنے کے بعد اسے پھر خارج کر دیا تھا) اس مومن و مسلم معاشرہ کے دائرہ اور فریم کے اندر اس کے ایک جزو کی حیثیت سے زندہ رہنا اور پھندنا پھولنا چاہتا ہے اور اپنے مستقبل کو کسی مصلحت یا مجبوری سے اس کے مستقبل کے ساتھ وابستہ کرتا ہے لیکن بایں ہمہ اپنے کو اس کے مطابق ڈھالنا اس کے رنگ میں رنگنا اس کو کسی حالت میں گوارا نہیں ہوتا۔ وہ اس معاشرے کے مسئلہ و بنیادی حقائق و تصورات اور صفات و خصوصیات پر یقین نہیں رکھتا اور نہ اس کے اندر اس کے لئے کوئی گرم جوشی اور اخلاص پایا جاتا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو یہ بات فتنہ ارتداد سے زیادہ خطرناک، فتنہ انگیز اور دور رس ہے جس کی سنگینی سے ہمارا مسلم معاشرہ واقف ہے۔

یہ مسئلہ اس وقت کچھ اور پیچیدہ بن جاتا ہے جب یہ منصر اپنی ذہانت و ہنرمندی سے عوامی اعتماد حاصل کرنے اور دوسروں پر چھا جانے کی وجہ سے زمام قیادت اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے اور پھر اس کے بعد پورے معاشرہ کو اس راستے پر لے جاتا ہے جو اس کے نزدیک الہاد و بے دینی اور اس کے طے شدہ اصولوں اور اخلاقی قدروں سے بغاوت کے راستے ہیں۔ بعض اوقات اس کو ان مقاصد کی طرف بھیڑ بکریوں کی طرح ہٹکایا جاتا ہے جو اس کے دین و عقیدہ کے سراسر منافی یا اس کے متوازی ہوتے ہیں، وہ ایک ایسی عمیق نفسیاتی کشمکش سے دوچار ہوتا ہے جس سے زیادہ سخت کشمکش تاریخ انسانی، تاریخ اخلاق و نفسیات اور تاریخ مذاہب میں شاید ہی کبھی پیش آئی ہو۔ وہ موت و زیست کی درمیانی اور بحرانی کیفیت میں مبتلا ہوتا ہے جس سے اس کو کسی وقت چھٹکارا نہیں ملتا۔

اس قیادت کے اثر سے، جو اپنے معاشرہ اور قوم کے دین و عقیدہ پر ایمان نہیں رکھتی بلکہ اکثر اوقات اس سے برسر پیکار اور آمادہ فساد رہتی ہے، فکری و ذہنی ارتداد کو کھلی چھوٹ مل جاتی

ہے اور ان لوگوں کی ایک بڑی تعداد، جن کے پاس اخلاقی و نفسیاتی حفاظت کا کوئی سامان یا ایمانی و روحانی قوت کا کوئی ذخیرہ یا کوئی علمی و فکری حصار نہیں ہوتا، اس سمندر میں غرقاب ہو جاتی ہے۔ دولت کے پرستار، چڑھتے سورج کے پجاری، موقع پرست، ابن الوقت اس کا خصوصیت سے اور زیادہ آسانی سے شکار ہوتے ہیں یا پھر دوسری شکل میں نفاق پورے معاشرے میں عام ہو جاتا ہے۔ معاشرے کی داخلی قوت ختم ہو جاتی ہے اور اس کا پورا ڈھانچہ اندر ہی اندر سڑنے لگتا ہے، مکرو فریب عام ہوتا ہے، سازشوں کی کثرت ہوتی ہے، غداری اور قومی خیانت کے واقعات بکثرت پیش آتے ہیں، ضمیر اور بڑی سے بڑی قابل احترام اور مقدس میراث کا سودا رزاں اور آسان ہوتا ہے، ملک کے بڑے بڑے رقبے چند سکوں کے عوض فروخت کر دیئے جاتے ہیں، جاسوسوں اور دشمنوں کے کارندوں اور ایجنٹوں کی بن آتی ہے اور ان کو اس خدمت کے لئے کوئی بھی طریقہ اور حربہ استعمال کرنے سے دریغ نہیں ہوتا۔ یہ وہ صورت ہے جس کی نظیر کسی اور انسانی معاشرے میں (جس کو یہ سخت آزمائش پیش نہیں آئی ہے یا جس کے عوام اور قیادت کے درمیان اتنی وسیع، گہری اور بنیادی و نظریاتی خلیج نہیں ہے) نہیں ملتی۔

معاشرہ میں کمزوری:

اس کے نتیجے میں یہ معاشرہ کسی بیرونی دشمن یا اندرونی خطرہ کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں رہتا اور اس کی اصل وجہ یہی ذہنی انتشار اور نفسیاتی کشمکش اور قیادت اور اس کے دیئے ہوئے اعلانات اور نعروں سے عوام کی بے تعلقی اور عدم دلچسپی ہے۔ یہ سب حالات و واقعات کا منطقی نتیجہ اور نفسیات انسانی کا طبعی خاصہ ہے اور ان تمام ملکوں کی قدیم و جدید تاریخ اس پر گواہ ہے جو اپنے قائدین و زعماء یا اپنے حکام و امراء کی محبت سے کبھی آشنا نہیں رہے اور جہاں جمہور قیادت میں جذباتی ہم آہنگی اور فکری یکسانیت کبھی پیدا نہیں ہو سکی۔

البتہ اس اسلامی سوسائٹی نے، جو خود دعوت اسلامی کی اساس پر قائم تھی اور جس نے نبوت محمد ﷺ کی آغوش تربیت میں پرورش پائی تھی، اس طبعی اور تاریخی حقیقت اور امر واقعی کا کامیابی سے مقابلہ کیا جس کا واسطہ قدرتی طور پر ہر اس جماعت کو پڑتا ہے جس کی تعمیر ایمان

و عقیدہ، و بانٹ و تقویٰ اور دعوت و جہاد کی بنیادوں پر ہوئی ہو، نفاق کی بیماری تو صرف اس ماحول کو لگتی ہے جہاں دو حریف نظریات اور مقابل قیادتیں پائی جاتی ہوں، خواہ ان دونوں میں ضعف و قوت اور قلب و کثرت کے لحاظ سے کوئی تناسب نہ ہو۔ اس موقع پر وہ متر و مختصر سامنے آتا ہے جو ان دونوں مخالف کیمپیوں کے درمیان گھومتا رہتا ہے اور متر دور رہتا ہے کہ ان میں سے کس کا انتخاب کیا جائے اور کس کا دامن تھا جائے؟ پھر کسی نہ کسی دعوت کی طرف مائل ہو کر اس میں شامل ہو جاتا ہے اور اس کو اپنی محبت و تعلق کا مرکز بنا لیتا ہے۔ تاہم اس کی مادی مصلحتیں اور حریف کی قوت اور عروج و اقبال اس کو اپنے موقف کے اعلان، اپنی رائے کے اظہار اور نئی دعوت کو بالکل قبول کرنے سے باز رکھتا ہے اور مقابل دعوت سے اپنی راہ و رسم قطعی اور آخری طور پر ختم نہیں کرتا۔ قرآن مجید میں اسی کیفیت کو اس آیت میں بیان کیا گیا ہے۔

”بیچ میں پڑے لٹک رہے ہیں، نہ ان کی طرف (ہوتے ہیں) نہ ان کی طرف۔“

(النساء، ۴۳)

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

”لوگوں میں بعض ایسے بھی ہیں جو کنارے پر (کھڑے ہو کر) خدا کی عبادت کرتے ہیں، اگر ان کو کوئی (دنیاوی) فائدہ پہنچے تو اس کے سبب مطمئن ہو جائیں اور اگر کوئی آفت پڑے تو منہ کے بل لوٹ جائیں (یعنی پھر کافر ہو جائیں)۔“

اسی لئے جیسا کہ اکثر مفسرین کا خیال ہے کہ مکہ میں نفاق کا وجود نہ تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اسلام وہاں مغلوب تھا، اس کے اندر نفع و نقصان پہنچانے اور تغیر و تبدل کی کوئی طاقت نہ تھی اور وہاں دو متوازی قوتیں نہ تھیں، مشرکین بڑے طاقتور اور غالب تھے اور مسلمان مظلوم، نسبتاً اور مغلوب تھے۔ جب اسلام مکہ سے مدینہ منتقل ہوا اور اسلامی سوسائٹی اپنے تمام لوازمات اور طبعی خاصیتوں کے ساتھ وجود میں آئی تو نفاق نے سراٹھایا، یہ ایک ایسی قدرتی اور نفسیاتی صورت حال تھی جس سے کوئی مفر نہ تھا۔ لیکن رسول اللہ ﷺ کے تشریف فرما ہونے اور سلسلہ وحی کی وجہ سے یہ نوازئیدہ سوسائٹی ان منافقین کے ضرر سے محفوظ رہی۔ قرآن مجید نے متعدد جگہوں پر ان کو اچھی طرح بے نقاب کیا ہے۔ عام مسلمان بھی ان سے واقف، بیزار اور متنفر تھے، سوسائٹی نے بھی ان کو اپنے دائرے سے خارج کر دیا تھا اور ان کے لئے اس کے اندر

چوری چھپے گھسنے اور خلل اندازی کرنے کا زیادہ موقع باقی نہیں رہا تھا، سوسائٹی کے اعتماد کو حاصل کرنے اور منصب و اقتدار تک پہنچنے کی بات تو بہت دور کی بات تھی، چنانچہ یہ اولین اسلامی سوسائٹی برابر صحت مند اور ان آلائشوں سے محفوظ رہی، نفاق اس کو کمزور نہ بنا سکا اور منافقین کو بھی اس کو نقصان پہنچانے کا موقع نہ مل سکا بلکہ ان کی کمزوری، شکست خوردگی اور بد حالی کو دیکھ کر بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم کو، جن میں بڑے جلیل القدر صحابی بھی شامل تھے، یہ خیال پیدا ہوا کہ شاید ان کی نسل ختم ہو چکی ہے اور عہد نبوی کے بعد اب نفاق کا کوئی وجود نہیں رہا لیکن نفاق پہلے بھی انسانی زندگی کا ایک خاصہ اور بہت سے لوگوں کی کمزوری تھا اور آج بھی ہے، اس نے کسی وقت قافلہ انسانی کا ساتھ نہیں چھوڑا ہے اور ہر موقع اور گنجائش سے پورا فائدہ اٹھایا ہے اور اپنی جگہ بنائی ہے۔ بہت سے اسباب و عوامل نے (جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں) اس کی ہمت افزائی کی اور اس کو تخت سلطنت، حربی قوت اور انتظام حکومت کی منزل تک پہنچایا نیز علم و ادب کی محفلوں میں اس کو باریابی کا موقع دیا اور یہ سب اس عہد میں ہوا جب اسلام پیش قدمی کر رہا تھا، فاتح و با اقتدار تھا اور اسلام قبول کرنے اور اسلامیت کا مظاہرہ کرنے میں بہت سے سیاسی اجتماعی اور اقتصادی فوائد بھی تھے، یہ وہ موقع تھا جب نفاق نے آگے بڑھ کر وسیع اسلامی سلطنت کے کلیدی اور اہم عہدوں پر قبضہ کر لیا اور اس میں ایسے لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے کسی خاص فن یا صنعت میں اپنی مہارت کی وجہ سے یا غیر معمولی ذہانت یا علمی برتری کی وجہ سے نوزائیدہ اسلامی حکومت پر پورا تسلط حاصل کر لیا اور ان میں بڑے اعلیٰ درجے کی انتظامی صلاحیتوں کے لوگ، افواج کے سپہ سالار اور ادباء، و اہل قلم اور حکومت کے اہل کار پیدا ہوئے۔

ان حالات میں ایک مرتبہ سیدنا حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے نفاق اور منافقین کی موجودگی کے بارے میں سوال کیا گیا اور آنحالیہ اقتدار اسلام اور مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے۔ انہوں نے اثبات میں جواب دیا اور صرف ان کے وجود کی تصدیق ہی نہیں کی بلکہ اس کا اظہار کیا کہ وہ طاقت کی پوزیشن میں ہیں۔ ان سے ایک شخص نے پوچھا کہ حضرت! کیا آج بھی نفاق کا کہیں وجود ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ اگر منافقین بصرہ کی گلیوں کو چھوڑ دیں تو تم کو ویرانی کی وجہ سے وحشت ہونے لگے۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ اگر وہ نکل جائیں تو تم اپنے دشمنوں سے عہدہ برآ نہ ہو سکو۔ ایک موقع پر کہا کہ خدا کی شان! اس امت کو منافقین نے کتنا نقصان

پہنچایا اور کس طرح اس پر قبضہ کر لیا۔

اس کے بعد غیر ملکی اقتدار اور مغرب کی فکری و تہذیبی یلغار کا دور شروع ہوتا ہے اور مشرق اپنے ارادے سے یا بلا ارادہ مغربی طرز تربیت، نظام تعلیم، وبستان فکر، مغربی تصور اور علوم و فنون کے مغربی زاویہ نگاہ کے سائے میں یا زیادہ بہتر الفاظ میں اس کی گود میں اس طرح آ جاتا ہے جیسے کوئی شیر خوار بچہ کسی دیرینہ سال مربی و اتالیق کی آغوش میں چلا جاتا ہے۔ وہ اس کے پورے نظام تعلیم یا مختصر الفاظ میں اس کے نظریہ تعلیم کو اس کی ساری خرابیوں اور خامیوں کے باوجود جوں کا توں قبول کر لیتا ہے، جو ایک ایسی سر زمین میں پیدا ہوا اور نافذ کیا گیا جس کے عقائد، بنیادی اصول، اخلاقی قد ریں، اسلامی معاشرہ کی قدروں اور بنیادی مسئلہ اصولوں سے ہر جگہ اور ہر سطح پر مختلف ہیں، جن پر وہ پورا ایمان رکھتا ہے یا ان پر ایمان لانا، ان کے لئے جدو جہد کرنا، ان کے لئے کچھ نہ کچھ قربانی دینا اپنے لئے ضروری سمجھتا ہے بلکہ مغرب کی اخلاقی قدروں کی تردید اور ان کی شیخ کنی اور تحقیر ہی پر اس کی بنیاد ہے، ایسی حالت میں اس کی مثال بعینہ اس شخص کی سی ہوتی ہے جو آب حیات کے شوق میں ہر کا پیالہ پینا چاہے یا کھاری اور نمکین پانی سے اپنی پیاس بجھانے کی کوشش کرے۔

انہوں نے اپنے تعلیمی منصوبوں اور علمی اداروں کی تشکیل میں بیرونی ملکوں کے تعلیمی مشیروں کو پورا اختیار دے رکھا ہے اور ان ملکوں سے صرف درسی کتابیں ہی درآمد نہیں کر رہے ہیں بلکہ وہ ان ملکوں میں اپنے تعلیمی وفد بھیجتے ہیں تاکہ وہ مغربی ماہرین تعلیم اور اساتذہ کی تربیت میں نشوونما حاصل کریں۔ پھر ان کو ممالک اسلامیہ کی تعلیمی منصوبوں اور پالیسیوں کی تشکیل و تربیت کی پوری آزادی بھی دے دیتے ہیں کہ جس طرح چاہیں ان کا نقشہ بنائیں اور ان کا جو رخ چاہیں متعین کریں۔ اس کے نتیجے میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا جو اپنے عقائد و افکار اور اپنے اخلاق و سیرت میں ذہنی انتشار کا شکار ہے، فکر مغربی اور فکر اسلامی کے درمیان تذبذب کی حالت بھی بسا غنیمت تھی لیکن اس نے اکثر اوقات اپنے ملک و ملت اور اپنے معاشرے کے سارے معقولات و مسلمات اور اصول و اقتدار سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔

یہ ایک بالکل قدرتی بات تھی جس پر کوئی تعجب نہ کرنا چاہئے بلکہ اگر یہ بات نہ ہوتی تو مقام تعجب تھا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ ماہرین اور مشیران تعلیم اور ان کے شاگرد اپنے کام میں مخلص

ہوں اور اس تعلیمی پالیسی اور منصوبہ بندی میں ان کے پیش نظر اسلامی ملکوں اور نئی نسلوں کی فلاح و ترقی ہو لیکن یہ فرض کر لینے سے بھی ان ملکوں میں پیدا ہونے والے فکری اضطراب اور بنیادی تضاد اور ناہمواری میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتا اور تصویر اسی طرح تاریک رہتی ہے، ان میں سے اکثر لوگوں کی اس خاصیت کو اس پر بھی محمول کیا جاسکتا ہے کہ وہ دین سے اور اس کی بنیادوں اور اصولوں سے، مسلم اقوام کے مزاج و کردار، اور ان کی شخصیت و دعوت کے مطابق اور منافی دونوں چیزوں سے واقف نہیں ہوتے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ ان ملکوں اور قوموں کو فائدہ پہنچانا چاہتے ہوں لیکن ان کو بچانے کی یہی کوشش ان کی ہلاکت کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

عہد حاضر کے ماہرین تعلیم نے بالاتفاق اس کا اظہار کیا ہے کہ تعلیم کوئی ایسا تجارتی سامان نہیں ہے جو درآمد کیا جاسکے مثلاً مصنوعات، خام مال، وہ ایجادات و ضروریات جو کسی ملک اور علاقہ کے ساتھ مخصوص نہیں، وہ ایسا لباس ہے جو ان اقوام کے قد و قامت اور جسامت کے ٹھیک ناپ کے مطابق تراشا اور سیا جاتا ہے اور پسندیدہ و محبوب علم و فن اور ان مقاصد کو سامنے رکھ کر تیار کیا جاتا ہے جن کے لئے وہ ہر طرح کی قربانی دے سکتی ہیں اور وہ ہے کہ تعلیم صرف اس عقیدہ کو مضبوط کرنے کا ایک مہذب اور شائستہ طریقہ ہے جس کا حال یہ ملک یا قوم ہے۔ اس کا مقصد فکری طور پر اس کو غزا دینا، اس پر اعتماد پیدا کرنا اور اگر ضرورت ہو تو علمی دلائل سے اس کو مسلح کرنا ہے، وہ اس عقیدہ کے دوام و بقا کا وسیلہ اور بے کم و کاست آنے والی نسلوں تک منتقل کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ نظام تعلیم کی بہترین تعریف یہ ہے کہ وہ والدین اور مربیوں اور نگرانوں کی اس سعی پیہم کا نام ہے جو وہ اپنی اولاد کو اپنے دین و مسلک پر قائم رکھنے کے لئے کرتے رہتے ہیں اور ان کی اس طرح تربیت کرنا چاہتے ہیں کہ وہ ان کے ورثے کے (جو انہوں نے اپنے آباؤ اجداد سے حاصل کیا تھا) اہل وارث اور امین ثابت ہوں اور ان کے اندر اس ثروت میں اضافہ اور توسیع اور اس کو ترقی دینے کی پوری صلاحیت ہو۔

برطانیہ کے ماہرین تعلیم کی ایک رپورٹ میں یہی بات کہی گئی ہے جس کا خلاصہ حسب

ذیل ہے:

”ریاست کا مفاد اس میں ہے کہ وہ دیکھے کہ اسکولوں کے ذریعے قومی زندگی کے مکمل

اجزاء، سلا بعد نسل منتقل ہوتے ہیں۔ اس کا کام ہے کہ یہ دیکھے کہ طلبہ قومی مفاد کے مقررہ معیار کی کارکردگی کو قائم رکھتے ہیں اور اسے ترقی دیتے ہیں ریاست کی ظاہری تعلیمی سرگرمی کے پس پشت غیر مرتب لیکن معاشرہ کی سب سے اہم ضرورت یہ ہے کہ نچے قومی خصوصیات کے جانشین بنتے ہیں۔“

گارفورڈ نے اپنی ایک کتاب میں اس حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ
 ”اولین طور پر تعلیم کے مقصد کو سماج کی روایات اور اس کے موجودہ اقدار پر رکھنا چاہئے کیونکہ یہی وہ بنیادیں ہیں جن پر اس کی خصوصیات اور بقا منحصر ہے، اور یہ بے حد ضروری ہے کہ ان دونوں کے درمیان دفعتاً کوئی بے ربطی نہ پیدا ہو۔ اس کے بجائے ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ ترقی کی ہر کوشش سماج کے مسلم اقدار کی بنیاد پر ہو۔“

ایک اور ماہر تعلیم ورنن میلنسن کی شہادت میں اس سے زیادہ یقین اور صراحت سے کام لیا گیا ہے، وہ لکھتا ہے:

”ایک قسم کا ذہنی منشور جو پورے معاشرے کے مشترکہ مقصد اور مشترکہ کوششوں کا آئینہ وار ہوتا ہے۔ ایک طرح یہ بڑے پیمانہ پر قومی جذبہ کی عکاسی کرتا ہے اور ان خصوصیات کا مجموعہ ہوتا ہے جو معاشرے کے نصب العین کے لئے ضروری ہوتا ہے۔“

مغرب اپنے سیاسی نظاموں اور مکاتب خیال کے اختلاف نیز اپنے مشرقی و مغربی کیمپوں اور اپنی ساری قومی بیماریوں، نقائص اور خامیوں کے باوجود اس تعلیمی پالیسی پر پوری طرح کاربند ہے اور تعلیم و تربیت کے تمام شعبوں میں اس نے اس بہ تمام و کمال نافذ کر رکھا ہے اور اس کے تمام تعلیمی پروگرام اور تعلیمی پالیسیاں اسی مقرر کردہ اصول کی تابع ہیں۔

سوویت یونین بھی، جو انقلابی ذہن اور اپنی انتہا پسندی میں مشہور ہے، اس اصول کو نافذ اور جاری کرنے میں سرمایہ دارانہ جمہوری حکومتوں سے پیچھے نہیں رہا بلکہ شاید اپنے اشتراکی نظریہ کی حفاظت اور انقلابی روح کی بناء پر اس اصول کو علمی جامہ پہنانے میں وہ ان ممالک سے بھی آگے ہے۔ ایک سرکاری حکم نامہ بحریہ ۱۲/ نومبر ۱۹۵۸ء میں یہ کہا گیا ہے کہ:

”ان خصوصیات کے حصول میں سماجی علوم کی تعلیم ایک اہم کردار ادا کرتی ہے مارکسزم، لینن ازم کے مبادیات کا علم ہر فن کے ماہرین کے لئے اشد ضروری ہے۔ ہمارے نوجوانوں کی

تربیت اس طرح ہونی چاہئے کہ ان میں نصب العین اور احیاء پرستی کے خلاف تعصب کی روح سرایت کر جائے۔“

یہی وہ چیز ہے کہ جس کی وجہ سے مغرب اس نقصان سے محفوظ رہا جس کا شکار مشرق کے اسلامی وغیرہ اسلامی ممالک ہیں، چنانچہ آج مغرب میں عوام اور قیادت یا جمہور اور حکومت میں کسی گہری اور وسیع نظریاتی، ذہنی و فکری خلیج کا سراغ نہیں ملتا، وہاں صرف ایک طرز، ایک آئیڈیل اور ایک قسم کے اصول و نظریات اور مقاصد و نصب العین پائے جاتے ہیں۔ وہاں مختلف طبقات اور سوسائٹی کے افراد کے درمیان کسی قسم کی ذہنی اور نفسیاتی رسد کشی نہیں اور اسی وجہ سے یہ ممالک اندرونی سازشوں اور بغاوتوں سے محفوظ ہیں۔

مغرب کے بعد ان مشرقی ممالک کا نمبر آتا ہے جو مدت دراز سے اپنا کوئی عقیدہ نہیں رکھتے اور ان کو ان حقائق پر یقین نہیں جن کی ایمان بالغیب اور انبیاء کی تعلیمات و ہدایت پر بنیاد ہے۔ ان کے پاس متعین آسمانی تعلیمات یا محفوظ آسمانی صحیفے بھی نہیں ہیں۔ وہ صرف ان قومی روایات اور جماعتی و شخصی مفادات کی حامل ہیں جن کو یہ تعلیمی نظام اور پروگرام چیلنج نہیں کرتی اور کسی جگہ اور دونوں کے مفادات کا ٹکراؤ نہیں ہوتا، چنانچہ یہ ممالک بھی اسی طرہ اس تضاد سے محفوظ ہیں جو مغربی نظام تعلیم پیدا کرتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ انہوں نے اس نظام تعلیم سے صلح صفائی کر لی ہے اور دونوں میں پوری مفاہمت پائی جاتی ہے یا انہوں نے اپنے آپ کو ان تعلیمی و تربیتی نظریات کے مطابق ڈھال لیا ہے اور اسی لئے انقلابات اور سازشوں کا تناسب یہاں بہت کم اور تضاد بھی بہت کم یا اتنا کمزور ہے کہ قومی زندگی پر اس کا کوئی اثر ظاہر نہیں ہوتا۔ ملک سے غداری اور قومی خیانت کے واقعات شاذ و نادر ہی رونما ہوتے ہیں اور یہاں بھی عوام اور رہنما طبقہ میں وہ وسیع خلیج حائل نہیں ہے جو ہمیں اسلامی ملکوں میں نظر آتی ہے۔ ان ممالک کے امراض اور ان کے عیوب دوسری نوع کے ہیں اور اس کے اسباب و عوامل بھی بالکل دوسرے ہیں جن کا تعلق ان کی تاریخ، ان کے قومی مزاج، مخصوص عقائد، دینی حاسہ کی کمزوری، شعور کی کمی اور نظام تعلیم و تربیت کی فساد سے ہے۔

جہاں تک اسلامی ممالک کا تعلق ہے، وہاں یہ کشمکش اور عجیب تضاد بڑے وسیع پیمانہ پر اور مختلف سطح پر پایا جاتا ہے۔ وہاں ایک طرف حکومت اور جمہور میں کشمکش ہے تو دوسری طرف

اعلیٰ تعلیم یافتہ اور کم پڑھے لکھے یا ناخواندہ لوگوں میں رسہ کسی ہے اور تیسری طرف دیندار، آزاد خیال اور ترقی پسند افراد دست گریباں ہیں اور یہ سب نتیجہ ہے اس نظام تعلیم کا جو مغربی ملکوں سے درآمد کیا جا رہا ہے یا مغربی ذہن اور نظام تعلیم کے خطوط پر خود ان ملکوں میں تیار کیا جا رہا ہے اور اس کے نتیجے میں ایک ایسی نسل پیدا ہو رہی ہے جو ان عقائد اور حقائق کو پوری طرح ہضم اور قبول نہیں کر پاتی جن پر اس کے معاشرہ اور اس امت کی بنیاد ہے، اس لئے کہ یہ نظام تعلیم جس طرح کے خیالات کی آبیاری اس کے دل و دماغ میں کرتا ہے وہ ان حقائق اور عقائد سے کھلے طور پر متصادم ہیں جو اس معاشرہ کے لئے ناگزیر ہیں، کبھی خارق عادت طریقہ پر یا کسی بیرونی اثر سے وہ اس کو قبول کرتی ہے تو لازماً اس کے نتیجے میں یہ نظام تعلیم ضرور کمزور پڑتا ہے لیکن ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔

جب یہ طبقہ اس نظام کی آغوش میں تربیت پا کر نکلتا ہے تو قوم کے عقیدے، خیالات اور جذبات سے اس کی کشمکش شروع ہو جاتی ہے۔ اگر وہ قوی الارادہ ہوتا ہے تو وہ رجعت پسندی کے بلے کو (جیسا کہ اس طبقہ کے افراد یہ اصلاح استعمال کرتے ہیں) راستے سے ہٹا کر اپنی قوم و ملک کو ماضی کے بارگراں سے رہائی بخشنا چاہتا ہے۔ اس موقع پر ایک ایسی طویل کشمکش برپا ہوتی ہے جس پر ملت کی ساری توانائیاں اور صلاحیتیں بے دریغ خرچ ہوتی ہیں اور اندرونی خانہ جنگیوں کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوتا ہے جو بیرونی جنگوں سے بھی بڑھ جاتا ہے۔ یہ ان ممالک کے قصے ہیں جہاں ایسی قیادتیں برسرِ اقدار تھیں جو انقلابی قوم پرستانہ اور لادینی فلسفوں پر یقین رکھتی تھیں۔

اگر اس طبقہ کی قوت ارادی کمزور ہوتی ہے اور وہ طاقتور شخصیت سے محروم ہوتا ہے تو وہ احساس کمتری کا شکار ہو جاتا ہے اور اس کے اندر عقائد اور مقاصد کی طرف سے دلی نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ آئے دن اس کے خلاف سازشوں میں مصروف رہتا ہے، غیر ملکوں اور بیرونی طاقتوں سے ساز باز کر لیتا ہے اور عوام کے قومی جذبہ اور باؤ اور علماء و دعوت دین کے علمبرداروں کے اثر و رسوخ سے پہلی فرصت میں چھٹکارا حاصل کر لینا چاہتا ہے، چنانچہ اس کے نتیجے میں غداری کے واقعات بار بار رونما ہوتے ہیں اور یہ ممالک مستقل طور پر بے یقینی، خوف و دہشت، ذہنی انتشار اور شبہ و بے اعتمادی کی فضا میں رہتے ہیں۔

اس غیر فطری اور غیر ضروری صورت حال سے چھٹکارا پانے کی اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں ہے کہ اس پورے تعلیمی نظام کو یکسر تبدیل کر دیا جائے اور اس کو ختم کر کے نئے سرے سے ایک نیا نظام تعلیم تیار کیا جائے جو اس ملت اور امت کے قد و قامت پر راست آتا ہو اور اس کی دینی و دنیاوی ضروریات پوری کر سکتا ہو۔

یہ عالم اسلام کا سب سے بڑا مسئلہ، اس کی سب سے اہم اور ناگزیر ضرورت، وقت کی آواز اور اسلامیان عالم کا سب سے بڑا فرض ہے۔

اس مسئلے کا حل، خواہ وہ کتنا ہی دشوار نظر آ رہا ہو؟ اور صبر آزما اور دقت طلب ہو، اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس نظام تعلیم کو از سر نو ڈھالا جائے اور اس کو امت مسلمہ کے عقائد، زندگی کے نصب العین، مقاصد اور ضروریات کے مطابق بنایا جائے اور اس کے تمام اجزاء سے ماویت، خدا سے سرکشی، اخلاقی و روحانی قدروں سے بغاوت اور جسم و خواہشات کی پرستش اور فکر اور پوری انسانیت پر شفقت کی روح اس میں جاری و ساری کر دی جائے۔ اس مقصد کے لئے زبان و ادب سے لے کر فلسفہ اور علم النفس تک اور علوم عمرانیہ سے لے کر اقتصادیات اور معاشیات تک صرف ایک روح پیدا کرنا ہوگی۔ مغرب کے ذہنی غلبہ اور تسلط کا خاتمہ کرنا ہوگا، اس کی قیادت و امامت کا انکار کرنا پڑے گا، اس کے علوم و نظریات و علمی تحلیل و تجزیہ اور بے لاگ تنقید کا مسلسل اور جرأت مندانہ رد عمل کرنا ہوگا اور یہ ثابت کرنا ہوگا کہ مغرب کی کامیابیوں اور پیش قدمیوں نے انسانیت اور تہذیب کو کتنا بڑا نقصان پہنچایا ہے۔

اس کے علوم کے ساتھ مواد خام کا سا معاملہ کرنا ہوگا اور اس سے وہ چیزیں تیار کرنا ہوں گی جو ان قوموں اور ملکوں کی اپنی ضروریات، رجحانات اور ان کے عقیدہ و تہذیب سے ہم آہنگ ہوں۔

اس راہ میں اگرچہ بہت سے سنگ گراں ہیں اور نتائج بھی بہت تاخیر سے ظاہر ہو سکتے ہیں لیکن تجد و پسندی، آزاد خیالی اور مغرب کی ذہنی غلامی کی اس طوفانی موج کو روکنے کا واحد طریقہ ہے جس نے عالم اسلام کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہلا کر رکھ دیا ہے اور اسلام کے فکری و اجتماعی ڈھانچہ اور ملت ابراہیمی کے شیرازہ کے لئے ایک چیلنج بن گئی ہے، اور جس کے نتیجے میں مسلم اقوام کے پر جوش اسلامی جذبات، ان کی سادہ دلی اور گرم جوشی، ان کی قربانیاں

اور سرفروشیاں اور اخلاص و وفا کی قیمتی سوغات (جس کا ان حکومتوں کے قیام اور غیر ملکی اقتدار سے آزادی میں سب سے بڑا اور براہ راست دخل ہے) افرنگی اور مغربیت کے تنور کی حقیر ایندھن بن رہی ہے۔ سب لوح، بے زبان، سچے اور مخلص مسلم عوام خاموشی سکون کے ساتھ بکریوں کے ریوڑ کی طرح نامعلوم منزل کی طرف ہنکائے جارہے ہیں اور یہ طبقہ ان کی قسمت کا مالک بن گیا ہے۔

کیا آج کوئی اسلامی ملک، کوئی اسلامی حکومت اور کوئی بڑی اسلامی یونیورسٹی اس آواز پر لبیک کہہ سکتی ہے؟ اور اپنی ساری کوششیں، توجیہات اور ذرائع و وسائل اس اہم تعمیر اور انقلابی آغاز پر مرکوز کر سکتی ہے؟ جو بالآخر عالم اسلام کو سب سے بڑے خطرہ اور چیلنج سے بلکہ مکمل تخریب کے اس عمل سے (جو جاری ہے اور جس سے عمومی، ہمہ گیر اور دور رس قومی تباہی و بربادی اقوام و مذاہب اور تہذیب و تمدن کی پوری تاریخ میں نہیں ملتی) بچا سکتی ہے؟

وما علینا الا البلاغ المبین

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا پیغام

فیصل ایوارڈ کمیٹی کے نام

فیصل ایوارڈ کمیٹی سعودی عرب نے مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کو ایوارڈ حاصل کرنے پر مبارک باد پیش کرنے کے ساتھ ۱۲ فروری کو تقسیم انعام کے جلسہ میں شرکت کی دعوت دی تھی، مگر مولانا رحمۃ اللہ علیہ اپنی غیر معمولی مصروفیتوں اور پہلے سے طے شدہ پروگرام کی وجہ سے تشریف نہ لیجاسکے تھے البتہ اپنی طرف سے ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی مدظلہ العالی کو مکلف فرمایا کہ وہ ان کی قائم مقامی کریں اور مندرجہ ذیل پیغام اس انعامی تقریب کے موقع پر حاضرین تک پہنچادیں۔ ذیل میں اس پیغام کا اردو ترجمہ نذر قارئین ہے۔

الحمد لله رب العلمين والصلوة والسلام على رسول الله سيدنا

محمد وآله وصحبه اجمعين.

معزز صدر جلسہ اور حاضرین بزم! السلام علیکم ورحمۃ وبرکاتہ
ہم آپ کے اور عالمی فیصل ایوارڈ کی اس سلیکشن کمیٹی کے شکر گزار ہیں جس کے منتخب انعام یافتہ حضرات میں ہمارا بھی نام شامل ہے۔

آپ حضرات کا یہ انتخاب اگر کسی بات کی شہادت دیتا ہے تو وہ مکمل اور بھرپور اعتماد ہے جو اسلام کے اس خادم کے ساتھ ظاہر کیا گیا ہے جو حسب توفیق الہی اپنی مقدرت بھر دین کی خدمت میں مشغول ہے۔ مختلف میدانوں میں اسلام کی سربلندی کے لئے کام کرنے والوں کی ہمت افزائی و سرپرستی کے لئے جس طرح یہ حکومت اور فیصل ایوارڈ کمیٹی کام انجام دے رہی ہے اس سے ہم سب خوب واقف ہیں، نیز اس ایوارڈ کی معنوی قدر و قیمت اور اس بلند و پاکیزہ جذبات سے بے خبر نہیں جو اس کی تہ میں کارفرما ہیں۔

دین کی خدمت کا تقاضا ہمیشہ یہی رہا ہے کہ محض اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کی نیت سے یہ کام بغیر کسی اجرت اور معاوضہ کے تصور کے انجام دیا جائے، سلف صالحین، اور اللہ کے مخلص بندوں کا طرز عمل ہمیشہ اس معاملہ میں یہی رہا ہے کہ وہ اس دنیا میں دین کی کسی خدمت کا ادنیٰ

معاوضہ حاصل کرنے کا خیال بھی دل میں نہ لاتے تھے بلکہ اس بات سے چوکنار ہا کرتے کہ خدا نخواستہ ان کے دینی کاموں میں دنیاوی نفع کا شائبہ بھی آ سکے، لیکن آج کے دور میں اسلام خود عالم اسلام میں اجنبی بن کر رہ گیا ہے اور جس اسلام نے پوری انسانیت پر احسانات کی بارش کی تھی اب اسی کے ساتھ احسان فراموشی اور بے مہری سے کام لیا جا رہا ہے اور اس کی راہ میں طرح طرح کی رکاوٹیں ڈالی جا رہی ہیں۔ اسی پر بس نہیں بلکہ اسلام کے خلاف سرگرم مخالف طاقتوں کی سرپرستی کی جا رہی ہے اور الحاد و بے دینی کو بڑھایا جا رہا ہے۔ ان اسباب و محرکات کی بناء پر اسلام کا در در کھنے والوں کی سرپرستی و ہمت افزائی کے لئے جو چند اقدامات کئے ہیں ان میں عالمی فیصل ایوارڈ کمیٹی کا قیام سرفہرست ہے، جس نے اس دین حنیف کی خدمت کرنے والوں کے لئے بطور ہمت افزائی ایک مخصوص سالانہ انعام دیئے جانے کا فیصلہ کیا، یہی احساسات مجھ پر اس وقت غالب تھے جب میں نے اس انعام کو قبول کرنے کا فیصلہ کیا جو میری ادنیٰ خواہش و طلب کے بغیر بالکل خلاف توقع تھا۔ اس ایوارڈ کا انتساب جس شہید ملک فیصل کے نام نامی سے ہے اور اس کی تہہ میں جو پاکیزہ جذبات کا رفرما ہیں ان سب کا تقاضا تھا کہ میں شکر و سپاس کے جذبات کے ساتھ اس کی قدر کی توفیق عطا فرمائے۔

چند ناگزیر اسباب اور پہلے سے طے شدہ ضروری پروگرام کی وجہ سے خود اس انعام کو قبول کرنے اور ذاتی طور پر شکریہ ادا کرنے سے قاصر رہا۔ میری طرف سے ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی ریڈر ملک عبدالعزیز یونیورسٹی اس مبارک موقع پر آپ کی خدمت میں حاضر ہو رہے ہیں۔ اس انعام کی جو غیر معمولی معنوی قدر و قیمت ہے وہ اس کی مالی حیثیت کے مقابلہ میں بہت بلند ہے۔

(۱) اس پیغام کو سنانے کے بعد ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی نے کہا،
ولی عہد معظم اب میں آپ سے اجازت چاہوں گا کہ مولانا ندوی کی طرف سے اس رقم کے مندرجہ ذیل طریقہ سے تقسیم کا اعلان کروں۔

روسی جارحیت کی وجہ سے ہمارے بے شمار افغانی بھائیوں کو گھر سے بے گھر ہونا پڑا۔ سعودی حکومت نے ان بے گھر پناہ گزینوں کی امداد و اعانت کے لئے بڑی فیاض امداد دی ہے اس لئے مولانا ندوی نے انعامی رقم کا نصف حصہ پناہ گزینوں کے فنڈ میں دینے کا فیصلہ کیا ہے۔

بقیہ نصف رقم میں سے ایک ربع مکہ مکرمہ میں حفظ قرآن کے مدارس کے لئے اور باقی چوتھائی رقم مکہ مکرمہ ہی کے مدرسہ صولیہ کے لئے، تاکہ یہ دونوں ادارے دینی تعلیم کے کاموں کو سرگرمی سے انجام دیتے رہیں۔

جہاں تک اس ایوارڈ کی مادی قدر و قیمت کا تعلق ہے میں آپ کی اجازت سے اس انعام کو ملت کے ان کاموں پر صرف کرنا پسند کروں گا جن کا اعلان ڈاکٹر عبداللہ عباس مدوی! سے ایوارڈ لیتے وقت کریں گے۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

مرد وہ ہیں جو زمانہ کو بدل دیتے ہیں

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم . اما بعد . فاعوذ باللہ من الشیطان
الرجیم . بسم اللہ الرحمن الرحیم . انہم فتیۃ آمنوا برہم وزدنہم ہدی وربطنا
علی قلوبہم اذ قاموا فقالوا ربنا رب السموت والارض لن ندعوا من دونہ الہا
لقد قلنا اذا شططا .

حضرات! یہ سورہ کہف کی ایک آیت ہے اس کا عنوان اگر اس زمانہ کے اسلوب اور
اشاؑل میں مقرر کروں تو کہوں گا ”قصہ سات جواں مردوں کا۔“ (۱) اس قصہ میں نسل انسانی کے
نو جوان عنصر کے لئے خصوصی پیغام اور ایک اعلیٰ نمونہ ہے، جو ہر زمانہ میں کام دے سکتا ہے اور
جو صرف دماغ و دل پر نہیں، بلکہ صلاحیتوں، حوصلوں اور عزائم پر بھی ایک تازیانے کا کام دے
سکتا ہے، وہ کبھی شبنم پکاتا ہے، کبھی پھول کی جھڑیاں لگاتا ہے، مجھے بھی آج نو جوانوں کے
سامنے نو جوانوں کا قصہ سنانا ہے، اور میں کیا سناؤں گا، قرآن مجید سناتا ہے، یہ وہ نو جوان ہیں
جن کو قرآن نے ان کا تذکرہ کر کے لافانی بنادیا، اور ہر دور کے نو جوانوں کے لئے قابل تقلید
نمونہ اور آئیڈیل۔ بات بڑی مختصر، بڑی سادہ، لیکن بڑی عمیق اور سبق آموز۔

قصہ یہ ہے کہ رومن امپائر کے ایک حصہ میں جو شام و فلسطین کہلاتا ہے، ایک دعوت پیدا
ہوئی جس کو لانے والے سیدنا مسیح علی الصلوٰۃ والسلام تھے جو ہم مسلمانوں کے نزدیک بھی خدا
کے پیغمبر برحق ہیں، انہوں نے تو حید کی دعوت دی، اس وقت ساری دنیا میں شرک پھیلا ہوا تھا
اور ہر طرف گھٹاؤپ تار کی چھائی ہوئی تھی۔ اس اندھیرے میں ایک روشنی چمکی، حضرت عیسیٰ
علیہ السلام نے شرک، نسل پرستی، رسم پرستی، توہم پرستی، ظاہر پرستی اور انسانیت کے استحصال کے
خلاف آواز بلند کی، جس کی اصل اساس تو حید اور سچی خدا پرستی تھی، اس دعوت کو کچھ لوگوں نے
تسلیم کیا اور وہ اس کے حامی و داعی بن گئے، انہوں نے اپنے قلمرو سے باہر قدم نکالا اور رومی

(۱) قرآن مجید میں آتا ہے کہ کسی نے کہا چار تھے پانچواں ان کا کتا تھا، کسی نے کہا چھ تھے، ساتواں ان کا کتا تھا، کسی
نے کہا سات تھے، آٹھواں ان کا کتا تھا۔ اس کے بعد قرآن مجید نے آگے کوئی ہندسہ نہیں بتایا، اس سے منسخرین اس
مقیہ پر پہنچے ہیں کہ وہ تعداد میں سات ہی تھے۔

شہنشاہیت کے مرکز کے قریب جا کر دعوت پیش کی۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ سن رسیدہ اور پختہ کار لوگوں کے مقابلہ میں (جن کے پاؤں میں تجربات، مفادات، رسم و رواج اور خوف و امید کی بھاری بیڑیاں پڑی ہوتی ہیں، اور ان کو کسی نئے تجربے اور انقلابی اقدام سے باز رکھتی ہیں) نوخیز اور جوان سال (جن کے پاؤں میں یہ بیڑیاں نہیں ہوتیں) اور ان کی وابستگیاں، اور ان کا انچھٹ ان چیزوں کے ساتھ نہیں ہوتا جن کے ساتھ عموماً بڑی عمر والوں کا ہوا کرتا ہے، نئی اور صالح دعوت کو جلد قبول کر لیتے ہیں۔ قرآن مجید ان نو جوانوں کی عمر کا تعین نہیں کرتا اور یہی قرآن مجید کا طریقہ ہے۔

اگر وہ کہتا کہ ۱۸-۲۰ سال کے نو جوان تھے، تو اس سے اوپر اور اس سے نیچے عمر والوں کو بہانہ مل جاتا کہ ہمارا قصہ نہیں ہے، قرآن کہتا ہے ”انھم فتیۃ“ وہ چند نو جوان تھے، جو حضرات عربی کا ذوق رکھتے تھے، وہ جانتے تھے کہ ”فتیۃ“ کے لفظ کے لفظ میں عمر کی جوانی کے ساتھ دل و دماغ اور حوصلوں اور عزم و ارادہ کی جوانی کی طرف بھی اشارہ آ گیا ہے۔ اس لئے اس کے ترجمہ میں، میں نے ”جوان مرد“ کا لفظ اختیار کیا، ”فتیۃ“ ”فتی“ کی جمع ہے ”فتی“ کی جمع ”فتیان“ بھی آتی ہے، لیکن ”فتیۃ“ جمع قلت کے لئے استعمال ہوتا ہے، اس طرح قرآن اشارہ دیتا ہے کہ وہ گنتی کے چند نو جوان تھے اور یہی ہمیشہ ہوا ہے کہ جب خدا پرستی اور اصلاح حال کی صحیح دعوت آئی ہے تو اس کے ماننے والے ابتداء میں تھوڑے ہوئے ہیں، جن کو خدا نے اس کی توفیق دی اور ان کو یہ ہمت ہوئی۔

اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے اپنے اسمائے حسنی اور صفات میں بھی ”رب“ کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ ”انھم فتیۃ امنوا برہم“ یہ بات بہت معنی خیز ہے، اس لئے کہ حکومتوں کو اپنے یہاں کے باشندوں کے رازق ہونے کا بھی (کبھی زبان قال سے اور کبھی زبان حال سے) دعویٰ ہوتا ہے اور ان کے ساتھ اس طرح کے خیالات اور عقیدے وابستہ ہو جاتے ہیں کہ اگر اپنی پرورش کا سامان کرنا ہے اور عزت و راحت کی زندگی گزارنی ہے، تو ان حکومتوں سے اپنے کو متعلق کرنا پڑے گا۔ ان کا حاشیہ بردار ہو کر رہنا، اور ان کے رکاب میں چلنا پڑے گا۔ ان کی ہاں میں ہاں ملانا ہوگا۔ اس کے بغیر رزق اور خوشحال و فارغ البال زندگی کے دروازے یکسر بند ہیں، قرآن جو لفظ کہتا ہے، وہ اپنی جگہ پر انگوٹھی میں نگینہ کا کام دیتا ہے۔ پوری پوری کتابوں کا مضمون ایک

لفظ میں آجاتا ہے۔ یہ جواں مرد انسانوں کے اس جنگل میں کھڑے ہو گئے، جہاں اس رومن امپائر کا جھنڈا لہرا رہا تھا جو اس وقت دنیا کی سب سے منظم، سب سے متمدن، دنیا کو اس وقت کا سب سے ترقی یافتہ قانون دینے والی، دنیا کی سب سے وسیع خطہ پر حکومت کرنے والی شہنشاہی تھی۔

انگریزی محاورہ کے مطابق اس حکومت کی ناک کے نیچے اور بالکل آنکھوں کے سامنے چند نو جوان کھڑے ہو جاتے ہیں اور اس دعوت کو قبول کر کے اس کا اعلان کرتے ہیں، جو اس وقت کا صحیح مذہب اور اس عہد کا اسلام تھا۔ اس وقت تک مسیحیت میں تحریف نہیں ہوئی تھی۔ اس کے وہ داعی وہاں پہنچے تھے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیغام کے صحیح علمبردار تھے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارا رازق اور ہماری پرورش کا ذمہ دار حکومت نہیں ہے، ہمارا رازق اور پروردگار خدا ہے، اور وہی ہماری پرورش کا ذمہ دار ہے۔ ”ربنا رب السموت والارض“۔ ہماری پرورش کرنے والا وہ ہے جو آسمانوں اور زمین کا پروردگار ہے، یہ بات اس منظم سلطنت میں کہی گئی تھی، جس نے وسائل معیشت پر قبضہ کر رکھا تھا، گویا وہاں کے باشندوں کی قسمت و روزی کی مالک بن گئی تھی اور بظاہر نفع و ضرر کی ساری طاقتیں اس کے ہاتھ میں آ گئی تھیں۔ اس وقت دانشمندی اور حقیقت پسندی کا ایک ہی ثبوت تھا کہ حکومت کے دامن سے وابستہ ہو کر حکومت کے عقیدہ کو اختیار کر کے کم سے کم اس عقیدہ پر سکوت اختیار کر کے اس قلمرو میں اچھی زندگی گزاری جائے، انہوں نے پوری یونانی دیومالا اور رومی دیومالا کا انکار کیا جو اس وقت کی رومی تہذیب و تمدن و معاشرت اور عقائد و اعمال میں سرایت کر چکی تھی اور پورا معاشرہ مشرک اور توہم پرست بن گیا تھا۔ یونان اور رومہ (اور قدیم ہندوستان میں بھی) صفات الہی کا تصور دیوتاؤں کی شکل میں کیا جاتا تھا اور ان کے نام پر بڑے بڑے معبد اور ہیکل بنے ہوئے تھے۔ یہ محبت کا دیوتا ہے، یہ شفقت کا، یہ روزی دینے کا، یہ جنگ کا، یہ ہیبت و جلال کا، یہ بارش کا، ان نو جوانوں نے بیک زبان ان سب کا انکار کیا اور کہا:

ربنا رب السموت والارض لن ندعوا من دونہ الہا لقد قلنا اذا
اشططاً هؤلاء قوم اتخذوا من دونہ آلهة لولا یا تون علیہم بسلطن بین فمن
اظلم ممن افتری علی اللہ کذباً O (الکھف ص ۱۴، ۱۵)

ہمارا پروردگار آسمانوں اور زمین کا مالک ہے، ہم اس کے سوا کسی کو معبود سمجھ کر نہیں پکاریں گے۔ (اگر ایسا کیا) تو اس وقت ہم نے بعید از عقل بات کہی، ہماری قوم کے ان سب لوگوں نے اس کے سوا اور معبود بنائے ہیں یہ (ان کے خدا ہونے پر) کوئی کھلی دلیل کیوں نہیں لائے تو اس سے زیادہ کون ظالم ہے جو خدا پر جھوٹ افتراء کرے۔

یہاں قرآن مجید نے ایک اور حقیقت بیان کر دی وہ یہ کہ پہلا قدم آدمی کی طرف سے اٹھتا ہے، پہلے ہمت اس کی طرف سے ہونی چاہئے۔ اس کے بعد اللہ کی طرف سے مدد آتی ہے۔ ”امسوا برہم وزدنہم ہدی“ (وہ اپنے رب پر ایمان لائے اور ہم نے ان کی ہدایت میں اضافہ کیا) اگر آدمی اس کا منتظر رہے کہ کوئی چیز خود بخود دل میں نفوذ کر جائے، اس کے گلے منڈھ دی جائے تو یہ صحیح نہیں۔ پہلے خود فیصلہ اور ہمت کرنی ہوگی اس کے بعد خدا کی مدد آتی ہے۔ فرماتا ہے ”وربطنا علی قلوبہم“ (ہم نے ان کے دلوں کو سہارا دیا) اس لئے کہ ان کا واسطہ اس زمانہ کی سب سے عظیم اور قہرمان سلطنت سے تھا۔ وہ سرکاری مذہب کو چھوڑ کر نیا مذہب اختیار کر رہے تھے۔

یہ اصحاب کہف کا واقعہ ہے، مجھے شرق اردن کے سفر ۱۹۷۳ء میں اس غار کو دیکھنے کا اتفاق ہوا، جہاں وہ محو خواب ہیں، اردن کے آثار قدیمہ کے ڈائریکٹر محقق فاضل رفیق و فالد جانی صاحب نے ان کی زیارت کرائی اور علمی و فنی دلائل سے ثابت کیا کہ یہی اصحاب کہف کی جگہ ہے، تاریخ بتاتی ہے کہ اس واقعہ کو صدیوں تک نظم کیا جاتا رہا ہے، اور وہ وہاں کی ادبیات کا ایک جزء بنا رہا ہے، میں نے بہت تفصیل کے ساتھ اپنی کتاب ”معرکہ ایمان و مادیت“ میں تقابلی مطالعہ کی روشنی میں اس پر نظر ڈالی ہے۔ تاریخ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان نوجوانوں میں سے اکثر اہل دربار کی اولاد تھے، یعنی سلطنت کے خاندانی نمک خوار تھے، کسی کے باپ، کسی کے چچا، کسی کے بڑے بھائی اس وقت رومن امپائر کے کسی بڑے عہدے پر فائز تھے۔ اس لئے یہ مسئلہ اور زیادہ پیچیدہ اور نازک بن گیا کہ بات صرف اتنی نہ تھی کہ چند بے تعلق اور سر پھرے نوجوان کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے بغاوت کا نعرہ لگایا اور کہہ دیا کہ ہم سرکاری مذہب کو نہیں مانتے، ہم نے ایک نیا دین قبول کیا ہے۔

یہ وہ لوگ تھے، جن کے ساتھ پورے پورے خاندان اور خاندانوں کی قسمت اور عزت

وابستہ تھی۔ ان کے اس اقدام سے ان کے والدین، ان کے خاندان کے بزرگ اور ذمہ دار نازک پوزیشن میں مبتلا ہو گئے، ان سے براہ راست سوال کیا جاسکتا تھا کہ تم نے اپنے فرزندوں اور خوروں کو اس باغیانہ اقدام سے کیوں نہیں روکا؟ دوسری طرف خود ان کے بزرگان خاندان کے لئے ایک بڑی آزمائش تھی کہ وہ ان نوجوانوں کے متکفل تھے، وہ ان سے بڑی امیدیں رکھتے تھے اور ان کو ان کا مستقبل شاندار نظر آتا تھا۔ ایک جگہ قرآن مجید نے اس نفسیاتی کیفیت کو جو خاندان کے بزرگوں اور ذمہ داروں کو نوجوانوں کے اس طرح کے اقدام سے پیش آتی ہے بڑے بلغ انداز میں بیان فرمایا ہے، جب حضرت صالح علیہ السلام نے قوم ثمود میں توحید اور دین حق کی دعوت پیش کی تو قوم کے سربراہ وردہ لوگوں نے بڑے درد اور دل کی چوٹ کے ساتھ کہا کہ صالح! تم سے تو آئندہ کے لئے بڑی امیدیں اور توقعات وابستہ تھیں، خیال تھا کہ تم سیدھے سیدھے اس لائن پر چل کر (جس پر قوم چل رہی ہے) اس میں کچھ امتیاز پیدا کر کے اپنے خاندان کا نام روشن کرو گے اور اپنی قوم کے لئے عزت و افتخار باعث بنو گے۔

”قالو یصلح قد کنت فینا مرجوا قبل هذا“ (صالح تم ہماری امیدوں کا مرکز تھے) تم نے ہماری امیدوں پر پانی پھیر دیا، تم یہ نئی دعوت لے کر کھڑے ہو گئے اور پوری قوم کو مخالف بنایا۔ ”مرجوا“ کا تقریباً وہی مفہوم ہے جو انگریزی میں لفظ (Promising) کا ہے جو کسی ایسے ہونہار طالب علم، یا نوجوان کے لئے بولا جاتا ہے، جس کا مستقبل درخشاں نظر آتا ہے۔

یہ نوجوان گنتی میں بہت تھوڑے تھے، اور بعض قرائن و قیاسات کی بناء پر سات سے زیادہ ان کی تعداد نہیں تھی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کے ساتھ کئی سو آدمیوں کی قسمت وابستہ تھی، صرف ایک کے ساتھ پورا پورا خاندان اور برادری کا سلسلہ تھا اور وہ سب ان کے اس اقدام کی وجہ سے خطرہ میں پڑ گئے تھے اور شک کی نگاہوں سے دیکھے جانے لگے تھے۔ وہ کتنے خاندانوں کی امیدوں کا مرکز تھے اور کتنے گھروں کی ترقیاں و خوش حالیاں ان سے وابستہ تھیں؟ اس کی طرف لوگوں کی کم نظر جاتی ہے۔ بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ سات آٹھ کا معاملہ کیا؟ پکڑے گئے تو پکڑے گئے اور مارے گئے تو مارے گئے!

اگر زندگی کے آسائشوں سے محروم ہوئے تو سات ہی آدمی تو محروم ہوئے، یہ نہیں

سوچتے کہ معاملہ کبھی ایک اکیلے آدمی کا نہیں ہوتا، متمدن زندگی میں فرد واحد (اکائی) کا تصور مشکل ہے۔ شعراء تو اس کا تصور کر سکتے ہیں لیکن واقعات کی دنیا میں اکثر فرد واحد کا وجود نہیں ہوتا۔ اس کے تعلقات و روابط کتنے لوگوں سے ہوتے ہیں، اس لئے فرد واحد فرد واحد نہیں ہوتا۔ اگر یہ سات بغاوت کرتے ہیں تو سمجھئے کہ ستر خاندان زد میں آ جاتے ہیں۔ اس لئے مسئلہ بہت اہم تھا اور اسی لئے قرآن مجید نے اس کو بطور مثال پیش کیا ہے، اس وقت تاریخ کی کتابوں میں یہ تفصیل نہیں مل سکتی کہ کس طرح سے ان کو ڈرا دھمکایا گیا اور کس کس طرح ان کو لالچیں دی گئیں اور سبز باغ دکھائے گئے۔

ایسے اقدامات سے روکنے کے لئے (خاص طور پر جبکہ مقابلہ میں نوخیز اور نو جوان ہوں) تربیات (ڈرانے والی چیزوں) کے ساتھ ترغیبات (راغب کرنے والی چیزیں) بھی ہوتی ہیں اور اکثر تربیات کے مقابلہ میں ترغیبات زیادہ موثر اور کامیاب ثابت ہوتی ہیں۔ ایک بزرگ نے جن کا دونوں چیزوں سے واسطہ پڑا تھا، فرمایا کہ توڑے کوڑوں سے زیادہ نازک ہوتے ہیں، طاقتیں اور حکومتیں کبھی کوڑے سامنے لاتی ہیں، اور کبھی توڑے (اشرفیوں کی تھیلیاں) ان نو جوانوں کے سامنے کوڑے بھی آئے ہوں گے اور توڑے بھی، انہوں نے کوڑوں کو بھی سہ لیا اور توڑوں کا بھی توڑ کر لیا اور یہ اس لئے ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو قوت و سکون اور صبر و تحمل اور قربانی و ایثار کی دولت عطا فرمائی۔ و ربطنا علی قلوبہم۔

ہمیشہ ملک و معاشرہ اس وقت بچا ہے جب کچھ لوگوں نے اپنے مستقبل کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں، وہ نا سمجھدار اور غیر متوازن بھی نہیں تھے، ان کی گفتگو بتاتی ہے کہ وہ صحیح الحواس، صحیح الدماغ دانہ اور فرزانہ نو جوان تھے۔ لیکن بات یہ تھی کہ ان کی روح صرف اس بات سے تسکین نہیں پاسکتی تھی کہ ان کو روٹی کیڑا ملتا رہے، ان کے ذہن میں یہ تھا کہ یہ تو کسی امیر گھر کے کتے کا راتب ہے۔ اس کو بعض اوقات ایسا اچھا دودھ ملتا ہے جو بہت سے غریب گھرانوں کے بچوں کو بھی نصیب نہیں ہوتا اور وہ ایسے ناز و نعم سے رکھے جاتے ہیں جس کا بہت سے انسان (جو اشرف المخلوقات ہیں) خواب بھی نہیں دیکھ سکتے، لیکن ہزار ناز پروردہ کتے ایک ایسے فاقہ کش انسان پر قربان جس کو معرفت الہی اور ایمان کی دولت حاصل ہے، اور اللہ نے اس کو اپنے ہم جنس انسانوں کی فکر اور درد نصیب کیا ہے وہ طے کر لیتے ہیں کہ ہمیں اپنی جگہ بنانی نہیں ہے

اور جانوروں کی طرح کھاپنی کر دنیا سے رخصت نہیں ہو جانا ہے، ہمیں اپنے کو بھی اس خطرے اور بلا آگست سے بچانا ہے جو غلط عقائد، غلط مقاصد، غلط اعمال اور خراب اخلاق کی صورت میں ہمیں پیش آنے والا ہے اور اپنی قوم، ملک اور معاشرہ کو بھی ان مصیبتوں اور خطروں سے بچانا ہے جو ان کے سرمنڈلار ہے ہیں، انسانی تاریخ اس کی شہادتیں پیش کرتی ہیں کہ ایسے باہمت افراد کامیاب ہو جاتے ہیں اور پوری پوری قوم اور ملک کو اپنی آسائش اور ملک کی قربانی دے کر بچالے جاتے ہیں۔ انسانیت کی آبروائیں کے دم سے ہے اور امن وامان صلاح و فلاح، حق و صداقت اور دعوت حق کا تسلسل انہیں سے قائم ہے۔

ہمارا ملک اخلاقی طور پر اس وقت احتضار کی کیفیت ”سکرات“ سے دوچار ہے، وہ کوہ آتش فشاں کے دہانے پر کھڑا ہے۔ پورے ملک میں کرپشن و باکی طرح پھیلا ہوا ہے، کارکردگی، فرش شناسی، محنت کوشی، جفاکشی، اپنے ملک سے سچی محبت اور اپنے ہم وطنوں کے ساتھ ہمدردی غنقا ہے۔ انتظامیہ میں دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر شخص اس لئے بیٹھا ہوا ہے کہ اپنی جیب بھرے۔ وہ قابل رشک انسان ہے جو جیب کے بجائے کاغذ کا پیٹ بھرنے (اپنا وقت پورا کرنے) کی فکر میں ہے، اگر کوئی سامنے آتا ہے تو غور سے دیکھا جاتا ہے کہ اس سے کتنی بڑی رشوت لی جاسکتی ہے۔ غور سے اس لئے نہیں دیکھا جاتا کہ اس کے چہرے پر کیا اتار چڑھاؤ ہے، وہ کس مصیبت میں مبتلا ہے؟ بلکہ اس لئے دیکھا جاتا ہے کہ چہرہ کیا بتا رہا ہے کہ وہ کس (Standard of Living) سے تعلق رکھتا ہے، اس کا نتیجہ ہے کہ مدت کے بعد اپنے وطن آنے والے مسافر کو بجائے وطن پہنچنے کی خوش کے سہم چڑھ جاتا ہے کہ معلوم نہیں اس کو کس ذلت اور کس مصیبت سے واسطہ پڑے اور کس کو کیا رشوت دینی پڑی۔

یہ کیوں نہیں ہوتا کہ ہندوستانی اپنے ملک کی سرحد پر (خواہ وہ ہوائی یا زمینی) آ کر عزت و سکون محسوس کرے اور خوش ہو کہ ہم اپنے گھر آئے، میں آپ کو یہ دعوت نہیں دیتا کہ آپ کالج چھوڑ کر قوم و ملک کی خدمت میں لگ جائیں، آپ ٹھوس خدمت جی کر سکیں گے جب آپ اچھی طرح پڑھیں گے، تعلیم میں امتیاز حاصل کریں گے اور یہاں سے نیک نام ہو کر نکلیں گے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ اچھے کارگذار، فرض شناس، محبت وطن اور اگر مسلمان ہیں تو اچھے مسلمان بنیں، آپ کے اندر مدد کا جذبہ ہونا چاہئے۔ آپ کے اندر کام سے وہ خوشی ہونی

چاہئے جو آرام کرنے سے نہیں ہوتی۔ اس وقت پورے ملک کا نظام ڈھیلا ہو گیا ہے اور عام زندگی مشکل ہو گئی ہے، کس کس محکمہ، کس کس شعبہ زندگی کا رونا رویا جائے۔

میں اپنے مسلمان بچوں سے خاص طور پر کہتا ہوں کہ کسی کا یہ اخلاقی یا شہری فرض ہو، تمہارا تو یہ مذہبی فرض ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”ویل للمطففین O الذین اذا اکتالو علی الناس یستوفون O و اذا کالوہم او ذللوہم یخسرون O“ (ناپ اور تول میں کمی کرنے والے کے لئے خرابی ہے، جو لوگوں سے ناپ کر لیں تو پورا لیں، اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیں تو کم دیں) کتنی بڑی حقیقت خدا کے بیان کی ہے، یہ صرف دودھ کی دوکان یا پرچون کی دوکان کا معاملہ نہیں۔ ”تطفیف“ (کم تولنا اور ڈنڈی مارنا) کا عمل پوری زندگی میں ہو سکتا ہے۔ آج ہمارا پورا انتظامی ڈھانچہ اور معاشرہ ”مطفف“ بن گیا ہے۔ سب کا مرض ”تطفیف“ ہے، اپنا حق پورا وصول کرنا، یا وصول کرنے کے لئے لڑنا، اور دوسروں کا فرض نہ ادا کرنا، یا ادھورا ادا کرنا، اگر آپ کو ہندوستان میں باعزت زندگی گزارنی اور اپنا مقام پیدا کرنا یا اپنا مقام محفوظ رکھنا ہے تو اس کا ذریعہ صحیح دینداری بلند و بے داغ کردار اور عملی نمونہ پیش کرنا ہے۔ اگر آپ اس ملک کی قیادت بھی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اس کا راستہ بھی یہی ہے کہ آپ اپنے دین کی تعلیمات، قرآن کی ہدایت، اپنے پیغمبر ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے اسوہ و سیرت پر چلیں اور ان جوان مردوں کی تقلید کر کے (جن کا قصہ قرآن کی سورہ کہف میں بیان کیا گیا ہے) اپنے مستقبل اور ترقی کے امکانات کو خطرہ میں ڈال کر ملک کو (اور اگر اللہ ہمت بلند اور وسیع نظر کرے) تو انسانیت کو خطرے سے بچانے کی کوشش کریں۔ اکبر نے صحیح کہا ہے:

ناز کیا اس پہ جو بدلا ہے زمانہ نے تمہیں
مرد وہ ہے جو زمانہ کو بدل دیتے ہیں

وما علینا الا البلاغ المبین

فقہ وقضا کی صلاحیت میں علماء گجرات کا امتیاز و اختصاص

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد المرسلين وخاتم النبیین محمد وآله وصحبه اجمعين ومن تبعهم باحسان و دعاء يدعوتهم الى يوم الدين.

حضرات علمائے کرام برادران اسلام وحاضرین جلسہ اہل عرب جب کسی عمل یا کسی کارروائی کے متعلق یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ وہ بر محل اور بر موقع ہوئی تو کہتے ہیں ”جاء فی مکانہ و فی اوانہ“ یہ بات اپنے صحیح محل ومقام اور مناسب موقع اور وقت پر پیش آئی (یا پیش کی گئی)

اس حقیقت پسندانہ جملہ کی روشنی میں پہلے اس حقیقت اور واقعہ کا اعتراف واعلان کیا جاتا ہے کہ مسلم پرسنل لا بورڈ کا یہ بار ہواں اجلاس اپنے صحیح محل ومقام پر ہو رہا ہے اور پھر عرض کیا جائے گا کہ وقت اور ضرورت کے تقاضہ کی بناء پر منعقد کیا جا رہا ہے اور وہ ایک فریضہ کی ادائیگی اور حقیقت پسندی اور فرض شناسی کا ثبوت ہے۔

جہاں تک اجلاس کے محل ومقام کی مناسبت اور اس اہم اجلاس کے یہاں منعقد کرنے کے جواز بلکہ معقولیت اور صحیح انتخاب کا سوال صوبہ گجرات (جو اس صوبہ کا قدیم تاریخی اور علمی دنیا میں معروف نام ہے) کے بارہ ہمیں ہندوستان کے اسلامی عہد کے سب سے بڑے مؤرخ وسوانح نگار پدربزرگوار مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب حسنی سابق ناظم ندوۃ العلماء کی کتاب کے چند اقتباسات پیش کرنے پر قناعت کی جائے گی جو گجرات کے بارہ میں پائے جاتے ہیں۔

علوم وفنون میں اگر گجرات شیراز تھا تو حدیث کی خدمات کے لحاظ سے یمن میمون سے مماثلت رکھتا تھا، علم حدیث کی سرگرمی کے ساتھ ساتھ یہاں فقہ میں بھی شاندار کارنامے انجام پائے تھے ہندوستان کے کسی دوسرے علاقہ کی علمی اور تمدنی سرگرمیوں کی تاریخ اتنی مسلسل اور طویل نہیں ہے جتنی گجرات کی۔

اس اجلاس و موضوع کی مناسبت سے کہا جاتا ہے کہ گجرات کا فقہ حنفی اور اصول فقہ میں بھی امتیازی حصہ ہے یہاں مفتی رکن الدین ناگوری نے جو نہروالہ کے مفتی تھے فقہ حنفی کی دو سو چار کتابوں کو پیش نظر رکھ کر فتاویٰ جمادیہ تصنیف کی جس کے حوالے فتاوے عالمگیری میں جا بجا ملتے ہیں۔

اسی طرح مفتی قطب الدین (م ۹۹۹ء) کا ذکر کئے بغیر بھی رہا نہیں جاتا جن کو حرم شریف میں درس دینے کا شرف حاصل ہوا، علامہ قاضی سوکانی صاحب نیلا الوطار نے اپنی کتاب البدر الطالع میں بڑے بلند الفاظ میں ان کا ذکر کیا ہے، یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ حرمین شریفین اور دیار عرب میں جن کے فضل کمال کا سب سے زیادہ اعتراف کیا گیا اور جن سے استفادہ کو باعث فخر و شرف سمجھا کہ وہ زیادہ تر علمائے گجرات تھے و کفہ بہ فخراً و شرفاً۔ اس سلسلہ میں وزیر آصف خاں کا نام لینا کافی ہوگا جن کو یہ شرف و خصوصیت حاصل ہے کہ علامہ ابن حجر مکی نے ان کے حالات پر مستقل رسالہ لکھا، جس میں وہ لکھتے ہیں جس زمانہ میں آصف خاں مکہ معظمہ میں آکر رہے تھے عجب طرح کی رونق مکہ معظمہ میں پیدا ہو گئی تھی، علماء و فقہاء ان کی صحبت کو غنیمت سمجھتے تھے گھر گھر علم کا چرچا ہو گیا تھا مکہ والوں نے تحصیل علم میں پوری کوشش کی تھی انہوں نے اہل علم پر اپنے احسان و کرم کے دائرہ کو اس قدر وسیع کر دیا تھا جس کی نظیر ان کے معاصرین میں بلکہ ایک مدت سے مفقود تھی علامہ عز الدین عبدالعزیز مکی نے آصف خاں کی مدح میں چھپا سی شعر کا قصیدہ لکھا۔

علوم دینیہ بالخصوص فقہ و قضاء و افتاء کی صلاحیت میں علمائے گجرات امتیاز و اختصاص کا نتیجہ تھا کہ سلطنت دہلی نے بھی ان کے اس امتیاز و اختصاص سے فائدہ اٹھایا، اور ان کو قاضی القضاۃ کے عہدہ پر فائز کیا قاضی شیخ الاسلام گجراتی دارالملک دہلی کے قاضی تھے ۱۰۸۶ھ میں عالمگیری نے ان کو مجبور کر کے قاضی القضاۃ کا عہدہ عنایت کیا اس عہدہ جلیلہ کے فرائض انہوں نے نہایت آزادی اور راست بازی کے ساتھ انجام دیئے اور حق بات کے ظاہر کرنے میں کسی بادشاہ کے سامنے بھی نہیں چو کے ان کے بعد ہی ان کے داماد قاضی ابوسعید ۱۰۹۴ھ میں ان کی جگہ قاضی القضاۃ کے عہدہ کے لئے گجرات ہی کے علماء کا منتخب ہونا اس کے علمی و فنی امتیاز کا کھلا ثبوت ہے۔

شخصی، خاندانی و موروثی سلطنت کے دور میں والیان سلطنت اور ان کے وزراء، کانہ صرف تابع شریعت و سنت ہونا بلکہ صلاح و تقویٰ میں اور شرع و دین کی واقفیت میں ممتاز ہونا پوری قلمرو وزیر حکومت علاقہ اور خواص و عوام کے طبقہ پر اثر انداز ہوتا ہے اور اس سے پوری قلمرو میں دین کا احترام اور شریعت پر عمل کرنے کا جذبہ اور رجحان پیدا ہو جاتا ہے اس سلسلہ میں بھی گجرات کو ایک محدود لیکن طویل مدت تک یہ امتیاز حاصل رہا ہے کہ یہاں بعض ایسے سلاطین صاحب اقتدار اور فرمانروائے ملک رہے ہیں جن کی نظیر کم سے کم ہندوستان کے صوبوں کی تاریخ اور سلاطین وقت کی سوانح (سلطان محی الدین اورنگ زیب کو مستثنیٰ کر کے جن کو بعض فضلاء نے سادات الخلفاء الراشدین کا لقب دیا ہے) میں مشکل سے ملتی ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ نمایاں مظفر شاہ حلیم گجراتی (۹۳۲ھ) کی ذات ہے مولانا سید عبدالحی صاحب ان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

فضل و کمال کے ساتھ تقویٰ و عزیمت کی دولت بھی اس نے خداداد پائی تھی تمام عمر نصوص احادیث پر عمل رہا، ہمیشہ با وضو رہتا نماز جماعت کے ساتھ پڑھتا روزے عمر بھر نہیں چھوٹے۔ ان سلاطین میں بعض ایسے سلاطین گزرے ہیں جن کی خدمت دین اشاعت علم اور اس کی سرپرستی کا دائرہ گجرات کے حدود سے نہیں بلکہ ہندوستان کے حدود سے بھی نکل کر مرکز و مصدر علم دین حجاز مقدس تک وسیع تھا و کفی بہ فخر او شرفا مولانا سید عبدالحی صاحب لکھتے ہیں کہ:-

محمود شاہ دوم (۹۶۱ھ) کی توجہ و سرپرستی سے مکہ معظمہ میں ایک عظیم الشان مدرسہ باب عمرہ سے متصل قائم کیا گیا جس میں علامہ شہاب الدین ابن حجر مکی اور معزز الدین عبد العزیز زمزمی وغیرہ علمائے مکہ تدریس کی خدمت انجام دیتے تھے علاوہ اس کے کئی رباط اور مکتب مکہ معظمہ میں تعمیر کئے گئے۔ محمود شاہ نے اس پر قناعت نہیں کی بلکہ اس نے خلیج کنیاہ (کھمبائیت) میں ایک بندرگاہ کی آمدنی محض حرمین محترمین میں رہنے والوں کے واسطے وقف کر دی تھی یہاں سے ایک لاکھ اشرفیوں کی قیمت کا مال جدہ بھیجا جاتا تھا اور اس کے بھیجنے میں جو کچھ صرف ہوتا تھا وہ خزانہ شاہی سے دیا جاتا تھا اس مال کے فروخت سے جو کچھ آمدنی ہوتی تھی وہ سب اہل حرمین محترمین پر تقسیم کر دی جاتی تھی۔

حضرات! ان قابل فخر تاریخی حقائق اور گجرات کے شاندار علمی و دینی دور کا تقاضا ہے کہ حفاظت و حمایت شریعت بلکہ غیرت دینی و حمیت اسلامی کا جو قدم ہندوستان بلکہ دنیا کے کسی بھی حصہ میں اٹھایا جائے، اور مسلمانوں کو پوری شریعت پر عمل کرنے جس میں وہ عائلی قانون (پرنسپل) بھی داخل ہے، جس کی بنیاد کتاب و سنت کے نصوص آیات قرآنی اور احادیث صحیحہ پر ہے اور اپنے معاشرتی معاملات، ازدواجی و عائلی زندگی کے مختلف مراحل اور تقاضوں کے سلسلہ میں شرعی و قانونی طور پر خود کفیل ہونے اور اپنے تشخص کو برقرار رکھنے کی دعوت دی جائے تو اہل گجرات اس پر لبیک کہیں اور اس کے لئے اپنے صوبہ کی فضا کو موافق و معادن بنائیں بلکہ اس کی کامیابی اور نفاذ کے لئے اگر ہندوستان کے کسی گوشہ سے بھی صدا لگائی گئی ہے اور اس کے لیے جدوجہد شروع کی گئی ہے تو اس کے ساتھ پورا تعاون و اشتراک کریں۔

حضرات! اب جب اسلام کے عائلی قانون کا تذکرہ آ گیا ہے تو مناسب بلکہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کے عائلی قانون کی بلندی و برتری، اس کے انسانیت کے احترام، فطرت انسانی سے مطابقت، عورت کے اسلام میں مرتبہ اور اس کے حقوق کا اعتراف اس کے ساتھ انصاف بلکہ رعایت و فیاضی کے بارہ میں بھی کچھ عرض کیا جائے اور قوانین مروجہ، دنیا کے مختلف مذاہب و تہذیبوں اور معاشرتی و ازدواجی زندگی کے رائج الوقت نمونوں اور مناظر کو سامنے رکھ کر تقابلی مطالعہ کی روشنی میں کچھ غیر مسلم مفکرین ماہرین قانون تمدن تہذیب علم کے مؤرخین اور فضلاء کے اقوال پیش کئے جائیں جنہوں نے اسلام کے عائلی قانون کی برتری انصاف پروری احترام انسانی نہیں بلکہ احترام نسوانی کا برملا اعتراف کیا ہے، اس کی ضرورت اس لئے بھی محسوس کی جاتی ہے کہ عام طور پر غیر اسلامی ذرائع ابلاغ پریس اور یک طرفہ ناقدین نے اس کے بارہ میں عام طور پر یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ اسلام کا عائلی قانون طبقہ نسواں کے ساتھ انصاف پر مبنی نہیں ہے، وہ قدیم تہذیب و معاشرت اور اس عہد کی یادگار ہے جب عورت کو وہ درجہ نہیں دیا جاتا تھا جس کی وہ مستحق ہے اور یہ قانون اب اس ترقی یافتہ دور میں باقی رہنے اور چلنے کے قابل نہیں ہے جب حقائق سے پردہ اٹھ گیا ہے قدیم رسم و رواج داستان پارینہ بن گئے ہیں عورت زندگی میں برابر کی شریک ہے اور اب ترقی یافتہ مغرب ہی اس سلسلہ میں قابل تقلید و استفادہ ہے۔

اس پروپیگنڈہ کا کچھ اثر مسلمان بالخصوص جدید تعلیم یافتہ طبقہ پر بھی ہوا ہے اور ایک طرح کے احساس کہنری میں مبتلا ہو گیا ہے اور اس میں اپنے عائلی قانون پر افتخار ہی نہیں اعتماد و اطمینان اور دفاع کا جذبہ بہت جگہ سرد پڑ گیا ہے ہم اس موقع پر چند مغرب ماہرین قانون مؤرخین تمدن و تہذیب اور مغربی دانشوروں کے اقوال پیش کرتے ہیں جنہوں نے صاف اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اسلام کا عائلی قانون دوسرے قوانین کے مقابلہ میں کہیں زیادہ منصفانہ حقیقت پسندانہ اور کہیں زیادہ طبقہ نسواں کے احترام اور اسکے ساتھ انصاف و مراعات پر مبنی ہے یہ بیانات ہمارے مرعوب تعلیم یافتہ طبقہ کی آنکھوں سے پردہ اٹھانے کے لئے کافی ہیں جس نے آزاد تقابلی مطالعہ کی زحمت گوارا نہیں کی اور وہ ایک طرف سطحی بیان سے متاثر ہے۔ اس سلسلہ میں ہم سب سے پہلے ایک مغربی فاضلہ کا بیان پیش کرتے ہیں اس لئے کہ اس سلسلہ میں خواتین زیادہ حساس جذباتی زود احساس اور رقیق الشعور واقع ہوتی ہیں، اس لئے کہ یہ ان کے طبقہ کا قضیہ ہے اور وہ اپنے طبقہ کی طرف سے دفاع اور اس کی حمایت اپنا فرض سمجھتی ہے۔

مسز اینی بسنٹ جو جنوبی ہند کی ایک ثقافتی ادارہ (تھیٹا سوسائٹی) کی صدر رہی ہیں، انہوں نے ہندوستان کی تحریک آزادی میں بھی حصہ لیا تھا وہ اپنی کتاب ”ہندوستان کے عظیم مذاہب“ میں لکھتی ہیں:

قرآن مجید کی آیت ہے، ومن يعمل من الصالحات من ذکر او انشی و هو

مؤمن فاؤ لئک یدخلون الجنة ولا یظلمون نقیرا (النساء ۱۲۴)

(اور جو کوئی نیکوئی پر عمل کرے گا (خواہ) مرد ہو یا عورت اور وہ صاحب ایمان ہو تو ایسے سب لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا) پیغمبر محمد ﷺ کی تعلیمات عام اخلاقی ہدایات میں محدود نہیں بلکہ عورتوں کی وراثت کیلئے پورا قانون قرآن مجید میں موجود ہے اور وہ قانون اپنے عدل و انصاف اور آزادی کی وسعت اور کار فرمائی میں اس مسیحی و انگریزی قانون سے کہیں زیادہ فائق ہے جس پر اب سے بیس سال پہلے تک برطانیہ میں عمل ہوتا رہا ہے اسلام نے عورت کے لیے جو قانون بنایا ہے وہ ایک مثالی قانون کا درجہ رکھتا ہے اس نے عورتوں کے حقوق کی حفاظت اور امکانی حد تک ان کی مدد کا ذمہ لیا ہے، اور ان کے کسی ایسے حصہ پر (جو

وہ اپنے اعزاء و بھائیوں اور شوہروں سے پائیں (دست درازی کا سد باب کر دیا ہے۔
ایک دوسری جگہ لکھتی ہیں:-

یک زوجگی اور تعدد از دواج کے الفاظ نے لوگوں کو مسحور کر دیا ہے اور وہ مغرب میں عورت کی اس ذلت پر نظر ڈالنا نہیں چاہتے جسے اس کے اولین محافظ سڑکوں پر صرف اس لئے پھینک دیتے ہیں کہ اس سے ان کا دل بھر جاتا ہے اور پھر ان کی کوئی مدد نہیں کرتا، عظیم و نامور فرینچ مصنف و دانشور گستاؤ لیبان اپنی شہرہ آفاق کتاب تمدن عرب میں لکھتا ہے:

میراث کے وہ اصول جو قرآن میں صراحت کے ساتھ آئے ہیں وہ کتاب ہندوستان کے عظیم مذاہب عدل و انصاف کا ایک واضح مظہر ہیں ان کے اور ان حقوق و قوانین کے درمیان مقابلہ کرنے سے جو قرآن و انگلستان میں عورت کے بارہ میں میں صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شریعت اسلامی نے شادی شدہ خواتین کو جن کے بارہ میں مغرب میں دعویٰ کے وہ حقوق دیئے ہیں جن کی نظیر ہمارے قوانین میں نہیں ملتی اسلام کا اثر مشرق میں عورت کی پوزیشن پر بہت گہرا اور وسیع تھا اس نے عورت کی معاشرتی پوزیشن کو گھٹانے کے بجائے بہت بلند کر دیا ان تمام دعاوی و مزعومات کے خلاف جو بغیر کسی دلیل و مطالعہ کے یورپ میں دہرائے جاتے ہیں قرآن نے عورت کو وہ درستی حقوق عطا کئے ہیں جو ہمارے مغربی قوانین سے کہیں بہتر ہیں اسلام میں عورتوں کے مرتبہ و اہمیت پر اس سے بھی روشنی پڑتی ہے کہ عربوں کے تمدن کے عروج کے زمانہ میں ان میں کثرت سے ایسی خواتین نظر آتی ہیں جو بڑا بلند علمی و ادبی مقام رکھتی تھیں۔

عہد عباسی میں ان کی ایک بڑی تعداد مشرق میں اور عہد اموی میں اسپین (اندلس) میں پائی جاتی تھی۔

والیٹر اپنے مضمون میں جو فلسفہ قرآن کے عنوان سے ہے ڈکشنری آف فلاسفی میں لکھتا

ہے:-

ہم اس سے ناواقف نہیں ہیں کہ قرآن عورت کا وہ امتیاز مانتا اور بیان کرتا ہے جو اس کو فطرت کی طرف سے ملا ہے لیکن قرآن اس بارہ میں تو رات سے مختلف نظر آتا ہے کہ وہ عورت کی فطری کمزوری کو خدائی سزا نہیں مانتا جیسا کہ سفر التکوین الاصحاح الثالث نمبر ۱۶ میں ہے۔

یہ غلط بیانی اور تلمیس کی بات ہے کہ محمد ﷺ جیسے عظیم شارع کی طرف عورتوں کے حق میں زیادتی و نا انصافی منسوب کی جائے حقیقت تو یہ ہے کہ قرآن کہتا ہے کہ:-

فان کرہتموہن فعسی ان تکرہوا شیئا ویجعل اللہ فیہ خیرا کثیرا
اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں تو جب کیا کہ تم ایک شے کو ناپسند کرو اور اللہ اس کے اندر کوئی بڑی بھلائی رکھ دے۔

نیز

ومن آیتہ ان خلق لکم من انفسکم ازواجا لتسکنوا الیہا وجعل بینکم مودۃ ورحمۃ ان فی ذلک لایۃ لقوم یتفکرون (الروم: ۲۱)

اور اسی کی نشانیوں میں ہے کہ اس نے تمہارے لئے تمہاری جنس کی بیویاں بنائیں تاکہ تم ان سے سکون حاصل کرو اور اس نے تمہارے (یعنی میاں بیوی کے) درمیان محبت و ہمدردی پیدا کر دی بے شک اس میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو فکر سے کام لیتے ہیں، ایک دوسرا مغربی مصنف اپنی کتاب میں لکھتا ہے: اگر معاشرتی نقطہ نظر سے یورپ میں عورت ایک بلند مرتبہ و مقام پر پہنچ گئی ہے تو اس میں شک نہیں کہ اس کی پوزیشن مذہبی و قانونی حیثیت سے چند سال پہلے تک (اور بعض مقامات پر اب تک) اپنے مرتبہ و مقام میں اس سے کم ہے جو مسلمان کو علم اسلامی میں حاصل ہے۔

مسٹر لکھتے ہیں:-

بلاشبہ عورتوں کی حیثیت کے بارہ میں خاص طور پر شادی شدہ عورتوں کے معاملہ میں قرآنی قوانین افضلیات کا مقام رکھتے ہیں نکاح اور طلاق کے قوانین کثیر تعداد میں ہیں جن کا عمومی مقصد عورتوں کی حیثیت میں بہتری لانا ہے اور وہ عربوں کے قوانین میں انقلاب انگیز تبدیلی کے مظہر ہیں اسے قانونی شخصیت عطا کی گئی جو اس سے پہلے حاصل نہیں تھی طلاق کے قوانین میں قرآن نے سب سے بڑی تبدیلی جو کی ہے وہ عدت کو اس میں شامل کرنا ہے۔

حضرات! ان نقول و اقتباسات کے جو اسلام کے عائلی قانون کی نہ صرف مقبولیت، انصاف پسندی بلکہ امتیاز و برتری کی شہادتوں پر مشتمل تھے پیش کرنے کے بعد اہل دین و اہل دانش کے اس تاریخی اجتماع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ حقیقت بھی پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں

کہ فلسفہ اخلاق فلسفہ انفسیات اور فلسفہ مذاہب کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ مذہب کو اپنے مخصوص نظام معاشرت و تہذیب سے الگ نہیں کیا جاسکتا، دونوں کا ایسا فطری تعلق و رابطہ ہے کہ معاشرت مذہب کے بغیر صحیح نہیں رہ سکتی اور مذہب معاشرت کے بغیر مستور و محفوظ نہیں رہ سکتا اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ مسجد میں مسلمان ہیں (اور مسجد میں کتنی دیر مسلمان رہتا ہے، اپنے سارے شوق عبادت کے باوجود؟) اور گھر میں مسلمان نہیں اپنے معاملات میں مسلمان نہیں اپنے عائلی و خاندانی روابط و تعلقات میں مسلمان نہیں، حقوق کی ادائیگی اور ترکہ کی تقسیم میں مسلمان نہیں۔

اس لئے ہم اس کی بالکل اجازت نہیں دے سکتے کہ ہمارے اوپر کوئی دوسرا نظام معاشرت نظام تمدن اور عائلی قانون مسلط کیا جائے، ہم اسکو دعوت ارتداد سمجھتے ہیں اور ہم اس کا اس طرح مقابلہ کریں گے جیسے دعوت ارتداد کا کرنا چاہئے، اور یہ ہمارا شہری آئینی جمہوری اور دینی حق ہے اور ہندوستان کا دستور اور اس جمہوری ملک کا آئین اور مفاد نہ صرف اس کی اجازت دیتا ہے بلکہ اسکی ہمت افزائی کرتا ہے کہ جمہوریت کی بقاء اپنے حقوق کے تحفظ اور اظہار خیال کی آزادی ہر فرقہ اور اقلیت کے سکون و اطمینان میں مضمر ہے۔

مگر ابھی آئینی اور حکومتی سطح پر کوئی ایسا اقدام یا خطرہ سامنے نہیں آیا تھا جس کا کھلے طور پر نوٹس لیا جائے اور اس خطرہ کو رفع کرنے یا اس سے محفوظ رہنے کی منظم اور جمہوری طریقے پر کوشش کی جائے کہ اچانک سپریم کورٹ کی طرف سے یکساں عائلی قانون کے نفاذ کا مطالبہ کیا گیا، اور حکومت کو توجہ دلائی گئی کہ وہ دستور ہند کے اس رہنما اصول کو نافذ کرے کہ اس سے ملک میں اتحاد معاشرت میں یکسانی اور وحدت پیدا ہوتی ہے اور اس سے ان بعض خطرات کا ازالہ ہوتا ہے جو بعض فرقوں (بلکہ صحیح معنی میں اکثریت) کو پیش آرہے ہیں۔

سپریم کورٹ کے اس شگوفہ کو چھوڑنے نے جو دستور ہند کے بنیادی اصول اور دفعہ مذہب میں عدم مداخلت کے بالکل منافی اور اقلیت کے لئے ایک چیلنج ہے مسلمانوں کو خاص طور پر دین کا علم اور ملی غیرت رکھنے والوں اور ان میں بھی خصوصی طور پر مسلم پرسنل لا بورڈ کے ذمہ داروں کو چونکا بلکہ لرزادیا جنہوں نے مطلقہ کو دائمی نفقہ دینے کے خلاف مہم چلائی تھی اور سپریم کورٹ کے اس فیصلہ کو منسوخ کرانے میں جو اس نے شاہ بانو کیس میں کیا تھا غیر معمولی اور تاریخی کامیابی

حاصل کی تھی۔

سپریم کورٹ کی حکومت کو اس توجہ دہانی اور پریس میں اس کے آجانے کے بعد سے مسلمانوں میں (بلا اختلاف فرقہ واریت، حلقہ خیال اور سیاسی تنظیم و پارٹی) ایک کھلبلی سی چُجائی اور شاہ بانو کیس سے بھی زیادہ اس سے مذہب میں صریح مداخلت کے خطرات پیدا ہو گئے اس لئے کہ شاہ بانو کیس ایک جزئیہ سے تعلق رکھتا تھا اور وہ مطلقہ کو دائمی نفقہ دینے کا مسئلہ تھا جس کی شریعت اسلامی میں کوئی قید و شرط نہ تھی، لیکن یونیفارم سول کوڈ یوری شریعت اسلامی، نکاح و طلاق تعداد از وواج کی اجازت نفقہ و میراث سب کے لئے ایک چلیخ اور ان کے ازالہ اور سد باب کے لئے دروازہ کھولتا تھا اور مسلمانوں کے لئے (جو ایک مکمل آسمانی شریعت منزل من اللہ کتاب اور عادلانہ و مطابق فطرت معاشرتی قانون رکھتے ہیں) خطرہ کی ایک گھنٹی بلکہ زندگی کی پوری چلتی ہوئی گاڑی کے لئے خطرہ کا اور روکنے کا ایک سنگل تھا۔

پھر سپریم کورٹ کی یہ توجہ دہانی بالکل ایک بے وقت اور بے فائدہ کام تھا کہ اس سے ملک کے حالات میں کوئی بہتری باہمی اعتماد کی فضا اور ملک کی تعمیر و ترقی کے لئے کوئی جذبہ اور جوش نہیں پیدا ہوتا تھا، بلکہ ملک میں ایک نئے انتشار کا اندیشہ اور صف آرائی کا خطرہ تھا اس لئے کم سے کم مسلمان اپنے عائلی قانون کو بجا طور پر عقائد و فرائض کی طرح دین کا ایک جزء اور قرآن کا ایک حصہ سمجھتے ہیں اس عائلی قانون کی بنیادیں اس کے اہم اجزاء قرآن مجید میں (نصوص کی صورت میں) صراحتہ موجود ہیں، پھر اس سے ملک کے مختلف فرقوں اور مذاہبوں میں کسی طرح بھی اتحاد اور وحدت نہیں پیدا ہو سکتی کہ اس کا اس سے دور کا بھی تعلق نہیں، اور دن رات اس کا مشاہدہ ہوتا رہتا ہے کہ ایک ہی عائلی قانون رکھنے والے ایک دوسرے سے برسر پیکار اور دست و گریباں ہیں۔

اس سلسلہ میں کچھ فیصلے اور اقدامات ضروری ہیں جو اس ملک میں جو آئینی حیثیت سے اور املان کی حد تک سیکولر ہے لیکن عملی اور واقعاتی طور پر وہ اکثریت کے مذہب تہذیب و معاشرت اور حجانات کے تابع ہوتا جا رہا ہے اور یہاں تدریجی طور پر ملک کا رخ اکثریت کے ترجمان و پسندیدہ نظام تعلیم طرز عمل اور عائلی قوانین و رسوم کی طرف پھیرا جا رہا ہے۔

۱۔ پہلا ضروری اقدام و فیصلہ یہ ہے کہ اس ملک میں جا بجا شرعی دارالقضاء قائم ہوں

جہاں سے عالمی اختلافات و تنازعات اور واقعات و حوادث کا شرعی فیصلہ معلوم کیا جائے اور اس پر عزم و خلوص اور دیانت داری کے ساتھ عمل کیا جائے اس سے مسلمان خاندان اس طوالت، مصارف کثیر اور سب سے بڑھ کر شریعت کی مخالفت کے امکان و خطرہ سے بچ جائیں گے جس کا عدالتی فیصلوں سے خطرہ ہے اور جس کے بار بار تجربے ہو چکے ہیں پھر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ شرعی فیصلہ پر فریقین اکثر راضی ہو گئے ہیں اور ایک دوسرے بغل گیر ہوئے ہیں اور وہ محاذ آرائی ختم ہو گئی ہے جو اس سے پہلے موجود تھی پھر اس سے ان کو وہ اجر و ثواب ملتا ہے جو حکم خداوندی کے سامنے سر تسلیم جھکا دینے سے حاصل ہوتا ہے اور وہ خدا کے حکم سے اس مرتابی اور بغاوت سے بچ جاتے ہیں جس کے بارہ میں قرآن مجید کے ساف الفاظ ہیں۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفٰسِقُونَ (المائدہ - ۴)

اور جو کوئی اللہ کے نازل کئے ہوئے (احکام) کے مطابق فیصلہ نہ کرے وہ ایسے ہی لوگ

نافرمان ہیں۔

اس سلسلہ میں اسلام کے عالمی قانون پر کتاب کی تدوین عمل ہو چکی ہے اور ضرورت ہے کہ وہ جلد زیور طبع سے آراستہ ہو اور اس کا انگریزی و ہندی میں ترجمہ بھی ہو جائے اور اسی کی روشنی میں ایسی عدالتوں اسلامی دارالقضاء میں فیصلے ہوں۔

۲۔ دوسرا کام اصلاح معاشرہ کا کام ہے۔

یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ اسلام صرف چند عقائد فرائض اور عبادات مضر و منہی ادا نیکی میں محدود نہیں وہ ایک پورا نظام حیات و معاشرہ ہے جس کا تعلق دونوں انسانی جنسوں (ذکور و اناث) اور ہر عہد اور ہر ملک کے مسلمانوں سے ہے مسلمانوں کی زندگی اور معاشرت (اپنے تمام اقسام و مراحل کے ساتھ) شریعت کے اس سانچے میں ڈھلی ہوئی ہونی چاہئے جو اللہ کے آخری رسول ﷺ قیامت تک کے لئے آئے اور جس کے بارہ میں واضح الفاظ میں اعلان کر دیا گیا کہ:-

اليوم اكملت لكم دينكم و اتممت عليكم نعمتي و رضيت لكم

الاسلام ديناً .

آج میں نے تمہارے لئے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت مکمل کر دی اور تمہارے لئے

اسلام کو بطور دین پسند کر لیا۔ اور اس حکمت کی بناء پر اللہ تعالیٰ نے ہر دور میں ہر نبی کو انسانی لباس میں (بشر کی حیثیت سے) بھیجا تا کہ وہ اپنی امتِ متبعین اور اپنے ملک و معاشرہ اور اپنے عہد کے زندہ انسانوں اور مختلف الانواع طبقات کے لیے نمونہ اور مثال و قابلِ تقلید بنستی بنے خود سید المرسلین و خاتم النبیین ﷺ کو بھی نوعِ بشر کے لئے اسوۂ کامل بنا کر بھیجا اور آپ کو ان تمام مراحل اور زندگی کے شعبوں سے گذارا جو انسانی زندگی کے فطری و ضروری شعبے ہیں یعنی صحت و مرض شباب و کہولت فراغت و مجاہدہ صلح و جنگ ازدواجی زندگی اولاد کی پیدائش بچگی اور ان میں بعض کی وفات بھی پھر بعض دخترانِ خاندان نبوت کے فریضہ ازدواج کی ادائیگی، پھر ان سب مراحل و شعبوں کے بارہ میں (حدیث و سیرت کے ذریعہ) مستند ترین معلومات مہیا کرنے اور محفوظ رکھنے کا نبی نظام فرمایا جس کی مثال صالحین و متقین مصلحین و معلمین کا ذکر گزشتہ انبیاء علیہم السلام کے بارہ میں بھی نہیں ملتی اور پھر اس سب کے بعد فرمایا:

لقد لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ لمن کان یرجو اللہ والیوم الآخر

و ذکر اللہ کثیرا (الاحزاب ۲۱)

رسول اللہ کا ایک عمدہ نمونہ موجود ہے تمہارے لئے یعنی اسکے لئے جو ڈرتا ہو اللہ اور روزِ آخرت سے اور ذکرِ کثرت سے کرتا ہو۔

پھر اس کے بعد آپ ہی کی حیات طیبہ مبارکہ میں دارالہجرہ مدینہ میں وہ اسلامی معاشرہ قائم ہوا جو زندگی قدرت و استطاعت، فراغت و عسرت شباب و کہولت خاندانی و قبائلی اختلافات ذوق و صلاحیت کے تنوع کے ساتھ ایک زندہ متحرک حساس عمل و امتیاز کی صلاحیتوں کے تنوع کے ساتھ آپ کی حیات طیبہ میں دس سال تک اور آپ کی وفات کے بعد خلافت راشدہ کے عہد میں ایک مثالی معاشرہ تھا اس میں قدرۃ و فطرتا شادیاں بھی ہوتی تھیں نکاح بھی ہوتے تھے اور طلاق بھی بیٹی کو نکاح کے بعد رخصت بھی کیا جاتا تھا اور بہو کو بیاہ کر گھر بھی لایا جاتا تھا مہر بھی معتین ہوتا تھا اور کسی نہ کسی شکل و مقدار میں جہیز بھی دیا جاتا تھا والدین کے انتقال کے بعد میراث بھی تقسیم ہوتی تھی اور املاک و جائداد میں حصہ بھی دیا جاتا تھا تجارت زراعت اور انواع معیشت میں مشارکت اور حصہ داری بھی ہوتی تھی غرض زندگی اپنے تنوع کے ساتھ موجود تھی اور مستند ترین تاریخی ذرائع تاریخ و مستند و متواتر روایات کے ذریعہ اس کی ایسی تصویر محفوظ ہے

جس میں ان سب کے نمونے انواع والوان مظاہر و مناظر دیکھے جاسکتے ہیں۔

اس میں ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت عبدالرحمن بن عوف جو عشرہ مبشرہ میں ہیں مہاجر ہیں اور قبیلہ قریش سے تعلق رکھتے ہیں اور اس کا پورا امکان ہے کہ اوپر ان کے خاندان کے اور بنی ہاشم (خاندان رسالت) کے رشتے بھی ہوئے ہوں ایک دن معمول کے مطابق آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں تو آپ ان کے لباس میں عطر کی ایسی خوشبو پاتے ہیں جو عام طور پر اس سے پہلے نہیں ہوتی تھی آپ ﷺ سوال فرماتے ہیں کہ عبدالرحمن کیا بات ہے آج تمہارے کپڑوں میں بہت عطر لگا ہوا ہے وہ جواب دیتے ہیں یا رسول اللہ میں نے نکاح کیا ہے، اس پر حدیث و روایات کی کسی کتاب میں یہ نہیں ملتا کہ آپ نے شکایت و استعجب کا کوئی لفظ فرمایا ہو کہ عبدالرحمن! اتنی جلدی یہ بے تعلقی یا بے مروتی تم نے ہمیں خبر بھی نہیں کی اور نہ بیعت اور نہ حضرت عبدالرحمن بن عوف سے معذرت و شرمندگی کا کوئی جواب منقول ہے حالانکہ یہ مسلم ہے اور تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ شیب (جواب مدینہ طیبہ ہے) کوئی ایسا بڑا شہر نہیں تھا جہاں اطلاع دینے کے لئے کوئی بڑا فاصلہ طے کرنا پڑتا اور یہ بھی ایک تجربہ و مشاہدہ کی بات ہے کہ ایک شہر یا ایک نسل و پیشہ کے لوگ جب ترک وطن کر کے کسی دوسرے ملک یا شہر میں جاتے ہیں تو عام طور پر قریب ہی رہتے ہیں اس لئے کہ وہ ایک دوسرے کے مزاج اور روایات سے واقف ہوتے ہیں اور خواتین کو بھی ایک دوسرے سے ملنے جلنے میں آسانی ہوتی ہے، آپ یہ سننے کے بعد کہ عبدالرحمن ابن عوف نے نکاح کیا صرف یہ فرماتے ہیں کہ اولم ولو بشاة (دیکھو و لیمر ضرور کرنا چاہے ایک بکری کا ہو)

یہ واقعہ اور روایت اس پر پوری روشنی ڈالتی ہے کہ عقد و نکاح کوئی ایسی ہنگامہ خیز اور زلزلہ انگیز تقریب یا واقعہ نہیں ہے کہ سارے شہر کو پوری برادری کو اور اہل تعلق کو اس کی خبر کی جائے اور ان کو مدعو کرنا ضروری سمجھا جائے ورنہ یہ سخت قابل شکایت بات ہوگی اور پھر اس میں ایسے اہتمام اور دھوم دھام سے کام لیا جائے جس سے نکاح کرنے والے یا اس کے سرپرست یا خاندان کی حیثیت عمری کا اظہار و تعین ہو۔

مدینہ طیبہ کے اس مثالی اور معیاری معاشرہ اور طرز زندگی کے بعد عرصہ دراز تک (جب تک مسلمان بیرونی تمدنوں اور طرز معاشرت سے متاثر نہیں ہوئے اور ان میں اظہار شان و

شوکت کی بیماری نہیں آئی) یہی طرز نکاح و ازدواج اور س کی سادگی اور محدودیت قائم رہی، عام طور پر مساجد میں نکاح ہوتے تھے بعض مرتبہ کسی نماز کے بعد چائیک اعلان کر دیا جاتا تھا کہ نماز کے بعد حاضرین تشریف رکھیں، فلاں کا نکاح ہوگا اکثر خاندان کے تمام افراد کو بھی اس کی پہلے سے خبر نہیں ہوتی تھی۔

لیکن جب مسلمان ان ملکوں میں جا کر بے جہاں دوسرا نظام معاشرت طریقہ، شادی و فی اور طرز زندگی رائج تھا جس میں عزت و افتخار شہرت و ناموری اور جب جاہ کا جذبہ کام کر رہا تھا یا وہ اس ملک کے قدیم روایات کے مطابق تھا جس میں دین و مذہب کام اور رسم و رواج کا زیادہ دخل تھا اور جو وہاں کے مذاہب کے تمام یر و داروں اور اچارہ داروں کے تساہل و تغافل اور ایک حد تک تعاون کا نتیجہ تھا تو مسلمان جن کو اس معاشرہ و ماحول پر اثر ڈالنا چاہئے تھا اور اسکی اصلاح کرنی چاہئے تھی وہ اگلے اس معاشرہ و ماحول اور طرز زندگی سے متاثر ہوئے اور انہوں نے نکاح لے اس مسنون فریضہ و جو نہایت سادگی اور سہولت سے ادا کیا جاسکتا تھا ایک بہت کم خرچ سے کرنے کے موقوف بن دیا جس کے لئے بعض اوقات سودی قرض لینے املاک کو فروخت کرنے یا رہمن رہنے کی نوبت بھی آ جاتی اور وہ تمام قبائح و منکرات اس میں شامل ہو جاتے ہیں جن سے شریعت نے روکا ہے اور پیغمبر خدا ﷺ اور آپ کے دین و شریعت کے صحیح تر، معافوں نے ان کی مذمت کی ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ قابل مذمت اور لائق توجہ مسئلہ زیادہ سے زیادہ جہیز دینے کے مطالبہ کا ہے جس کو خود مسلمانوں نے اختیار کر لیا ہے کہیں اس کا نام تلک ہے کہیں گھوڑا جوڑا اس سلسلہ میں وہ قابل مذمت اور لائق نفرت اقدامات بھی پیش آنے لگے ہیں اور بیاہی خاتون کے ساتھ احتجاج اور مقاطعہ کے وہ طریقے اختیار کئے جانے لگے ہیں جو نہ صرف شرعاً و اخلاقاً مذموم ہیں بلکہ وحشت و جاہلیت کی یادگار ہیں جب دوست کی معبود کی طرح پرستش ہوتی تھی اور اس کے حصول کے لئے سب کچھ جائز سمجھا جاتا تھا۔

پھر اسی طرح طلاق کے بارہ میں ترکہ کی تقسیم اور میراث کے بارہ میں رفیقہ حیات کے حقوق کی ادائیگی اور معاشرت کے بارہ میں بہت سی کوتاہیاں مسلمانوں کے معاشرہ اور عائلی زندگی میں ایسی داخل ہو گئی ہیں جنہوں نے اسلامی معاشرہ کا امتیاز اور وقار کھو دیا ہے اور کثیر التعداد مشکلات پیدا کر دی ہیں جو محض اس شریعت سے روگردانی اور ناواقفیت کا نتیجہ ہے جو ایک

نعمت خداوندی کے طور پر انسان کو دی گئی تھی۔ ان حقائق کے پیش نظر جنہوں نے اسلام کی عمومیت ابدیت مطابق فطرت ہونے اور نعمت خداوندی ہونے پر پردہ ڈال دیا ہے اور مسلمان معاشرہ کو صد ہا مشکلات میں اور قبائح میں مبتلا کر دیا ہے ایک عالمگیر توہمیں لیکن ہند گیر مہم چلانے کی ضرورت ہے یہ کام اصلاح معاشرہ کے عنوان سے مسلم پرسنل لا بورڈ نے شروع سے اپنے پروگرام میں داخل اور اپنے فرائض میں شامل کیا تھا اس سلسلہ میں پٹنہ میں لکھنؤ میں میرٹھ میں بستی میں اور بعض دوسرے مقامات پر اصلاح معاشرہ کے نام سے کامیاب اور کثیر الازدحام کانفرنسیں ہوئیں جن میں پوری طاقت و تاثیر کے ساتھ عقائد و فرائض اسلام کی پابندی کے ساتھ اس کے معاشرتی نظام اور عائلی زندگی کے احکام قبول کرنے کی دعوت دی گئی اور صفائی کے ساتھ اس آیت کی روشنی میں مکمل اور مسلمانوں کو کامل اسلام قبول کرنے کی دعوت دی گئی۔

يا ايها الذين آمنوا ادخلوا في السلم كافة ولا تتبعوا خطوات الشيطان

انه لكم عد ومبين (البقرة: ۲۰۸)

اے ایمان والو! سلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے پیچھے نہ چلو وہ تو تمہارا صریح دشمن ہے۔

ضرورت ہے کہ یہ کام ہند گیر پیمانہ پر ہو جا بجا اصلاح معاشرہ کے وسیع اور مؤثر جلسے ہوں اس میں صوبہ گجرات کے جس کی شاندر علمی و دینی تاریخ اور اس کے اس امتیاز و تفوق کا ذکر خطبہ کی ابتداء میں آچکا ہے جو اس کو صرف اس برصغیر میں نہیں بلکہ (ایک طویل عرصہ تک) عالم عربی و اسلام میں حاصل رہا ہے ہر طرح شایان شان قرین قیاس اور حسب توقع ہے واللہ هو الموفق والمعین۔

آخر میں اس اعزاز کے لئے جو صدارت کی شکل میں ناپیز کو حاصل ہوا اور اس توجہ و التفات اور حسن استماع کے لئے جس کا مؤمر حاضرین جلسہ نے اظہار کیا اللہ تبارک و تعالیٰ کا شکر اور آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

الحمد لله الذي هدانا لهذا وما كنا لنهتدي لولا ان هدانا الله لقد

جاءت رسل ربنا بالحق.

وما علينا الا البلاغ المبين

عالم اسلام میں احساس کہتری کا مرض اور اس کے اثرات و نتائج

۱۴ ذی قعدہ ۱۴۱۸ھ مطابق ۱۴ مارچ ۱۹۹۸ء کو المعبد العالی للدعوة والفکر الاسلامی دارالعلوم ندوۃ العلماء کے طلباء اور حاضرین و شرکاء مجلس کے سامنے یہ تقریر کی گئی۔

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونفوكل عليه ،
ونعوذ بالله من شرور انفسنا ومن سيئات اعمالنا من يهده الله فلا مضل له ومن
يضلله فلا هادي له ونشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له ونشهد ان
سيدنا محمدا عبده ورسوله . ارسله الله بالحق بشيرا ونذيرا . وداعيا الى الله
باذنه وسراجا منيرا . اما بعد .

عزیز طلباء! المعبد العالی و دارالعلوم ندوۃ العلماء و حاضرین۔
میں بے تکلفی کے ساتھ اس پر اپنی مسرت کا اظہار کرتا ہوں کہ مجھے اپنے عزیز طلباء سے
خطاب کرنے اور اس وقت جن حقائق کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور آئندہ جن حقائق کا سامنا کرنا
ہے ان کی لئے ان کے ذہن کو تیار کرنے کا موقع مل رہا ہے یہ نہ صرف ندوۃ العلماء کے مقاصد
میں داخل ہے بلکہ اس وقت پوری ملت اسلامی کے صاحب فکر صاحب علم اور صاحب صلاحیت
طبقہ کے فرائض میں ہے اور یہ صورت حال کا صحیح جائزہ بھی ہے اور اس کا پورا مقابلہ اور اس کا مداوا
بھی ہے۔

اس سے پہلے تقریر اس موضوع پر تھی کہ امریکا و اسرائیل نے (اس میں خاص طور پر
امریکہ جو قیادت و سیادت کی حیثیت رکھتا ہے) عالم اسلام کو بے کار بے اثر بنانے کے لیے بڑا
عمیق لیکن بڑا وسیع اور بڑا منظم منصوبہ بنایا ہے عالم اسلام امریکا و اسرائیل کے مقابلہ میں ایک
حریف طاقت ہے اسرائیل امریکا کا وکیل اور ایجنٹ ہے اور اس کا ایک کارندہ ہے ان دونوں کی

طرف سے یہ منصوبہ بنایا جا رہا ہے کہ ان کے مقابلہ میں کوئی محاذی طاقت کوئی آنکھ ملانے والی جمعیت باقی نہ رہے خاص طور پر جب سے کمیونزم کا زوال ہوا ہے (جو سرمایہ دار طاقتوں اور امریکا کا حریف تھا) اب اس کو جو کچھ خطرہ ہے وہ عالم اسلام سے ہے گزشتہ تقریر میں بتایا گیا تھا کہ وہ ایک حریف ہے اس نے ایک نقشہ بنایا ہے وہ اس وقت ایک سببی حصہ تھا نشانِ وہی کا جائزہ کا مگر اب ہم ایجابی حصہ آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں کہ آپ اس کے لیے تیاری کریں اور اللہ سے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ آپ کے اندر اسلام کی خدمت کے لئے صلاحیت پیدا کرے پھر توفیق دے۔

صورت یہ ہے کہ اس حریف نے اسلامی ممالک بلکہ مرکزِ قیادت و مرکزِ توجہ میں سب سے زیادہ جو مؤثر دعوت اور مؤثر انقلاب انگیز چیز ہو سکتی ہے وہ عالم اسلام کے لیے تجویز کی ہے وہ یہ ہے کہ وہاں کے تعلیم یافتہ طبقہ میں احساسِ کمتری پیدا کیا جائے اس کو انگریزی میں (INFERIORITY COMPLEX) کہتے ہیں خاص طور پر اس طبقہ میں جو کہ ملک کی رہنمائی کر سکتا ہے (قیادت کی جگہ لینے والا) جو ان تعلیم یافتہ طبقہ ہی ہوتا ہے یونیورسٹیوں کے فضلاء کا یعنی انٹلکچوئل کلاس مشقف طبقہ) ان کی حقیقت شناسی کی داد دینی چاہئے کہ جو طبقہ کسی ملک کی زمام اختیار و اقتدار لے سکتا ہے سیاسی طور پر بھی انتظامی طور پر بھی فنی و فکری طور پر بھی صحافی طور پر بھی وہ طبقہ ہے پڑھا لکھا طبقہ تعلیم یافتہ طبقہ یونیورسٹیوں کے فضلاء کا طبقہ ہی طبقہ زمام قیادت سنبھال سکتا ہے یہ طبقہ فکری قیادت بھی ہاتھ میں لے سکتا ہے اس میں جو چیز زیادہ مؤثر ہو سکتی ہے عالم اسلام کو کمزور بنانے کے لئے اور مستقبل کی ضمانت کے لئے مستقبل میں مسلمانوں کے غیر مؤثر ہونے کے لئے اور حریف نہیں بلکہ حلیف بن جانے کے لئے اور ان مغربی تہذیب کے پوری طور پر (اگر بے ادبی نہ ہو تو کہا جائے) کلمہ پڑھنے والا بنانے کے لئے اور اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دینے کے لئے نہیں بلکہ اس کے داعی بن جانے اور اس کا مبلغ ہو جانے کے لئے جو چیز سب سے زیادہ مؤثر ہے وہ احساسِ کہتری ہے کہ مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ میں یہ خیال پیدا ہو جائے کہ اس ترقی یافتہ زمانہ میں اسلام کا کوئی مستقبل نہیں باقی عوام کا طبقہ تاجروں کا طبقہ کاشتکاروں کا طبقہ مزدوروں کا طبقہ جو جسمانی محنت سے کام لیتے ہیں ان طبقوں میں ایسی صلاحیت نہیں ہے جو اس کو حریف بنا کر میدان میں لے آئے اس تعلیم یافتہ طبقہ ہی

میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ ملک کو بالکل ایک نئی فردے اور پورے ملک کو ایک نئے سانچے میں ڈھال کر کھڑا کر دے اور حریف کمپ کو حلیف و مددگار کمپ بنادے اس میں اپنے دین کے بارہ میں اپنے بارہ میں اپنے ماضی کے بارہ میں احساس کمتری اور مستقبل کے بارہ میں مایوسی پیدا ہو جائے اس کے دل میں یہ بات بیٹھ جائے بلکہ دماغ میں یہ بات تحلیل کر دی جائے کہ اب اسلام کا کوئی دور نہیں رہا اسلام کوئی ایسی منوثر طاقت نہیں وہ عالمی و قیادی طاقت نہیں ہے جس سے کسی حریف کو خطرہ ہو اسلام نے اچھا کام کیا تھا وہ شکر یہ کے قابل ہے چھٹی صدی عیسوی میں اس نے بت پرستی کی کھلی مذمت اور اس کی تردید کی دختر کشی کی مذمت اور مخالفت کی بڑی نا انصافی تھی کہ لڑکیاں دفن کر دی جاتی تھیں بہت اچھا کام کیا کچھ اخلاقی تعلیم بھی دی۔

لیکن اب دنیا نے ترقی کی جو منزلیں طے کر لی ہیں اور تمدن کی جس منزل پر یہ دنیا پہنچ گئی ہے اور جو سائنس کی ایجادیں اور کسی چیز کو پھیلانے اور کسی چیز کو دل و دماغ میں اتارنے کے جوئے وسائل پیدا ہو گئے ہیں صحافت کی ٹیلی وژن کے انٹرنیٹ کے اس کے بعد اب مسلمانوں میں کوئی ایسی طاقت نہیں ہے کوئی ایسا امکان و وسیلہ نہیں ہے جو دنیا کو نیا پیام دے سکے اور دنیا کو ایک متبادل چیز دے سکے اس مغربی تہذیب کے مقابلہ میں لادینیت کے مقابلہ میں روشن خیالی کے مقابلہ میں ترقی پسندی کے مقابلہ میں اور پھر جو عالمی وحدت پیدا کی جا رہی ہے اس کے مقابلہ میں بہت بڑی ذہانت کی اور دور بینی کی ضرورت ہے۔

ان مفکرین مغرب کا یہ انتخاب صحیح تھا کہ مسلمانوں میں احساس کمتری پیدا کیا جائے کہ ان کے اندر خود اپنے بارہ میں اپنے مستقبل کے بارہ میں اپنی صلاحیت کے بارہ میں شکوک و شبہات پیدا ہو جائیں دنیا میں صرف قیادت کرنے کی صلاحیت ہی نہیں بلکہ اپنے دین کے ساتھ باقی رہنے کی صلاحیت پر بھی ان کا یقین متزلزل ہو جائے ان کے اندر یہ خیال پیدا ہو جائے کہ اسلام کا دور ختم ہو چکا ہے ایک زمانہ تھا جب ترقی نہیں ہوئی تھی مسلمان فاتحین نے ملکوں کو تسخیر کر لیا حکومتیں قائم کیں، اسلامی تمدن بھی پھیل گیا اور بعض ملکوں کی زبان بھی بدل گئی یہاں تک کہ وہ اسپین تک پہنچ گئے مغرب اقصیٰ تک پہنچ گئے لیکن اب زمانہ بہت بدل گیا ہے بہت ترقی کر گیا ہے ان لوگوں کے پاس نہ قومی طاقت ہے اور نہ اس کے پاس سائنس کے وسائل میں ترقی ہے اور نہ ان کے پاس وہ وحدت ہے جو اس وقت عالم مسیحی میں ہے یہ بڑی

چالاکی کی بات تھی مسلمانوں میں کمتری پیدا ہو جائے وہ کہیں کہ ہم کو زندہ رہنے کی اجازت دی جائی اچھا بھائی نماز بھی پڑھ لیا کرو خاموشی کے ساتھ اپنے دینی فرائض ادا کرو حج کو بھی چلے جایا کرو لیکن عصر حاضر کے نقائص بتانے ان پر تنقید کرتے اور ان کی مذمت کرنے اور ان کے مقابلہ میں متبادل نظام پیش کرنے کی اجازت نہیں ہے مغربی تہذیب کو چیلنج کرنا یا ان ممالک کی پوزیشن پر ان کے اقدامات پر تنقید کرنا ان کے بجائے متبادل نظام قائم کرنا کہ مسلم اکثریت کے ملک میں ان ہی کی قیادت ہو اور وہاں کے حکمران وہی ہوں جو کہ وہی طور پر پورا یقین رکھتے ہوں خود شریعت کے پابند ہوں اور جن کے اندر اسلامی قانون کے نفاذ کا جذبہ ہو بالکل اس کا خیال نہیں کرنا چاہئے یہ کتنی بڑی چالاکی و ذہانت دور بینی اور نفسیات شناسی کی بات تھی آپ یقین مانئے کہ ہتھیار کے ذریعہ کسی ملک کو فتح کرنا اتنا کامیاب منصوبہ نہیں ہے جتنا کہ یہ آپ جانتے ہیں کہ جن ملکوں کو ہتھیار کے ذریعہ فوجی طاقت کے ذریعہ فتح کیا گیا وہ ملک آزاد ہو گئے خود ہندوستان ان ہی ملکوں میں ہے لیکن جب یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے (خاص طور پر تعلیم یافتہ طبقہ کی دل و دماغ میں پیوست ہو جاتا ہے) کہ ہمارا دور ختم ہو گیا بس ہم اس کو غنیمت سمجھیں کہ ہمیں اپنے مذہبی فرائض ادا کرنے کی آزادی ہے بس یہی بہت کافی ہے یورپ بھی اس طریقہ کار میں شامل تھا لیکن امریکا کے مقابلہ میں اب ذرا پیچھے آ گیا ہے اس میں مغرب کو ایسی کامیابی حاصل ہوئی کہ ہمارا جدید تعلیم یافتہ طبقہ جو کسی ملک کی قیادت کا اہل ہوتا ہے مغربی زبان جانتا ہے یونیورسٹی کا فاضل ہوتا ہے اسکا لڑ ہوتا ہے اور سیاسی نظاموں پر نظر رکھتا ہے اس سے اتنا متاثر ہے اور اس کی اندر گہرائی کے ساتھ یہ خیال پیدا ہو گیا کہ اور کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں بس یہ غنیمت ہے کہ ہم نماز روزہ کر لیں اور ہمیں شرعی طریقہ پر نکاح و طلاق کی آزادی حاصل ہو اور ہمیں کوئی چھیڑے نہیں ہماری نسل کشی نہ ہو یہی غنیمت ہے۔

یہ نا انقلاب تعلیم یافتہ طبقہ کے دل میں ایسا پیدا ہوا کہ اس کے سامنے اگر کوئی بات کہی جائے تو مسلمان خود اس کی تردید کرنے لگے اس وقت جو خلاء پیدا ہوا ہے جو دنیا کے لئے انسانیت کے لئے خود کشی ہے مسلمان قیادت سے ہٹ گئے اور یہ قیادت ان قوموں کے ہاتھ میں چلی گئی جن کے اندر نہ خدا پر ایمان ہے نہ خدا کا خوف ہے نہ انسانیت کا احترام ہے نہ انصاف ہے۔

یہ سمجھا جانے لگا کہ مسلمان کوئی فیکٹ نہیں ہیں، کوئی عامل نہیں ہیں موثر نہیں ہیں وہ ایکٹو و مشل ہیں، مسلمانوں کی صرف اتنی پوزیشن ہے کہ کوئی کام ان کے سپرد کر دیا جائے کر لیں، کوئی محاذ جو بہت پر امن ہو اور جو غیر خطرناک ہو، اس پر ان کو کھڑا کر دیا جائے تو وہ کھڑے ہو جائیں باقی یہ کہ دنیا کی تاریخ کا محاسبہ اس طرح کیا جائے اور یہ بتایا جائے کہ مسلمانوں کے منصبِ قیادت سے جانے یا محروم ہو جانے کی وجہ سے دنیا کو یہ نقصان پہنچا، اس پرانہ سے محاسبہ کیا جائے تو دنیا کا نہیں بلکہ خود مسلمانوں کا جو ذہن اور اونچا طبقہ ہے اس کا ذہن اس کو قبول ہی نہیں کرتا۔

اس کے سمجھنے کے لئے ایک بات آپ کو بتاتا ہوں کہ جب میری کتاب مآذا خسّر العالم بانحطاط المسلمین، مصر میں چھپی، جس کو اس سطح سے لکھا گیا تھا کہ دنیا کو کیا فائدہ پہنچا تھا مسلمانوں کی ترقی سے، جب مسلمان دعوت و قیادت کے منصب پر فائز ہوئے اس میں دنیا کو ایمانی حیثیت سے اخلاقی حیثیت سے، انسانی حیثیت سے انتظامی و تنظیمی حیثیت سے آپس کے تعلقات کی حیثیت سے اور اپنے منصوبوں اور عزائم کے لحاظ کیا فائدہ پہنچا؟ اس لحاظ سے تاریخ کا مطالعہ بہت کم کیا گیا تھا اور معاف کیا جائے اس پر بہت کم لوگوں نے قلم اٹھانے کی ضرورت سمجھی تھی یا جرات کی تھی، جب یہ کتاب مصر میں چھپی اور ۱۹۵۱ء کے شروع میں جنوری میں ہمارا قاہرہ جانا ہوا تو ہماری موجودگی میں ایک مقبول اور بڑے اخبار میں مضمون نکلا کہ ابھی ایک کتاب نکلی ہے جس کا نام مآذا خسّر العالم بانحطاط المسلمین، ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ نام رکھا کیسے گیا مسلمانوں کے تنزل اور پستی سے دنیا کو کچھ نقصان پہنچ سکتا ہے کیا مسلمان اس پوزیشن میں ہیں کہ ان کے تنزل سے دنیا کو نقصان پہنچے یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ استاذ ندوی نے کیسے اپنی کتاب کا نام مآذا خسّر العالم بانحطاط المسلمین رکھا اس سے آپ اندازہ کیجئے کہ یہ چیز دماغ میں کتنی بیٹھ گئی تھی اور علمی حلقہ میں پھیل گئی تھی کہ مسلمانوں کو ایکٹر سمجھا جائے یا کوئی تمدنی ڈرامہ ہو رہا ہے سیاسی ڈرامہ ہو رہا ہے تو اس میں ایک ایکٹر یہ بھی ہے جو ڈیوٹی بتا دی گئی ہے کہ آپ کو یہ کرنا ہے وہ کرتے رہیں گے لیکن یہ بجائے ایکٹر کے عامل و موثر ہوں یہ ہو نہیں سکتا۔

یہ علامہ اقبال ہی کی خصوصیت ہے ان کا بڑا امتیاز ہے کہ انہوں نے خود اپنے اشعار میں

اس کا اظہار کیا، وہ کہتے ہیں کہ ابلیس کی ایک مجلس شوریٰ ہوئی جس میں معاصر دنیا کا جائزہ لیا گیا کہ اس وقت ابلیسی نظام کے خلاف دنیا میں کیا خطرات ہیں یعنی ابلیسی نظام کو کیا چیز چیلنج کرتی ہے تاکہ اس مجلس (مجلس ابلیسی) کے ارکان اسکے مقابلہ کی تیاری کریں تو کسی نے خطہ بتایا سرمایہ داری کا کسی نے اشتراکیت کا مجلس ابلیسی کا جو صدر مجلس تھا وہ سب کا جواب دیتا رہا کہ اس کا جواب سوچ لیا گیا ہے یہ علاج ہے جب یہ کہنے کا موقع آیا کہ اصل خطرہ کیا ہے؟ تو اس نے کہا۔ یہ اقبال کا کمال ہے کہ انہوں نے ابلیس کی زبان سے اس حقیقت کا اظہار کیا ہے۔

ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں

ہے حقیقت جس کے دیں کی احتساب کائنات

یہ جو ذیلی اور وقتی خطرے ہیں ان سے ہم نہیں ڈرتے ہم نے سب کا علاج سوچ لیا ہے سرمایہ داری کے خلاف، اشتراکیت کے خلاف انتظام کر لیا ہے، لیکن ہمیں اصل ڈر یہ ہے کہ وہ قوم بیدار نہ ہو جائے جس کا کام احتساب کائنات ہے جو پوچھتی ہے یہ کیوں ہو رہا ہے یہ حلال ہے، یہ حرام ہے یہ جائز ہے یہ ناجائز ہے، یہ شیطانی کام ہے یہ ملکوتی کام ہے، یہ خدا کے منشاء کے مطابق ہے، یہ خلاف ہے، میں اس سے ڈرتا ہوں، چنانچہ اس نے کہا کہ۔

مست رکھو ذکر و فکر صبح گاہی میں اسے

تابساط زندگی پر اسکے سب مہرے ہوں مات

تم اس کو اس میں لگا دو کہ وہ عبادت کرتے رہیں اور ذکر بھی کرتے رہیں تصوف کا اس کے ذہن میں ناقص نقشہ تھا اس کے مطابق اس نے کہا کہ ذکر و فکر صبح گاہی میں رہیں نتیجہ یہ ہوگا کہ اسکے جتنے مہرے ہیں سب مات ہو جائیں گے اور ہم بالکل آزادی کے ساتھ اپنا کام کر سکیں گے۔

عزیزو! بات یہ ہے کہ دو چیزیں ہیں جن پر ہم کو توجہ دینی ہے ایک یہ کہ اس احساس کمتری کو دور کیا جائے اس کے لئے فکری طور پر بلند معیار فکر سے اور علمی طرز تحریر اور بلند معیار سے کتابیں لکھی جائیں اور تقریریں کی جائیں دورے کئے جائیں تعلیم یافتہ طبقہ سے ملا جائے کہ اس کے اندر سے دین کے بارہ میں اور امت اسلامیہ کے بارہ میں احساس کمتری نکل جائے اس کے دل میں جو مایوسی بیٹھ گئی ہے اور تحقیر کی نظر، شرمندگی کی نظر جو اس کے اندر آگئی ہے کہ

ہاں سب ٹھیک ہے لیکن اس وقت اس کے متعلق بلند باتیں کرنا اور یہ کہ مسلمانوں کے ہاتھ میں زمام اقتدار ہونا چاہئے مسلمانوں کے پاس طاقت ہونی چاہئے یہ منکر ہے یہ معروف ہے یہ جائز ہے یہ ناجائز ہے اس بحث کا موقع نہیں ہے یہ بات انہوں نے تعلیم یافتہ میں عام طور پر اور صاحبِ قلم صحیفہ نگار صحافتی طبقہ میں اور ملکوں کی جولیڈر شپ ہے اس میں خاص طور پر یہ بات ایسی پیوست کردی ہے کہ ہم مسلمانوں کا کوئی مستقبل نہیں اس ترقی یافتہ دنیا میں اس سیاست و سائنس کے دور میں امریکا کی سربراہی و قیادت کے دور میں اب مسلمانوں کا جو اپنے دین کے داعی ہوں اپنے دین کی برتری اور صلاحیت کا اور صلاحیت بقاء کے پورے پورے قائل ہیں ان کا کوئی موقع نہیں۔

یہ ہے اصل مرض جو سب سے بڑی بیماری ہے اس عہد کی کہ ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ میں اسلام کے مستقبل کی طرف سے بالکل مایوسی آگئی ہے اور وہ یہ سمجھنے لگا ہے کہ ہم نماز روزہ کر لیں یہ بھی غنیمت ہے لیکن بلند نگاہی، حوصلہ مندی اور احساسِ برتری اس کی کوئی گنجائش نہیں۔

خود ان ملکوں میں یہ حال ہے کہ وہ طبقہ حاوی ہو گیا ہے جو اسلام سے بالکل مایوس ہے اور مایوس ہی نہیں بلکہ اسلام کا نام لینے والوں کو سب سے بڑا خطرہ سمجھتا ہے، اس کے لئے الجزائر کی مثال لے لیجئے وہاں سول وار ہو رہی ہے موجودہ صاحبِ اقتدار طبقہ کے درمیان اور دین پسندوں کے درمیان اور بے رحمی کے ساتھ دین دار مسلمان مارے جاتے ہیں الجزائر کو عالموں نے آزاد کر لیا شیخ عبدالحمید بن بادیس نے آزاد کر لیا عبدالقادر الجزائری نے اسے آزاد کر لیا، جہاں اللہ کے نام پر شہادت کے شوق میں مسلمانوں نے فرانس کو نکالا اور الجزائر کو آزاد کر لیا وہاں اسلام آج سب سے بڑا خطرہ بن گیا ہے، حکومت کا حریف بن گیا ہے، جیسے کبھی فرانس تھا اس کے بعد میں آئے مصر میں، اخوان المسلمین کی تحریک شروع ہوئی بڑی روح پرور حیات افروز اور حوصلہ آفریں تحریک تھی جو عرصہ کے بعد عالم عربی میں پیدا ہوئی تھی اس کا انجام یہ ہوا ہے کہ امام حسن البنا، کوشہید کر دیا گیا، سید قطب جو بڑے طاقتور لکھنے والے تھے بہت جری تھے اسلامی خیالات کے اظہار میں بڑے ادیب تھے ان کو شہید کیا گیا، یہ امریکا برطانیہ، اسرائیل نے نہیں کیا بلکہ خود مسلمان حکمرانوں نے کیا جمال عبدالناصر اور انور البسادات نے کیا۔

شام جو اس وقت دروڑیوں کے قبضہ میں ہے حافظ الاسد دروڑی عقیدہ کا ہے، وہ شام

جہاں یرموک ہے، جہاں صحابہ کرام اور شہداء کی اتنی بڑی تعداد میں قبریں ہیں کہ مدینہ منورہ کے علاوہ کہیں نہیں ہیں، جہاں خالد بن الولید آرام فرما ہیں جہاں ابو عبیدہ آرام فرما ہیں جہاں بلال حبشی آرام فرما ہیں جہاں کیسے کیسے علماء اور ائمہ فن ہوئے، وہ شام بھی اب دروزیوں کے رحم و کرم پر ہے حافظ الاسد نے ایک موقع پر کہا تھا کہ ”ہم کرسی توڑ سکتے ہیں چھوڑ نہیں سکتے“

ایک بات تو یہ ہے جس کی تیاری کرنی ہے، احساس کمتری کو دور کیا جائے آپ پڑھئے ان چیزوں کو جن سے حوصلہ پیدا ہوتا ہے اور اس ترقی یافتہ دنیا کی کمزوری سامنے آتی ہے اور اس سازش کا پتہ چلتا ہے جو صرف اسلام ہی نہیں بلکہ حقانیت کے خلاف صداقت کے خلاف انسانیت کے خلاف کی گئی ہے اس کا گہرا مطالعہ کرنے کی ضرورت اللہ تعالیٰ آپ کو موقع دے کہ اتنی انگریزی آجائے کہ آپ ان کتابوں کا مطالعہ کریں جو مغربی تہذیب اور مغربی اقتدار کی تنقید میں لکھی گئی ہیں آپ کو معلوم ہو جائے کہ سب سے بڑا منصوبہ یہ ہے کہ اسلام کو بالکل زندگی سے بے دخل کر دیا جائے بے اثر بنا دیا جائے وہ بس ایک تاریخی چیز رہ جائے، ہاں اپنے وقت میں اس نے بڑا کام کیا لیکن اب زمانہ بڑا ترقی کر گیا ہے اس میں وہ اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ دوسری بات یہ ہے مغربی تہذیب کی کمزوریاں آپ کو معلوم ہوں، علمی انداز میں معلوم ہوں اور تحقیقی و تحلیلی انداز میں معلوم ہوں کہ مغربی تہذیب میں کیا کمزوریاں ہیں اس وقت انگریزی میں بڑا اثر پچر ہے، قابل اعتراف اور قابل داد ہے خود یورپین مصنفین نے اس سلسلہ میں بڑی جرأت سے کام لیا ہے اور بہت صفائی کے ساتھ انہوں نے مغربی تہذیب کی کمزوریوں کا اعتراف کیا ہے ہم نے ایک کتاب دیکھی اس میں بتایا گیا ہے کہ مغربی تہذیب میں یہ خرابیاں ہیں اور صفائی کے ساتھ اس میں مغربی تہذیب پر تنقید کی گئی ہے، ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ پیرس یا لندن میں وہاں کے رہنے والے نے ایک ہندوستانی فلاسفر سے کہا کہ ہمارا ہوائی جہاز اتنے منٹ میں پیرس پہنچ گیا اور ہمارا بحری جہاز اتنے گھنٹے میں فلاں جگہ پہنچ گیا، ہم نے اتنی ترقی کی تو انہوں نے کہا کہ ہاں تم کو ہوا میں چڑیوں کی طرح اڑنا آ گیا اور مچھلیوں کی طرح پانی میں تیرنا آ گیا مگر آدمیوں کی طرح زمین پر چلنا نہ آیا ہمیں اس بات کا اعتراف کرنا چاہئے کہ انہوں نے اس تہذیب پر، اس ترقی پر جرات مندانہ طریقہ پر تنقید بھی کی ہے، ان چیزوں کو پڑھنے کی ضرورت ہے۔ یہ صرف ندوۃ العلماء کا نہیں بلکہ عالم اسلام کا ایک بہت ہی اہم مفید

بلکہ انقلاب انگیز طرز عمل ہوگا، مبہم ہوگی کہ آپ ایک طرف تو تعلیم یافتہ طبقہ سے احساس کمتری دور کریں جو احساس کمتری ان کے اندر پیوست ہو گیا ہے وہ کہتے ہیں:

ارے صاحب شکر کیجئے، آپ کیا باتیں کرتے ہیں، مسجدیں تو موجود ہیں کوئی توڑتا نہیں، باری مسجد کا قصہ تو الگ ہے مدرسے بھی اپنا کام کر رہے ہیں لید کی نماز آزادی کے ساتھ ہوتی ہے، حج کو بھی جاتے ہیں، بس اسی پر قناعت کیجئے یہ سوچئے کہ آپ کو کوئی موقع ملے قانون سازی کا اور آپ کو نئے نظام تمدن کے پیش کرنے کا، کوئی اصلاحی مشورہ دینے کا اس کا بالکل موقع نہیں ہے، تو اس چیز کو دور کرنے کی ضرورت ہے، وقت کا سب سے اہم فریضہ ہوگا کہ تعلیم یافتہ طبقہ سے احساس کمتری کو دور کیا جائے مغربی تہذیب کا پول کھول دیا جائے مغربی تہذیب کی جو حقیقت ہے وہ سمجھائی جائے کہ وہ ایک نفس پرستی اور جاہ پسندی ہے وہ ایک سطحیت ہے اور کچھ نہیں، اس کے لئے تیاری کی ضرورت ہوگی، مطالعہ کی ضرورت ہوگی، اس میں آپ اسلام ایٹ دی کراس روڈس محمد اسد کی کتاب، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی کتابیں اور مضاہین جو انہوں نے شروع میں لکھے تھے خود مجلس تحقیقات و نشریات، کی مطبوعہ کتابیں پڑھئے اور خود پہلے اپنے ذہن دو مانع کو آزاد کیجئے مغربی تہذیب کے نئے تمدن اور نئی تہذیب کے اثر سے اس کے جلال اس سے مرعوب ہونے کو دور کیجئے پھر اس کے بعد اپنے اندر صلاحیت پیدا کیجئے ذہنی طور پر، عملی طور پر کہ آپ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو بھی متاثر کر سکیں، مطمئن کر سکیں کہ اب اس کا بھی زمانہ نکلنے والا ہے، اس کی روح پرواز کرنے والی ہے وہ ناکامی کی طرف بڑھ رہی ہے، کوئی رومی تہذیب تھی کوئی یونانی تہذیب تھی، کوئی فرعونی تہذیب تھی جیسے ان سب کا خاتمہ ہو گیا اب اس کا بھی خاتمہ ہو گا یہ بہت بڑا کام ہے خاص طور سے اس شعبہ میں جو طلبہ ہیں جو اس سے تعلق رکھتے ہیں ان کے بنیادی فرائض میں ہے کہ ان دو چیزوں کی تیاری کریں ایک احساس کمتری کو دور کرنے کے لئے علمی و فکری مدلل انداز میں ایک مغربی تہذیب کے تسلط کو جو ذہنی مرعوبیت ہے اور دلوں میں مغربی تہذیب کی جو تقدیس بیٹھ گئی ہے اس کو دور کیا جائے، اس کے بغیر ہماری نئی نسل کے تعلیم یافتہ طبقہ کا فکری طور پر اسلام کا گرویدہ ہونا اور اسلام کے عروج کے لئے کوشش کرنا ناقابل قیاس ہے۔

آپ اس کے لئے اپنے اساتذہ سے جو الحمد للہ اس پر نظر رکھتے ہیں اور جب کبھی اہل علم

سے ملاقات ہو تو ان سے ان مآخذ و مصادر کا علم حاصل کریں کہ جن کو پڑھ کر آپ کے ذہن سے خود مغربی تہذیب کی برتری کا احساس اور اس سے مرغوبیت نکل جائے اور آپ دوسروں کو بھی متاثر کر سکیں اور یہ سمجھیں کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں جب تک اسلام کی پورے طور پر حقانیت، صداقت و وحدت (یعنی وہی واحد نجات دہندہ ہے وہی باعث سعادت و سلامتی ہے) کا خیال و عقیدہ پیدا نہیں ہوگا اس وقت تک یہی حال رہے گا کہ ایک ہٹا دوسرا آیا دوسرا ہٹا تو تیسرا آیا نتیجہ یہ ہوگا کہ کسی اسلامی ملک میں بھی اسلام کو پورے طور پر اپنی افادیت ثابت کرنے، اپنی ضرورت تسلیم کرانے اور اپنی برتری و صداقت کا کلمہ پڑھانے کی نوبت نہیں آئے گی، اللہ تعالیٰ آپ کو توفیق دے کہ آپ اس میدان کے لئے اپنے آپ کو تیار کریں کہ تعلیم یافتہ طبقہ سے احساس برتری دور ہو اور اسلام سے جو ایک مایوسی دل میں بیٹھ گئی ہے کہ اب اس کا وقت نہیں رہا اب اس کا دور نہیں رہا اب تو ان ترقی یافتہ ممالک کا دور سیادت ہے جو سائنس میں بھی اور سیاست میں بھی ماہر ہیں، اسلامی ملکوں پر بھی انہیں کا قبضہ ہوگا جو مغربی تہذیب کے ترجمان بلکہ کارندہ اور ایجنٹ ہوں گے جیسا کہ اکثر ہو رہا ہے ہمارے اسلامی ملکوں میں وہی لوگ حکمرانی کر رہے ہیں جو امریکا و مغرب کے ایجنٹ ہیں، امریکا کے نمائندہ ہیں اسی کے کارکن ہیں، مسلمانوں کے نام سے کام ہو رہا ہے لیکن کام ہو رہا ہے امریکا کا مغربی تہذیب کا اور اسلام سے اور زیادہ دوری بڑھتی جا رہی ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے۔

وآخر دعوانا نحمد لله رب العالمین۔

علم کا بھی ایک قانون ہے

دوسری دفعہ بھٹکل آمد کے موقع پر اساتذہ و طلباء اور منتظمین جامعہ سے حضرت مولانا امت پرہا جہم کا خصوصی خطاب جو ہر مدرسے اور دینی ادارے سے تعلق رکھنے والے افراد کے لیے مہم مومن کی حیثیت رکھتا ہے۔

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم۔ اما بعد۔

صحیح راہ کی ضرورت:

میرے عزیز و اور بھائیو! آپ کو شاید معلوم ہو یا معلوم نہ ہو جو لوگ تفسیر پڑھتے ہیں اور ان کی تفسیر کی کتاب شروع ہو چکی ہے یا کم سے کم سورہ بقرہ اور اس کا ترجمہ و تفسیر انہوں نے پڑھی ہے وہ جانتے ہیں کہ جاہلیت میں جو لوگ حج کو نکلتے تھے ان کا ایک صرف اور ضابطہ یہ بن گیا تھا جو خود ساختہ تھا شریعت میں نہیں تھا لیکن انہوں نے اپنی طرف سے اپنے اوپر ایک پابندی عائد کر لی تھی کہ جب تک کہ حج سے فارغ نہ ہوں حج کے ارکان میں مشغول ہوں اور اس دوران اگر ضرورت ہو گھر آنے کی، کوئی بات کہنے کی تو گھر کے دروازے سے نہ آئیں کہ ابھی تو اللہ کے گھر سے ہو کر نہیں آئے تو اپنے گھر میں قاعدے سے کیسے داخل ہوں تو چھتوں پر سے یا دیواروں کی طرف سے من ظہور ہا پشت سے وہ گھر میں آیا کرتے تھے اور اس کو وہ بڑی نیکی کا کام سمجھتے تھے کہ اس میں بیت اللہ کا ادب و احترام ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لیس البران تاتوا البیوت من ظہورھا یہ کوئی نیکی کا کام نہیں ہے کہ تم گھروں میں پشت کی طرف سے آؤ و لکن البر من اتقی و اتوا البیوت من ابوابھا گھروں میں گھروں کے دروازوں سے آؤ یہی قاعدہ ہے اور یہی عقل سلیم اور ذوق سلیم کی بات ہے اور قانون قدرت ہے کہ جس چیز کا جو مدخل ہے اس سے آدمی آئے قرآن مجید تو پوری زندگی کی کتاب اور پوری زندگی کے لئے کتاب ہدایت ہے ہر طبقہ کے لئے ہر مشغلہ ہر میدان اور ہر مرحلہ کے لئے وہ ایک دستور العمل

اور ایک ہدایت نامہ کا کام دیتا ہے قرآن کے یہ دو لفظ بڑے اہم و اتوا البیوت من ابو ابہا یہ پوری زندگی پر حاوی ہے اس میں پوری زندگی کی حکمت بتا دی گئی یہ صرف گھ کا معاملہ نہیں ہے چیز کا معاملہ یہی ہے کہ جو اس کا دروازہ ہے اس دروازہ سے آنا چاہئے اور کوئی شخص پیشہ سیکھنا چاہے کوئی صنعت دیکھنا چاہے لیکن صنعت کے استاذوں سے نہ سیکھے اور صنعت کے آداب کا خیال نہ کرے اور صنعت کے اوزار مہیا نہ کرے اور ترتیب کے ساتھ درجہ بدرجہ مرحلہ وار اس کو نہ سیکھے اور یہاں تک کہ ان کی وردی استعمال نہ کرے لوہاروں کی ایک وردی ہے اور ستقاؤں کی ایک وردی ہے سپاہیوں کی ایک وردی ہے اور ڈاکوؤں کی ایک وردی ہے تو مردی تک بعض اوقات نہ مردی ہوتی ہے ورنہ وہ اپنے پیشہ میں کامیاب نہیں ہوگا اس کو پیشہ نہیں آئے گا نہیں آئے گا تو بس یہ معمولی چیزوں کا حال ہے اور کوئی آتا ہے کہ فضول باتیں ہیں ہمیں نہ باری کافن سیکھنا ہے یا ہمیں فوج میں بھرتی ہونا ہے سین وردی کا جھگڑا ہم مول نہیں جیتے یہ پہنویا نہ پہنوا اور صاحب لیفٹ راجٹ فضول بات ہے ہم اپنی ذہانت سے کام لیں گے ہم دوسرا طرز ایجا کریں گے وہ یوں ہی رہ جائیگا اچھا سپاہی بن نہیں سکتا ایسے ہی لوہار نہیں بن سکتا نجار (کار پیئٹر) نہیں بن سکتا اس کے لئے بھی واتوا البیوت من ابو ابہا کی ضرورت ہے جو اس کا دروازہ ہے ادھر ہی سے آؤ۔

حروف تہجی کی اہمیت

یہ واتوا البیوت من ابو ابہا ساری زندگی دین و دنیا سب پر حاوی ہے کہ اللہ نے اور فطرت انسانی نے فطرت سلیم نے سالوں سال کے تجربہ سے جو اصول مقرر کئے ہیں اور جو اس کے مداخل اور نجارج ہیں اگر کوئی شخص اس کا پابند نہ ہو ان کا کوئی احترام نہ کرے وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا اپنا مقصد حاصل نہیں کر سکتا۔ ایک شخص کہے کہ حروف تہجی کا جھگڑا عجیب ہے اب "ا" (الف) کا کون جھگڑا مول لے کہ پہلے الف بات پڑھے ہم براہ رست پڑھنا شروع کر دیتے ہیں تو وہ کتنا ہی ذہین ہو کبھی اس کو پڑھنا نہیں آئے گا جواب، ت نہیں پہچانتایا نہیں پہچانتا وہ کبھی ایک سیکند نہیں بول سکتا آپ کسی وقت بھی تجربہ کر کے دیکھئے کہ آپ کے زمانے کا کوئی بقراط سقراط ہو جو بڑھا ہوا نہ ہو خواندہ نہ ہو، آپ اس کو ایک کتاب دیجئے اردو کی دیجئے یا انگریزی کی دیجئے یا عربی کی دیجئے یا یہیں کی کنٹر زبان کی دے دیجئے اور کہئے کہ رات

بھرنے نہیں آپ کو ایک مہینہ کی مہلت دی جاتی ہے آپ کے پاس کوئی دوسرا آدمی نہیں جائے گا۔ یہ کتاب ہے اور آپ ہیں ہم آپ کو کمرے میں بند کر دیتے ہیں تالہ لگا دیتے ہیں کھانے پینے کا سب سامان کھڑکی سے ہم پہنچاتے ہیں اور وہاں پہلے سے موجود اور زندگی کی سب ضروریات ہیں ایک مہینہ نہیں چھ مہینے آپ اس میں رہتے اور یہ صفحہ حل کر دیتے اس صفحہ کو آپ پڑھ دیتے اور اس نے حروف تہجی نہیں پڑھے ہو تو آپ یقین ماننے کہ جب وہ نکلے گا تو ویسے ہی جاہل ہوگا جیسے وہ داخل ہوا تھا اسلئے کہ وائٹوا البیوت من ابوابہا پر اس نے عمل نہیں کیا حروف تہجی بڑے حق میں لیا حقیقت ہے اب اسے انچوں کو چھلایا جاتا ہے لیکن بڑے بڑے علامہ امام غزالی امام رازی بھی متان تھے کہ پہلے حروف تہجی پڑھیں پھر ادبیا، صوم الدین اور تفسیر رازی تک پڑھیں وہ ادبیا صوم اور تفسیر رازی تک پڑھیں پھر ان کے اساتذہ حروف تہجی نہ پڑھے ہوتے ایسے ہی ہر فن کا، ہر علم کا، ہر شعبہ کا ایک قانون ہے اس قانون پر چلنا ہوگا۔ یہ ہمارا علم اولیٰ ہے مگر علم ہے مگر علم کا حال بھی یہی ہے کہ بہت سی چیزیں تو اس میں مشترک ہیں ہم سمجھتے ہیں کہ ہماری دنیا الگ ہے ان کی دنیا الگ لیکن آپ دیکھیں گے تو زیادہ حصہ دنیاوی اور دینی تعلیم میں مشترک ہے مثلاً درجہ بدرجہ پڑھنا استاد سے پڑھنا محنت کرنا استاد کا احترام کرنا۔

یورپ میں استاد و شاگرد:

میرے بھائیوں! بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ یورپ وغیرہ میں استادوں کا کوئی احترام کرنا نہیں ہوتا یہ آپ یہاں کی یونیورسٹیوں اور کالجوں پر قیاس نہ کیجئے گا یہ نہ مشرق کے ہیں اور نہ مغرب کے اور نہ دنیا کے اور نہ دین کے یہ تو کچھ نہیں یہ تو خود رو ہیں جنگلی درخت ہیں، میں یورپ گیا ہوں میں نے وہاں کی یونیورسٹیاں دیکھیں مجھے تو حیرت ہو گئی کہ میں کیمبرج آکسفورڈ گیا ضرورت کے لئے بتاتا ہوں آپ کو وہاں معلوم ہوا کہ وہاں اب تک میٹوریل سسٹم جاری ہے ایک استاد کو اتالیق بنالینا۔ جب آپ کسی آفس میں چلے جائیں اور آپ داخلہ کرائیں بی اے اور ایم اے میں تو آپ سے پوچھا جائے گا کہ آپ کس استاد کا انتخاب کرتے ہیں آپ کا مشیر کون ہوگا۔ تو بتانا پڑتا ہے کہ فلاں استاد فلاں پروفیسر کی نگرانی میں اور اس کے مشورہ سے علم حاصل کرنا ہے۔ پھر اس پروفیسر سے بالکل ایسا تعلق ہو جاتا ہے جیسے مرید و پیر کا تعلق ہوتا ہے یعنی طالب علم اس کے مشورے سے کتابیں پڑھتا ہے کتابیں پڑھ کر نوٹس اسکو

دکھاتا ہے تاکہ معلوم ہو کہ طالب علم کتاب کی صحیح اہمیت سمجھتا ہے اور اس کا جو اصل مغز لب لباب ہے اس کو لے رہا ہے پھر اس کے بعد مضمون اس کو تیار کرنا پڑتا ہے وہ بالکل اس سے ایسا وابستہ ہو جاتا ہے جیسے پہلے ہمارے مدارس میں تھا کہ ہر استاد کے ساتھ چند طلباء ہوتے تھے کہ جو بالکل مربوط ہو جاتے تھے اساتذہ سے۔

اور شعراء تک کا یہ حال تھا کہ ان کے راویہ ہوتے تھے چنانچہ تاریخ ادب میں آتا ہے کہ فلاں فلاں کا راویہ تھا یعنی اس کے اشعار و اخذ کرنے والا یا کر لینے والا اس کے ساتھ ساتھ شامل کر لیتے تھے کہ یہ میرا روایہ ہے میں انہیں قصیدہ سناؤں گا اس سے سن لو ویسے ہی ہمارے زمانہ تک طالب علم تقسیم ہو جاتے تھے استادوں میں پارٹ طالب علم ایک استاد کے ساتھ لگ گئے ہیں خادم بھی ہیں وہ اس کی خدمت بھی کرتے ہیں چائے بناتی، دودھ پیا کرتے ہیں گے اس کے آرام کا خیال کریں گے بازار سے اس کی چیزیں لائیں گے اور ہمارے یہاں تو یہ بھی تھا کہ اس کا حساب کتاب بھی دے دیں گے وہ جو اس کے بعد جو کچھ لکھوائے گا اس کو دے دیں گے وہ جو مواد نکلوائے گا اس کو نکالیں گے، ہم سب لوگوں نے ایسا ہی پڑھا تو معلوم ہوا کہ یہ سسٹم آج تک وہاں کی اعلیٰ درجہ کی یونیورسٹیوں میں رائج ہے اس کے بغیر وہ طالب علموں کو گویا قبول نہیں کرتے پہلے بتانا پڑتا ہے کہ تمہارا یورکون ہے یعنی تمہارا خاص استاد کون ہے جس کے ساتھ تم وابستہ ہو گے اور اس کے مشوروں پر چلو گے یہی ہمارے علم کا حال ہے۔

علم دین کا امتیاز:

کچھ چیزیں تو مشترک ہیں لیکن پھر اس کے بعد ایک سرحد ایسی آتی ہے ایک ایسی یہ آتی ہے جہاں سے ہماری سرحد الگ ہو جاتی ہے وہ کیا مثلاً اللہ کی رضا کی طلب ہو اخلاص ہو دعا ہو خدا سے کہ اے اللہ ہم سے توجہ و محنت ہو سکتی ہے ہم کریں گے اصل تو دینے والا ہے علم کا۔
حضرت امام شافعی کا شعر یاد کیجئے:

شکوت الی و کیع سوء حفظی
فأوصانی الی ترک المعاصی
فان العلم نور من الہ
ونور اللہ لا یعطی لمعاصی

میں نے اپنے استاد و کعب سے شکایت کی کہ میرا حافظہ کمزور ہے تو انہوں نے کہا کہ گناہوں سے اجتناب کرو بہت زیادہ گناہوں سے دور رہو اس لئے کہ علم جو اللہ کا نور ہے اللہ کا نور نافرمان کو نہیں دیا جاتا۔ یہاں سے ہماری سرحد الگ ہو جاتی ہے وہ سینما جائیں اور کسی اخلاقی کمزوری یا کسی بے راہ روی کے شکار ہو جائیں تو بھی فرق نہیں پڑتا بلکہ میرا تو خیال ہے کہ فرق پڑتا ہے، لیکن خیر مان لیا نہیں فرق پڑتا ویسے ہی وہ فرسٹ ڈویژن سے پاس ہو جائیں فرسٹ آئیں گے نوکری مل جائے گی لیکن فرق اس میں بھی پڑتا ہے مگر مان لیجئے کہ نہیں فرق پڑتا لیکن ہمارے یہاں تو کھانا، افرق ہے کہ وہ شخص جو استاد کا ادب کرتا ہے اس کی دعا میں لیتا ہے اور اس کے ساتھ باطل و پابندھ جاتا ہے اس کا گویا ملازم ہو۔ آپ تارتخ نہیں پڑیں گے تو معلوم ہوگا کہ بعض اوقات ایسی ہی آدمی ایک استاد کے ساتھ مخصوص ہو گیا وہ بس بالکل اس کا شفیق بن گیا اور بالکل اس کے ہم وایا جذبہ کی جیسے اپنی ہوتا ہے وہ پی لیتا ہے ان طرح پی لیا اس کے ہم وپھر پھوڑا یا اپنے شاگردوں میں۔

علم کے آداب:

تو عزیزو! یہ ہمارا علم جو ہے جس علم کے طالب علم ہیں اس کے لئے یہ جامعہ قائم کیا گیا ہے یہ علم خاص آداب رکھتا ہے، یہ پہلوانی کا علم نہیں ہے کہ آدمی کہے کہ کون ہوتا ہے استاد کیا کتابوں کا ادب لیا پڑائی دیا تو کی باتیں کرنے جو اللہ نے ہمیں ذہن دیا ہے حافظہ دیا ہے محنت صحت ہماری اچھی ہے ہم سب سے دیکھا دیں گے نہیں ایسا نہیں بعض لوگ کم صلاحیت کے ساتھ ایسے کامیاب ہو گئے ہیں کہ دنیا میں ان کا نام نہ کیا مجھے یاد ہے کہ لاہور میں ایک صاحب تھے انہوں نے غلط امن اختیار کی تھی اور کالج میں پڑھاتے تھے ان کی ذہانت اور معقولیت میں ان کی دسترس مسلم تھی یہاں تک کہ ڈاکٹر اقبال بھی ان کو مانتے تھے لیکن جو فیض ان سے پہنچنا چاہئے تھا جو علوم و سنت کا اجر ان سے ہونا چاہئے تھا اور جو شاعت ہونی چاہئے تھی جو ان لوگوں میں بیٹھ کر خشیت پیدا ہونی چاہئے تھی وہ لوگوں میں پیدا نہیں ہوئی کہنے لگے کہ مولوی حسین احمد مدنی تو ہمارے ساتھ تھے تو ان کا شمار غبی طالب علموں میں تھا وہ کچھ وہاں نمایاں نہ تھے یہ بڑے نمایاں تھے ان سے کیا فیض پہنچا ذہانت کے باوجود۔ ایسے ہی ایک صاحب کہنے لگے ارے مولوی الیاس تو جب دیکھو نقلیں پڑھتے تھے پڑھنے کے زمانے میں نقلیں پڑھتے تھے

مولوی الیاس صاحب نے گیا کر دکھلایا دنیا کو بلا کر رکھ دیا یہاں تک کہ امر یکہ اور افریقہ میں بھی ان کی دعوت مقبول ہوئی تو بھائی بڑے تجربے کی بات بتاتا ہوں تھوڑی صلاحیت سے وہ طریقہ اختیار کر کے واتوا البیوت من ابوابہا پر عمل کر کے آدمی وہاں پہنچ سکتا ہے جہاں وہ لوگ جن کو اپنی ذہانت پر ناز ہے اور اپنے قوت مطالعہ پر اور محنت پر وہ نہیں پہنچ سکتے ان کے پڑھنے پڑھنے میں برکت نہیں ہوگی کہ لوگوں کو نفع پہنچے علم کے ساتھ سنتوں کا اجرا ہو بدعات کا مٹو ہو معصیتوں سے نفرت پیدا ہو طاعت میں رغبت پیدا ہو فوراً کے یہ بات پیدا نہیں ہوگی یہ بات جب پیدا ہوگی کہ آدمی اس طریقہ پر عمل کرے جو استاد بتائے۔ ایک صاحب تھے بہت بڑے علامہ شام کے علامہ بیطار کہنے لگے کہ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ مولف اپنے استاد کے پاس نہیں جا سکے بڑی سخت سردی تھی، شام میں بڑی سردی پڑتی ہے برف پڑتی ہے کہنے لگے ہم مجبور ہو گئے دوسرے وقت گئے تو کہنے لگے کیوں نہیں آئے ہم نے کہا سردی بہت تھی اوپر سے ایک گھڑ اپانی اور ڈال دیا کہنے لگے کہ یہ سردی ہے کہنے لگے کہ ہم لوگوں نے برداشت کیا اور کوئی شکایت نہیں کی اور پھر جانے لگے اب وہ علامہ بیطار بن گئے انہوں نے خود سنایا یا ایسے ہی ایک صاحب نے ان کے ہم عصروں میں سے سنایا تو یہ اس زمانہ کا طریقہ تھا کہ استاد خدمت بھی دیتے تھے اور پڑھاتے بھی تھے اور پھر استاد و استاد ہی نہیں ہوتا تھا ایک طرح کا چیرہ ہوتا تھا اس کے پاس رہتے کہ نماز کیسے پڑھتا ہے کیا خشوع و خضوع ہے سنتوں کا کہاں تک اہتمام کرتا ہے مسجد آتا ہے تو پہلا قدم کون رکھتا ہے نکلتا ہے تو کون سا قدم نکالتا ہے یہ باتیں بھی سیکھتے تھے استادوں سے۔ اور اب یہ باتیں کم ہو گئیں۔

قحط الرجال کا دور:

آج دیکھئے کوئی غیر معمولی شخص کوئی سطح سے بلند کوئی علامہ کوئی کوہ قامت کوہ پیکر ایسی کوئی ہستی نہیں پیدا ہو رہی ہے اس وقت کوئی امام مزنی، امام نووی، شیخ الاسلام ابن عبدالسلام حافظ ابن حجر عسقلانی نہیں بن سکتا تو کوئی حافظ ابن حجر عسقلانی بن جائے ان جیسا ان سے دوسرے تیسرے نمبر کا ادیب بنے لیکن نہیں بن رہے ہیں لوگ یہاں سے مصر تک اور اب تو مصر بھی خالی ہے اس زمانہ میں از ہر بڑے لوگ پیدا کرتا تھا بڑے فضل لوگ راسخ العلم لوگ پیدا کرتا تھا وہاں بھی خزاں کا دور آ گیا اور سیاسی اغراض اور سیاسی مقاصد نے اس کو بالکل بے اثر کر کے رکھ

دیا ہے اور وہاں بھی لوگ پیدا نہیں ہو رہے ہیں اور ہر ملک میں یہ احساس کیا جا رہا ہے کہ اب اس پایہ کے عالم پیدا نہیں ہو رہے ہیں تو اس کے لئے ضروری ہے درس کی پابندی استاد کا احترام، مطالعہ کرنا مطالعہ دیکھے بغیر نہ پڑھنا اور مولانا اشرف علی تھانوی صاحب فرماتے ہیں کہ طالب علموں کا شعار دیکھے بغیر نہ پڑھنا اور مولانا اشرف علی تھانوی صاحب فرماتے تھے کہ طالب علموں کا شعار یہ ہو گیا ہے نہ دیکھ کر پڑھنا نہ پڑھ کر دیکھنا دیکھ کر پڑھنا یہ مطالعہ کر کے پڑھیں گے اور پڑھ کر کے اس کو رواں کریں دیکھیں بار بار پڑھیں وہوں چیز میں ختم ہوئیں جس چیز میں قیامت نہیں ہے۔ ان پر عمل یہاں سے قرآن بھی اللہ کا قانون بھی ہے جو سیکھوں میں انہوں میں پہلے تھا امام احمد اب بھی دین و دھرم ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ لکھتے تو تو اسے رہا ہے پہلے دیکھ کر پڑھنا اور اس سے کیا فائدہ ان کی ترقی کرنی تھی بیچاروں کو مفتوں میں بیٹوں نہ ہی ملے نہ چکنائی ملے نہ فروٹ ملے نہ گوشت یہ سوکھی روٹی کھا کے انہوں نے اتنے بڑے کام لئے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ بعض ایسے گذرے ہیں کہ کھڑے ہو گئے نان بائیں دہان پر اور روٹی تو پر ڈالنے کی جو خوشبو ہوتی ہے اس سے طاقت حاصل کی اور آ کر پھر پڑھنے لگے بس وہی بات ہے کہ وائسوا البیوت من ابوابھا کہ بیت علم میں باب علم سے داخل ہو، باب علم ایات دینی قواعد و ضوابط پر چلنا احترام کرنا نظام کے ساتھ رہنا من بعد دیکھنا منت کرنا اور جہاں اتر ملے یہ سب تو پیکموگے انشاء اللہ نام روشن کرو گے اپنے ملک کا بھی اور اپنی ملت کا بھی اور نہیں تو بس شد بد ہو جائے گی مشکل سے کوئی مسئلہ بتا سکو گے کوئی کتاب پرھا سکو گے باطنی کام کر سکو گے میں سمجھتا ہوں کہ بس یہ کافی ہے، ہم اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ اللہ شروعات سے بچائے اخلاص عطا فرمائے اپنے کلام کا حاملین کلام کا اپنے سب کا احترام و ادب نصیب فرمائے۔ (آمین)

و آخر دعوانا الحمد لله رب العالمین .

اصل مسئلہ ترجیح کا ہے

دوسری دفعہ سرزمین بھنگل آمد پر مورخ ۲ جنوری ۱۹۸۳ء کو باں کی سب سے بڑی اور معروف
دینی درس گاہ جامعہ اسلامیہ کے علماء، طلبہ میں حضرت مولانا قدس سرہ کا ایمان افروز بیان ہوا
جو ہر دور سے اور دینی ادارے سے تعلق رکھنے والے فروع کے لئے پیامِ راہ کے حیثیت رکھتا ہے

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على سيد المرسلين خاتم
النبيين وعلى آله واصحابه اجمعين اما بعد.

اول سلام:

عزیزو! جب کوئی کہیں سے آتا ہے تو پہلے سلام کرتا ہے، ہم آپ کے پاس دور سے
آئے ہیں، ہمیں بھی چاہئے کہ آپ کو سلام کریں، اس وقت جو میں کہہ رہا ہوں اس کی حیثیت
محض سلام کی ہے باقی سلام کے بعد کلام بھی ہوتا ہے وہ شاید بعد میں ہو میں تو اس وقت صرف
ہدیہ سلام پیش کر رہا ہوں، جیسا کہ حکم ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

فاذا دخلتم بيوتا فسلموا على انفسكم تحية من عند الله مباركة طيبة
(جب تم گھروں میں داخل ہونے لگو تو اپنے لوگوں کو جو لوگ وہاں موجود ہوں ان کو سلام کریں
کرو جو دعا کے طور پر اللہ کی طرف سے مقرر ہوا ہے بابرکت اور عمدہ چیز ہے۔)

موقعہ سے فائدہ اٹھائیے:

عزیزو! آج کل عام رواج ہے، جب ادارے ہوتے ہیں تو باہر کے لوگ آتے ہیں
بلائے بھی جاتے ہیں، خود بھی آتے ہیں، لیکن بہت سے آنے والوں کو اس کا خیال بھی نہیں ہوتا
کہ ہم کیوں آئے ہیں اور اس سے کیا فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اسی طرح بہت سے رہنے والوں کو
اس کا خیال بھی نہیں ہوتا کہ یہ آمد محض ایک رسمی و رواجی آمد ہے یا اس سے کوئی دینی علمی فائدہ
بھی اٹھایا جاسکتا ہے اس کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے بلکہ ہماری حیثیت اور ہمارے

رفقاء کی حیثیت باہر سے آنے والے مہمانوں یا مشاییر کی آمد یا لیڈروں کی آمد نہیں بلکہ اپنوں کی آمد ہے، اس جامعہ کا تعلق شروع سے ندوۃ العلماء اور وہاں کے کارکنوں سے رہا ہے بلکہ حقیقت میں اس کی بنیاد ایک ہندوی فاضل مولانا عبد الحمید صاحب ہندوی مرحوم نے ڈالی ہے۔ وہ یہاں آئے، انہوں نے کچھ تعلیمی خدمت شروع کی تو یہ خدمت برگ و بار لائی جو لوگ آج جامعہ کے روح رواں ہیں وہ زیادہ تر تو ان ہی کے فیض یافتہ ہیں تو گویا اس جامعہ کی جسم البدن ہی ہونی ندوہ کے تعلق سے، پھر اس کے بعد جب جامعہ کی بنیاد ڈال دی گئی تو ندوہ ہی کے تعلق والوں کو بلایا گیا اور اس کے بعد برابر آمد و رفت کا سلسلہ جاری ہے، یہ میں اس لئے نہیں کہہ رہا ہوں کہ ندوہ اور غیر ندوہ میں کچھ فرق ہے بلکہ اس لئے کہ رہا ہوں کہ کم سے کم اس وقت جو لوگ آئے ہیں، یہ سب گھر ہی کے لوگ ہیں، ایسے ہی ہیں جیسے ایک خاندان کی شاخیں ہو جاتی ہیں کوئی قریب رہتا ہے کوئی دور رہتا ہے ایک شاخ کے لوگ دوسرے شاخ کے لوگوں سے ملنے جاتے ہیں، وہ ملنا خاندانی قسم کا ہوتا ہے، ویسے ہی خاندانی قسم کا سفر یہ بھی ہے اور اس میں اپنے ایک عزیز کی تقریب میں شریک کی نیت بھی شامل ہو گئی ہے، تو آپ ہم لوگوں کو باہر کے اجنبی یا تماشا کی حیثیت سے نہ دیکھئے کہ آپ کہیں کہ فلاں بھی آیا فلاں بھی آیا، بلکہ ذہن میں یہ ہونا چاہئے کہ یہ لوگ دو چار دن رہیں گے، ان سے لیا فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور اس پر اللہ کا شکر ادا کرنا ہے کہ اب جامعہ اس درجہ کو پہنچا کہ دور دور سے لوگ آتے ہیں اور اسے دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ اپنی چیز سمجھتے ہیں، اسی کے ساتھ نیت بھی درست کرنا بہت ضروری ہے اور ہماری بھی نیت یہ ہونی چاہئے کہ ہم اپنے عزیزوں سے اور اپنے خاندان کے بچوں سے ملنے آئے ہیں آپ کی بھی نیت یہ ہونی چاہئے کہ ہمارے خاندان میں کچھ بڑے کچھ ہمارے مشیر یا جن کو خدمت کا جذبہ ہے شوق ہے وہ آئے ہیں ان کے دوران قیام میں جلسے ہوں گے تقریریں ہوں گی، عمومی خطاب ہوں گے شاید ہمارے دوست منیری صاحب نے اس کا نظام بنایا ہو لیکن اس کے علاوہ ہمارے ساتھیوں سے آپ فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں ان میں بعض دارالعلوم کے استاذ ہیں اور وہ آپ سے عمر میں اور تعلیم میں قریب ہیں مناسبت رکھتے ہیں ان میں وہ تفاوت نہیں ہے جو ہمارے آپ کے درمیان ہے آپ ان کے ساتھ زیادہ بے تکلفی سے مل بھی سکتے ہیں بات بھی کر سکتے ہیں، ان کو بتلائیے کہ آپ نے اب تک کیا پڑھا پھر ان سے پوچھئے اور مشورہ لیجئے کہ

اس کے بعد کس طرح پڑھیں کس ترتیب سے پڑھیں وہ کتابوں کا انتخاب کر دیں، ان سے کہئے کہ ہمارا فلاں مضمون کچھ کمزور ہے، کیا ہے یا فلاں مضمون سے زیادہ مناسبت نہیں کیے مناسبت پیدا ہو سکے گی، اس کے مبادی کیا ہیں، کس طرح شروع کریں اس سے کس طرح مناسبت پیدا کریں، سب سے پہلے اور سب سے اہم تفسیر، حدیث، فقہ اور صرف و نحو وغیرہ کے مضامین ہیں اس کے بعد جس کو شوق ہو وہ ادب و انشاء کے بارے میں بھی مشورہ کر سکتا ہے، اس وقت جو لوگ ہمارے ساتھ ہیں، الحمد للہ وہ لکھتے پڑھتے ہیں، ان کے مضامین چھپتے ہیں، آپ لوگ بھی دیکھتے ہوں گے، ان لوگوں سے پورا فائدہ اٹھائیے، تین چار دن وہ لوگ یہاں قیام کریں گے ان دنوں میں ذہن کو حاضر رکھئے اور اس وقت کو قیمتی سمجھئے کوشش بھی کیجئے دعا بھی کیجئے کہ اتنی دور سے جو سفر ہوا ہے یہ مفید اور کارآمد ہو، یہ نتیجہ خیز ہو اس لئے کہ یوں ہی کوئی اتنی دور کسی سے ملنے کے لئے نہیں جایا کرتا ہے، جب کوئی ملنے آتا ہے اتنی دور سے تو بہت غنیمت سمجھنا چاہئے، اس سے فائدہ اٹھانا چاہئے، آپ لوگوں کو اس سے خوش ہونا چاہئے جیسے سیاسی لوگ خوش ہوتے ہیں بڑے بڑے لیڈروں کے آنے پر۔ آپ کو خوش ہونا چاہئے اساتذہ اور ماہرین فن کی آمد پر، ایسے مواقع کم ملتے ہیں اور مل جائیں تو انہیں ضائع نہیں کرنا چاہئے۔

ہاتھی یا علم حدیث:

ایک لطیفہ سناتا ہوں ایک مرتبہ لکھنؤ سے بارہ بنکی گیا جو لکھنؤ سے پندرہ سولہ میل دور ہوگا، لکھنؤ سے میں وہاں گیا تو میرا وہاں خطاب پیام انسانیت کے سلسلہ میں تھا اور اسی روز وہاں سابق وزیراعظم مسٹر گاندھی آئی ہوئی تھیں، لوگ منتشر تھے، تقسیم ہو گئے تھے، اکثر لوگ وہاں سے تماشا ہی دیکھنے کے لیے چلے گئے کیونکہ بارہ بنکی چھوٹی جگہ ہے چھوٹا ضلع ہے، اس میں وزیراعظم مسٹر اندرا گاندھی آئیں تو بڑی بات تھی، جتنے مجمع کی توقع تھی اتنا مجمع ہمارے جلسہ میں نہیں تھا، پھر بھی بہت سے لوگ آئے وہ قابلِ داد تھے تو میں نے ان سے کہا کہ میں آپ کو ایک لطیفہ سناتا ہوں وہ حسبِ حال ہے، ایک مرتبہ امام مالکؒ موٹا کا درس دے رہے تھے، مدینہ میں ایک ہاتھی آ گیا اور مدینہ میں ہاتھی ہوتا نہیں عرب ہی میں ہاتھی نہیں ہوتا، شور مچ گیا، ہاتھی آیا ہاتھی۔ جاء الفیل جاء الفیل وہ ہمیشہ پڑھ رہے تھے الم تر کیف فعل ربک باصحاب الفیل الم يجعل کیدہم فی تضلیل۔ انہوں نے اور جانور تو دیکھے تھے۔ گھوڑا

تو ان کے گھر کی چیز تھی، اونٹ بھی ان کے گھر کی چیز تھی ہاتھی نہیں دیکھا تھا، تو بے اختیاری اور غیر ارادی طریقہ پر لوگ ہاتھی دیکھنے چلے گئے، یہ امام مالک کا حلقہ درس تھا، وہاں بہت منتخب لوگ تھے، پھر بھی لوگ ہاتھی دیکھنے چلے گئے، لیکن ان کے ایک شاگرد یحییٰ حلقہ درس سے نہیں اٹھے، وہ امام مالک کے خدمت ہی میں بیٹھے رہے۔

امام مالک نے کہا کہ اے یحییٰ تم نہیں گئے، تمہارے ملک میں بھی تو ہاتھی نہیں ہوتا کہا ہم ہاتھی دیکھتے نہیں آئے ہیں، ہم آپ کو دیکھنے آئے ہیں، انہوں نے غالباً دعادی اس کا نتیجہ کہ ایسا دنیا میں کم پیش آیا ہے کہ یحییٰ بن یحییٰ مسعودی کی وجہ سے اس سارے شمالی افریقہ میں امام مالک کا مسلک پھیلا اور اس علاقہ کے سبھی لوگ مالکی ہیں، یہ موجودہ روایت مؤطا کی جو ہم تک پہنچی ہے یحییٰ بن یحییٰ مہمودی کی روایت ہے اور ایسا کم ہوتا ہے کہ علاقہ کا علاقہ ملک کے ملک ایک مسلک کے ہوں، لیکن آپ تصور کیجئے کہ لیبیا جس میں مالکیہ کی بڑی تعداد ہے، لیبیا سے شروع ہو کر جو شمالی پٹی چلی گئی ہے، مراکش پر بلکہ آبنائے جبل الطارق پر ختم ہوتی ہے، یہ پورا علاقہ سو فیصد مالکی ہے، بے شک اس میں ابن بادیس کا بھی بہت بڑا دخل ہے، جس نے مذہب مالکی کو سرکاری مذہب بنا دیا لیکن بیچ لایا ہوا ہے یحییٰ بن یحییٰ کا، ایک بات تھی ذرا سی بات اللہ کو پسند آئی، ہاتھی دیکھنے نہیں گئے تو ان کے علم اور ان کی ذات سے اتنی برکت ہوئی، یہ اس وجہ سے کہ انہوں نے امام مالک کے درس حدیث کو ہاتھی کا تماشا دیکھنے پر ترجیح دی۔

ترجیح کی بات:

عزیزو! سارا معاملہ ترجیح کا ہے، تم کس کو کس پر ترجیح دیتے ہو؟ مہار اقرآن اسی سے بھرا ہوا ہے، اللہ کے حکم کو، ترجیح دیتے ہو یا خواہش کو ترجیح دیتے ہو، رسول کے کہنے کو ترجیح دیتے ہو یا رسم و رواج کو ترجیح دیتے ہو، مصلحت کو ترجیح دیتے ہو یا حکم الہی کو ترجیح دیتے ہو، اسلام کا معاملہ شریعت کا معاملہ ہے، یحییٰ بن یحییٰ نے ہاتھی پر امام مالک کو ترجیح دی تو اللہ نے اور بہت سے داعیوں پر ناشرین علم پر ان کو ترجیح دی اور جس کتاب کے وہ حامل و شارح بنے اس کو اچھی اچھی کتابوں پر ترجیح دی گئی سب کتابیں اچھی ہیں، ہدایہ اگر وہاں پہنچتی یا وہاں مسند امام ابو حنیفہ ہوتی وہ بھی خیر سب سراپا نور، لیکن صرف اس ایک عمل کا اثر یہ ہوا کہ اس حامل علم کو ترجیح دی گئی دوسرے حاملین علم پر، اور اس محمول کو ترجیح دی گئی دوسرے محمولات پر دوسری جو علم کی سونگاتیں

تھیں، علم کے تحائف تھے ان پر ان کو ترجیح دی، سارا معاملہ ترجیح کا ہے آج بھی اتفاق سے آپ کے شہر میں ایک بڑی شخصیت آئی ہوئی ہے، آج ہی اللہ نے آپ کو یہ ایک منظر دکھلایا، امتحان میں تو نہیں ڈالا کہ وہی وقت ہوتا ہمارے بھی آنے کا لیکن منظر آپ کو دکھایا کہ یہاں ہندوستان کی سب سے بڑی شخصیت آئی اور ہم طالب علم بھی آئے۔ اگر آپ کے دل میں ان طالب علموں کی عزت ہے، ہمارے آنے سے آپ کو زیادہ خوشی ہے تو اللہ تعالیٰ کے یہاں بھی یہ خوشی رنگ لائے گی یقین مانئے اگر آپ نے کہا الحمد للہ آج ہمارے کچھ بزرگ، ہمارے کچھ مشفق ہمارے کچھ خیر خواہ ہمارے لیے دعا کرنے والے لوگ آئے ہیں، ہم بڑے خوش نصیب ہیں تو یہ بات اللہ تعالیٰ کو پسند آئے گی اور کچھ تعجب نہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کے معاملہ میں علم نافع کا فیصلہ فرماوے۔

شعائر اللہ کا احترام:

یہ جو کچھ آپ شریعت کو دیکھتے ہیں، یہ سب احترام کی باتیں ہیں، کرنا کرنا تو بعد کا مرحلہ ہے اور ضروری ہے لیکن پہلا مرحلہ احترام کا معاملہ ہے اللہ اور رسول کو اللہ و رسول سے نسبت رکھنے والی چیزوں کو کس نظر سے دیکھا جائے، یہی حقیقت ہے شعائر اللہ کی، اللہ رب العزت کا ارشاد ہے ومن یعظم شعائر اللہ فانہا من تقوی القلوب تو تعظیم شعائر اللہ دلیل ہے قلوب میں تقویٰ کی، قلب میں اللہ کی عزت ہے تو جو چیز اللہ کے لیے کہلاتی ہے اس کے لیے بھی عزت ہوگی ایسے ہی ہم لوگ کوئی چیز نہیں اور کون کیا چیز ہے، سوائے اللہ کے اور اللہ کے رسول کے صحابہ کے اور کبار اولیاء اللہ کے سب برابر ہیں، ایک طرح لوگ ہیں، لیکن سارا انحصار جو ہے وہ نظر پر ہے، طریقہ فکر پر ہے، نقطہ نظر پر ہے اور ذہنی کیفیت پر ہے ومن یعظم شعائر اللہ میں ذہنی کیفیت کو بیان کیا گیا ہے، ایک بزرگ کو بہت بڑے مدارج عالیہ ملے، مجھے اس وقت ان کا نام یاد نہیں، فضیل بن عیاض یا جنید بغدادی کا نام یاد آتا ہے، کسی نے پوچھا کہ حضرت اتنا بڑا درجہ اللہ نے نصیب فرمایا، کیا بات ہے کہنے لگے بات تو اتنی ہے کہ میں چلا جا رہا تھا ایک جگہ میں نے ایک کاغذ پڑا دیکھا، اس پر اللہ کا نام لکھا تھا میں نے اٹھایا، آنکھوں سے لگایا اس کو ایک جگہ عزت کے ساتھ کسی دیوار وغیرہ میں حفاظت سے رکھ دیا، اللہ کو یہ ادا پسند آئی اور اللہ نے مجھے یہ مرتبہ عطا کیا۔

اصل میں تعظیم جو ہے محبت و محبت کا اس پر انحصار ہے، اس کی دلیل ہے یہی علم کا حال

ہے۔

بے حرمتی کا انجام:

ایک عجیب واقعہ جو بڑا عبرتناک ہے، شاید بہت کم لوگوں کو معلوم ہو، حضرت شاہ عبد العزیزؒ کے شاگردوں میں ایک صاحب تھے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو محفوظ رکھے، ہم سب کا خاتمہ ایمان پر فرمائے دہریہ ہو گئے تھے کلکتہ میں رہتے تھے گورکھپور کے رہنے والے تھے، شاہ اسماعیل شہید کے ساتھ پڑھے ہوئے تھے، بڑا عجیب و غریب واقعہ ہے جب حضرت شاہ اسماعیل صاحب حج کو جانے لگے تو ٹیپو سلطان، وہ ٹیپو سلطان جو آپ ہی کے علاقہ کے تھے، ان کے پوتوں کے وہ اتالیق تھے، جن کی وجہ سے ٹیپو سلطان کے پوتوں پر کچھ اثر ہو رہا تھا تو ٹیپو سلطان کی پوتی یا صاحبزادی نے حضرت سید احمد شہید سے کہلایا کہ ہمارا خاندان تو آپ ہی کے خاندان کا متوسل ہے۔

ہمارے اجداد مادری میں شاہ ابوالملیث صاحب جو سید صاحب کے حقیقی ماموں تھے سفر حج سے واپسی پر ۱۲۰۸ھ میں ٹیپو سلطان (م ۱۲۱۴ھ ۱۷۹۹ء) کی حیات میں کوریا بندر پر (منگلور) میں اترے اور مختصر علالت کے بعد وہیں وفات پائی اور وہیں سپرد خاک ہوئے اس سے پتہ چلتا ہے کہ سلطان ٹیپو کے اس مجاہد خاندان کے حضرت شاہ علم اللہ صاحبؒ کی اس شاخ اور سید صاحبؒ کے اجداد مادری سے عقیدت و ارادت کے مستحکم تعلقات تھے۔ تو صاحبزادی نے کہلایا کہ ہمارے بھائی صاحبان پر بڑا اثر پڑ گیا ہے، فلاں مولوی صاحب اور وہ ملحد ہو گئے ہیں، آپ ذرا توجہ فرمائیں اور ان کی اصلاح فرمائیں، الحمد للہ ان کی اصلاح ہوئی وہ سب بیعت ہو گئے تو ان مولوی صاحب کے الحاد کی طرف جانے کی وجہ بھی ایک عجیب و غریب معلوم ہوئی، زیادہ کرید کر پڑھا تو معلوم ہوا کہ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ حضرت شاہ عبد العزیز صاحب بخاری کا درس دے رہے تھے، بڑے زور کی ہوا چلی، بار بار ورق الٹتے تھے، آپ سب جانتے ہیں بخاری کے اوراق جو بڑے ہوتے ہیں تو اس کے ورق کی آواز سے سبق میں انتشار ہوا، شاہ صاحب نے کہا بھائی! اس پر ہاتھ رکھ لو یا کوئی چیز رکھ لو تو کسی نے ہاتھ رکھا کسی نے کوئی دینی کتاب رکھی، پس اس شخص نے غور باللہ اس پر پاؤں رکھ دیا، یہ کرنا تھا کہ لائن بدل گئی تو سارا معاملہ عزت و احترام کا ہے، سب

وہیں سے ہوتا ہے وہیں سے ملتا ہے جس کو ملتا ہے۔ لیکن جو قلبی کیفیت ہے وہ بڑی چیز ہے چنانچہ یہی دیکھا کہ جن لوگوں میں استاد و کتاب کا احترام تھا تو اللہ تعالیٰ نے ان سے بہت نفع پہنچایا عالم کو نسا بڑا ہے اس کو اللہ جانتا ہے بلکہ ہمیں بھی کچھ تھوڑا بہت معلوم ہو سکتا ہے، کم علموں کو بھی کہ بعض لوگ ان سے زیادہ ذی علم ہیں بہت زیادہ ذہین ہیں لیکن کچھ فائدہ نہیں ہوا فائدہ ان سے ہوا جن کا علم اتنا نہیں تھا وجہ کیا تھی، وہی اساتذہ کا ادب و احترام اور ان کی دعائیں بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ صاحب ہدایۃ علامہ مرغینانی ایک مرتبہ دورے پر تھے تو سب شاگردوں نے کہا کہ مصنف ہدایۃ آئے ہیں، مصنف ہدایۃ آئے ہیں ایک شور مچ گیا، جو جہاں تھے سب کام چھوڑ کر ہر طرف سے طلباء ملنے آئے سلام کرنے آئے کہ ہمارے استاد آ گئے ہیں، صرف ایک طالب علم جو اچھے ممتاز تھے وہ نہیں آئے تو انہوں نے کہا کہ بھئی فلاں آدمی نہیں آئے خیر اس کے بعد کسی موقع پر وہ ملے تو انہوں نے کہا ہم تو تمہارے دیار میں آئے تھے تم ملنے نہیں آئے؟ تو اس نے کہا حضرت! والدہ بیمار تھیں چھوڑ کر نہیں آ سکے تو انہوں نے کہا انشاء اللہ تمہاری عمر دراز ہوگی، یہ بڑا اچھا فعل ہے برکت ہوگی تمہاری عمر میں، لیکن درس میں رونق نہیں آئے گی تم نے ایک اچھا کام کیا اس کا اثر عمر درازی میں ظاہر ہوا چونکہ وجود کا تعلق ماں سے ہے جب وجود ہے تو عمر بھی ہے تو وہ جو جسمانی تعلق ماں سے ہے تو جسمانی فیض تم کو پہنچے گا کہ تمہاری عمر دراز ہوگی لیکن وجود معنوی جس سے تھا، وجود روحانی جس سے تھا گویا اس پر تم نے ترجیح دی ہے ترجیح کا معاملہ ہے نو درس میں رونق نہ ہوگی، یہ زبان سے نکل گیا تو لکھا ہے لوگوں نے کہ ان کے درس میں سب پلٹے تھے لیکن رونق نہیں تھی یعنی لوگ آنے لگے اور استفادہ کریں، تلامذہ کی کثرت ہو، بس بھائیو! میں نے سلام کے موقع پر یہ باتیں کیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو نیک عمل کی توفیق عنایت فرمائے آمین!

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ محمد وآلہ اجمعین

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

دعوت و تبلیغ اور مطالعہ کے لیے مستند کتب

۳ جلد اردو ترجمہ	مولانا محمد یوسف کاندھلوی	حیۃ الصحابہ
۳ جلد انگریزی	مولانا محمد احسان صاحب	حیۃ الصحابہ
اردو	شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا	فضائل اعمال
انگریزی	شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا	فضائل اعمال
اردو	شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا	فضائل صدقات مع فضائل حج
انگریزی	شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا	فضائل صدقات
	شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا	فضائل نماز
	شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا	فضائل قرآن
	شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا	فضائل رمضان
	شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا	فضائل حج
	شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا	فضائل تبلیغ
	شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا	فضائل ذکر
	شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا	حکایات صحابہ
	شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا	شمال ترمذی
اردو	مولانا محمد یوسف کاندھلوی مترجم مولانا محمد سعد مدظلہ	منتخب احادیث
انگریزی	مولانا محمد یوسف کاندھلوی مترجم مولانا محمد سعد مدظلہ	منتخب احادیث

ناشر: دارالاشاعت
اردو بازار ایم اے جناح روڈ
کراچی، پاکستان، فون: ۲۱۱۲۱۱۱ (۲-۲۱۱۲۱۱۱)
دیگر اداروں کی کتب دستیاب ہیں لیکن ملک کے باہر کے قارئین کے لیے مفت ڈاک کیلئے بھیج سکتے ہیں۔

خواتین کے لئے دلچسپ لوہائی اور مستند اسلامی کتب

حضرت تھانویؒ	انگریزی	اردو	تحفہ زوجین بہشتی زیور اصلاح خواتین اسلامی شادی پردہ اور حقوق زوجین اسلام کا نظام عفت و عصمت حیض و عجزہ یعنی عورتوں کا حق تنسیخ نکاح خواتین کے لئے شرعی احکام سیر الصحابیات مع اسوۃ صحابیات چھ گناہ گار عورتیں خواتین کا حج خواتین کا طریقہ نماز ازواج مطہرات ازواج الانبیاء ازواج صحابہ کرام پیارے نبیؐ کی پیاری صاحبزادیاں نیک بیبیاں جنت کی خوشخبری پانے والی خواتین دور نبوت کی برگزیدہ خواتین دور تالیفین کی نامور خواتین تحفہ خواتین مسلم خواتین کے لئے بیس سبق زبان کی حفاظت شرعی پردہ میاں بیوی کے حقوق مسلمان بیوی خواتین کی اسلامی زندگی کے سائنسی حقائق خواتین اسلام کا مثالی کردار خواتین کی دلچسپ معلومات و نصائح امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں خواتین کی ذمہ داریاں قصص الانبیاء اعمال و قرآنی آئینہ عملیات اسلامی وظائف
حضرت تھانویؒ	"	"	"
حضرت تھانویؒ	"	"	"
ابلیہ ظریف تھانوی	"	"	"
سید سلیمان ندوی	"	"	"
مفتی عبدالرزاق صاحب	"	"	"
ڈاکٹر حفصانی میاں	"	"	"
احمد حلیل جمہ	"	"	"
عبدالعزیز شاہ	"	"	"
ڈاکٹر حفصانی میاں	"	"	"
حضرت میاں اختر حسین صاحب	"	"	"
احمد حلیل جمہ	"	"	"
مولانا عاشق الہی بلوچ	"	"	"
"	"	"	"
"	"	"	"
"	"	"	"
مفتی عبدالغنی صاحب	"	"	"
مولانا ادریس صاحب	"	"	"
حکیم طارق محمود	"	"	"
نذیر محمد مکتبی	"	"	"
قاسم عاشور	"	"	"
نذیر محمد مکتبی	"	"	"
امام ابن کثیرؒ	"	"	"
مولانا اشرف علی تھانوی	"	"	"
صوفی عزیز الرحمن	"	"	"

پیشکش کیلئے مفت
کتاب درخواست کریں !!

قرآن و حدیث سے ماخوذ وظائف کا مجموعہ

پیشکش دارالاشاعت اردو بازار ایم ایچ خارج روڈ کراچی فون: ۲۶۳۱۸۶۱-۲۲۱۲۴۱۸